خواتین ڈائجسٹ

ستمبر 2015

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیر اعلیٰ —— محمود ریاض

مدیرہ —— سعادرہ خاتون

مدیر —— آذر ریاض

نائب مدیرہ —— رضیہ جمیل

مدیرہ خصوصی —— امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات —— عدنان

اشتہارات —— خالد جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

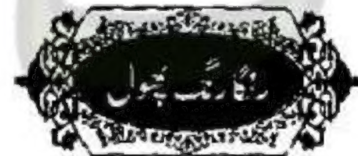
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

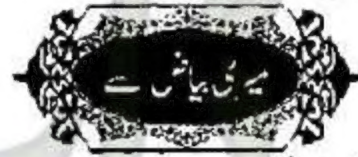
زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 8000 روپے















ستمبر 2015

جلد 43 شمارہ 5

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com



ستمبر کا شمارہ آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر ہے۔

پاکستان کی تاریخ میں ستمبر کے مہینے کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ چھ ستمبر 1965ء جب پڑوسی ملک نے حملہ کیا اور پاکستانی قوم کا وہی جوش اور جذبہ سامنے آیا، جس نے پاکستان کے قیام کا معجزہ کر دکھایا تھا۔ کامل یک جہتی، مکمل اتحاد، ہم سب ایک قوم تھے۔ اور ہماری پہچان مسلمان اور پاکستان۔ پاکستان کے دشمنوں نے بھانپ لیا، جب تک ہماری صفوں میں اتحاد ہے۔ ہمیں شکست دینا ممکن نہیں۔ اسی لیے ان کا اگلا نشانہ ہمارا اتحاد بنا۔

پاکستان دو لخت ہوا۔ ہم بہت مشکل ادوار سے گزرے، لیکن اللہ کا کرم ہے کہ پاکستان ایک بار پھر مستحکم ہو رہا ہے۔ امن و امان کی صورتِ حال بہتر ہوئی ہے۔ اور دیگر شعبوں میں بھی تبدیلی آ رہی ہے۔

راتوں رات کچھ بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ تبدیلی خواہش اور کوشش کا عمل ہے۔ ہماری نیت، ہمارا انتخاب ہی زندگی کا رُخ متعین کرتا ہے۔ اصل فیصلہ تو قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے، لیکن کامیابی کے راستے پختہ ارادے، نیک نیتی، صاف دلی اور جہدِ مسلسل سے عبارت ہیں۔

مثبت سوچ اور نیک نیتی ہمارے راستوں کا چراغ ہے جو منزل کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اتار چڑھاؤ، خوشی، غم، اندھیرا، اجالا، زندگی ہمیں ہر رنگ دکھاتی ہے اور کامیاب وہی ہیں جو ہر رنگ میں جینے کا ڈھنگ جانتے ہیں، جنہیں وقت کے ساتھ چلنے کا ہنر آتا ہے۔ اور موسم کی ہر گردش کے ساتھ سمجھوتے کی راہ اپناتے ہیں۔

کامیابی مشکل ضرور ہوتی ہے، ناممکن نہیں۔ آج اگر زندگی میں کوئی دکھ، تکلیف یا پریشانی ہے تو یقین رکھیں کہ وقت ہمیشہ ایسے ہی نہیں رہے گا۔

روبرو،

ہماری بہت سی قارئین نے فرمائش کی ہے کہ بہن تنزیلہ ریاض کا انٹرویو شائع کیا جائے۔ قارئین تنزیلہ ریاض کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں اور عہدِ الست کے حوالے سے بھی ان کے ذہن میں کئی سوالات ہیں۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ بہن تنزیلہ ریاض سے انٹرویو ہمارے قارئین خود کریں۔

آپ تنزیلہ ریاض سے جو سوالات کرنا چاہتی ہیں، ہمیں بھجوا دیں۔ ہم ان تک پہنچا دیں گے۔ وہ آپ کے سوالات کے جواب دیں گی۔ سوالات اس طرح بھجوائیں کہ 30 ستمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- آسیہ رزاقی کا مکمل ناول۔ فیصلہ سامنے تھا۔
- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ نمل،
- امت العزیز شہزاد کا مکمل ناول۔ شہر آشوب،
- فرح بخاری کا ناولٹ۔ مان،
- سمیرا حمید، بشریٰ احمد، مصباح علی، قرۃ العین رائے اور عائشہ رباب کے افسانے۔
- عمیرہ احمد اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- ٹی وی اینکر ارسلان خالد سے ملاقات،
- باتیں نادیہ حسین سے،
- حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ۔ مصنفین کے جوابات،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔
- خواتین کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

فال لینا

حضرت عمرو بن عاصر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فال گیری کا ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ان میں سب سے اچھی چیز تو نیک فال ہے اور (بدفالی) کسی مسلمان کو کام سے نہ روکے۔ چنانچہ جب تم میں سے کوئی شخص ناگوار چیز دیکھے (جس سے بدشگونی کا وسوسہ پیدا ہو) تو یہ دعا پڑھے۔"

"یا اللہ! تیرے سوا کوئی بھلائیاں نہیں پہنچاتا تیرے سوا کوئی برائیاں نہیں ٹالتا اور برائیوں سے بچنا اور نیکی کرنے کی قوت سے بہرہ ور ہونا تیری ہی توفیق سے ممکن ہے۔"

(یہ حدیث صحیح ہے۔ اسے ابو داؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)

تصویریں بنانا

"حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بے شک وہ لوگ جو یہ تصویریں بناتے ہیں۔ قیامت کے دن ان کو عذاب دیا جائے گا (اور) ان سے کہا جائے گا۔ تم نے جو تصویریں بنائی تھیں ان کو زندہ کرو۔" (ان میں روح ڈالو۔) (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

اس سے معلوم ہوا کہ تصویر سازی بہت بڑا گناہ ہے جس پر عذاب ہوگا۔ تاہم جو تصویر حکومت کی طرف سے لازم قرار دی گئی ہو' جیسے شناختی کارڈ' پاسپورٹ اور ڈومیسائل وغیرہ میں' ان میں چونکہ انسان مجبور ہے' اس میں اس کی اپنی مرضی کا دخل نہیں' اس لیے ان پر انہیں عذاب نہیں ہوگا' ان شاء اللہ۔ بشرطیکہ انسان ان ضرورتوں سے تجاوز نہ کرے۔

تصویریں بنانا

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر سے تشریف لائے اور میں نے گھر کی ڈیوڑھی یا طاقچے پر ایک پردہ ڈالا ہوا تھا جس پر تصویریں تھیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے عائشہ! قیامت والے دن اللہ کے ہاں سب سے زیادہ سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں اس کی نقل اتارتے ہیں۔"

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ چنانچہ ہم نے اس پردے کو کاٹ دیا اور اس سے ایک یا دو تکیے بنا لیے۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ تصویریں بنانا اور انہیں گھروں میں نمایاں کرکے آویزاں کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ تاہم انہیں پھاڑ اور کاٹ کر ایسی چیز بنالی جائے جو قابل احترام نہ ہو اور لوگ اسے روندتے رہیں تو تصویر والے کپڑے کا ایسا استعمال جائز ہے، جیسے حضرت عائشہؓ نے اس کپڑے کے تکیے بنالیے تھے۔

تصویر بنانے والا

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔

"ہر تصویر بنانے والا جہنمی ہے۔ اس کی ہر تصویر کے بدلے میں جو اس نے بنائی ہوگی، ایک شخص بنایا جائے گا جو اسے جہنم میں عذاب دے گا۔" حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ "چنانچہ اگر تم نے تصویر ضرور ہی بنانی ہو تو درخت کی اور ایسی چیز کی تصویر بناؤ جس میں روح نہ ہو۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ مصور (تصویر بنانے والے) نے جتنی تعداد میں تصویریں بنائی ہوں گی، اسی حساب سے اسے عذاب ہوگا۔ جتنی زیادہ تصویریں اتنا ہی زیادہ عذاب۔ اس میں شادیوں اور جلسوں وغیرہ کی ویڈیو فلمیں بنانے والوں کے لیے سخت وعید ہے کہ وہ بیک وقت سیکڑوں، ہزاروں اور بعض دفعہ لاکھوں آدمیوں کی تصویریں بنا لیتے ہیں۔ اگر وہ اس کاروبار کو حرام جانتے ہوئے محض تساہل کی وجہ سے کررہے ہوں گے تو اس کی سخت نہایت سخت سزا ان کو جہنم میں بھگتنی پڑے گی اور اگر وہ اسے حلال سمجھتے ہوئے کریں گے۔ درآں حالیکہ وہ جانتے ہیں اسلام میں یہ حرام ہے، تو وہ اپنے اس فعل سے کافر قرار پائیں گے اور ان کا دائمی ٹھکانا جہنم ہوگا۔

2۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وعید صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو ہاتھ سے تصویر بناتے یا مجسمے تراشتے ہیں اور کیمرے کی تصویر، تصویر نہیں بلکہ عکس ہے تو ایسا سمجھنا بالکل غلط ہے۔ تصویر ہاتھ سے بنائی گئی ہو یا کیمرے اور ویڈیو کے ذریعے سے، وہ تصویر ہے اور اس کا بنانے اور بنوانے والا نار جہنم کی وعید کا مستحق۔ البتہ قدرتی مناظر کی، جیسے نہر، درخت، پہاڑ وغیرہ جن میں روح نہیں ہے، تصویر بنانا جائز ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔

"جس نے دنیا میں کوئی تصویر بنائی اسے قیامت والے دن مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس میں روح پھونکے، جبکہ وہ روح پھونکنے پر قادر نہیں ہوگا۔" (بخاری و مسلم)

سب سے زیادہ عذاب

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔

"قیامت والے دن سب سے زیادہ سخت عذاب میں مبتلا تصویر بنانے والے ہوں گے۔" (بخاری و مسلم)

ظالم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "ان لوگوں سے بڑا ظالم کون ہے جو میرے پیدا کرنے کی طرح پیدا کرنے لگتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ ایک ذرہ (یا چیونٹی) ہی پیدا کر دکھائیں یا (کسی غلے کا) ایک دانہ پیدا کردیں یا ایک جو ہی پیدا کردیں۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ:۔

1۔ اس میں مصورین (فوٹو گرافروں اور ویڈیو سازوں) کے لیے سخت وعید ہے جو صفت خالقیت میں اللہ کی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔

کتایا تصویر

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کوئی کتایا تصویر ہو۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ:۔

فرشتوں سے مراد رحمت کے فرشتے ہیں جن کی آمد سے گھروں میں اللہ کی رحمت و برکت نازل ہوتی ہے۔ ورنہ حفاظت و نگرانی پر مامور فرشتے تو ہر وقت ہی انسان کے ساتھ رہتے ہیں، وہ جدا ہی نہیں ہوتے۔

فرشتوں کا داخلہ

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے (ایک مرتبہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے کا وعدہ کیا، لیکن انہوں نے آنے میں تاخیر کردی، حتیٰ کہ (یہ انتظار) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہایت گراں گزرا۔ بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبریل ملے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے (دیر سے آنے کی) شکایت کی تو جبریل نے فرمایا۔

"ہم اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کوئی کتایا تصویر ہو۔" (بخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت جبریل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی ایک گھڑی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ وہ گھڑی تو آگئی لیکن جبریل نہ آئے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے ہاتھ سے پھینک دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے۔

"اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا اور نہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر دوڑائی تو دیکھا کہ آپ کی چارپائی کے نیچے ایک پلا (کتے کا بچہ) ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ کتا کب اندر گھس آیا ہے؟"

(حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔) میں نے کہا۔ "اللہ کی قسم! مجھے تو اس کا پتا نہیں۔"

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بابت حکم دیا اور اسے باہر نکالا گیا تو اس کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، میں تمہارے لیے بیٹھا رہا، لیکن تم آئے نہیں؟"

جبریل علیہ السلام نے عرض کیا۔

"مجھے اس کتے نے روکے رکھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تھا۔ ہم اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتایا کوئی تصویر ہو۔" (مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اس حدیث سے گزشتہ حدیث کی وضاحت ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آپ کی لاعلمی میں کتے کا ایک بچہ گھس آیا تھا جو جبریل علیہ

السلام کے لیے گھر کے اندر آنے میں رکاوٹ بنا رہا۔ لیکن آج بہت سے مسلمان محض انگریزوں کی نقالی میں بڑے شوق سے کتے پالتے اور ان کو گھروں میں رکھتے ہیں۔

2 ۔اسی طرح اکثر گھروں میں تصویریں بھی آویزاں ہیں۔ کسی نے آرائش کے لیے مختلف جانوروں کی تصویریں شوکیسوں میں رکھی ہوئی ہیں' کسی نے اپنی اور اپنی بیوی بچوں کی تصویریں سجا رکھی ہیں' کسی نے اپنے مرحوم باپ یا دادا کی تصویر اور کسی نے "برکت" کے لیے اپنے پیر یا کسی بزرگ یا کسی ننگ دھڑنگ ملنگ کی تصویر لٹکا رکھی ہے' حالانکہ تصویر تو رحمت و برکت سے محرومی کا سبب ہے نہ کہ برکت کے حصول کا سبب۔

حضرت ابو ہیاج حیان بن حصین بیان کرتے ہیں۔ کہ مجھ سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"کیا میں تجھے اس کام پر نہ بھیجوں' جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا؟ (وہ یہ ہے کہ) کوئی تصویر دیکھو تو اسے مٹا ڈالو اور کوئی اونچی قبر پاؤ تو اسے برابر کر دو۔" (مسلم)

فوائد و مسائل

1 ۔تصویریں اور ایک بالشت سے زائد اونچی قبریں' یہ ان منکرات میں سے ہیں جن کو ختم کرنا اور مٹانا مسلمان حکمرانوں کی ذمہ داری ہے۔

2 ۔برابر کرنے سے مراد یہ نہیں کہ انہیں زمین کے برابر کر دو' بلکہ مطلب ہے کہ حکم شریعت کے مطابق ان کی زیادہ اونچائی ختم کرکے ایک بالشت کے برابر کر دو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا آپ فرماتے تھے۔

"جو شخص شکار یا مویشی کی حفاظت کے علاوہ (کسی اور مقصد کے) کتا پالے تو اس کے اجر میں سے ہر روز دو قیراط گھٹ جاتے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

ایک جوتے میں چلنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"جب تم میں سے کسی کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو دوسرے (یعنی صرف ایک) جوتے میں نہ چلے' یہاں تک کہ وہ اس کی مرمت کرلے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل : یہ تسمہ' ہمارے آج کل کے تسموں سے مختلف ہوتا تھا۔ اس تسمے کے بغیر جوتا پاؤں میں نہیں ٹھہرتا تھا۔ یہ تسمہ گویا جوتے کو پاؤں کے ساتھ باندھ کر رکھتا تھا اور تسمہ ٹوٹ جانے کی صورت میں جوتا پہن کر چلنا ممکن ہی نہیں ہوتا تھا' اس لیے فرمایا کہ پہلے ٹوٹے ہوئے تسمے کی مرمت کرائے اور پھر دوسرا جوتا بھی پہن لے' کیونکہ ٹوٹے ہوئے تسمے کے ساتھ' ایک پاؤں ننگا اور ایک میں جوتا ہوگا جو ممنوع ہے' تاہم کوئی عذر ہو تو اور بات ہے۔

گھر کے اندر جلتی ہوئی آگ چھوڑنے کی ممانعت

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سوتے وقت تم اپنے گھروں میں آگ (جلتی ہوئی) نہ چھوڑا کرو۔" (بخاری و مسلم)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ مدینہ میں ایک گھر' گھر والوں سمیت رات کو جل گیا۔ جب ان کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ آگ تمہاری دشمن ہے۔ جب تم سونے لگو تو اسے بجھا دیا کرو۔" (بخاری و مسلم)

سوتے وقت

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"برتنوں کو ڈھانپ دیا کرو' مشکیزے کا منہ باندھ دیا کرو' دروازے بند کر دیا کرو اور چراغ بجھا دیا کرو' اس لیے کہ شیطان بندھے ہوئے مشکیزے کو' بند دروازے کو اور ڈھکے ہوئے برتن کو نہیں کھولتا۔ اگر تم میں سے کسی کو کوئی چیز نہ ملے تو اس کی چوڑائی میں لکڑی ہی رکھ دے اور اللہ کا نام لے' بلاشبہ ایک چوہیا بھی گھر کو گھر والوں سمیت جلا دیتی ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ مذکورہ احادیث میں رات کو سوتے وقت آگ بجھا کر سونے کی تلقین کی گئی ہے' یہ آگ چراغ کی شکل میں ہو یا سردیوں میں گرمی حاصل کرنے کے لیے انگیٹھی اور سوئی گیس کے ہیٹر وغیرہ ہوں' تجربات و مشاہدات سے واضح ہے کہ ان کو جلتا ہوا چھوڑ کر سونا نہایت خطرناک ہے۔

برتنوں اور پانی پینے کے مشکیزوں' صراحی اور مٹکوں وغیرہ کو بھی ہر وقت ڈھانپ کر رکھنا چاہیے' تاکہ ان میں کوئی گندی چیز یا جانور وغیرہ داخل نہ ہوں جو نقصان کا باعث بن سکتے ہیں۔ اسی طرح رات یا دوپہر کو' بلکہ آج کل تو ہر وقت ہی دروازوں اور کھڑکیوں کو بند رکھنا ضروری ہے تاکہ چوروں اور ڈاکوؤں سے بچاؤ رہے۔

چیزوں کو رکھتے اور استعمال کرتے وقت اللہ کا نام لینا' یعنی بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے۔

تکلف اختیار کرنے کی ممانعت' اور یہ قول و فعل میں بلا مصلحت مشقت کا نام ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"(اے پیغمبر!) کہہ دے: میں تم سے اس پر (اللہ کی طرف بلانے کی) کوئی مزدوری نہیں مانگتا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔" (ص۔86)

تکلف

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ بیان فرماتے ہیں کہ ہمیں تکلف اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ (بخاری)

فائدہ : تصنع اور بناوٹ بھی تکلف ہے جس کا مظاہرہ بعض لوگ اپنی گفتگو' لباس اور چال ڈھال میں کرتے ہیں۔ کھانے پینے میں یا مہمان نوازی اور خاطر داری میں ضرورت سے زیادہ مشقت اٹھانا اور انواع و اقسام کے کھانے تیار کرنا بھی تکلف ہے۔ ہر قسم کا تکلف ممنوع اور سخت ناپسندیدہ ہے' لیکن بدقسمتی سے مسلمان قوم نے اس تکلف' یعنی دعوتوں میں اسراف و تبذیر کو اپنا شعار اور وطیرہ بنا لیا ہے۔

گناہ اور قرض سے اللہ کی پناہ مانگنا

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے۔

"اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں سستی سے' بہت زیادہ بڑھاپے سے' گناہ سے' قرض سے اور قبر کی آزمائش سے اور قبر کے عذاب سے اور دوزخ کی آزمائش سے اور دوزخ کے عذاب سے اور مالداری کی آزمائش سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں محتاجی کی آزمائش سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں مسیح دجال کی آزمائش سے' اے اللہ! مجھ سے میرے گناہوں کو برف اور اولے کے پانی سے دھو دے اور میرے دل کو خطاؤں سے اس طرح پاک کر دے جس طرح تو نے سفید کپڑے کو میل سے پاک صاف کر دیا اور مجھ میں اور میرے گناہوں میں اتنی دوری کر دے جتنی مشرق اور مغرب میں دوری ہے۔"



قصہ درخت تلے دبے آدمی کا

انشاجی

آج ہم میاں مچھر خاں کے شایان شان استقبال کے لیے بیٹھے تھے۔ دروازے پر چلمن' نیچے چارپائی۔ چارپائی پر مچھر دانی تنی ہوئی۔ گلوب کی کوائل یعنی جلیبی سلگتی ہوئی ایک ہاتھ میں ڈی ڈی ٹی کی پچکاری۔ دوسرے میں عصائے تنبیہ الغافلین یعنی ڈنڈا۔ باہر ہم نے ہرکاروں کی ڈاک بھی بٹھادی تھی کہ جونہی غنیم نظر آئے نقارے پر چوب لگادیں۔ گھر والے بھی توپوں اور منجنیقوں سے لیس کھڑے تھے۔ ہم نے پنجابی فلم کے ولن کی طرح منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بکرا بلایا۔ یعنی اب آئے کون مائی کا لال آتا ہے یکایک کہیں سے آواز آئی۔ "یہ کیا بد تمیزی ہے؟"

ہم نے کہا۔ "کون ہے؟ کہاں ہے؟ ہینڈز اپ۔"

مچھر خان کا مانوس قہقہہ سنائی دیا۔ بولا "اب یہ ناٹک ختم بھی کیجئے۔ کوائل بجھائیے اس کی بو مجھے پسند نہیں۔"

ہم نے کہا۔ "مچھر خان؟ تم ہو یا تمہاری روح بول رہی ہے؟"

جواب ملا "فی الحال تو میں ہی بول رہا ہوں۔ اتنی دیر سے اس پچکاری کی پھننگ پر بیٹھا آپ کی تیاریاں دیکھ رہا تھا۔ اچھا اب ہوش کی دوا کیجئے۔ مچھر دانی کا نقاب اٹھائیے اور کہانی سماعت فرمائیے۔"

ہم نے مری ہوئی آواز سے کہا۔ "کون سی کہانی' کل والی؟"

بولا "جی ہاں کل والی۔ اس شخص کی جو سیکریٹریٹ کے احاطے میں جامن کے درخت تلے دب گیا تھا اور فائل ایک محکمے سے دوسرے میں جارہی تھی کہ "اس درخت کو کون ہٹوائے۔"

"ہاں یاد آگیا۔" ہم نے کہا۔ "محکمہ تجارت نے کیس محکمہ زراعت کو بھیجا۔ زراعت والوں نے محکمہ باغبانی یعنی ہارٹی کلچرل والوں کو بھیجا کیونکہ جامن پھل دار درخت تھا۔ انہوں نے صادنہ کیا تو آدمی کو دھڑ سے کاٹنے اور پلاسٹک سرجری سے جوڑنے کی تجویز ہوئی۔ یہ اس ضدی آدمی نے منظور نہ کی۔ اب آگے چل....."

"سنیے۔" مچھر خاں نے سلسلہ کلام کو جوڑا۔

"رات کو مالی نے دبے ہوئے آدمی کے منہ میں کھچڑی کے لقمے ڈالتے ہوئے اسے بتایا۔ "اب معاملہ اوپر چلا گیا ہے۔ کل سیکریٹیریٹ کے سارے سیکریٹریوں کی میٹنگ ہو گی۔ اس میں تمہارا کیس رکھا جائے گا۔ امید ہے کام ٹھیک ہو جائے گا۔"

دبا ہوا آدمی ایک آہ بھر کر بولا۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک۔

مالی نے حیرت سے کہا۔ "کیا تم شاعر ہو؟"

دبے ہوئے آدمی نے آہستہ سے سرہلا دیا۔

دوسرے دن مالی نے چپراسی کو بتایا۔ چپراسی نے کلرک کو' کلرک نے ہیڈ کلرک کو' تھوڑے ہی عرصے میں سیکریٹریٹ میں خبر پھیل گئی کہ دبا ہوا آدمی شاعر ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ لوگ شاعر کو دیکھنے آنے لگے۔ شام تک محلے محلے سے شاعر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ اور دبے ہوئے آدمی کے گرد مشاعرہ برپا ہو گیا۔ کچھ شاعر اسے اپنی غزلیں اور نظمیں سنانے لگے۔ کئی کلرک اس سے اپنی غزلوں پر اصلاح کے لیے مصر ہونے لگے۔

ہم نے کہا۔ "میاں مچھر خان! دیکھا۔ آخر ادیب کے کام ادیب ہی آتا ہے۔ ہزار کوس سے آتے ہیں غم گسار چلے۔ اچھا تو ان لوگوں نے مل ملا کر اس غریب کو بوجھ تلے سے نکالا۔ شاباش!"

بولا۔ "آپ کہانی سنیے! جب یہ پتا چلا کہ دبا ہوا آدمی شاعر ہے تو سیکریٹریٹ کی سب کمیٹی نے فیصلہ دیا کہ اس فائل کا تعلق نہ ایگریکلچرل ڈپارٹمنٹ سے ہے' نہ ہارٹی کلچرل ڈپارٹمنٹ سے' بلکہ صرف کلچرل ڈپارٹمنٹ سے ہے۔ لہٰذا کلچرل ڈپارٹمنٹ سے استدعا کی گئی ہے کہ شاعر کو اس شجر سایہ دار سے رہائی دلائی جائے۔

فائل کلچرل ڈپارٹمنٹ کے مختلف شعبوں سے گزرتی ہوئی ادبی اکیڈمی کے سیکریٹری کے پاس پہنچی۔ وہ بے چارا فورا" اپنی گاڑی میں سوار سیکریٹریٹ پہنچا اور دبے ہوئے آدمی سے انٹرویو لینے لگا۔

"تم شاعر ہو؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں!"

"کیا تخلص کرتے ہو؟"

"اوس۔"

"اوس!" سیکریٹری زور سے چیخا "وہی اوس جس کا گراں

قدر مجموعہ "اوس کے پھول" حال میں شائع ہوا ہے۔"

دبے ہوئے آدمی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا تم ہماری اکیڈمی کے ممبر ہو؟"

"نہیں۔"

"حیرت ہے کہ تم ہماری اکیڈمی کے ممبر نہیں۔ اف اتنا بڑا شاعر گوشہ گمنامی میں دبا پڑا ہے۔" سیکریٹری نے کہا۔

"گوشہ گمنامی میں نہیں، درخت کے نیچے دبا ہوں، براہ کرم مجھے نکالیے۔"

"ابھی بندوبست کرتا ہوں۔" سیکریٹری بولا اور اپنے محکمہ کو رپورٹ کی۔

دوسرے دن سیکریٹری بھاگا بھاگا شاعر کے پاس آیا۔

'مبارک ہو، مٹھائی کھلاؤ۔ ہماری سرکاری اکیڈمی نے تمہیں اپنی مرکزی کمیٹی کا ممبر چُن لیا ہے۔ یہ رہا پروانہ انتخاب۔"

"مگر مجھے اس درخت کے نیچے سے تو نکالو۔" دبے آدمی نے کراہ کر کہا۔

"یہ ہم نہیں کر سکتے، جو کر سکتے تھے کر دیا۔ تم مر جاؤ تو البتہ تمہارا یوم وغیرہ منایا جا سکتا ہے۔"

"میں ابھی زندہ ہوں۔" شاعر رک رک کر بولا۔ "مجھے زندہ رکھو۔"

"مصیبت یہ ہے۔" سرکاری ادبی اکیڈمی کا سیکریٹری بولا۔ "درخت کاٹنے کا معاملہ قلم دوات سے نہیں۔ آری کلہاڑی سے متعلق ہے۔ اس لیے فارسٹ ڈپارٹمنٹ کو لکھ دیا ہے اور ارجنٹ لکھا ہے۔"

شام کو مالی نے آکر دبے ہوئے آدمی کو بتایا۔ "کل فارسٹ ڈپارٹمنٹ کے آدمی آکر اس درخت کو کاٹ دیں گے۔ تمہاری جان بچ جائے گی۔"

مالی بہت خوش تھا۔ دبے ہوئے آدمی کی صحت جواب دے رہی تھی لیکن وہ اپنی زندگی کے لیے لڑے جا رہا تھا۔

دوسرے دن فارسٹ ڈپارٹمنٹ کے آدمی آری کلہاڑی لے کر پہنچے تو ان کو درخت کاٹنے سے روک دیا گیا۔ معلوم ہوا محکمہ خارجہ سے حکم آیا ہے اس درخت کو نہ کاٹا جائے وجہ یہ تھی کہ اس درخت کو دس سال پہلے حکومت پی ٹونیا کے وزیراعظم نے سیکریٹریٹ کے لان میں لگایا تھا۔ اب اگر یہ درخت کاٹا گیا تو شدید اندیشہ ہے کہ حکومت پی ٹونیا سے ہمارے تعلقات ہمیشہ کے لیے بگڑ جائیں گے۔"

"مگر ایک آدمی کی جان کا سوال ہے۔" ایک کلرک غصے سے چلایا۔

"دوسری طرف دو حکومتوں کے تعلقات کا سوال ہے۔" دوسرے کلرک نے پہلے کو سمجھایا۔ "اور یہ بھی تو دیکھو کہ حکومت پی ٹونیا ہماری حکومت کو کتنی امداد دیتی ہے۔"

لیکن معاملہ چونکہ فائل پر تھا۔ امید باقی تھی۔ انڈر سیکریٹری نے سپرنٹنڈنٹ کو بتایا۔ آج صبح وزیراعظم دورے سے واپس آگئے ہیں۔ آج چار بجے محکمہ خارجہ اس درخت کی فائل ان کے سامنے پیش کرے گا۔ جو فیصلہ وہ دیں گے، وہ سب کو منظور ہوگا۔

شام کو پانچ بجے سپرنٹنڈنٹ خود شاعر کے پاس آیا اور فائل خوشی سے لہرا کر کہا۔ "سنتے ہو۔ وزیراعظم نے اس درخت کو کاٹنے کا حکم دے دیا ہے۔ اس واقعے کی ساری بین الاقوامی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے۔ کل یہ درخت کاٹ دیا جائے گا۔"

شاعر خاموش رہا۔

"ارے سنتے ہو؟" سپرنٹنڈنٹ نے شاعر کا بازو ہلا کر کہا۔

مگر شاعر کا ہاتھ سرد تھا۔ اس کی زندگی کا درخت کٹ کر گر چکا تھا۔ اس کی فائل مکمل ہو چکی تھی۔

"یہ کس کی کہانی ہے؟" ہم نے کہا۔

"کرشن چندر کی۔"

"کرشن چندر کون؟ نام سے تو ہندو معلوم ہوتا ہے۔"

"جی ہاں۔"

"تو پھر انڈیا میں رہتا ہوگا؟"

ہاں انڈیا میں رہتا ہے۔"

"ہاں تو انڈیا میں ایسا ہی ہوتا ہوگا میاں مچھر خاں۔" ہم نے کہا۔ "اس ملک میں بڑی بے انتظامی ہے۔"

"اور آپ کے ملک میں نہیں ہے؟" مچھر خان نے طنز میں بجھے لہجے میں کہا۔

"جناب یہ فائل کا درخت جامن کے درخت سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ یہاں بھی فائلیں دفتروں میں گھومتی رہتی ہیں۔ عدالتوں میں مقدموں کی تاریخیں پڑتی رہتی ہیں اور لوگ....."

"بہرحال یہ کہانی تو انڈیا کی ہے۔" ہم نے کہا۔ "کسی نے اسمگل کی ہوگی۔ ہم اسمگلنگ کے مال کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ ہم اس کہانی سے سبق کیوں لیں۔ ہم بڑے محب وطن آدمی ہیں۔"

✡



آل اِن وَن

باتیں نادیہ حسین سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"

"نادیہ حسین خان۔"

2 "پیار کا نام؟"

"کوئی ایسا نام نہیں۔۔۔ نادیہ ہی کہتے ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"

"11 جنوری / لندن۔"

4 "بہن بھائی / ستارہ؟"

"میرا ایک ہی چھوٹا بھائی ہے / اور ستارہ Capricorn (جدی) ہے۔"

5 "تعلیمی قابلیت؟"

"او لیولز + اے لیول 'بی ڈی ایس ڈاکٹر ہوں اور کچھ ڈپلومہ کورسز بھی کیے ہیں میں نے۔"

6 "شادی؟"

"11 سال ہو گئے ہیں ماشاء اللہ سے شادی کو۔"

7 "شوبز میں آمد؟"

"پندرہ سولہ سال سے ہوں۔ ابتداء ہوسٹنگ سے کی۔"

8 "پہلی کمائی / خرچ؟"

"25 ہزار / جیولری 'جوتوں اور کپڑوں پہ خرچ کر دیے۔"

9 "شوبز کی برائی؟"

"کافی برائیاں ہیں مگر ایسا تو ہر فیلڈ میں ہوتا ہے۔"

10 "بچپن کا خواب؟"

"میڈیکل کے متعلق ہی خواب دیکھا کرتی تھی اور اپنے اس خواب کو پورا کیا اور ڈینٹل ڈگری حاصل کی۔ ہاں پریکٹس نہیں کر سکی۔"

11 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"

"بچوں کے اسکول کھلے ہوتے ہیں تو صبح چھ بجے اٹھتی ہوں۔ ورنہ صبح ساڑھے دس تک اٹھتی ہوں۔"

12 "اور رات؟"

"بہت دیر ہو جاتی ہے۔ بچوں کی چھٹیوں میں دو ڈھائی بج

جاتے ہیں، جبکہ عام دنوں میں بارہ ساڑھے بارہ بجے تک سو جاتی ہوں۔"

13 "صبح اٹھتے ہی دل چاہتا ہے کہ؟"
"کہ میں ایکسرسائز کروں۔"

14 "ٹین ایج میں گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی تھی؟"
"جب امی کسی کام سے روکتی تھیں یا کہتی تھیں کہ یہ کپڑے نہ پہنو، یہ نہ کرو۔ تو مجھے برا لگتا تھا۔"

16 "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"
"میرے بال بہت ہلکے ہیں۔"

17 "شدید بھوک میں چڑچڑی ہو جاتی ہیں؟"
"نہیں چڑچڑی تو نہیں ہوتی.... اور نہ بھوکی رہتی ہوں، کیونکہ مجھے کھانے کا بہت شوق ہے۔"

18 "کس دن کا انتظار ہے؟"
"ہر روز کا... کیونکہ ہر دن کچھ نیا کرنے کو ملتا ہے۔"

19 "اتوار کے بعد پیر کیسا لگتا ہے؟"
"میرا تو سنڈے منڈے ایک جیسا ہی ہوتا ہے کیونکہ میرا سیلون شروع ہو گیا ہے تو اس میں مصروف رہتی ہوں۔"

21 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟"
"یہ تو منحصر ہے کہ خوشی کونسی ہے۔ پرائیویٹ سے ہٹ کر ہو تو پھر سوشل میڈیا کا استعمال کرتی ہوں۔"

22 "شدید غصہ کب آتا ہے؟"
"جب سامنے والا میرے منہ پر جھوٹ بول رہا ہوتا ہے، اور اپنی غلطی نہیں مانتا۔"

23 "کیفیت؟"
"غصہ تو ضرور نکالتی ہوں، چاہے چیخنا ہی کیوں نہ پڑے۔"

24 "اپنے ایمپلائز کو کتنا فری ہینڈ دیتی ہیں؟"
"بالکل بھی نہیں دیتی۔ ہر چیز پہ ان کو مانیٹر کیا جاتا ہے۔"

25 "طبیعت میں ضد ہے؟"
"ہاں ہے... بالکل ہے۔"

26 "مردوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے اور کیا بری لگتی ہے؟"
"مردوں میں ذہانت اچھی لگتی ہے، حس مزاح ہونی چاہیے اور اپنی فیملی کا جس طرح وہ خیال رکھتے ہیں۔ یہ سب مجھے اچھا لگتا ہے۔ ہاں ان میں شک والا عنصر ہوتا ہے، وہ برا لگتا ہے۔"

27 "کوئی غیر مرد مسلسل گھورے تو؟"
"میں تو جا کر بات سنا دیتی ہوں۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"

28 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
"گھر میں تو میں ہی غصہ کرتی ہوں اور تو کوئی غصہ نہیں کرتا۔"

29 "پرائز بانڈ نکلنے پر یقین رکھتی ہیں؟"
"بالکل نہیں۔"

30 "کچھ جو وقت سے پہلے مل گیا ہو؟"
"اپنی اب تک کی زندگی پر نظر دوڑاتی ہوں تو وقت سے پہلے ہی سب کچھ ملا ہے۔ خاص طور پر کامیابیاں۔"

31 "محبت کا اظہار کھل کر کرتی ہیں؟"
"ہاں جی... بالکل۔"

32 "جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے؟"
"منحصر ہے کہ کس کے ساتھ ہے۔ اگر شوہر کے ساتھ ہے تو شوہر کے ساتھ تو جوائنٹ اکاؤنٹ نہیں ہونا چاہیے۔ ماں یا بچوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔"

33 "کس ملک کی شہریت لینا چاہیں گی...؟"
"میرے پاس پہلے سے ہی انگلینڈ کی شہریت ہے۔"

34 "شاپنگ میں خریداری کے لیے پہلی ترجیح؟"
"پرسنل آئیٹم زیادہ خریدتی ہوں، جیولری اور میک اپ وغیرہ۔"

35 "ونڈو شاپنگ کا شوق ہے؟"
"نہیں جی.... ٹائم ہی نہیں ہے۔"

36 "کبھی کرائسس میں وقت گزارا؟"
"بالکل.... زندگی کے سفر میں کرائسس تو آتا ہی ہے۔"

37 "کس بات سے موڈ اچھا ہو جاتا ہے؟"

"میرا چھوٹا بیٹا آٹھ ماہ کا ہے تو جب میں اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہوں تو میرا موڈ اچھا ہی رہتا ہے۔"

38 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"
"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے پیچھے خلوص ہونا ضروری ہے۔"

39 "آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتی ہیں یا؟"
"تھوڑی دیر آرام سے لیٹی رہتی ہوں اور لیٹے لیٹے فون چیک کرتی ہوں اگر جلدی اٹھنا ہو تو پھر اٹھ ہی جاتی ہوں۔"

40 "خلوص کس میں ہوتا ہے اپنوں میں یا غیروں میں؟"
"اپنوں میں ہی ہوتا ہے پرائے تو بری نظر سے ہی دیکھتے ہیں۔"

41 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند ہے؟"
"ہوتا ہی نہیں چھٹی کا دن۔"

42 "لباس میں کیا پسند ہے؟"
"منحصر ہے کہ دن میں نے کہاں گزارنا ہے۔"

43 "عورت ذہین ہونی چاہیے یا حسین؟"
"لازمی ہے کہ وہ ذہین ہو۔"

44 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے بستر پر ہی سکون ملتا ہے۔"

45 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتی ہیں؟"
"اپنے میاں کے۔"

46 "بوریت کس طرح دور کرتی ہیں؟"
"بور ہونے کے لیے ٹائم ہی نہیں ملتا۔"

47 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"
"نہیں بالکل نہیں' کیونکہ اب اگر آپ کو کوئی تنگ کرے تو آپ اس کا نمبر بلاک کروا سکتی ہیں۔"

48 "مہمانوں کی آمد؟"
"اب آج کل کہاں آتے ہیں مہمان۔"

49 "اگر آپ پاور میں آجائیں تو؟"
"تو تعلیم پر زور دوں گی اور کچھ قوانین نافذ کروں گی۔"

50 "کون سی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"جیولری' جوتیاں' کپڑے وغیرہ۔"

51 "انسان کی زندگی کا بہترین دور؟"
"20 سے 30 سال کے دوران کا وقت یا دور بہترین ہوتا ہے۔"

52 "وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"
"کچھ چیزوں میں کرتی ہوں کچھ میں نہیں' کچھ باتوں میں ایزی گوئنگ ہوں۔"

53 "کن پہ دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟"
"بچوں پہ۔"

54 "کھانے کے لیے بہترین جگہ۔ چٹائی' ڈائننگ ٹیبل یا اپنا بیڈ؟"
"ڈائننگ ٹیبل... بستر پہ کھانا تو زہر لگتا ہے۔"

55 "ہاتھ سے کھاتی ہیں یا چھری کانٹے سے؟"
"چھری کانٹے سے نہیں بلکہ ہاتھ سے۔"

56 "آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو کیا لینا پسند کریں گی؟"
"بہت اچھا آرٹ ورک' آرٹ پینٹنگز وغیرہ۔"

57 "دیسی کھانے پسند ہیں یا بدیسی؟"
"ہممم... دونوں طرح کے۔"

58 "کون سی کھانے کی ڈش آپ خود بھی اچھی پکا لیتی ہیں؟"
"اٹالین کھانے اور پاستا وغیرہ۔"

59 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"
"مرد زیادہ نرم دل ہوتے ہیں۔"

60 "کوکنگ چینلز سے لگاؤ؟"
"بالکل بھی نہیں ہے۔"

61 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"
"ماں اور اولاد کی محبت اندھی ہوتی ہے۔ ماں کو اپنا بچہ چاہے جیسا ہی کیوں نہ ہو دنیا کا سب سے خوب صورت بچہ لگتا ہے۔"

62 "روپے جو دکھ دیتے ہیں؟"
"بے بسی کے رویے۔"

63 "شادی کی رسومات میں پسندیدہ رسم؟"
"مہندی۔"

64 "شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"
"تحفہ دینا چاہیے اور میں تحفہ ہی دیتی ہوں اور اگر تحفہ نہ لے سکوں تو پھر کیش دے دیتی ہوں۔"
65 "عموماً" کھانا خود پکاتی ہیں؟"
"نہیں "کک آتا ہے وہی پکاتا ہے۔"
66 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"
"اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوتی تو کیا ہی بات تھی۔"
67 "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"
"آج تک نہیں کیا۔"
68 "کس چیز کا فوبیا ہے؟"
"الحمد للہ ایسا کچھ نہیں ہے۔"
69 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"
"اپنا فون اور دوپٹہ۔۔۔ لازمی لے کر نکلتی ہوں۔"
70 "ماں ناراض ہو جائے تو؟"
"نہیں وہ ناراض نہیں ہوتیں۔"
71 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں آپ؟"
"جی بہت آسانی سے۔"
72 "دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟"
"میں دماغ کی سنتی ہوں۔"
73 "آپ کی اچھی اور بری عادت؟"
"میں کبھی شکایت نہیں کرتی' بہت جذباتی نہیں ہوں۔ میری سوچ پریکٹیکل ہے۔ اب اسے اچھی عادت کہہ لیں یا بری۔"
74 "بچپن کا ایک کھلونا جو آج بھی آپ کے پاس ہے؟"
"میرے پاس تو محفوظ نہیں ہے' میری ماں کے پاس ہے۔"
75 "غصے میں پہلا لفظ؟"
"سچویشن پہ ہی منحصر ہے۔"
76 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"نہیں کبھی نہیں۔"
77 "شہرت مسئلہ بنتی ہے؟"

"اکثر اوقات بنتی ہے۔ خاص طور پر ڈرائیونگ کے دوران۔"

78 "بستر پہ لیٹتے ہی سو جاتی ہیں یا کروٹیں بدلتی ہیں؟"

"جب بہت تھکی ہوئی ہوتی ہوں تو فوراً" سو جاتی ہوں۔ ورنہ ذرا مشکل سے ہی نیند آتی ہے۔"

79 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟"

"پانی' بے بی کی کچھ دوائیاں' کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی سوتا ہے۔ فون اور کچھ مزید ضروری چیزیں۔"

80 "کس رنگ کے کپڑے زیادہ استعمال کرتی ہیں؟"

"یہ تقریب پر منحصر ہے۔ ویسے برائٹ کلر زیادہ پہنتی ہوں۔"

81 "خدا کی حسین تخلیق؟"

"جانور' جیسے سمندر کے جانور' جن کی وجہ سے سمندر میں بہت خوب صورتی آجاتی ہے۔ ان کے خوب صورت رنگوں کی وجہ سے۔"

82 "کبھی زندگی بری لگی؟"

"نہیں اللہ کا شکر ہے ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

83 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"

"اچار... جو کہ مجھے بہت پسند ہے۔"

84 "ویلن ٹائن ڈے مناتی ہیں؟"

"اگر ٹائم ہو تو..."

85 "محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟"

"دونوں کی وجہ سے... لیکن قسمت زیادہ رول پلے کرتی ہے آپ کی زندگی میں۔"

86 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"

"اتنا ایشو نہیں ہوگا۔ کیونکہ کسی کو کوئی مسئلہ ہوتا ہے تو کوئی گہری نیند سے اٹھاتا ہے۔"

87 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"

"ریگولرلی چھوٹا موٹا جھوٹ تو بولنا ہی پڑتا ہے۔"

88 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو فریش محسوس کرتی ہیں؟"

"میں تو پورا دن ہی فریش ہوتی ہوں مجھے تھکن کا احساس زیادہ نہیں ہوتا۔"

89 "گھر آکر پہلی خواہش؟"

"بچوں کو دیکھوں اور گلے لگاؤں۔"

90 "آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"

"کچھ نہیں... بس یہ دیکھتی ہوں کہ کوئی دانہ وغیرہ تو نہیں ہے۔"

91 "سینما میں سب سے پہلی فلم کونسی دیکھی تھی؟"

"سپرمین دیکھی تھی۔"

92 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟"

"کم سے کم 10 روپے۔"

93 "اپنے تجربات سے سیکھتی ہیں یا دوسروں کے تجربات سے؟"

"اپنے ہی تجربے سے سیکھتی ہوں۔"

94 "اچانک چوٹ لگ جائے تو؟"

"آوچ نکلتا ہے۔"

95 "لوگ آپ سے مل کر پہلی فرمائش کیا کرتے ہیں؟"

"تصویر بنوانے کی۔"

96 "لوگ کن باتوں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟"

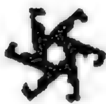
"گوسپ میں۔"

97 "کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش ہمارا ہوتا؟"

"کسی کے لیے نہیں اور میرے پاس تو ویسے ہی انگلینڈ کی شہریت ہے۔"

98 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"اللہ مالک ہے اور میرے پاس کوئی ایک شعبہ نہیں ہے اور میں شہرت کے لیے تو اس فیلڈ میں نہیں آئی۔ بس مجھے تو کام کرنا تھا اور کر رہی ہوں۔"



حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

میرے روز و شب تھے بندھے ہوئے موسموں کے مزاج سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا، کبھی سال پل میں گزر گیا

آپ کی محبتوں کے ساتھ ایک اور سال کا سفر تمام ہوا۔

43 برسوں پر محیط یہ سفر جتنا مشکل تھا، اتنا ہی آسان بھی تھا کہ اس سفر میں لگن اور شوق شامل تھا جس نے تھکنے نہیں دیا۔

گردشِ ماہ و سال کی نیرنگیوں میں کئی راستوں سے گزرے، کئی اتار چڑھاؤ دیکھے لیکن قافلۂ شوق رکنے نہیں پایا، وہ شوق، وہ جستجو، وہ تلاش آج بھی جاری ہے۔

اس طویل سفر میں ہماری مصنفین نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی سوچ اور فکر کے رنگ لفظوں میں ڈھلے تو ان میں زندگی کے سارے منظر سمٹ آئے۔ ان کی تحریروں میں عہدِ حاضر کی کرب ناک حقیقتوں کی آگہی کے ساتھ ساتھ شگفتگی، دل آویزی اور خوابوں کے دلکش رنگ بھی شامل تھے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے لاکھوں قارئین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی، ان کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے، یہی وجہ ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے مصنفین کو اپنی پہچان کے ساتھ ساتھ قارئین کی بے پایاں محبت و تحسین بھی ملی۔

فطری بات ہے ہم جن کو پسند کرتے ہیں، جن سے لگاؤ رکھتے ہیں، ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں، ہماری قارئین بھی مصنفین کے بارے میں ان کی ذات کے حوالے سے جاننا چاہتی ہیں۔

سالگرہ نمبر کے موقع پر ہم نے مصنفین سے سروے ترتیب دیا ہے، سوالات یہ ہیں۔

1 لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت میں منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن، بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟

2 آپ کے گھر والے، خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہے۔

3 آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو۔ اب تک جو لکھا ہے، اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟

4 اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟

5 اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

آیئے دیکھتے ہیں، مصنفین نے ان کے کیا جوابات دیے ہیں۔

قانتہ رابعہ

سب سے پہلے سالگرہ نمبر کی مبارک باد، انسان کی زندگی میں سالگرہ ایک سال کم ہونے کا اشارہ کرتی ہے لیکن رسالوں اور اداروں کی زندگی میں ایک سال بڑھنا بہت اچھا شگون ہوتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہر سال آپ کے ڈائجسٹوں میں ایک تحریر تو ضرور پسند کرلیا کرے۔ مصنفین، ناشرین، ادارتی عملے کی عاقبت میں سرخروئی کے لیے۔۔۔ آپ کی ہر

کاوش کو شرف قبولیت عطا کرے۔

اب سوالوں کے جواب۔

1۔ لکھنے اور پڑھنے کے دونوں شوق ورثے میں ملے۔ اردو ڈائجسٹ' قومی ڈائجسٹ سے لے کر ادب عالیہ کے نمائندہ رسالے نقوش تک سب ابا جی نے لگوائے ہوئے تھے۔ مہینے کی پہلی تاریخ سے پندرہ بیس آجاتی تھی روزانہ ہی ڈاکیہ کئی کئی رسالے دے کر جاتا تھا اور گھر کا ہر فرد کسی نہ کسی رسالے میں منہ دیے پایا جاتا تھا۔ امی خود پڑھنے کی بہت شوقین تھیں۔ بچوں کو فیڈ کرتے ہوئے نسیم حجازی کے تمام ناول (لالٹین کی روشنی میں) جس طرح انہوں نے پڑھے۔ اکثر اسے گوش گزار کیا کرتی تھیں۔ بہت اچھی داستان گو تھیں۔ واقعہ کی تمام تر تفصیلات بمعہ جزئیات کے افسانوی انداز میں سناتی تھیں۔ میرے نانا حکیم محمد عبداللہ سو سے زائد کتب کے مصنف تھے۔ ان کی صرف طبی کتب ہی نہیں' سفرنامے اور یادداشتیں بھی بڑے ادبی پیرائے میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی طبی کتب کا دنیا کی ہر مشہور زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کا انداز تحریر سادہ' مگر دل پسند ہوتا لیکن میرے ابا جی لکھتے تھے تو ان کے اندر کا مزاح نگار بھی انگڑائیاں لے کر اٹھ بیٹھتا تھا۔ ان کی کتاب "جنات اور جادو ' حقیقت اور علاج" میں تو ہر صفحے پر یہی انداز غالب ہے۔

(اصل پیاری۔۔۔ یہ تحریر مارچ کے اوائل میں شروع کی تھی اور تکمیل تک پہنچتے پہنچتے اگست کا آخری عشرہ آن پہنچا۔ اوپر والے سوال کے جواب میں "شرف قبولیت" کا لفظ لکھ تو دیا تھا' لیکن اس دوران پیش آنے والے واقعات نے بتایا کہ یہ شرف ایسے ہی نہیں حاصل ہو جاتا بلکہ کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑتا ہے' ملزم کہلوانا پڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ خیر ابھی تو Bail پر چل رہے ہیں۔ کیس عدالت میں جائے گا تو مجرم ثابت ہوں گے یا بری ہوں گے۔ میرے رب نے جو کہہ دیا ہے افنجعل المسلمین کالمجرمین۔۔۔ اللہ تعالیٰ آگے مجرم نہ بنائیں یہی کافی ہے۔)

2۔ گھر کے افراد سے مراد اگر بچے اور ان کے ابا حضور ہیں تو حضرت ناندار نے مطالعہ کے لیے کبھی افسانے کی صنف منتخب ہی نہیں کی کجا بیوی کے (وہ بھی اپنی) افسانے' ہاں بچیاں' بہت کڑی نقاد ہیں۔۔۔ یہ کیا لکھا ہے۔۔۔؟ بسا اوقات یہ بھی کہہ دیتی ہیں اچھی تحریر ہے۔ اصل میں ہمارے ہاں "نفس کو پھولنے نہیں دیتے۔" اگر گھر والوں سے مراد خاندان ہے تو بالعموم تعریف ہی ہوتی ہے اور ان کی تعریف پر جہاں دل خوش ہونے لگتا ہے۔۔۔ آنکھ کا کونا بھیگ جاتا ہے۔ اے کاش اوپر والا بھی روز حشر تعریف کردے۔

3۔ یادگار افسانے نہیں' ان کا پس منظر ہوتا ہے اور ہر دور میں ایک آدھ افسانہ اپنے پس منظر کی وجہ سے بہت یادگار بن جاتا ہے۔ مثلاً "میرا افسانہ "قاتلوں کا شہر" جامعہ کراچی کے اس سنہری دور سے تعلق رکھتا ہے جب شاعری میں خلیل اللہ فاروقی' انٹرویوز میں طاہر مسعود کا طوطی بولتا تھا۔ متین صاحب (متین الرحمان مرتضیٰ) شعبہ صحافت کے ہیرو تھے۔ شفیق حماد صاحب کی جملہ بازی سے بڑے بڑے مصنفین پسینہ پونچھتے تھے۔ صلاح الدین صاحب تکبیر شروع کر چکے تھے۔ اس پس منظر میں یہ افسانہ میں نے بہت درد سے لکھا اور بار بار روئی۔۔۔ اس کے بعد حج کی خواہش مند ہمارے محلے کی خاتون "تائی ریاں" پر لکھا جانے والا افسانہ "کالی کملی والا۔۔۔" اس کے بعد لیلتہ القدر' بہت سے افسانے ہیں۔

4۔ پسندیدہ مصنفین کی فہرست بھی ہر دور (ذہنی پختگی) کے حساب سے بدلتی رہی ہے۔ پھر بھی سلمیٰ آپا (سلمیٰ یاسمین نجمی) کی تحریر ہر دور میں پسند آئی ہے اور بار بار پڑھی ہے اس کے بعد عمیرہ احمد کو دل سے پڑھا ہے اور عنیزہ سید کو دماغ سے کہ بہت ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سمجھ کر پڑھنا پڑتا ہے۔ اب نمرا حمید اور سائرہ رضا بلکہ سچ پوچھیں تو آپ کے ڈائجسٹ کو بس کا لفظ بہت موافق آیا ہے۔ سحر ساجد کے علاوہ بھی اس سے شروع ہونے والے بہت سے نام ہیں اگر انگریزی کا ایس کریں تو تعداد میں بہت زیادہ اضافہ نظر آئے گا۔

جیسے صدف آصف، صائمہ وغیرہ۔ کوئی بھی تحریر اگر واضح سوچ، مقصدیت کے ساتھ ادبی چاشنی لیے ہوئے ہو تو دل میں خود ہی جگہ بنا لیتی ہے۔

5۔ پسندیدہ اقتباس اور اشعار بے شمار ہیں، کہاں تک سنو گے کہاں تک سنائیں۔۔۔ اقتباسات صرف افسانوں کے ہی نہیں کالموں، سیرت کی کتب سے بھی شاندار اور جاندار مل جاتے ہیں۔ ننھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کئی پیراگراف ایسے ملے کہ چھم سے آنکھوں کے سامنے میرے پیارے آقا کا بچپن آتا رہا۔ آنکھیں بھیگتی رہیں اب "یارم" میں سے کئی کئی جملے خط کشیدہ کیے رکھے ہیں، اس کا مطلب ہے ڈائری میں اتارو اور بار بار پڑھو۔۔۔ تعداد سیکڑوں میں ہے۔ رہی بات اشعار کی تو نعیم صدیقی، سلیم احمد اور اقبال کو پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ بہت سے اشعار ہیں لیکن بات انتخاب کی ہے، تو شعر ہمیشہ حالات کی ترجمان والا ہی زبان پر رہتا ہے۔ چلتے چلتے ایک آدھ اقتباس اور اشعار چکھ لیجیے۔

(1) سلف صالحین ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تو ان کا حال احوال نہیں، دین کا حال احوال دریافت کرتے تھے۔

(2) ابن حجر عسقلانی نے لکھا کہ عرب کا ایک شاعر مسلمان ہوا اور اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں شعر کہنا شروع کیے۔ وہ نعتیہ اشعار کہتے کہتے چالیس ہزار اشعار کہہ گیا لیکن ان چالیس ہزار اشعار پر مشتمل نعت کا اختتام ان اشعار پر کرتا ہے، جو حفیظ تائب نے ترجمہ کیے ہیں۔

؎ تھکی ہے فکر رسا اور مدح باقی ہے
قلب ہے آبلہ پا اور مدح باقی ہے
تمام عمر لکھا اور مدح باقی ہے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

عسقلانی نے چالیس ہزار اشعار پر مشتمل نعت کو معجزہ قرار دیا ہے۔ اب اشعار۔

اثر ہوا تو یہ تحریر کا کمال نہیں
میرا خلوص مخاطب تھا میں کہاں بولا

؎ حیات جس کی امانت تھی اسی کو لوٹا دی
میں آج چین سے سوتا ہوں پاؤں پھیلا کر

؎ کشیدہ کار ازل تجھ کو اعتراض نہ ہو
کہیں کہیں سے اگر زندگی رفو کر لوں۔

؎ تنہائی گوارہ نہیں فطرت کو کسی کی،
دل جس کو دیا ہے اسے غم ساتھ دیا ہے۔

راشدہ رفعت

سب سے پہلے تو خواتین ڈائجسٹ کی سالگرہ پر دلی مبارک باد قبول کیجیے۔

سروے کے جوابات حاضر خدمت ہیں۔

1۔ لکھنے کی صلاحیت اور شوق یقیناً "وراثت" میں ہی منتقل ہوا ہے۔ امی، ابو، نانا ابا اور دادا ابا ان چاروں میں کوئی باقاعدہ ادیب اور لکھاری تو نہ تھا، لیکن سب ہی علمی، ادبی ذوق رکھتے تھے۔ نانا ابا انگریزی کے استاد تھے۔ انگریزی صرف ونحو پر انہوں نے کئی کتابیں تحریر کیں، لیکن اردو زبان میں وہ خطوط جو انہوں نے زندگی کے آخری چند برسوں میں اپنی نواسیوں یعنی ہم بہنوں کے نام تحریر کیے، اگر انہیں کتابی شکل میں سامنے لایا جائے تو ادب کے قدر دان یقیناً اس کتاب کو پذیرائی بخشیں گے۔ دادا ابا (مرحوم) بھی وسیع المطالعہ شخص تھے۔ پڑھنے کی "لت" میرے ابو کو اپنے ابا جی سے لگی تو مجھے اپنے ابو سے۔ گھر میں میرے علاوہ بشریٰ باجی (بشریٰ احمد) لکھتی ہیں اور ان سے آپ بخوبی واقف ہوں گے اور اب سب سے چھوٹی تابندہ بھی لکھنے کے لیے پر تول رہی ہے۔

2۔ اگر تین سال پہلے مجھ سے یہ سوال پوچھا جاتا تو میں جواب میں سب سے پہلے اپنی پیاری امی کا نام لکھتی۔ امی نہ صرف میری کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی تھیں، بلکہ اگلے ماہ چھپنے والے تعریفی، تنقیدی خطوط بھی ضرور پڑھتی تھیں۔ میری تخلیقی صلاحیت کو جلا بخشنے میں میری امی کی حوصلہ افزائی کا بہت عمل

دخل ہے۔ اب میری تحریریں پڑھ کر میری پیٹھ تھپکنے والوں میں میری تینوں بہنیں شامل ہیں۔ نندیں بھی شوق سے پڑھتی ہیں۔ اقربا پروری کہہ لیں یا فطری محبت میرے اپنے میری تحریروں کی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں۔

3 ۔ اکثر مصنفین کی تحریروں میں وقت گزرنے کے ساتھ مزید نکھار' روانی اور پختگی آتی ہے' لیکن مجھے اپنے ہنستے مسکراتے وہ افسانے زیادہ پسند ہیں جو میں نے بالکل شروع شروع میں لکھے۔ آج بھی پرانے ڈائجسٹ کھولوں تو وہ تحریریں پڑھ کرنئے سرے سے لطف آجاتا ہے۔ "سعدی اسٹریٹ" "سیما کے خطوط" "سرقہ یا توارد" "دنیا گول ہے" اور ایسے بہت سے افسانے ہیں جو آج بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کا سبب بنتے ہیں۔ جہاں تک اطمینان کا تعلق ہے تو ہر وہ کہانی جو میری سستی کی وجہ سے بہت عرصے تک ادھوری رہنے کے بعد پایہ تکمیل کو پہنچے' دلی اطمینان کا باعث بنتی ہے۔

4 ۔ ڈائجسٹ میں لکھنے والی مصنفین کا تعلق ہے تو میں نمرہ احمد کو بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔

سمیرا حمید کی پہلی تحریر جو میں نے پڑھی' وہ مری میں چند کزنز سیر سپاٹا کرنے جاتے ہیں اور شاید کسی کرنل وغیرہ کے گھر ہیروئن کو ایمرجنسی میں قیام کرنا پڑتا ہے۔

سمیرا مجھے اپنی کہانیوں کے نام یاد نہیں رہتے' اس لیے معذرت کہ کہانی کا نام نہیں لکھا۔ بہرحال وہ کہانی پڑھ کر میں نے صفحے پلٹے اور غور سے رائٹر کا نام دیکھا اور پھر تو ماشاء اللہ سمیرا آئیں اور چھا گئیں اور مجھے ثمینہ عظمت علی کا طرز تحریر بہت پسند ہے۔

ابھی کچھ دنوں پہلے نقلی نوٹ پر قائداعظم کی تصویر والا افسانہ' کتنا پیارا افسانہ تھا۔ "نوٹ نقلی ہے پر بابا تو اصلی ہے۔" فقرہ سیدھا دل میں اتر گیا۔ (قائد اور قائد کے پاکستان سے بے تحاشا د بے حساب محبت بھی ہمیں اپنے ابو سے ورثے میں ملی ہے۔)

آمنہ مفتی نے اب بہت عرصے سے ڈائجسٹ کے لیے کچھ نہیں لکھا' ان کی تحریریں بھی میں بہت شوق سے پڑھتی تھی۔

سینئر مصنفین کے وہ بڑے بڑے نام جنہیں پڑھنے کا بہت شوق تھا' مگر افسوس جب ہم نے پڑھنا شروع کیا' ان میں سے بیشتر لکھنا چھوڑ چکی تھیں' لیکن رفعت ناہید سجاد کا تذکرہ کیے بنا میری پسندیدہ مصنفین کی فہرست ہرگز مکمل نہ ہوگی۔ ہماری خوش قسمتی کہ کچھ عرصے پہلے رفعت جی نے "چراغ آخر شب" خواتین ڈائجسٹ کے لیے لکھ ڈالا۔ میری پڑھنے کی رفتار حیران کن حد تک تیز ہے' لیکن یہ ناول میں نے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا اور بلاشبہ ہر سطر سے پڑھنے کا صحیح لطف کشید کیا۔

5 ۔ شفیق الرحمن' کرنل محمد خان' پطرس بخاری' ابن انشاء ان میں سے کسی کی بھی کوئی سی کتاب اٹھالیں اور درمیان کا کوئی سا صفحہ کھول کر کوئی سا بھی پیراگراف پڑھ لیں۔ وہ پیراگراف میرے پسندیدہ اقتباسات میں سے ایک ہوگا اور اگر مسکرانے کی ایکسر سائز کرنے کا جی نہ چاہ رہا ہو تو آپ کے اور میرے' ہم سب کے پیارے بابا جی اشفاق احمد کی کوئی کتاب اور چلیں کوئی مشکل کتاب نہ سہی۔ زاویہ (1) ہی اٹھالیں۔ کتاب آپ کے پاس نہیں ہے تو کسی دوست سے ادھار مانگ لیں۔ یہ کتاب تو بہت زیادہ چھپنے والی کتابوں میں سے ایک کتاب ہے۔ ادھر' ادھر' آس پڑوس' کسی دوست' سہیلی' کہیں سے بھی مل جائے گی' اس کتاب کا بھی کوئی سا صفحہ کھول کر کوئی سا بھی پیراگراف پڑھ لیں اور جان لیں۔ وہ پیراگراف میرا پسندیدہ پیراگراف ہے' لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ پڑھیں گی اور پڑھتی ہی جائیں گی۔ کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی ہی نہ چاہے گا اور صحیح ہے نا۔

جلدی جلدی پڑھ لیں۔ عاریتاً" مانگی ہوئی کتاب سہیلی کو واپس بھی تو کرنی ہے۔

اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ خواتین ڈائجسٹ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہے اور اسی طرح دھوم دھام سے اپنی سالگرہ مناتا رہے۔ (آمین)





سچ ٹی وی کے اینکر اور ایف ایم 100 کے آر جے

ارسلان خالد سے دلچسپ ملاقات

شاہین رشید

کرنٹ افیئرز سے متعلق ٹاک شوز کی ریٹنگ لسٹ میں اگر آپ جائیں تو آپ کو اکثر ٹاپ ریٹنگ میں "سچ" ٹی وی کا پروگرام "گویا" نظر آئے گا۔ اپنی سچی اور کھری باتوں کے ساتھ اس پروگرام کی "ارسلان خالد" میزبانی کرتے ہیں اور شرکا کے اندر سے باتیں نکالتے ہیں جو کہ واقعی کمال کی بات ہے۔

"کیسے ہیں ارسلان خالد صاحب اور کیا مصروفیات ہیں آج کل؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔ ریڈیو بھی چل رہا ہے اور کرنٹ افیئرز کا پروگرام بھی چل رہا ہے اور میرا مین فوکس اب جرنلزم کی طرف ہی ہے۔"

"شروعات آپ نے ریڈیو سے کی؟"

"جی شروعات ریڈیو سے ہوئی اور اور میری پہلی محبت ریڈیو ہی ہے اور ریڈیو سے آج بھی پروگرام کرتا ہوں اور ہفتے کی رات ایف ایم 100 سے گیارہ سے تین بجے تک پروگرام ہوتا ہے میرا۔"

"پہلی محبت ریڈیو سے اور آخری محبت؟"

"بس سمجھیں کہ ہو چکی ہے۔ جو پہلی محبت ہوتی ہے وہ ہی آخری بھی ہوتی ہے اور ویسے میں ابھی تک بیچلر ہوں اور تلاش ابھی جاری ہے ـــــ دیکھیں کہ والدین اس میں کب کامیاب ہوتے ہیں۔"

"اس زمانے میں بھی والدین کی پسند کو ترجیح دیں گے۔ ورنہ تو لڑکے پسند کرتے ہیں اور والدین کو رشتے کے لیے بھیج دیتے ہیں؟"

"مگر میں بہت فیملی اورینٹ ٹائپ بندہ ہوں اور والدین اور فیملی کا بڑا گہرا رشتہ ہے اور چونکہ ایک ہی بیٹا ہوں والدین کا تو ان کی خوشی میری پہلی ترجیح ہے۔"

"گڈ۔۔۔ ریڈیو اور ٹی وی کی فیلڈ سے وابستہ ہوئے

کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

"تقریباً" چھ سال' چھ سال قبل ریڈیو جوائن کیا تھا۔ اور تقریباً" ساڑھے چار سال سے ٹی وی سے وابستہ ہوں۔ اور پہلے میں مختلف چینلز سے وابستہ رہا۔ مثلاً" جرمنی رہا اور "وائس آف جرمنی" کے لیے کام کیا۔ 2014ء میں میری واپسی ہوئی تو میں نے 'سچ' ٹی وی جوائن کیا۔ بہ حیثیت کرنٹ افیئر اینکر۔ اللہ نے کامیابی دی اور ریٹنگ اچھی آگئی۔"

"ارسلان! اکثر آپ کا پروگرام ٹاپ ریٹنگ پہ ہوتا ہے تو پھر آپ کسی مشہور چینل سے منسلک کیوں نہیں ہوئے؟"

"میرے خیال میں آپ جتنے بڑے چینل پہ ہوتے ہیں اتنے ہی زیادہ ایکسپوز ہوتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ میں ابھی لرننگ فیز میں ہوں' بہت ساری چیزیں سیکھ چکا ہوں اور بہت ساری چیزیں وقت کے ساتھ ساتھ سیکھ رہا ہوں اور ہر چیز کا ایک صحیح وقت ہوتا ہے اور جب وہ وقت آئے گا تو میں کسی اچھے اور دوسرے چینل کو جوائن کروں گا اور اگر ایمان داری سے بتاؤں تو میں "سچ" چینل پہ کام کر کے بہت مطمئن ہوں۔ کیونکہ بڑی اچھی ٹیم ہے۔ بڑی اچھی مینجمنٹ ہے اور سب سے بڑی بات کہ مجھے فری ہینڈ دیا ہوا ہے' کہ میں اپنی مرضی سے پروگرام کروں اور مجھے کوئی خاص ہدایات نہیں دی جاتیں' نہ ہی مائنڈ سیٹ کیری کرنے کو کہا جاتا ہے۔ ہاں آگے بڑھنے کی خواہش تو پھر ہر ایک کو ہوتی ہے اور وہ مجھے بھی ہے۔"

"آپ نے بتایا کہ آپ جرمنی میں تھے تو وہاں بھی کام کرتے تھے تو واپس کیوں آئے' جبکہ لوگ تو پاکستان سے بھاگنے کا سوچ رہے ہیں؟ اور آپ کے پاس موقع تھا؟"

ہنستے ہوئے "ہاں جی بہت اچھا موقع تھا۔ وہاں رہا' کافی عرصہ رہا' یورپ کے تیرہ چودہ ممالک گھوما اور بہت کچھ سیکھا' لیکن کچھ فیملی معاملات ایسے تھے کہ وہاں رہنا ممکن نہ تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے کچھ ذمہ داریاں میری بھی تھیں اور اکیلے ہونے کی وجہ سے بہت سی چیزیں والدین کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ جب عید آتی تھی یا کوئی اور موقع آتا تھا تو میں اپنے والدین کو بہت پریشان دیکھتا تھا تب پھر میں نے سوچا کہ پاکستان واپس جانا چاہیے اور پاکستان میں بھی میں بہت اچھی جاب کر سکتا ہوں اور چونکہ میں نے آغاز ریڈیو سے کر دیا تھا تو پھر مستقل طور پر پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا میں نے۔ کچھ مواقع تھے میرے پاس تو بس پاکستان کو ترجیح دی اور مجھے پاکستان آنے کا افسوس اس لیے نہیں ہے کہ میں نے یہاں آکر بہت اچھا پروگریس کیا ہے۔"

"آپ اپنے والدین کو بھی تو جرمنی بلا سکتے تھے؟"

"والدین کو بلانا اتنا آسان نہیں تھا' کافی وقت درکار تھا اور اتنا لمبا ٹائم میں اپنے والدین کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا اور پھر میں تو یورپ کے ان ممالک کی سیر کر چکا تھا جن کو دیکھنے کو لوگ ترستے ہیں۔"

"ریڈیو کرنے میں زیادہ مزہ آرہا ہے یا کرنٹ افیئر کے پروگرام کرنے میں؟"

"دونوں بہت مختلف شعبے ہیں۔ جب میں کرنٹ افیئر کا پروگرام کر رہا ہوتا ہوں اور سیاست دانوں سے بات کر رہا ہوتا ہوں تو اس کا اپنا ایک مزہ ہے' اس کا اپنا ایک فیڈ بیک ہے اور دوسری طرف جب رات کو بارہ سے تین بجے ریڈیو پہ پروگرام کر رہا ہوتا ہوں تو وہ ایک بہت ہی مختلف قسم کا پروگرام ہوتا ہے۔ اپنے دونوں موڈ سوئچ کرنا پڑتا ہے۔ اب پرابلم یہ ہے کہ جو ریڈیو کے میرے فینز ہیں وہ ٹی وی پہ مجھے فالو نہیں کرتے اور جو ٹی وی پہ مجھے دیکھتے ہیں وہ ریڈیو پہ مجھے قبول نہیں کرتے۔ دونوں الگ الگ میڈیم ہیں۔ ریڈیو کو میں اس لیے ترجیح دیتا ہوں کہ آپ کا ڈائریکٹ رابطہ ہوتا ہے لوگوں سے فوری طور پر آپ کو ریسپانس مل رہا ہوتا ہے۔ تو ریڈیو کو چھوڑنے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ریڈیو نے ہی مجھے بولنا سکھایا اور اس کے ذریعے میں ٹی وی تک پہنچا اور اینکر بنا۔ تو مدر آرگنائزیشن ریڈیو ہی ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ۔ کرنٹ افیئر بہت ڈرائی سبجیکٹ ہے' آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی کہ

آپ اختلاف رکھیں یا حمایت کریں۔ پھر بہت پڑھنا پڑتا ہے ریسرچ کرنی پڑتی ہے۔"

"آؤٹ ڈور بھی کیے پروگرام؟"

"جی' جی بالکل کیے اور آؤٹ ڈور پروگرام کرنا بہت اچھا لگتا ہے ابھی حال ہی میں سیلاب کی کوریج کے لیے چترال سے اپر دیر اور اس کے گردونواح کے علاقوں میں بھی گیا' گزشتہ سال پنجاب کے سارے علاقوں کی کوریج کی' جہاں جہاں سیلاب آیا تھا تو آؤٹ ڈور میں عوام کے ساتھ رابطہ رہتا ہے اور ان کے خیالات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔"

"اینکرز کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ٹاک شو میں بس سیاست دانوں کو "چٹکی" بھرتے ہیں اور پھر تماشا شروع ہو جاتا ہے... ایسا ہے؟"

قہقہہ... "بدقسمتی سے یہ ایک حقیقت بھی ہے اور میں اس سے انکار بھی نہیں کروں گا۔ ایسا بہت سارے لوگ کر بھی رہے ہیں اور ایسا ہوتا بھی ہے۔ لیکن ہر مرتبہ ایسا نہیں ہوتا اور اب تو اس قسم کے تماشے سے لوگ بھی تنگ آگئے ہیں۔ اب لوگ اس تماشے کو پسند نہیں کرتے۔ اب عوام سمجھ دار ہو گئی ہے اب وہ اس تماشے کو دیکھنا پسند نہیں کرتی نہ ہی انجوائے کرتی ہے۔ اب لوگ ایشو پہ بات کرنے والے پروگرام پسند کرتے ہیں۔ سلوشن دینے والے پروگرام پسند کرتے ہیں اور چونکہ چینلز کی بھرمار ہے' 8 بجے سب چینلز پہ ٹاک شو ہو رہے ہوتے ہیں تو بڑا مشکل ہے کہ آپ اپنی دیور شپ کو اپنے پروگرام کی طرف راغب کریں تو اس کے لیے آپ کو ایسے سالڈ پروگرام دینے پڑتے ہیں کہ لوگ آپ کے پروگرام کی طرف مائل ہوں۔ اب پروگرام کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔"

"ایسی صورت حال میں کیا کرتے ہیں' وقفہ لے کر سمجھاتے ہیں' کیا کرتے ہیں؟"

"بہت بار ایسا ہوا کہ معاملات اتنے بگڑ گئے کہ مجھے پروگرام ختم کرنا پڑا۔ تھوڑی بہت تکرار تو گوارا ہوتی



ہے' مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ ایسے میں ہمیں فوری طور پر بریک پہ جانا پڑتا ہے اور وقفے میں انہیں ٹھنڈا کرتے ہیں۔ کیونکہ لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں اور پھر جو زبان استعمال کی جا رہی ہوتی ہے وہ کسی طریقے سے بھی مناسب نہیں ہوتی اور کئی بار مجھے اپنا پروگرام وقت سے پہلے ختم کرنا پڑا اور اب تو اللہ کا شکر ہے کہ بہت سے سیاست دان ایسے بھی ہیں جن کو چٹکی بھری بھی جائے تو وہ تماشہ نہیں لگاتے کیونکہ انہیں بھی سمجھ آگئی ہے' وہ اب غصے میں نہیں آتے۔ آپ دیکھیے گا کہ آہستہ آہستہ اینکر بھی میچور ہو جائیں گے۔ سیاست دان بھی اور ناظرین کی بھی ایک چوائس ہو جائے گی تو وقت کے ساتھ ساتھ بہت بہتری آجائے گی۔"

"پروگرام کے حوالے سے بھی اور انفرادی طور پر بھی آپ کی کئی سیاست دانوں سے ملاقات ہوئی ہوگی' تو کس کو بہت تیز پایا' کون بہت بھولا بھالا ہے' کون بہت چالاک و مکار ہے اور کس میں جھوٹ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے؟"

"بہت مشکل ہو جائے گا یہ سب کچھ بتانا۔ کیونکہ مجھے آئندہ بھی پروگرام کرنے ہیں۔ لیکن خیر... کون

بھولا ہے تو میرے خیال میں جو سیاست داں بھولا ہو گا وہ پھر سیاست دان نہیں ہو گا سیاست دان کا ہمیشہ "ایجنڈ" ہوتا ہے وہ جہاں چاہتا ہے کہ بات کرنی ہے، اس کے پیچھے کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ اگر میں فیصل رضا عابدی کی بات کروں تو ان کو ٹیکل کرنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ وہ اینکر سے ان کا پروگرام "ہائی جیک" کر لیتے ہیں۔ "نبیل گبول" کے ساتھ میرا ایک تعلق ہے۔ ان کے میں نے کافی انٹرویوز کیے ہیں، تو ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی اینکر کو کوئی بریکنگ نیوز دے دیں۔ "جھوٹ" کے لیے میں کسی ایک کا نام نہیں لوں گا۔ کیونکہ "جھوٹ" سب ہی بولتے ہیں۔ جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر سیاسی پارٹی میں کوئی نہ کوئی ایک چالاک و مکار بھی ہوتا ہے اور بہت اچھے اچھے لوگ بھی ہیں اس ملک میں میری مراد سیاست دانوں سے ہے۔ اگر میں "جاوید ہاشمی صاحب" کی بات کروں تو وہ مجھے بہت "سچے اور کھرے" انسان لگتے ہیں۔ اگر میں "منور حسن" صاحب کی بات کروں تو اگرچہ ان کے بیانات پہ بہت لے دے ہوتی ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ سیاست نہیں کرتے، بات کو چھپاتے نہیں ہیں، بلکہ سچی اور کھری بات کرتے ہیں جو اکثر اوقات دوسروں کو بری لگتی ہے اور سراج الحق صاحب بہت "ڈاؤن ٹو ارتھ" انسان ہیں۔ اتنا مجھے کوئی اور سیاست دان نظر نہیں آتا۔

"عمران خان" بڑے "پوٹینشل اور فیوچر" لیڈر ہیں پاکستان کے بس جوان کے ارد گرد لوگ ہیں جو ان کے مشیر ہیں ان سے مجھے تحفظات ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ اگر کوئی "اپ ڈاؤن" عمران خان میں یا پاکستان تحریک انصاف میں آتا ہے تو اس کی وجہ ان کے ارد گرد کے لوگ ہیں اگر وہ اچھے لوگوں کا انتخاب کر لیں تو معاملات بہتری کی طرف جا سکتے ہیں اور پی ٹی آئی بہت آگے تک جا سکتی ہے۔

ایم کیو ایم ایک بڑی سیاسی حقیقت ہے۔ ایک منظم جماعت ہے اور اس کا ووٹ مڈل کلاس کی نمائندگی کرتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ ہیں بہت اچھے لوگ ہیں ان کے پاس۔

پاکستان میں اگر سیاست کے داؤ پیچ اگر کوئی جانتا ہے تو وہ زرداری صاحب ہیں۔ یہ پوائنٹ ٹو پوائنٹ ہے مگر اپنے دور حکومت میں وہ کچھ بھی ڈلیور نہیں کر پائے یہ بڑا المیہ ہے۔ نواز شریف کے بارے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ان کے پاس ایک بڑا ووٹ بینک ہے۔ لوگ ان سے محبت کرتے ہیں انہوں نے کافی اچھے کام کیے ہیں، مگر کچھ غلطیاں بھی وہ مسلسل کیے جا رہے ہیں اگر وہ اپنی غلطیاں دور کر لیں تو وہ اس بار ضرور اپنا دور حکومت مکمل کر لیں گے۔ ان کے لیے ایک بات میں ضرور کہنا چاہوں گا کہ انہیں ان کی کچن کیبنٹ کا طعنہ دیا جاتا ہے کہ اپنے ہی لوگوں پر انحصار کرتے ہیں تو ذرا ان سے باہر نکل کر دیکھیں تو ان کی پارٹی میں بھی بہت قابل لوگ موجود ہیں جن پر وہ انحصار کر سکتے ہیں۔"

"کسی نے انکار کیا آپ کے پروگرام میں آنے سے؟"

"بہت سے لوگ انکار کرتے ہیں اور ترجیحات سیٹ کی ہوئی ہیں، میں نام لے کر کہنا چاہوں گا کہ میں "شیخ رشید" کے ساتھ آج تک انٹرویو نہیں کر سکا۔ منع کرتے ہیں اور ان کی کچھ ترجیحات ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ وہ شاید چینلز کو "ریٹنگ" دیتے ہیں۔ ان کے کچھ من پسند لوگ ہیں جن کے پروگرام میں وہ جانا پسند کرتے ہیں۔"

"آپ نے بتایا کہ اس پروگرام کے لیے پڑھنا بہت پڑتا ہے، خبروں سے ٹچ رہنا پڑتا ہے۔ بہت محنت طلب پروگرام ہے لیکن آپ لوگوں کو اس کا معاوضہ بھی شاید ٹھیک ٹھاک ملتا ہے کیونکہ اکثر معروف اینکر کہتے ہیں کہ ہم تو فلاں لیڈر سے زیادہ انکم ٹیکس دیتے ہیں۔ تو کتنی صداقت ہے اس میں؟"

"بالکل صداقت ہے۔ اینکرز کو زیادہ معاوضہ ملتا

ہے۔ اینکورز کے لیے پلس پوائنٹ یہ ہے کہ محنت کا کام بہت ہے اور کوئی بھی چینل ہو خواہ بہت مشہور ہو یا کم اس پہ کرنٹ افیئرز کے سلوٹ بہت ویلیو رکھتے ہیں۔ بہت دیکھے جاتے ہیں تو اینکر کا پے آؤٹ کافی اچھا ہوتا ہے عام لوگوں سے اور جتنے بھی اینکورز یہ من ہیں ماشاء اللہ بہت اچھا کمارہے ہیں اور یہاں میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ اینکورز کو تو بہت اچھا معاوضہ دیا جاتا ہے، لیکن جن کی وجہ سے ہم یہ پروگرام کرتے ہیں، جو آف دی کیمرہ ہوتے ہیں، انہیں ان کا صحیح حق نہیں دیا جاتا۔"

"فیلڈ سے متعلق تو بہت باتیں ہو گئیں۔ اب بتائیے کہ اس فیلڈ میں آمد کیسے ہوئی؟"

"خالصتاً" حادثاتی طور پر، بچپن میں میں اپنے اسکول اور کالج اور اپنی فیملی میں مشہور تھا کہ میں ایک بہت ہی شرمیلا بچہ ہوں اور بہت ہی کم گو بھی اور میرے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کبھی ریڈیو ٹی وی پہ بہت زیادہ بولنے والے پروگرام کروں گا۔ ایک دن یونہی ایک جاننے والے مجھے ریڈیو لے گئے کہ تمہاری آواز بہت اچھی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، کوشش کر لیتے ہیں۔ میں نے آڈیشن دے دیا۔ کچھ عرصے کے بعد کال آ گئی اور کہا کہ تھوڑی آپ کی ٹریننگ کریں گے اس کے بعد آپ آن ایئر جائیں گے۔ تو جب میں ٹریننگ پریڈ میں تھا تو میں نے ریڈیو سننا شروع کیا اور ٹی وی کو دیکھنا شروع کیا کہ کس انداز میں پروگرام ہوتے ہیں مجھے دلچسپی ہوتی ہو گئی ان دونوں میڈیاز سے، پھر جب ریڈیو کافی عرصے تک کیا تو اسٹاروالی فیلنگز آنی شروع ہو گئیں کہ لوگ ایس ایم ایس کرنے لگے، مجھے فالو کرنے لگے۔ پھر ٹی وی کے لیے میں نے محنت کی تو مجھے اچھے استاد مل گئے، ان میں شکور طاہر اور غلام اکبر کا نام ضرور لوں گا کہ انہوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا تو ریڈیو حادثاتی طور پر آیا اور ٹی وی شوق کی خاطر اور پھر میں نے سوچ لیا کہ اس فیلڈ میں رہنا ہے۔ جبکہ میری تعلیم میڈیا سے متعلق نہیں تھی، میں نے ماسٹرز ان پروجیکٹ مینجمنٹ کیا ہوا تھا۔ میں اے سی سی اے کوالیفائیڈ ہوں اور میں اب اس فیلڈ میں بہت مطمئن ہوں۔ لوگ جب تعریف کرتے ہیں اور پہچان لیتے ہیں تو اس کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔"

"اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتائیے؟"

"میری پیدائش ایک گاؤں بلانی کی ہے جو کہ جہلم کے قریب ہے اور ہمارے فیملی ویلیوز مائنڈ کی ہے، جو کہ اپنے رشتے داروں اور دیگر لوگوں کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ ہم شروع سے ہی راولپنڈی اسلام آباد میں رہے اور اپنی تعلیم بھی اس شہر سے کی۔ میری والدہ ہاؤس وائف ہیں جبکہ والد صاحب راجہ خالد 'ڈائریکٹر پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی ہیں اور ہاں 9 اپریل میری پیدائش کی تاریخ ہے اور میرا اسٹار Aries ہے۔"

"مزاج؟"

"وقت کے ساتھ ساتھ اچھا ہوتا گیا، پہلے تھوڑا غصے کا تیز تھا اور جذباتی بھی تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ کافی تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ ماں کے بہت قریب ہوں میں۔۔۔ کھانے پینے سے بہت محبت ہے اور ہر طرح کے مزاج کا کھانا کھاتا ہوں۔ چکن کڑاہی اور فاسٹ فوڈ بہت پسند ہیں، ناشتہ کافی ہیوی کرتا ہوں اور پھر شام کو کھانا کھاتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ کھانا بڑے اہتمام کے ساتھ کھاؤں اور اپنے آپ کو سیٹ رکھنے کے لیے گولف اور بیڈ منٹن کھیلتا ہوں۔ وقت بہت کم اور مشکل سے ملتا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ارسلان خالد سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں اپنی مصروفیات میں سے وقت دیا۔



عمیرہ احمد



آبِ حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایئر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں ان میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔



J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانو۔ مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ ہجے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی ہے دیکھ کر اس کے والدین اور وہاں کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

I۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

11 گیارہویں قسط

حاصل و محصول

نیویارک میں واقع امریکہ کے سب سے بڑے میڈیا ڈسٹرکٹ مڈ ٹاؤن مین ہٹن کے کولمبس سرکل میں واقع ٹائم وارنر سینٹر کی عمارت کے سامنے کھڑے پیٹرس ایباکا کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے چمک رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر میں اس عمارت کے اندر واقع سی این این کے اسٹوڈیوز میں امریکہ کے ممتاز ترین اخباری صحافیوں میں سے ایک اینڈرسن کوپر سے اس کے پروگرام 360 کے سلسلے میں ملاقات کرنے والا تھا۔

اینڈرسن کوپر دو ہفتے بعد کانگو میں بارانی جنگلات کے حوالے سے ایک پروگرام کرنے جا رہا تھا۔ اس نے انگلینڈ اور یورپ کے اخبارات میں پیٹرس ایباکا کے انٹرویوز اور پگمیز کی بقا کے لیے چلائی جانے والی اس کی مہم کے بارے میں بنیادی معلومات لینے کے بعد اپنی ٹیم کے ایک فرد کے ذریعے اس سے رابطہ کیا تھا... اور آج اسے کوپر کے ساتھ ایک خفیہ ملاقات کرنی تھی اور پیٹرس ایباکا خوشی سے بے قابو تھا۔ کانگو کے تاریک جنگلات میں بسنے والے پگمیز کی جدوجہد کی کہانی کبھی روشنیوں سے چمکتی تہذیب یافتہ دنیا کے اس جنگل میں سنی جا سکتی تھی، ایباکا کو اس کی توقع تھی پر یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام اتنی جلدی بھی ہو سکتا تھا۔ وہ واشنگٹن میں کئی دنوں سے کئی نیوز چینلز کے لوگوں سے ملتا رہا تھا اور امید و ناامیدی کے درمیان لڑھکتا پھر رہا تھا اور ان ہی نیوز چینلز پر مختلف حوالہ جات کے ذریعے رابطہ کرتے کرتے اسے بغیر کسی حوالے کے اور اچانک ــــ اینڈرسن کوپر کی طرف سے ملنے والی وہ کال غیر یقینی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نعمت غیر مترقبہ بھی تھی۔

کئی سالوں سے کی جانے والی اس کی وہ بے نام جدوجہد اگر سی این این پر کوپر کے پروگرام میں ہائی لائٹ ہوتی اور دنیا کے سامنے آتی تو اس کے بعد ایباکا کے لیے بہت ساری چیزیں آسان ہو جاتیں۔ اور اس کے لیے سب کچھ جتنا آسان ہو جاتا... ورلڈ بینک اور اس سے منسلک عالمی قوتوں کے لیے اس پروجیکٹ کو دنیا کی نظروں سے چھپائے اسی طرح چلائے جاتے رہنا اتنا ہی مشکل ہو جاتا... بین الاقوامی میڈیا کی کوریج اور اس کوریج کے نتیجے میں ہونے والی تنقید کا سامنا کرنا مشکل ہوتا، پروجیکٹ ختم ہونے کے خدشات تو جو پیدا ہوتے سو ہوتے لیکن ورلڈ بینک کے لیے افریقہ سے دوسرے ممالک میں اسی طرح کے نئے پروجیکٹس کے ٹھیکے اور آغاز مشکل سے مشکل ہو جاتا... وہ بونا جسے پچھلے کئی سالوں سے وہ بونا رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے اور اس میں کامیاب بھی تھے۔ یک دم جن بن گیا تھا اور کسی جن کو بوتل میں واپس قید کرنے سے زیادہ آسان اس کی جان لے لینا تھا۔

ایباکا کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اینڈرسن کوپر کی طرف سے ملنے والی اس کال نے اس کی زندگی اور موت کے حوالے سے بھی فیصلہ کر دیا تھا۔ مگر تاخیر بس تھوڑی سی ہوئی تھی اس کی نگرانی کرنے والے لوگوں سے... ایک سراسیمگی اور بدحواسی پھیلی تھی ان لوگوں میں جنہوں نے یہ طے کرنا تھا کہ اب اچانک سی این این کے منظر میں آجانے کے بعد وہ فوری طور پر ایباکا کا کیا کریں... تشویش اس بات پر بھی ہوئی تھی کہ اگر ایباکا اور پگمیز کے حوالے سے کوپر نے پروگرام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو چوٹی کے اور کتنے ایسے صحافی تھے جو اس پروجیکٹ کے حوالے سے پروگرام کرنے کی تیاریوں میں تھے...

ایباکا جن چھوٹے موٹے نیوز چینلز اور جرنلسٹس کو "بڑا" اور "طاقتور" سمجھ کر واشنگٹن میں ان کے ساتھ گھنٹوں گزار کر آتا رہا تھا... وہ سب پہلے ہی ایباکا کی نگرانی کرنے والے لوگوں کی فہرست میں شامل تھے... ان سے ایباکا کے حوالے سے پہلے ہی بات کر لی گئی تھی اور انہیں اس پروجیکٹ اور اس ایشو کی کوریج کے حوالے سے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی ہدایات بھی پہنچائی گئی تھیں کہ امریکی مفادات کے لیے اس پروجیکٹ کے حوالے سے کوئی منفی خبر کی کوریج اور رپورٹ کس قدر نقصان دہ ہو سکتی تھی... اور ان چھوٹے چینلز اور نیوز جرنلسٹس کو تابع کرتا

آسان تھا۔ سی این این جیسے بڑے ادارے کو بھی امریکن مفادات کو ہر چیز پر بالاتر رکھنا کی سوچ کے تابع رکھنا مشکل نہیں تھا مگر مشکل تھا تو ان نیوز جرنلسٹس کی عالمی مقبولیت اور پہنچ پر کنٹرول رکھنا جو سی این این پر جب بھی کسی ایشو کو کتنا بھی امریکی مفادات کو بالاتر رکھنے کی پالیسی کے باوجود اٹھاتے وہ دنیا میں کسی نہ کسی نئے تنازعے کو جنم دے دیتے....

اور یہاں بھی ایباکا کو مانیٹر کرنے والے لوگوں کو اچانک درپیش آنے والا چیلنج یہی تھا۔ اگر وہ پروگرام کوویر ایباکا سے پہلے پیش کرنے کا ارادہ نہ کر چکا ہوتا تو سی آئی اے کے لیے کوویر کو اس آفشنسی صحافت سے روکنے کا واحد حل یہ تھا کہ ایباکا کو اس تک کسی بھی قیمت پر نہ پہنچنے دیا جاتا لیکن یہاں کوویر۔ ایباکا سے اس اسٹیج پر رابطہ کر رہا تھا جب مبادہ اور اس کی ٹیم پہلے ہی اس ایشو پر بہت زیادہ کام کرنے کے بعد کانگو روانگی کی تیاریوں میں تھی اور اب اس صورت حال میں کیا جاتا...! یہ تھا وہ چیلنج جس نے فوری طور پر ایباکا اور کوویر کی ملاقات کے حوالے سے سی آئی اے کو پریشان کیا تھا اور اس پریشانی میں اضافہ تب ہو گیا تھا جب ایباکا اس کال کے ملنے کے فوراً بعد ہی واشنگٹن سے نیویارک کے لیے چل پڑا تھا اور جب تک ان کا اگلا لائحہ عمل فائنل ہو سکا ایباکا ٹائم وارنر سینٹر پہنچ چکا تھا۔

اینڈرسن کوویر کے ساتھ دو گھنٹے کی ایک گرماگرم نشست کے بعد وہ جب سی این این اسٹوڈیوز سے باہر نکلا تھا تو ایباکا کا جوش پہلے سے بھی زیادہ بڑھ چکا تھا۔

اسے پہلی بار سالار سے رابطے کا خیال آیا تھا کیونکہ اینڈرسن کوویر کے ساتھ سوال و جواب کے اس آف کیمرہ سیشن میں سالار سکندر کا ذکر کئی بار آیا تھا۔ اس نے کئی بار اس کے لیے تعریفی جملے ادا کیے تھے.... کیسے سالار سکندر نے اس پروجیکٹ کے حوالے سے اس کے تحفظات کو سنجیدگی سے سنا۔ کیسے وہ چھ ماہ اس کے ساتھ ان جنگلات میں جا جا کر مقامی لوگوں کے ساتھ حقائق اکٹھا کرتا رہا... اور کیسے اس نے ورلڈ بینک کو جمع کیے جانے والے حقائق اور تحفظات پر مشتمل رپورٹ بھیجی تھی جو اس پروجیکٹ کے اختیارات کو ہی نہیں اس کی بنیاد کو بھی قابل اعتراض گردانتی تھی۔ سالار سکندر کے لیے اپنے ستائشی جذبات کوویر تک پہنچاتے ہوئے ایباکا کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ اس نے سالار سکندر کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

کوویر اس پروجیکٹ کے حوالے سے جن مزید لوگوں سے بات چیت کرنے والا تھا ان میں سالار سکندر کا نام سرفہرست تھا... سی آئی اے کو اس کا اندازہ تھا... یہ وہ دن تھا جب سالار سکندر سفر کرتے ہوئے رات کو واشنگٹن پہنچ رہا تھا اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ بدقسمتی اس سے پہلے اس کے انتظار میں وہاں بیٹھی تھی۔

ایباکا نے اس عمارت سے نکلنے کے بعد سینٹرل پارک کی طرف جاتے ہوئے بے حد خوشی کے عالم میں سالار کو ٹیکسٹ کیا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اب سی این این تک رسائی حاصل کر چکا تھا اور کوویر ہی نے حوالے سے اسے واشنگٹن کے سی این این اسٹوڈیوز میں اسی کی ٹیم کے چند اور لوگوں سے بھی ملنے کا موقع مل گیا تھا... اور ایباکا ساتویں آسمان پر تھا۔

اسے اب کوویر کے ساتھ دو ہفتے کے بعد کانگو واپس جانا تھا جہاں وہ اینڈرسن کوویر کو اس پروجیکٹ کے حوالے سے کی جانے والی تحقیقات میں مدد دیتا اور وہ خواب جو کئی سالوں سے صرف خواب تھا پیٹرس ایباکا اسے بالآخر حقیقت بنتا دیکھنے لگا تھا۔ اس ٹیکسٹ میں ایباکا نے اسے بتایا تھا کہ وہ بے حد خوش تھا... بے حد... پیٹرس ایباکا چھوٹے موٹے نیوز چینلز اور اخبارات میں اس مسئلے کو لے کر پھرتا اور بولتا رہا تھا اور خوار ہوتا رہا تھا...

اینڈرسن کوویر سی این این پر پرائم ٹائم میں امریکہ کے مقبول ترین پروگرامز میں سے ایک 360 میں جب اس مسئلے پر بات کرتا تو صرف عالمی افق پر ہی تہلکہ نہیں مچتا بلکہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور ورلڈ بینک کے اندر بھگدڑ

مچنے کے ساتھ ساتھ ان دوسری عالمی طاقتوں کے لیے بھی پریشانی کے آثار پیدا ہوتے جو اس پروجیکٹ میں حصہ دار تھے اور جن کے ہاتھ ان پگمیز کے خون سے رنگے جارہے تھے۔

وہ ٹیکسٹ بہت لمبا تھا۔ اس میں اور بھی بہت کچھ تھا... اور پیٹرس کا جوش و خروش وہیں ختم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس بہت لمبے ٹیکسٹ کو کرتے کرتے ای میل کردیا تھا۔ سالار سکندر اس وقت اپنی فلائٹ پر تھا اور کچھ گھنٹوں کے بعد وہ جب واشنگٹن اترا تھا تب تک اس کے رابطوں کے تمام ذرائع زیر نگرانی آچکے تھے۔ پیٹرس ایباکا کی وہ آخری ای میل سالار سکندر کو اس کی موت کے بعد ملی تھی۔ لیکن ان لوگوں کو سالار سکندر کے جہاز اترنے سے بھی کئی گھنٹے پہلے مل گئی تھی جو پیٹرس ایباکا کی زندگی اور موت کے حوالے سے فیصلہ کررہے تھے۔

ایباکا کی فوری موت انہیں نہیں چاہیے تھی۔ انہیں فی الحال کچھ گھنٹوں کے لیے اس کی زندگی چاہیے تھی۔ اپنی تحویل میں ایباکا کو رکھتے ہوئے وہ اب ایباکا ہی کے ذریعے اس پورے کیس کو بند کرنا چاہتے تھے۔ وہ پنڈورا باکس جسے ایباکا نے کھولا تھا' وہ ایباکا کے ہاتھوں ہی بند کروانا چاہتے تھے... اور اس کے بعد وہ ایباکا سے جان چھڑا لیتے... اس کی طبعی موت کے ذریعے۔

بعض اوقات کسی شخص کی زندگی کسی دوسرے کی موت بن جاتی ہے... اور کسی دوسرے کی موت کسی اور کی زندگی... ایباکا کی موت کے فیصلے نے سی آئی اے کی فوری طور پر سالار سکندر کو ماردینے کی حکمت عملی بدل دی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے سالار سکندر کو بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں ہونے والے مذاکرات کے بعد اس کے انکار اور معاملہ حل نہ کرنے کی صورت میں ایک "حادثاتی موت" کا سامنا کرنا تھا۔ اینڈرسن کوپر سے ایباکا کی ہونے والی اچانک ملاقات نے سی آئی اے کو یک دم پسپا کردیا تھا۔ وہ ایباکا اور سالار دونوں کو اکٹھا نہیں مار سکتے تھے... شاید مارنے کا سوچ ہی لیتے اگر اتفاقی طور پر وہ دونوں ایک ہی وقت میں امریکہ میں موجود نہ ہوتے اور وہ بھی دو قریبی شہروں میں... وہ ایسا کوئی رسک نہیں لے سکتے تھے کہ کسی تفتیش شروع ہونے کی صورت میں ایباکا اور سالار کی طبعی اموات کے درمیان کوئی اور قدرتی تعلق نکال لیا جاتا۔

سالار کو فی الحال صرف خوف زدہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور سی آئی اے کو اندازہ نہیں تھا کہ انہوں نے غلط حکمت عملی 'غلط آدمی پر لاگو کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

پیٹرس ایباکا کو چند گھنٹوں کے بعد بروکلین کے ایک ایسے علاقے کی ایک تنگ و تاریک گلی میں روکا گیا تھا جہاں ایک قریبی عمارت میں ایباکا کو اپنے ایک دوست سے ملنا تھا۔ سی آئی اے کا خیال تھا ایباکا ان کے لیے حلوہ تھا جسے وہ بہت آرام سے اسے پکڑ کرلے آتے۔ ایسا نہیں ہوا تھا۔ ایباکا ان دو افراد سے بڑی بے جگری سے لڑا تھا جنہوں نے اچانک اس کے قریب اپنی گاڑی روک کر اسے ریوالور دکھاتے ہوئے اندر بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ساری زندگی امریکہ کی مہذب دنیا میں مہذب طور طریقوں کے ساتھ گزاری تھی لیکن جنگل اور جنگلی زندگی اس کی سرشت اور جبلت میں تھی' اپنا دفاع کرنا اسے آتا تھا۔

وہ ان تربیت یافتہ گماشتوں کے قابو میں نہیں آیا تھا... پستہ قامت ہونے کے باوجود وہ سخت جان اور مضبوط تھا۔ وہ پٹتا اور پیٹتا رہا تھا۔ اس سڑک سے گزرتے ہوئے اکا دکا لوگوں میں سے کسی نے ایک سیاہ فام اور دو سفید فاموں کے درمیان ہونے والی اس دھینگا مشتی کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گزرنے والے سفید فام تھے اور پیٹرس ایباکا ان کی ملامتی نظروں کا' معاملے کو نہ سمجھتے ہوئے بھی نشانہ تھا۔ جرم ہمیشہ کالا کرتا تھا... قصوروار ہمیشہ کالا ہوتا تھا۔ وہ فلسفی پاس سے گزر جانے والے لوگوں کے ذہنوں کے ساتھ ساتھ نظروں میں بھی تھی۔

وہ ایسا معاشرہ نہیں تھا جو کسی سیاہ فام کو پٹتے دیکھ کر انسانیت کے جذبے کے تحت تڑپ جاتا اور مدد کے لیے بن بلائے آجاتا... اور یہاں تو ایک ایسا سیاہ فام تھا جو پٹ رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ پیٹ بھی رہا تھا۔ خود لہولہان تھا تو ان

دو سفید فاموں کو بھی لہولہان کر چکا تھا۔ پتا نہیں یہ ایبا کا کی بدقسمتی تھی۔ ان دونوں ایجنٹس کی یا پھر سی آئی اے کی ..... کہ لڑتے لڑتے ریوالور ایبا کا کے ہاتھ میں آگیا تھا اور ایک بار ریوالور ہاتھ میں آنے پر اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ان دونوں افراد پر گولیاں چلا دی تھیں۔ گولی ایک کو لگی تھی لیکن دوسرا خود پر ہونے والے فائر سے بہت پہلے اپنا ریوالور نکال کر ایبا کا پر دو فائر کر چکا تھا جو اس کے سینے میں لگے تھے۔

یکے بعد دیگرے ہونے والے ان تین فائرز نے اس سڑک پر چلتے راہ گیر کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا اور ان ہی میں سے کسی نے پولیس کو بھی فون کیا تھا لیکن پولیس کے آنے سے پہلے ہی وہ دونوں ایجنٹ شدید زخمی حالت میں تڑپتے ایبا کا کو گاڑی میں ڈال کر فرار ہو گئے تھے۔ جس ایجنٹ کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ وہ ہوش و حواس میں تھا اور اپنی گاڑی میں ایبا کا کو لے کر فرار ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے سرپرستوں کو سارے واقعے سے انفارم کر دیا تھا۔

ایبا کا کی وہ حالت اس دن سی آئی اے کے لیے دوسرا جھٹکا تھی۔ انہیں ایبا کا صحیح سلامت کچھ گھنٹوں کے لیے چاہیے تھا تاکہ اس کے ذریعے ان تمام چیزوں کو بھی نابود کر سکتے جو ایبا کا کی موت کی صورت میں کسی اور کے ہاتھ لگ جانے کی صورت میں ان کے لیے کوئی اور بیٹرس ایبا کا کھڑا کر دیتا۔ سی آئی اے کو یہ پتا تھا کہ ایبا کا کے پاس موجود کاغذات کی ہزاروں نہیں تو کم از کم سینکڑوں کاپیاں تھیں، جو ایبا کا مختلف لوگوں کے پاس رکھواتا آرہا تھا۔ پتا نہیں یہ احتیاط تھی یا کوئی خوف یا کوئی حکمت عملی، لیکن یہ وہ واحد حفاظتی تدبیر تھی جو ایبا کا کے ذہن میں ابھرنے والے خدشات کا ایک حل تھا اور یہ خدشات اس وقت ابھرنا شروع ہوئے تھے جب ایک سال پہلے پہلی بار کچھ لوگوں نے اس سے رابطہ کر کے اس پورے معاملے سے پیچھے ہٹ جانے کے عوض رشوت دینے کی کوشش کی تھی۔ رشوت شاید ایک بہت چھوٹا اور گھٹیا لفظ تھا اس سب کے لیے جو اسے آفر کیا گیا تھا۔ اگر بلینک چیک کسی کو صرف روپے کے لیے پیش کیا جاتا تھا تو ایبا کا کو اس مقصد سے پیچھے ہٹنے اور دوسرے لفظوں میں اپنے لوگوں کی زندگی بیچ دینے کے عوض ہر چیز کے حوالے سے ایک بلینک چیک پیش کیا گیا تھا..... کوئی بھی ایسی چیز جو ایبا کا کی خواہش ہوتی..... کوئی بھی چھوٹی سے چھوٹی، بڑی سے بڑی.....

ایبا کا کا انکار، اقرار میں نہیں بدلا تھا۔ قیمت ہمیشہ اقرار کی ہوتی ہے "انکار انمول" ہوتا ہے..... بکنے والے آدمیوں کے بیچ میں نہ بکنے والا آدمی کانٹے کی طرح چبھتے ہوئے بھی ہیرے کی طرح چمکتا ہے اور سی آئی اے "ہیروں کے کاروبار" میں مہارت رکھنے کا دعوا رکھتی تھی۔

ان پیش کشوں اور اس انکار کے بعد ایبا کا کو پہلی بار یہ خدشات لاحق ہونے لگے تھے کہ اگر اسے خرید انہیں جا سکا تو پھر اسے مارا جا سکتا ہے..... اور یہ خدشہ ہی وہ چیز تھی جس نے ایبا کا کو اپنے بہت سے دوستوں اور ساتھیوں کے پاس ان دستاویزات کی کاپیاں رکھوانے پر مجبور کرنا شروع کر دیا تھا۔ سی آئی اے کو اس کی بھی خبر تھی۔ ایبا کا نے اگر سینکڑوں کاپیاں امریکہ اور کانگو اور انگلینڈ میں اپنے دوستوں کے پاس رکھوائی تھیں تو سی آئی اے کو ان سینکڑوں لوگوں کی مکمل معلومات تھیں..... وہ دستاویزات ہر اس جگہ سے چوری کر کے ان کی جگہ کچھ اور ڈاکومنٹس رکھ دی جاتی تھیں اور ایبا کا کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوا تھا کہ اس کے پیچھے اس پروجیکٹ کے حوالے سے سارے سراغ مٹائے جاتے رہے تھے۔

فی الحال دنیا میں اب صرف دو شخص تھے جن کے پاس وہ دستاویزات اصلی شکل میں تھیں کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر..... پیٹرس ایبا کا اور سالار سکندر..... پیٹرس ایبا کا اب موت اور زندگی کی کشمکش میں تھا اور سالار سکندر اگلے دن خوار ہونے والا تھا مگر سی آئی اے کے لیے فی الحال سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ وہ ایبا کا کے دستخط کیسے حاصل کرتے، جن کی انہیں فوری ضرورت تھی تاکہ وہ اس کے وہ لاکرز کھلوا سکتے جہاں اس کی اصل دستاویزات تھیں..... ان کی

حکمت عملی یہ تھی کہ وہ ان اصلی دستاویزات کو حاصل کرنے کے بعد ایباکا کو ختم کر دیتے۔ مگر سب کچھ اس کے الٹ ہوا تھا۔

پلان اے اور پلان بی ناکام ہو چکا تھا۔ اب سی آئی اے کو پلان سی سے کام لینا تھا لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایباکا کے پاس ایک پلان ڈی تھا جس کا انہیں کبھی پتا نہیں چل سکا تھا۔۔۔ وہ کانگو میں اپنی ایک گرل فرینڈ کے پاس ایک وصیت چھوڑ کر آیا تھا۔



امامہ کو اندازہ نہیں تھا۔ وہ کتنی دیر بے ہوشی کی حالت میں رہی تھی یا رکھی گئی تھی مگر بے ہوشی جب ختم ہونا شروع ہوئی تھی تو اس نے جیسے بے اختیاری کے عالم میں سب سے پہلے اس وجود کو ڈھونڈنا شروع کیا تھا جسے اس نے پہلی اور آخری بار آپریشن تھیٹر میں بے ہوش ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔ تکلیف کی حالت میں بھی اسے یاد تھا کسی نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک لڑکا تھا۔

درد سے بے حال اس نے محمد حمین سکندر کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے اسے چوما تھا اور پھر اسے چومتی چلی گئی تھی۔ وہ بے حد کمزور تھا اس کی بڑی دو اولادوں کے برعکس بے حد کمزور۔۔۔ اور وجہ اس کی قبل از وقت پیدائش تھی۔ وہ تین ہفتے قبل دنیا میں آیا تھا۔۔۔ نیم غنودگی میں وہ اپنا بستر ٹٹولتی رہی۔

اس بات کا احساس کیے بغیر کہ وہ نوزائیدہ بچہ اس کے بستر پر نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر اسے بے مقصد تلاش کرتے رہنے کے بعد اسے اچانک یاد آگیا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہو سکتا تھا۔ بے ہوشی کی دوا کا اثر آہستہ آہستہ زائل ہونا شروع ہو رہا تھا۔ اس کی یادداشت جیسے آہستہ آہستہ واپس آرہی تھی۔ دماغ نے کام کرنا شروع کیا تھا تو آہستہ آہستہ اسے سب یاد آنے لگے تھے۔۔۔ جبریل۔۔۔ عنایہ۔۔۔ سالار۔ وہ کچھ بے چین ہوئی تھی جبریل اور عنایہ کہاں تھے؟ پیڈی کہاں تھی؟ اور سالار کیا اس کو پتا تھا اس کی اس حالت کے بارے میں۔

اس نے بھاری سر اور آنکھوں کے ساتھ اس کمرے کا جائزہ لیا تھا جس میں وہ تھی۔ وہ ایک ہاسپٹل کا وی آئی پی روم تھا اور ایک ساؤنڈ پروف کمرہ جس کی کھڑکیوں کے سامنے بلائنڈز تھے اور امامہ اس ذہنی حالت میں فوری طور پر یہ اندازہ نہیں کر پائی تھی کہ وہ دن تھا یا رات اور وقت!۔۔۔ وقت کیا ہو رہا تھا۔۔۔ اس نے وقت کا خیال آنے پر کمرے کی کسی دیوار پر دیوار گیر تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہاں کوئی وال کلاک نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا وہ آپریشن کے بعد اس کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے سلائی گئی تھی اور اب وہ ہوش میں آئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ دو دن کے بعد ہوش میں آرہی تھی۔ امامہ نے یاد کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ وہاں کیسے آئی تھی۔ ذہن پر زور دے کر۔



سی آئی اے کے لیے سب سے بڑی پریشانی سالار کی فیملی تھی۔ انہیں غائب کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا مگر انہیں یہ احساس دلائے بغیر غائب کرنا کہ انہیں غائب کیا جا رہا تھا سب سے مشکل کام تھا۔ بینک کے کرتا دھرتا دوبارہ سالار سے مذاکرات کرنے تھے اور ان مذاکرات کے نتیجے میں اگر وہ مان جاتا تو پھر اپنی فیملی کے ساتھ ہونے والے کسی برے سلوک پر وہ ردعمل کا اظہار کر سکتا تھا۔۔۔ وہ اسے یہ سراغ نہیں دینا چاہتے تھے کہ ورلڈ بینک کے علاوہ کوئی دوسری طاقت اس سب میں ملوث تھی۔

سالار جس رات واشنگٹن کے لیے روانہ ہوا تھا اس کے اگلے دن امامہ کی گائناکولوجسٹ نے اسے فون کیا تھا۔ امامہ کے معائنے کی تاریخ تین دن بعد کی تھی۔ اس کی امریکن ڈاکٹر نے اسے اسی دن ایمرجنسی میں آنے کے لیے

کہا کیونکہ اسے کسی میڈیکل کیمپ میں شرکت کے لیے اگلے ایک ہفتہ کے لیے گھانا میں رہنا تھا۔ اس کی سیکریٹری نے امامہ سے کہا تھا کہ وہ اپنی تمام اپائنٹمنٹس ری شیڈول کر رہی ہے اور اس نے امامہ کو آج کے دن کہا تھا۔ امامہ نے کسی غور و خوض کے بغیر جانے کی ہامی بھرلی تھی۔ وہ اسے ایک معمول کی بات سمجھ رہی تھی اور اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا اگر سالار سکندر سی آئی اے کے ہاتھوں بے بس ہو رہا تھا تو امامہ تو کوئی شے ہی نہیں تھی۔

وہ ہمیشہ کی طرح جبریل اور عنایہ کے ساتھ بیڈی کو بھی ہسپتال لے کر گئی تھی۔ وہ کنشاسا کے بہترین اسپتالوں میں سے ایک تھا کیونکہ وہاں پر زیادہ تر غیر ملکی ملٹی نیشنل کمپنیز اور سفارت کاروں کا علاج ہوتا تھا سالار اس وقت اپنی فلائٹ پر تھا اور امامہ کا خیال تھا وہ جب تک واشنگٹن پہنچتا وہ اس سے بہت پہلے واپس گھر آجاتی۔ لیکن وہ واپس گھر نہیں آسکی تھی۔

اس کی ڈاکٹر نے اس کا الٹراساؤنڈ کرنے کے بعد کچھ تشویش کے عالم میں اس سے کہا تھا کہ اسے بچے کی حرکت ابنارمل محسوس ہو رہی ہے۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ اسے کچھ اور ٹیسٹ کروانے ہوں گے اور ساتھ اسے کچھ انجیکشن بھی لینا ہوں گے۔ امامہ کو تشویش ہوئی تھی تو صرف یہ کہ سالار وہاں نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے ہمیشہ اس کے ساتھ ہی وہاں آئی تھی۔ ایسے معائنوں کے لیے لیکن اسے اپنے بچے کے حوالے سے کوئی فکر نہیں تھی! کیونکہ وہ بچے کی حرکت کی ابنارملٹی کو بھی ایک اتفاقی چیز سمجھ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے فوری طور پر ہاسپٹل میں کچھ گھنٹوں کے لیے یہ کہہ کر ایڈمٹ کیا تھا کہ انہیں اس کو زیر نگرانی رکھنا تھا۔

اسے ایک کمرے میں شفٹ کیا گیا تھا اور جو انجکشن امامہ کو دیے گئے تھے وہ درد بڑھانے والے انجکشن تھے۔ امامہ کو گھر سے غائب اور سالار اور اپنی کسی اور فیملی ممبر سے رابطہ منقطع رکھنے کے لیے سی آئی اے کے پاس اس سے بہترین حل نہیں تھا کہ اس کے بچے کی قبل از وقت پیدائش عمل میں لائی جائے۔

اس کے بچے کی حالت اتنی اچھی تھی کہ وہ تین ہفتے پہلے پیدا ہونے پر بھی زندہ بچ سکتا تھا۔ اور نہ بچتا تو بھی سالار یا امامہ میں سے کوئی ورلڈ بینک یا سی آئی اے کا ہاتھ اس ساری صورت حال میں سے برآمد نہیں کر سکتا تھا۔

امامہ انجکشن لگوانے سے پہلے ہاسپٹل کے کمرے میں ہی بیڈی، جبریل اور عنایہ کو لے آئی تھی اس وقت بھی اس کا یہی خیال تھا کہ چند گھنٹوں میں وہ واپس گھر چلی جائے گی لیکن اسے پہلی بار تشویش تب ہوئی تھی جب اسے دردِزہ ہونا شروع ہو گیا تھا اور ڈاکٹر نے اس کی تصدیق بھی کر دی تھی کہ انجکشن کے ری ایکشن میں شاید انہیں بچے کی زندگی بچانے کے لیے فوری طور پر دنیا میں لانا پڑے۔

وہ پہلا موقع تھا جب امامہ بری طرح پریشان ہوئی تھی وہاں کنشاسا میں گھر کے چند ملازموں کے علاوہ ان کا کوئی ایسا حلقہ احباب نہیں تھا جنہیں وہ ایسے کسی بحران میں مدد کے لیے پکارتے یا جن پر بھروسا کرتے۔ ان کا جتنا میل ملاپ تھا وہ سرکاری تھا اور غیر ملکی تھا۔

فوری طور پر امامہ کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا تھا کہ وہ بچوں کو کہاں بھیجے۔ اس کی ڈاکٹر نے اسے مدد کی پیش کش کی تھی کہ وہ بچوں کو اپنے گھر رکھ سکتی ہے، لیکن امامہ کے لیے تو یہ ناممکن تھا۔ وہ اپنی اولاد کے بارے میں جنون کی حد تک محتاط تھی اور خاص طور پر جبریل کے حوالے سے۔ یہ غیر فطری نہیں تھا۔ اس نے ایک بھرے پرے خاندان سے نکل کر دس سال کی قید تنہائی کاٹی تھی اور پھر امید اور ناامیدی کے درمیان لٹکتے ہوئے اس نے ان خونی رشتوں کو پایا تھا۔ وہ اس کی کل کائنات تھے اور اسے اس وقت ملے تھے جب وسیم کی موت کے بعد وہ مایوسی کے سب سے بدترین دور سے گزر رہی تھی۔ جبریل اس کی زندگی میں اس وقت بہار کی طرح آیا تھا۔ اس کے وجود کے اندر پلتے ہوئے بھی اس نے ماں کو کسی مسیحا کی طرح سنبھالا تھا۔

وہ پہلی بار جبریل کو دیکھنے اور گود میں لینے پر بلک بلک کر رو دی تھی۔ لگتا تھا اولاد نہیں معجزہ تھا اس کے لیے... اور یقین یہ نہیں آ رہا تھا کہ یہ معجزہ اس کے لیے کیسے ہو گیا تھا۔

وہ اس کی وہ اولاد تھی جس نے اس کی زندگی کے بدترین دنوں میں سے کچھ دن' اس کے وجود کے اندر پلتے ہوئے اس کے کرب کو سہتے ہوئے گزارے تھے اور یہ وہ احساس تھا جو امامہ کو جبریل کے سامنے ہمیشہ شرمندہ بھی رکھتا تھا اور احسان مند بھی۔ سالار کہتا تھا وہ جبریل کی عاشق تھی اور وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اسے جبریل کے سامنے واقعی کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ عنایہ... سالار دونوں کہیں پیچھے چلے جاتے تھے... وہ اس پر بھروسا کرتی تھی اور چار سال کے اپنے اس بیٹے کو ہر جگہ اپنے ساتھ یوں رکھتی تھی جیسے وہ بہت بڑا ہو۔ جبریل عام بچوں جیسی عادات نہیں رکھتا تھا۔ ذہانت اسے باپ سے ورثے میں ملی تھی لیکن برداشت اس نے کہاں سے لی تھی؟ یہ امامہ نہیں جان پائی تھی۔ اس کے دونوں بچے ہی ضدی اور شرارتی نہیں تھے لیکن جبریل میں ایک عجیب سی سنجیدگی اور سمجھ داری تھی جو اس کے معصوم چہرے پر بلا کی بجتی تھی۔

وہ ہر چیز کا بے حد خاموشی سے مشاہدہ کرنے کا عادی تھا' بنا کوئی تبصرہ کیے۔ امامہ کون سی چیز کہاں رکھ کر بھولتی تھی یہ جبریل کو یاد رہتا تھا۔ وہ سالار سکندر کی عدم موجودگی میں اس گھر کا "بڑا" تھا... اور وہ جیسے اپنے اس کردار سے بخوبی واقف بھی تھا۔

ہسپتال میں امامہ اور ڈاکٹر کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو بھی اس کے سامنے ہی ہوتی رہی تھی اور وہ چپ چاپ بیٹھا سن اور دیکھ رہا تھا۔

امامہ کو اب بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی اس کی ڈلیوری کم از کم تب تک ٹل جائے جب تک سالار امریکہ پہنچ جائے اور وہ اس سے بات کر لے اور اسے صورت حال سے آگاہ کر دے... وہ اس کے اور بچوں کی فوری دیکھ بھال کے لیے تو کچھ کر تا ہی کرتا لیکن کم از کم وہ اس سے ڈلیوری سے پہلے ایک بار بات تو کر لیتی۔

وہ خوف جو ہمیشہ اسے اپنے حصار میں لیتا رہا تھا وہ اب بھی لے رہا تھا... اور کیا ہوا... اگر ڈلیوری کے دوران مر جائے تو... اور یہ وہ "تو" تھی جو اسے ہر بار آپریشن تھیٹر میں جاتے ہوئے سالار سے ایک بار معافی مانگنے پر مجبور کرتی تھی۔ اپنی احسان مندی جتانے پر بھی مجبور کرتی تھی لیکن بس زبان اگر ایک جملے پر آ کر اٹکی تھی تو وہ اس سے محبت کا اظہار تھا... وہ آج بھی سالار سے محبت کے اظہار کے لیے بس جملے اور لفظ ہی ڈھونڈتی رہ جاتی تھی۔ وہ لفظ اور وہ جملے جو اسے اتنے خالص' اتنے سچے لگتے کہ وہ سالار تک وہ جذبات پہنچا پاتی جو اس کے دل میں اپنے مرد کے لیے تھے۔ اللہ کے بعد جو بھی تھا اسی کے دم سے تھا۔ وہ حمین کی پیدائش سے پہلے موت کے خوف میں مبتلا ہوئی تھی... اور اس بار پہلے سے کئی گنا زیادہ کیونکہ سالار دور تھا... وہ تنہا تھی... اور اس کے بچے کم سن تھے۔

اس کی خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی۔ درد بڑھ رہا تھا اور ڈاکٹر اسے آپریشن تھیٹر میں لے جانا چاہتی تھی کیونکہ کیس نارمل نہیں تھا۔ اسے آپریشن کرنا تھا۔

امامہ نے بیڈی کو اپنے بچوں کی ذمہ داری سونپنے سے پہلے جبریل کو عنایہ کی ذمہ داری سونپی تھی۔ اسے بہن کا خیال رکھنے کا کہا تھا اور کبھی بھی اسے اکیلا نہ چھوڑنے کا کہا تھا۔ جبریل نے ہمیشہ کی طرح سر ہلایا تھا۔ فرماں برداری سے۔ یہ ذمہ داری اسے پہلی بار نہیں سونپی گئی تھی' ہمیشہ سونپی جاتی تھی... لان میں اکیلے کھیلتے ہوئے... کسی شاپنگ مال میں شاپنگ کے دوران' پرام میں بیٹھے... گاڑی میں اکیلے بیٹھے جب سالار کبھی کسی سروس اسٹیشن یا کسی اور جگہ اکیلا انہیں لے کر جاتا اور کچھ منٹوں کے لیے اتر کر کچھ لینے جاتا' جبریل خود بخود کمانڈ سنبھالنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا... اور عنایہ بھائی کی فرماں برداری کرتی رہتی تھی... ایک بار پھر جبریل کو ایک ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ ایک بار پھر اس نے ہمیشہ کی طرح ماں کو تسلی دی تھی۔

"آپ نیا بےبی لے آئیں۔ میں اس بےبی کا خیال رکھوں گا۔"
چار سالہ جبریل نے انگلش میں ماں کو تسلی دی تھی اور اس کی تسلی امامہ کے ہونٹوں پر اس تکلیف میں بھی مسکراہٹ لے آئی تھی۔ آپریشن تھیٹر میں جانے سے پہلے اس نے ان دونوں کو گلے لگا کر چوما تھا اور پھر پیڈی کو ان کا خیال رکھنے کا کہہ کر اور سالار کو اطلاع دینے کا کہتے ہوئے اپنا فون اور بیگ تھمائی تھی۔
اور اب جب وہ ہوش میں آئی تھی تو اس کمرے میں وہ اکیلی تھی۔ وہاں نہ پیڈی تھی نہ جبریل.... نہ عنایہ.... نہ ہی حمین....



یوٹیوب پر کسی نے ایک ویڈیو اپ لوڈ کی تھی۔ جس میں ایک سیاہ فام بروکلین کے ایک نسبتاً "پس ماندہ حصے میں ایک پاس سے گزرنے والی گاڑی سے یک دم نکلنے والے دو سفید فام لوگوں سے لڑتا نظر آیا تھا.... ان سفید فاموں کے ہاتھوں میں موجود ریوالور سے بچنے کی کوشش کرتا' انہیں چھینتا اور ان پر فائر کرنے کے بعد ان میں سے ایک کے ہاتھوں گولی کھا کر ــــ گرتا نظر آیا تھا۔ پھر ان دونوں افراد کا اسے بے رحمی سے گھسیٹ کر گاڑی میں تقریباً" پھینکنے والے انداز میں گرایا جانا بھی اس ویڈیو میں تھا۔
ویڈیو سیل فون سے نہیں اس بلڈنگ میں رہنے والے ایک سیاہ فام نوعمر بچے نے ہینڈی کیم سے بنائی تھی جو اتفاقاً" اس جگہ سے بالکل قریب ایک بلڈنگ کی دوسری منزل کی کھڑکی سے ایک اسکول پروجیکٹ کے سلسلے کی ایک ویڈیو شوٹ کر رہا تھا "میرے پڑوسی".... اس نے اپنی گلی میں شروع ہونے والی اس لڑائی کو اتفاقاً" لیکن بڑی دلچسپی سے یہ سوچتے اور کمنٹری کرتے ہوئے ریکارڈ کیا تھا کہ وہ اس علاقے میں ہونے والی اسٹریٹ فائٹ کو بھی اپنے اطراف کے ایک امتیازی فیچر کے طور پر پیش کرے گا.... لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اسٹریٹ فائٹ گولیوں کے تبادلے پر نہیں گولیاں مارنے پر ختم ہوگی۔
سی آئی اے کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ ویڈیو بہت قریب سے بنی تھی اور اس میں نظر آنے والے تینوں افراد کے چہرے واضح تھے.... سی آئی اے کی بے وقوفی یہ تھی کہ انہوں نے ایک سیاہ فام ٹارگٹ کو اٹھوانے کے لیے دو سفید فاموں کا انتخاب کیا اور انہیں ٹارگٹ کو اٹھوانے کے لیے اس جگہ بھیجا جہاں سیاہ فاموں کی آبادی نسبتاً زیادہ تھی۔
یہ ان ایجنٹس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ وہاں سے ایک سیاہ فام کو پیٹ کر اور گولی مار کر بھی نہ صرف خود صحیح سلامت آگئے تھے بلکہ اس سیاہ فام کو بھی لے گئے تھے۔
اس بچے نے ویڈیو شوٹ کرتے ہوئے بھی چلا چلا کر ان دونوں افراد کو سیاہ فام کو کھینچ کر گاڑی میں ڈالنے سے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کوشش میں ناکامی کے بعد اس نے اس گاڑی کی نمبر پلیٹ کو زوم کر کے ریکارڈ کیا تھا۔
پولیس کو ویڈیو دینے سے پہلے اس نے وہ ویڈیو سیاہ فاموں کے ساتھ امریکہ میں ہونے والی زیادتیوں پر مبنی ایک ویب سائٹ پر منتقل کی تھی اور اس ویب سائٹ نے اسے یوٹیوب پر.... اگلے بارہ گھنٹوں وہ ویڈیو یوٹیوب پر دستیاب ہوگئی تھی.... اس پر بے شمار لوگوں نے ردعمل کا اظہار کیا تھا اور ہزاروں ملامتی تبصرے اور سفید فاموں کے لیے گالیاں.... وہ بارہ گھنٹوں میں یوٹیوب سے نیوز چینلز پر آگئی اور وہاں سے بین الاقوامی نیٹ ورکس پر....
پیٹرس ایباکا کو پہچاننا مشکل نہیں تھا وہ بہت جلد پہچانا گیا تھا۔ پولیس اس جگہ سے قریبی ہسپتال میں بھی پہنچ گئی تھی جہاں وہ ایجنٹس ایباکا کی زندگی بچانے کے لیے فوری طبی امداد دلانے گئے تھے اور ہاسپٹل کی انتظامیہ کو یہ بھی پتا تھا کہ وہ ایک اسپیشل مریض تھا جسے سی آئی اے کے دو ایجنٹس لے کر آئے تھے اور اس کی حالت کچھ بہتر ہونے

پر سرجری کے فوراً" بعد وہاں سے لے گئے تھے۔
NYPD نے سی آئی اے سے رابطہ کیا تھا اور انہیں یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ ایبا کا کو فوری طور پر واشنگٹن منتقل کردیا گیا تھا اور وہ وہاں مرچکا تھا۔ سی آئی اے اب سرپیٹ رہی تھی کہ وہ میڈیا پر پیٹرس ایباکا کے ایک حادثے میں زخمی ہو کر ہاسپٹل جانے والی خبر کو کیسے درست ثابت کرتی۔
پیٹرس ایباکا کے ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہونے کی خبر میڈیا پر چلانا ان کی ایسی حکمت عملی تھی جو اب ان کے گلے کی ہڈی بن گئی تھی۔ طوفان یوٹیوب پر کیا مچا تھا' طوفان تو وہ تھا جو سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز میں آیا تھا۔ ایک آسان ترین سمجھا جانے والا آپریشن سی آئی اے کے منہ پر ذلت اور بدنامی تھوپنے والا تھا۔ ساتھ امریکن گورنمنٹ اور ورلڈ بینک بھی پھنسنے والے تھے اور فی الحال سی این این کو اس مصیبت سے نجات تو ایک طرف اس پر قابو پانے کا بھی کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔
کبھی کبھی انسان کو اس کی بے وقوفی نہیں اس کی ضرورت سے زیادہ چالاکی لے ڈوبتی ہے۔ سی آئی اے کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ایک تیر سے دو شکار کرتے کرتے وہ اپنی کمان ہی تڑوا بیٹھے تھے۔ انہوں نے پیٹرس کو نیویارک کے اسی ہاسپٹل میں چھوڑ دیا ہوتا تو ان کی بچت ہو جاتی۔ وہ دو افراد کسی گینگ کے ثابت کردیے جاتے یا کوئی مجرم' جو ایباکا کو لوٹنے کے لیے اس سے الجھے تھے۔ کچھ دن شور مچتا پھر بات کالے اور گورے کی روایتی لڑائی تک ہی محدود رہ کر نسلی تعصب کے خلاف کچھ اپیلوں' قراردادوں اور شمعیں روشن کرنے کے ساتھ ختم ہو جاتی...
پیٹرس ایباکا بھی ختم ہو جاتا اور اس کے ساتھ اس کا مشن بھی۔۔۔ عزت سی آئی اے کی بھی بچی رہتی اور ناک ورلڈ بینک کی بھی۔۔۔ لیکن اس آپریشن کے ماسٹر مائنڈ کو ہر چیز کو الجھا کر انتقام تک پہنچانے کی خواہش تھی کہ کل کوئی اس گتھی کو سلجھانے کے لیے دھاگے کا سرا ڈھونڈتا ہی رہ جاتا لیکن مسئلہ یہ ہوا تھا کہ گتھی الجھانے والے اسے الجھاتے الجھاتے خود اندر پھنس گئے تھے اور اب انہیں باہر نکلنا نہیں آرہا تھا۔
وہ اسے کسی حادثے کا زخمی دکھا کر اس سے جان چھڑانا چاہتے تھے اور یہ کام وہ واشنگٹن میں کرنا چاہتے تھے' جہاں سالار سکندر تھا اور اس دن واشنگٹن میں صرف ایک حادثہ ہوا تھا۔ جس کا ایک زخمی پیٹرس ایباکا کو ظاہر کر کے دونوں کا تبادلہ کیا گیا تھا۔ ہاسپٹل کی انتظامیہ کو ایباکا کے حوالے سے معلومات تھیں بالکل نیویارک کے اس ہاسپٹل کی طرح جہاں ایباکا کو پہلی بار لے جایا گیا تھا۔
اس کی حالت مسلسل بگڑ رہی تھی اور سی آئی اے سرجری کے بعد ہاسپٹل سے اسے اپنے ٹھکانے پر لے جا کر بھی اس سے کوئی کام کی بات نہیں پوچھ سکی تھی۔ تو اب انہیں اس سے وہ آخری کام لینا تھا جس کے لیے اسے واشنگٹن "پہنچایا" گیا تھا اور جس کے لیے نیوز چینلز پر بار بار اس حادثے کے زخمیوں اور مرنے والے کے نہ صرف نام چلائے گئے تھے بلکہ ان کی پاسپورٹ سائز کی تصویریں بھی سی آئی اے کو یقین تھا نیوز چینلز پر چلنے والی یہ خبر سالار سکندر کے علم میں ضرور آئے گی اور انہیں یہ بھی یقین تھا کہ جس طرح کی قربت ان دونوں کی حالیہ کچھ عرصے میں رہی تھی' وہ متقاضی تھی کہ سالار اس سے ملنے ضرور جاتا۔
اندازے درست ثابت ہوئے تھے۔ وہ خبر سالار نے دیکھ بھی لی تھی اور وہ فوری طور پر اس سے ملنے بھی چلا گیا تھا۔ اگر کسی طرح وہ خبر اس کے علم میں نہ آتی یا وہ اس سے ملنے نہ جاتا تب سی آئی اے والے ہاسپٹل کے ذریعے اس سے رابطہ کرتے اور کہتے کہ پیٹرس ایباکا کی آخری خواہش ہے کہ وہ سالار سکندر سے ملنا چاہتا ہے۔ لیکن انہیں پلان B کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ سالار' ایباکا کو دیکھنے چلا گیا تھا اور ہاسپٹل میں آنے جانے میں اسے تقریباً" دو گھنٹے لگے تھے اور سی آئی اے کو اتنا ہی وقت چاہیے تھا۔ اس کے کمرے سے لیپ ٹاپ سمیت ہر اس چیز کا صفایا کرنے کے لیے جسے وہ کام کی سمجھتے تھے سالار کو کسی اور کام کے لیے کمرے سے اتنی دیر تک باہر رکھنا ان

کے لیے مشکل تھا کہ وہ اپنا لیپ ٹاپ تو ساتھ رکھتا تھا۔ لیکن ہاسپٹل جاتے ہوئے انہیں توقع تھی وہ سب کچھ وہیں چھوڑ کر جائے گا۔

سب کچھ ویسے ہی ہوا تھا جیسے ان کا پلان تھا لیکن نتیجہ وہ نہیں نکلا تھا جس کی انہیں توقع تھی۔

وہ ویڈیو انہیں لے ڈوبی تھی۔ کوئی بھی اس ویڈیو میں نظر آنے والے چہرے کے نقوش کو بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ اتنے واضح تھے اور اس ویڈیو میں دوسری سب سے نمایاں چیز وہ وقت اور تاریخ تھی جو اسکرین پر نیچے آرہی تھی۔ وہ اس پیٹرس ایباکا کی شناخت نہیں بدل سکتے تھے اور وہ واشنگٹن کے ہاسپٹل میں بظاہر حادثے میں زخمی ہو کر آنے اور مرنے والے ایباکا کی شناخت بھی نہیں بدل سکتے تھے۔ وہ نیوز چینلز پر ایباکا کی تصویریں نہ چلوا چکے ہوتے اس حادثے کے فوراً" بعد شدید زخمی فرد کے طور پر۔ تو شاید سی آئی اے یہی کرتی اور ایباکا کو واشنگٹن کے اس ہاسپٹل سے فوری طور پر واپس نیویارک منتقل کر دیا جاتا لیکن وہ ایک غلطی کے بعد صرف دوسری نہیں تیسری اور چوتھی غلطی بھی کر بیٹھے تھے۔

اس جلتی آگ کو بجھانے کی کوششیں بہت جلد شروع کر دی گئی تھیں۔ انہوں نے یوٹیوب سے اس ویڈیو کو ہٹانے کی کوششیں شروع کر دیں' وہ اسے بلاک نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ شور شرابے کو بڑھاتا لیکن وہ بار بار اپ لوڈ ہونے والے لنکس کو مٹا رہے تھے اور اس میں کوشش کے باوجود ناکام ہو رہے تھے۔ سی آئی اے کی بلاگر ٹیم مختلف لنکس پر آنے والے تبصروں میں سیاہ فام بن کر ایسی پوسٹ کر رہے تھے جو یہ ظاہر کرتا کہ یہ کوئی نسلی تعصب ہو سکتا ہے۔ پیٹرس ایباکا کو مارنے میں کم از کم سی آئی اے یا ایف بی آئی جیسی کوئی ایجنسی ملوث نہیں ہو سکتی تھی' وہ بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹا نقصان کرنے پر تیار تھے مگر یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ وہ معاملہ قومی سطح کا نہیں رہا تھا۔ وہ آگ امریکا سے کانگو تک پہنچ گئی تھی۔

اینڈرسن کوپر کی ٹیم نے پیٹرس ایباکا کی مشکوک حالت میں موت کے بعد ان پیغامات اور ای میلز کو اور اس ویڈیو میں نظر آنے والے وقت کو چیک کیا تھا۔ وہ سب پیغامات اور ای میلز جن میں ایباکا نے کوپر کے شو میں شرکت سے معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ کسی قسم کی معاونت سے بھی انکار کیا تھا وہ اس ویڈیو کے دو گھنٹے بعد کے میسج تھے اور اس وقت کے جب نیویارک کے ہاسپٹل میں ایباکا کی سرجری ہو رہی تھی اور ایسے پیغامات صرف کوپر ہی کو نہیں ان دوسرے پروگرامز کے میزبانوں کو بھی کیے گئے تھے یا صحافیوں کو جن سے ایباکا پچھلے کچھ دنوں سے مل رہا تھا اور ہگمیز کے مسئلے کو سامنے لانے کی درخواست کر رہا تھا۔

اینڈرسن کوپر نے ایک نیوز پروگرام میں پیٹرس کے ان پیغامات اور اس ویڈیو کی ٹائمنگ کو پوائنٹ آؤٹ کیا تھا اور پھر اس نے نیویارک اور واشنگٹن کے دو ہاسپٹلز کے معتبر ذرائع کا حوالہ دیتے ہوئے یہ راز کھول دیا تھا کہ ان دونوں ہاسپٹلز میں اسے داخل کرنے والے سی آئی اے سے تعلق رکھتے تھے۔

پیٹرس ایباکا کی موت کی وجہ کیا ہو سکتی تھی... کون اسے مار سکتا تھا اور کیوں مار سکتا تھا۔ اس کو صرف وہ شخص بتا سکتا تھا جس کا نام ایباکا کوپر کے سامنے کئی بار لے چکا تھا... جو واشنگٹن میں اس سے ملنے کے لیے آنے والا واحد ملاقاتی تھا... اور جس نے اپنی شناخت ایباکا کے رشتہ دار کے طور پر ظاہر کی تھی... امریکہ کے ہر نیوز چینل پر اس رات سالار سکندر کا نام اس حوالے سے چل رہا تھا اور ہر کوئی سالار سے رابطہ کرنے میں ناکام تھا۔



اور اس رات اپنے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے ان تمام نیوز چینلز کی کوریج ماؤف دماغ کے ساتھ سالار بھی دیکھ رہا تھا... سی آئی اے بھی دیکھ رہی تھی... اور ورلڈ بینک کے وہ سارے کرتا دھرتا بھی جو دو دن سے سالار

سکندر کو ہراساں کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگائے بیٹھے تھے۔

پیٹرس ایباکا کو اس ویڈیو میں نشانہ بنتے دیکھ کر سالار کو اس رات یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کی فیملی زندہ نہیں تھی۔ وہ لوگ اگر ایباکا کو مار سکتے تھے اور اس طرح مار سکتے تھے تو وہ اور اس کی فیملی کیا شے تھی اور اگر اس رات اسے کسی چیز میں دلچسپی تھی تو وہ اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی زندگی تھی... اور کچھ نہیں۔ اپنا آپ بھی نہیں...

اور سی آئی اے میں اس آپریشن کو کرنے والے لوگ اس رات صرف ایک بات سوچ رہے تھے... انہیں سالار سکندر کا کیا کرنا تھا... ؟ زندہ رکھنا تھا... مار دینا تھا... زندہ رکھنا تھا تو پھر اس کی کھلنے والی وہ زبان کیسے بند رکھتے جو ورلڈ بینک سمیت بہت سے دارالحکومتوں میں بھونچال برپا کر دیتی... مار دیتے تو کیسے مارتے... کہ اس کی موت پیٹرس ایباکا کی طرح سی آئی اے کے منہ پر ایک اور بدنامی کے دھبے کا اضافہ کرتی۔ یا پھر وہ کنشاسا میں موجود اس کی بیوی اور بچوں کی زندگی کے ذریعے اسے بلیک میل کرتے۔ قید میں وہ اسے رکھ نہیں سکتے تھے۔ ہمیشہ کے لیے وہ اس کے رابطوں کے ذرائع بھی بند نہیں کر سکتے تھے۔ زندگی یا موت؟... زندگی؟ موت؟ ٹیبل ٹینس کی گیند کی طرح ہاں یا نہیں کے کورٹس میں گھوم رہی تھی زندگی۔

پھر فیصلہ ہو گیا تھا لیکن وہ سی آئی اے نے نہیں کیا تھا۔ کانگو کے عوام نے کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

چار سالہ جبریل نے اپنے خاندان کو درپیش آنے والے اس بحران میں جو رول ادا کیا تھا' وہ اس نے زندگی میں کئی بار ادا کرنا تھا۔ یہ اس ننھے سے بچے کو تب علم نہیں تھا۔ اسے پتا تھا اس کی ماں تکلیف میں تھی' اسے یہ بھی پتا تھا کہ اس کی ماں ایک بے بی لینے جا رہی تھی جو ایک لڑکا تھا اور اسے یہ بھی پتا تھا کہ اس کی ماں نے ہمیشہ کی طرح دو سالہ عنایہ کی ذمہ داری اس کو سونپی تھی۔

امامہ کے جانے کے بعد ہیڈی کو اچانک خیال آیا تھا کہ امامہ اسے گھر سے کچھ چیزیں لانے کا کہہ کر گئی تھی جو نوزائیدہ بچے اور اس کے لیے ایک بیگ میں گھر پر پہلے ہی پیک کر کے رکھی ہوئی تھیں اور ہیڈی سے ان دونوں بچوں کے لیے کھانے پینے اور ان کے کپڑوں کے لیے بھی کہہ کر گئی تھی کیونکہ اسے بچوں کو گھر واپس نہیں بھیجنا تھا جب تک سالار نہ آجاتا۔ اس نے ہیڈی سے کہا تھا وہ ان بچوں کو ہاسپٹل میں ہی کسی فی میل اٹینڈنٹ کے پاس چھوڑ کر گھر سے یہ چیزیں لے آئے یا پھر گھر میں موجود کسی اور ملازم کی مدد لے لیکن وہ بچوں کو کہیں نہیں لے جائے گی۔

ہیڈی کو امامہ کی یہ ہدایات یاد نہیں رہی تھیں۔ ان کا گھر وہاں سے صرف دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا اور ہیڈی نے سوچا تھا۔ وہ یہاں ان بچوں کو اکیلا چھوڑنے کے بجائے ان کو اپنے ساتھ ہی لے جائے گی اور واپس لے آئے گی۔

جبریل نے ساتھ لے جانے کی اس کوشش کے جواب میں صاف انکار کرتے ہوئے اسے یاد دلایا تھا کہ ممی نے اس سے کہا تھا وہ وہیں رہیں گے۔ وہ انہیں ساتھ نہیں لے جائے گی۔ ہیڈی کو یاد آگیا تھا اور اس نے دوبارہ اصرار نہیں کیا تھا۔ وہ جبریل کو بہت اچھی طرح جانتی تھی... چار سال کی عمر میں بھی وہ بچہ کسی طوطے کی طرح ماں باپ کی باتیں رٹ کر پھر وہی کرتا تھا اور مجال تھی کہ وہ کسی دوسرے کی باتوں میں آکر امامہ یا سالار کی طرف سے ملنے والی ہدایات فراموش کر دیتا۔ ہیڈی انہیں امامہ کی ڈاکٹر کی ایک اسسٹنٹ کے پاس چھوڑ کر فوری طور پر گھر چلی گئی تھی۔

اس کی عدم موجودگی میں عنایہ کو نیند آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر کی اسسٹنٹ نے نیند میں جھومتی ہوئی دو سال کی اس بچی کو اٹھا کر ایک بینچ پر لٹانے کی کوشش کی اور جبریل نے اسے روک دیا۔ وہ وہاں سے عنایہ سمیت ہٹنا نہیں چاہتا تھا جہاں ہیڈی اسے بٹھا کر گئی تھی اور جہاں اسسٹنٹ عنایہ کو لے کر جا کر لٹانا چاہتی تھی۔ وہ ایک بغلی کمرہ تھا...

چار سال کا وہ بچہ اپنی دو سالہ بہن کے ساتھ وہیں پبلک میں بیٹھے رہنا چاہتا تھا کیونکہ اسے پتا تھا کسی اجنبی کے

ساتھ نہیں نہیں جانا چاہیے۔ کسی ایسی جگہ جو دور ہوتی..... اسسٹنٹ کچھ حیران ہو کر واپس اپنی ٹیبل پر گئی تھی۔ وہ ایک انٹرسٹنگ بچہ تھا۔ اس نے اپنی کرسی پر بیٹھے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔ دو سالہ عنایہ اب جبریل کی گود میں سر رکھے سو رہی تھی اور وہ بے حد چوکنا بیٹھا بہن کے سر کو اپنے ننھے ننھے بازوؤں کے حلقے میں لیے ملاقاتی کمرے میں آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور تب وہ عورت ان دونوں کے برابر میں آکر بیٹھی اور اس نے جبریل کو ایک مسکراہٹ دیتے ہوئے اس کا سر تھپتھپایا اور جواباً "اس بچے کے تاثرات نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے یہ بے تکلفی اچھی نہیں لگی ہے۔ اس عورت نے دوسری بار سوئی ہوئی عنایہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے کی کوشش کی تو اس بار جبریل نے اس کا ہاتھ بڑی نرمی سے پرے کرتے ہوئے سرگوشی میں اس سے کہا۔

" She is sleeping(یہ سو رہی ہے)"

"اوہ سوری!" امریکن عورت بظاہر شرمندگی ظاہر کرتے ہوئے اسے دیکھ کر مسکرائی' جبریل نے ایک بار پھر سپاٹ چہرے اور اس کی طرف دیکھے بغیر اس کی مسکراہٹ نظر انداز کی۔

اس عورت نے اپنا پرس کھول کر اس کے اندر سے چاکلیٹ کی ایک بار نکال کر جبریل کی طرف بڑھائی۔

"نو تھینکس" جواب چاکلیٹ آگے بڑھائے جانے سے بھی پہلے آگیا تھا۔

"میرے پاس کچھ کھلونے ہیں۔" اس بار اس عورت نے زمین پر رکھے ایک بیگ سے ایک اسٹفڈ کھلونا نکال کر جبریل کی طرف بڑھایا اس کی سرد مہری کی دیوار توڑنے کی یہ اگلی کوشش تھی۔ جبریل نے اس کھلونے پر ایک نظر ڈالے بغیر بہت شائستگی سے اس سے کہا۔

" Would you please stop bothering us"

(آپ ہمیں تنگ کرنا بند کریں گی پلیز)

ایک لمحہ کے لیے وہ عورت چپ ہی رہ گئی تھی یہ جیسے شٹ اپ کال تھی اس کے لیے مگر وہ وہاں منہ بند کرنے کے لیے نہیں آئی تھی۔ انہیں ان دونوں بچوں کو وہاں سے لے جانا تھا اور ان کا خیال تھا۔ آتے جاتے ملاقاتیوں میں دو کم سن بچوں کو بہلا پھسلا کر وہاں سے لے جانا کیا مشکل تھا۔ زور زبردستی وہ اتنے لوگوں کے سامنے عنایہ کے ساتھ کر سکتے تھے جبریل کے ساتھ نہیں۔

وہ اب منتظر تھی کہ عنایہ کی طرح وہ چار سالہ بچہ بھی تھک کر سو جائے پھر شاید ان کو کسی طرح وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔ لیکن اسے جبریل کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا سونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ دس پندرہ منٹ بیٹھے رہنے کے بعد وہاں سے اٹھ گئی تھی اسے ان بچوں کے حوالے سے نئی ہدایات لینی تھیں اور پانچ منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو پیڈی وہاں ان دونوں کے پاس موجود تھی۔

وہ عورت ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی تھی۔ وہ ان دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے' صرف اپنی نگرانی میں رکھنا چاہتے تھے جب تک امریکہ میں سالار کے ساتھ معاملات طے نہ ہو جاتے۔

امریکہ میں سالار کو اس کی فیملی کے حوالے سے صاف جواب دینے کے باوجود سی آئی اے اس کی فیملی پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ وہ عورت ایک بار پھر اس وزیٹرز روم میں کہیں اور بیٹھ گئی تھی۔ عنایہ اب جاگ گئی تھی اور باتھ روم جانا چاہتی تھی۔ پیڈی اسے باتھ روم لے کر جانا چاہتی تھی۔ اس نے جبریل کو ایک بار پھر وہیں ٹھہرنے کا کہا تھا۔ وہ نہیں ٹھہرا تھا۔ وہ کسی طرح بھی عنایہ کو اپنی آنکھوں سے اوجھل کرنے پر تیار نہیں تھا۔ پیڈی کو اسے بھی باتھ روم لے جانا پڑا تھا۔ وہ عورت بھی اٹھ کر ان کے پیچھے باتھ روم آئی تھی اور جبریل نے اس عورت کو ایک بار پھر نوٹس کیا تھا۔

" Why are yor stalking us"

(تم ہمارے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہو۔)

واش بیسن میں ہاتھ دھونے میں مصروف وہ عورت قریبی بیسن میں ہاتھ دھوتی ہیڈی کے ساتھ کھڑے اس بچے کا جملہ سن کر جیسے ایڑیوں پر گھومی تھی۔ نہ بھی گھومتی تو بھی اسے اندازہ تھا وہ بچہ اسے ہی مخاطب کر رہا تھا۔ ہیڈی نے اس عورت کو دیکھا اور معذرت خواہانہ انداز سے مسکرائی یوں جیسے وہ جبریل کے اس تبصرے سے متفق نہیں تھی۔ لیکن جبریل اسی ناخوش گوار انداز میں اس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ پینتالیس سال کی اس عورت نے مسکراتے ہوئے اس چار سال کے بچے کو سراہا تھا۔ وہ پہلی بار ایک چار سال کے بچے کے ہاتھوں پسپا ہوئی تھی اور وہ اسے سراہے بغیر نہیں رہ سکی تھی وہ جن بھی ماں باپ کی اولاد تھا۔ کمال تربیت ہوئی تھی اس کی۔

ہیڈی ان دونوں کو لے کر وہاں سے چلی گئی تھی لیکن وہ عورت نہیں گئی تھی وہ ایک بار پھر اس بچے سے وہ جملہ نہیں سننا چاہتی تھی جو اس نے کچھ دیر پہلے سنا تھا۔ بہتر تھا اسے بھیجنے والے اس کی جگہ کسی اور کو بھیج دیتے۔

ہیڈی امامہ سے ڈیڑھ گھنٹے بعد بھی نہیں مل سکی تھی کیونکہ ڈاکٹر نے کہا تھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ آپریشن ٹھیک ہوا تھا لیکن اسے ابھی خواب آور دوا میں دی جا رہی تھیں۔ ہیڈی نے امامہ کے فون سے بار بار سالار کو کال کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام ہونے کے بعد اسے اپنے نمبر سے بھی کال کی تھی۔ وہ اسے اس کے بیٹے کی خوش خبری دینا چاہتی تھی اور ساتھ یہ اطلاع بھی کہ اس کے دونوں بچے اس کے پاس تھے اور محفوظ تھے لیکن وہ رابطہ نہیں کر پائی تھی۔

ہیڈی نے بار بار امامہ سے بھی ملنے کی کوشش کی تھی اور اس کے بچوں کو بھی امامہ سے ملوانے کے لیے ڈاکٹر سے اصرار کیا تھا کیونکہ عنایہ اب بے قرار ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے ان کو بیٹر میں پڑا ہوا حمین تو دکھا دیا تھا لیکن امامہ تک رسائی نہیں دی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اسے دونوں بچوں کو اس کی تحویل میں دینے کا کہا تھا اور ہمیشہ کی طرح جبریل اڑ گیا تھا۔ نیند سے بوجھل آنکھوں اور تھکاوٹ کے باوجود وہ عنایہ کا ہاتھ پکڑے بیٹھا ہوا تھا کیونکہ ممی نے اسے عنایہ کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ اس نے انکوبیٹر میں وہ بے بی بوائے بھی دیکھ لیا تھا جسے ممی لینے گئی تھیں لیکن ممی کہاں تھیں؟ یہ سوال اب صرف اسے ہی نہیں ہیڈی کو بھی پریشان کر رہا تھا وہ اب کنشاسا میں سالار کے آفس کے ذریعے اس سے رابطہ کرنے میں مصروف تھی لیکن سالار غائب تھا اور کانگو میں ورلڈ بینک پر قیامت ٹوٹنے والی تھی صرف ورلڈ بینک پر نہیں ان مغربی اقوام کے نمائندوں پر بھی جو کانگو میں استعماریت کے ستون بنے بیٹھے تھے۔



پیٹرس ایباکا اپنی موت کے چوبیس گھنٹوں میں ہی صرف کانگو کے پگمیز کا نہیں پورے افریقہ کا ہیرو بن گیا تھا اس خطے نے آج تک صرف بکنے والے حکمران دیکھے تھے جو اربوں ڈالرز کے کمیشن لے کر اپنے ملک کی ہر چیز بیچنے کے لیے ہر وقت تیار بیٹھے تھے اس خطے نے "ہیرو" پہلی بار دیکھا تھا۔ جان دینے والا ہیرو۔ پیٹرس ایباکا ساری زندگی پرامن طریقوں سے جدوجہد کرتا اور اس کا درس دیتا رہا تھا لیکن اپنی موت کے بعد اس کی جو وصیت منظر عام پر آئی تھی اس میں اس نے پہلی بار اپنی غیر متوقع اور غیر فطری موت کی صورت میں اپنے لوگوں کو لڑنے کے لیے اکسایا تھا اس جنگل کو بچانے کے لیے انہیں سفید فاموں کو مار بھگانا تھا چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔

اپنی اسی وصیت میں اس نے ورلڈ بینک، امریکہ اور ان دوسری عالمی طاقتوں کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے انہیں ان سب کے خلاف "جہاد" کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ مسلمان نہیں تھا لیکن مذاہب کا تقابلی جائزہ لیتا رہا تھا۔ اور اسے اپنے لوگوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور ظلم کے خلاف بغاوت کے لیے "جہاد" سے زیادہ موزوں

لفظ نہیں ملا تھا۔ اس نے صرف پگمیز کو مخاطب کیا تھا صرف انہیں جنگلوں سے نکل کر شہروں میں آکر لڑنے کے لیے کہا تھا۔ ورلڈ بینک اور ان آرگنائزیشنز کے ہر دفتر پر حملہ کرکے وہاں کام کرنے والوں کو مار بھگانے کا کہا تھا لیکن اس رات وہ صرف پگمیز نہیں تھے جو جوایبا کا کی کال پر ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ غیر ملکی آرگنائزیشنز پر چڑھ دوڑے تھے۔ وہ کانگو کے استعماریت کے ہاتھوں سالوں سے استحصال کا شکار ہوتے ہوئے عوام تھے جو باہر نکل آئے تھے۔

کنشاسا میں اس رات کنشاسا کی تاریخ کے وہ سب سے بڑے فسادات ہوئے تھے جن میں کوئی سیاہ فام نہیں صرف سفید فام مارے گئے تھے۔ ورلڈ بینک کے آفسوں پر حملہ کرکے انہیں لوٹنے کے بعد آگ لگادی گئی تھی۔ اور یہ سلسلہ صرف وہیں تک نہیں رکا تھا۔ ورلڈ بینک کے حکام کی رہائش گاہوں پر بھی حملے لوٹ مار اور قتل و غارت ہوئی تھی اور ان میں سالار سکندر کا گھر بھی تھا۔ وہ سالار سکندر کا گھر نہیں تھا جسے آگ لگائی گئی تھی' وہ ورلڈ بینک کے سربراہ کا گھر تھا جسے ہجوم نے اس رات تباہ کیا تھا۔ کانگو میں اس رات ڈیڑھ سو کے قریب امریکیوں اور یورپ کے لوگوں کو مار دیا گیا تھا اور ان میں اکثریت ورلڈ بینک اور دوسری عالمی تنظیموں میں کام کرنے والے افراد اور ان کے خاندان کے افراد کی تھی۔

ورلڈ بینک کے چالیس افراد ان فسادات میں مرے تھے اور یہ چالیس لوگ نچلے عہدوں پر کام کرنے والے لوگ نہیں تھے' وہ ورلڈ بینک کی سینئر اور جونیئر مینجمنٹ تھی۔ اپنی اپنی فیلڈ کے ماہر نامور لوگ۔ جو کئی سالوں سے اس بینک اور اس کے مختلف آپریشنز اور پروجیکٹس سے منسلک تھے اور جو کانگو میں اس ادارے کے ستونوں کے طور پر کانگو کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔

ورلڈ بینک کی تاریخ میں پہلی بار ورلڈ بینک کے خلاف فسادات اور اس کے عملے کا قتل عام کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے دنیا میں ورلڈ بینک کے افسران کو صرف انڈے' ٹماٹر مار کر یا ان کے چہروں اور کپڑوں پر سرخ رنگ پھینک کر احتجاج کیا جاتا رہا تھا اور وہ احتجاج کسی اثر اور تبدیلی کے بغیر ختم ہو جاتا تھا۔ وہ مہذب دنیا میں رہنے والوں کا احتجاج تھا۔ یہ اس غیر مہذب دنیا میں رہنے والوں کا احتجاج تھا جنہیں مہذب دنیا انسانوں سے کمتر سمجھ کر رکھتی تھی۔

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ' ورلڈ بینک اور سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز میں آپریشن روم کی دیواروں پر لگی اسکرینوں پر تینوں اداروں کے سینئر حکام صرف دم سادھے بے بسی کے ساتھ کانگو کے مختلف علاقوں میں ہونے والے ان فسادات کے مناظر کو دیکھ رہے تھے ان کو بچانے کی کوششیں ہو رہی تھیں لیکن فوری طور پر کوئی بھی کانگو کے ان فسادات میں عملی طور پر نہیں کود سکتا تھا' وہ زیادہ نقصان دہ ہوتا ورلڈ بینک اور دوسرے اداروں کا۔ جو جانی اور مالی نقصان ہوا تھا' وہ پورا کر لیا جاتا لیکن جو ساکھ اور نام ڈوبا تھا' اسے دوبارہ بحال کرنے کے لیے کوئی معجزہ چاہیے تھا۔

ان فسادات کے آغاز سے بالکل پہلے اینڈرسن کوپر نے پیٹرس ایباکا کے ساتھ ہونے والے اس آف کیمرہ سیشن کو اپنے پروگرام میں چلادیا تھا تب تک اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس رات کانگو میں کیا ہونے والا تھا اگر اسے یا سی آئی اے کو اس کا رتی بھر بھی اندازہ ہوتا تو وہ ٹیپ شدہ چیزیں بھی نہیں چلتیں۔ اس آف کیمرہ سیشن میں پیٹرس ایباکا نے امریکہ اور ورلڈ بینک پر شدید تنقید کرتے ہوئے انہیں گدھ اور ڈاکو قرار دیا تھا۔ جو کانگو کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ اور کوئی ان کا ہاتھ روک نہیں پا رہا تھا۔

پیٹرس ایباکا کا وہ آخری انٹرویو افریقہ میں لوگوں نے اسٹیڈیم اور چوکوں پر روتے ہوئے بڑی اسکرینوں پر سنا تھا اور اس کی گفتگو میں ورلڈ بینک کے صرف ایک عہدے دار کی تعریف تھی جو ورلڈ بینک کو اس پروجیکٹ کی انکوائری پر مجبور کر رہا تھا اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ اس پروجیکٹ اور ورلڈ بینک کو چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ پیٹرس ایباکا نے اس انٹرویو میں پہلی بار اپنی زندگی کو لاحق خطرات کی بھی بات کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ طاقتیں

جو اسے مار ڈالنا چاہتی ہیں وہ سالار سکندر کو بھی مار ڈالیں گی۔
سالار سکندر کا نام پیٹرس ایباکا کے بعد ایک رات میں افریقہ میں زبان زد عام ہو گیا تھا۔ افریقہ میں ویسی شہرت اور ویسا تعارف پہلی بار کسی غیر ملکی کو نصیب ہوا تھا اور وہ "غیر ملکی" اس وقت واشنگٹن میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں ٹی وی پر یہ سب دیکھ رہا تھا پھر بار بار ہوٹل سے باہر جا کر پاکستان فون کر کے اپنی فیملی کے بارے میں پتا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کاش اسے وہ نام وری نہ ملتی' اس نے سوچا تھا۔
اینڈرسن کوپر کا انٹرویو نشر ہونے کے دو گھنٹے کے اندر کانگو میں فسادات شروع ہو چکے تھے اور سالار سکندر نے ان فسادات کے مناظر بھی ٹی وی پر لائیو دیکھے تھے۔ ورلڈ بینک کے دفاتر میں لوٹ مار اور آگ لگانے کے منظر بھی اس فوٹیج کا حصہ تھے اور افسران کے رہائشی علاقوں میں گھروں پر حملے کے مناظر بھی۔ نیوز چینلز یہ بتا رہے تھے کہ کنٹری ہیڈ سمیت سارے گھروں کو لوٹا گیا تھا اور ان بہت سے گھروں میں اموات بھی ہوئی تھیں۔ کچھ میں افسران کی بیویوں پر حملے ہوئے تھے۔ کچھ میں ان کے بچے مارے گئے تھے۔
ٹی وی پر وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے وہ شدید پریشان تھا۔ وہ سب ہو جانے کے باوجود بھی جو ورلڈ بینک کے افسران نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ اسے اگر پہلے سے یہ پتا نہ چل چکا ہوتا کہ امامہ اور اس کے بچے گھر پر نہیں تھے تو وہ کبھی بھی اس بیڈ روم میں بیٹھا یہ مناظر نہیں دیکھ پاتا۔ لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ کبھی کبھی دشمن کا سب سے بڑا وار آپ کی بقا کا باعث بن جاتا ہے۔ امامہ اور اس کے بچوں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ سی آئی اے نے انہیں صرف اس لیے اس گھر سے غائب رکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ امامہ سے سالار کی فیملی یا آفس کا بھی کوئی شخص رابطہ نہ کر سکے اور حمین کی تین ہفتے ـــــ قبل از وقت پیدائش جیسے امامہ اور اس کے بچوں کی زندگی بچنے کا باعث بن گئی تھی پر اس وقت سالار کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔
بے شک اللہ سب سے بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ اور بے شک ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔ ہر مشکل کے بعد آسانی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میرے بچے کہاں ہیں؟" اس نے اٹینڈنٹ کی شکل دیکھتے ہی ہوش و حواس سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔
"وہ کچھ دیر میں آپ کے پاس آجائیں گے.... آپ کو فوری طور پر اس ہاسپٹل سے کہیں منتقل کرنا ہے۔"
اٹینڈنٹ نے بے حد مؤدب انداز میں اس سے کہا تھا۔ امامہ نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تھی اور بے اختیار کراہ کر رہ گئی تھی.... زخم والی جگہ اب سن نہیں رہی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے کوئی خنجر کسی نے یک دم اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں گھونپا تھا۔ اٹینڈنٹ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے واپس لٹانے میں مدد کی اور اسے لٹانے کے بعد سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی اس ٹرے میں سے ایک انجکشن اٹھا کر سرنج میں بھرنا شروع کیا جو وہ لائی تھی۔
"مجھے کوئی انجکشن نہیں لگوانا' مجھے اپنے بچوں کو دیکھنا ہے۔ امامہ نے بے حد ترشی سے اس سے کہا تھا۔
"یہ آپ کی تکلیف کم کر دے گا۔ آپ کی حالت ابھی ٹھیک نہیں ہے اٹینڈنٹ نے کہتے ہوئے گلوکوز کی بوتل میں سرنج کی سوئی گھونپ دی۔
امامہ نے اپنے ہاتھ کی پشت پر ٹیپ کے ساتھ چپکائی ہوئی سرنج نکال دی۔
"مجھے فی الحال کسی میڈیسن کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنے بچوں سے ملنا ہے اور اپنے شوہر سے بات کرنی ہے۔"

وہ اس بار زخم کی تکلیف کو نظرانداز کرتے ہوئے اٹھ بیٹھی تھی اور اس نے اٹینڈنٹ کا ہاتھ بھی جھٹک دیا۔ تھا وہ اٹینڈنٹ کچھ دیر چپ کھڑی رہی تھی پھر وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

اس کی واپسی آدھ گھنٹے کے بعد پیڈی، جبریل اور عنایہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلتے ہی ماں پر پہلی نظر پڑتے ہی جبریل اور عنایہ شور مچاتے ہوئے اس کی طرف آئے تھے اور اس کے بستر پر چڑھ کر اس سے لپٹ گئے تھے۔ وہ ڈیڑھ دن کے بعد ماں کو دیکھ رہے تھے۔ پیڈی بھی بے اختیار لپک کر اس کے پاس آئی تھی۔ ڈیڑھ دن سے امامہ کو نہ دیکھنے پر اور ڈاکٹرز کی بار بار کی لیت و لعل پر امامہ کے حوالے سے اس کے ذہن میں عجیب و غریب وہم آ رہے تھے اور اب امامہ کو بخیریت دیکھ کر وہ بھی جذباتی ہوئے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

"تم نے سالار کو اطلاع دی؟" امامہ نے پیڈی کو دیکھتے ہی اس سے پوچھا تھا۔

"میں کل سے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن ان کا نمبر نہیں مل رہا۔ میں نے ان کے آفس اسٹاف سے بھی رابطہ کیا ہے لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ سالار صاحب کے ساتھ ان کا بھی رابطہ نہیں ہو رہا۔"

امامہ کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ وہ پیڈی کا پہلا جملہ تھا جس نے اسے چونکایا تھا۔

"کل؟" وہ بڑبڑائی "آج کیا تاریخ ہے؟"

اس نے پیڈی سے پوچھا اور پیڈی نے جو تاریخ بتائی وہ اس دن کی نہیں تھی جس دن وہ ہاسپٹل میں آئی تھی۔ وہ پچھلی دوپہر کو ہاسپٹل آئی تھی اور اس وقت اگلی رات ہو چکی تھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا، وہ اتنے لمبے عرصہ تک خواب آور ادویات کے زیر اثر رکھی گئی تھی۔۔۔ اور کل سے سالار نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ امریکہ تو کل ہی پہنچ چکا تھا پھر اس سے رابطہ کیوں نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے پیڈی سے اپنا بیگ لے کر اس میں سے فون نکال کر اس پر کال کی کوشش کی۔۔۔

اٹینڈنٹ نے اسے بتایا کہ ہاسپٹل میں اس حصے میں سگنلز نہیں آتے تھے۔ وہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اپنے سیل فون پر اس نے سب chat apps اور ٹیکسٹ میسجز چیک کر لیے تھے۔ کل سے آج تک اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس وقت سے لے کر جب وہ ہاسپٹل آئی تھی اب تک۔۔۔

بے حد تشویش لاحق ہونے کے باوجود امامہ نے یہی سمجھا تھا کہ ہاسپٹل میں سگنلز کے ایشوز کی وجہ سے وہ کوئی کال یا ٹیکسٹ ریسیو نہیں کر سکی۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ پیڈی سے کچھ اور پوچھتی۔ پیڈی نے اسے کانگو میں ہونے والے فسادات کے بارے میں بتایا تھا اور ساتھ یہ بھی کہ گومبے میں ان کے گھر پر بھی حملہ کیا گیا تھا۔ امامہ سکتے میں رہ گئی تھی پیڈی کے پاس تفصیلات نہیں تھیں کیونکہ وہ ایک بار ہاسپٹل سے نکلنے کے بعد دوبارہ بچوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں گئی تھی۔ اس کے پاس جو بھی خبریں تھیں، وہ اس کے خاندان کے افراد کی طرف سے فون پر ملی تھیں یا پھر ہاسپٹل میں لگے ٹی وی سیٹ پر نشر ہونے والی نیوز سے۔۔۔

یہ وہ لمحہ تھا جب امامہ کو پہلی بار سالار کے حوالے سے بے قراری ہوئی تھی۔۔۔ پیٹرس ایباکا مارا گیا تھا تو سالار کہاں تھا۔۔۔؟ وہ بھی تو واشنگٹن میں تھا۔۔۔ پیڈی نے اسے نیوز چینلز پر چلنے والی ساری خبریں بتائی تھیں۔۔۔ پیٹرس ایباکا کیسے مارا گیا اور کیسے اس کی موت سامنے آئی۔ اس سے آخری بار ملنے کے لیے جانے والا شخص سالار سکندر تھا اور سالار سکندر اس وقت سے غائب تھا۔

امامہ کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔۔۔ اس کا خیال تھا، اسے دنیا میں سب سے زیادہ محبت جبریل سے تھی پھر عنایہ سے پھر اپنی اس اولاد سے جس کو ایک دن پہلے اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ لیکن اب جب سالار یک دم اس کی زندگی سے کچھ دیر کے لیے عجیب طرح سے غائب ہوا تھا تو اس کے اوسان خطا ہونے لگے تھے۔

وہ جبریل اور عنایہ کو اسی طرح بستر پر چھوڑ کر درد سے بے حال ہوتے ہوئے بھی لڑکھڑاتے قدموں سے فون لیے

کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ اسے ہاسپٹل میں اس جگہ جانا تھا جہاں سے وہ کال کر سکتی اور اس سے بات کر سکتی۔ اسے اس گھر کے تباہ برباد ہونے کا بھی خیال نہیں آیا تھا جس میں ہونے والی لوٹ مار کے بارے میں ہیڈی نے اسے کچھ دیر پہلے بتایا تھا۔۔۔ گھر' بچے سب کچھ یک دم اس ایک شخص کے سامنے بے معنی ہو گیا تھا جو اس کا سائبان تھا جو زندگی کی دھوپ میں اس کے لیے تب چھاؤں بنا تھا جب اس کا وجود حدّت سے جھلس رہا تھا۔ پاؤں آبلہ پا ہو گئے تھے۔

اٹینڈنٹ اور ہیڈی نے اسے روکنے اور پیچھے آنے کی کوشش کی وہ نہیں رکی۔ اس نے ہیڈی کو اپنے پیچھے نہیں آنے دیا اسے بچوں کے پاس رکنے کے لیے کہا۔ وہ ننگے پاؤں پھوڑے کی طرح دکھتے جسم کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے کوریڈور میں نکل آئی تھی۔

سالار وہاں ہوتا تو اس حالت میں اسے بستر سے ہلنے بھی نہ دیتا لیکن سارا مسئلہ یہی تو تھا کہ' سالار وہاں نہیں تھا اور وہ اسے پانے کے لیے بے حال ہو رہی تھی۔ ہاسپٹل میں کوئی ایسی جگہ ڈھونڈتی جہاں سگنل آجاتے جہاں سے وہ سالار سے بات کر پاتی۔ اس کی آواز سن لیتی۔

اس کا جسم ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ یہ موسم نہیں تھا جو اسے لرزا رہا تھا۔ خوف تھا جو رگوں میں خون جما رہا تھا۔۔۔ صرف ہاتھ نہیں تھے جو کپکپا رہے تھے۔۔۔ اس کا پورا جسم پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

"آپ کے شوہر بالکل ٹھیک ہیں۔ میں تھوڑی دیر میں ان سے آپ کی بات کرواتی ہوں۔"

امامہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتے چلتے ساکت ہوئی اور اٹینڈنٹ کی آواز پر پلٹی تھی۔ اور پھر وہاں کھڑے کھڑے جیسے موم کی طرح پگھلنے لگی تھی۔۔۔ زرد' کانپتی' ٹھٹھرتی بے آواز روتی۔۔۔ وہ ماں تھی' اپنے بچوں پر جان دے دینے والی۔۔۔ اور وہ رب تھا۔ اپنے بندوں کو ایسے کیسے چھوڑ دیتا' اس نے جس کو پکارا تھا۔ مدد کے لیے وہی آیا تھا۔

رحم اٹینڈنٹ کو اس کی حالت پر نہیں آیا تھا۔ اس برتر ذات کو اپنے بندے پر آیا تھا۔ اور وہ اپنے بندوں پر بلاشبہ بے حد شفقت کرنے والا ہے۔



سی آئی اے اور ورلڈ بینک کے ساتھ ساتھ امریکن گورنمنٹ کو ایک ہی وقت میں سالار کی ضرورت پڑی تھی۔ کانگو میں اگر کوئی اس وقت ورلڈ بینک کی عزت کو بحال کرنے کی پوزیشن میں تھا تو وہ سالار سکندر ہی تھا۔ اور یہ ایک دم ون مین شو بن گیا تھا۔ افریقہ میں جو آگ پیٹرس ایباکا کی موت نے لگائی تھی وہ سالار سکندر کی زندگی ہی بجھا سکتی تھی۔ فیصلہ تاخیر سے ہوا تھا۔ لیکن فیصلہ ہو گیا تھا۔

اس آپریشن کے تباہ کن نتائج نہ صرف سی آئی اے میں بہت سے لوگوں کی کرسی لے جانے والے تھے بلکہ ورلڈ بینک میں بھی بہت سے سر کٹنے والے تھے۔ تاج کہیں اور رکھا جانے والا تھا۔

سالار سکندر اس سب سے بے خبر ہوٹل کے اس کمرے میں اب بھی نیوز چینلز دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے اپنے باپ سے بات کر کے آیا تھا جنہوں نے اسے بتایا تھا کہ کانگو کے حالات کی وجہ سے فی الحال کانگو کی فلائٹس اور میڈیا دونوں دستیاب نہیں تھے۔ سالار سکندر کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ اس کا وہ غم گسار میگرین ایک بار پھر اس کا غم غلط کرنے آگیا تھا۔ وہ ہوٹل واپس آیا تھا۔ عجیب کیفیت میں۔ ٹی وی کے سامنے کھڑا وہ سالار سکندر سب سے چلنے والی خبروں' کانگو کے دل دہلا دینے والے مناظر کے ساتھ یوں دیکھتا رہا تھا جیسے وہ کوئی اور تھا نہ اس سالار سکندر سے اس کا کوئی تعلق تھا نہ کانگو سے۔ وہاں امامہ اور اپنی اولاد چھوڑ آنے والا بھی کوئی اور تھا۔ انہیں جنوں جانے والا بھی کوئی اور تھا۔

"What 'next to exstasy"

"آہ کیا سوال تھا۔ کیا یاد دلایا تھا۔ کیا یاد آیا تھا۔"

" Pain "(درد کا احساس)

" And What is naxt to Pain "

(اور درد کے بعد۔)

اتنے سال بعد ایک بار پھر وہ سوال و جواب اس کے ذہن میں چلنے لگے تھے۔ آخر کتنے موقعے آئے تھے اس کی زندگی میں اسے سمجھانے کہ اس کے بعد کچھ نہیں ہے۔ عدم وجود۔ خالی پن۔

اور وہ اسی عدم وجود کی کیفیت میں آ کھڑا ہوا تھا ایک بار پھر۔ زمین اور آسمان کے درمیان کسی ایسی جگہ معلق جہاں وہ نہ اوپر جا پا رہا تھا نہ نیچے آ پا رہا تھا۔

" And What is Naxt to NothingNess "

(اور اس عدم وجود، خالی پن کے بعد۔؟)

اس کا اپنا سوال ایک بار پھر اس کا منہ چڑانے آیا تھا۔

" Hell(جہنم) "

جہنم کوئی اور جگہ تھی کیا۔ اس نے جیسے بے اختیار کراہتے ہوئے سوچا۔

" And What is Next To Hell "

ہاں وہ اس کے بعد والی جگہ جانا چاہتا تھا۔ ان سب تکلیفوں، ان سب اذیتوں، ان سب آزمائشوں سے گزر کر۔ وہاں سے آگے۔ اور آگے۔ آگے جہاں جنت تھی۔ یا شاید اس لمحہ لگی تھی۔

دو دن کے بعد اس کا سیل فون جیسے نیند سے نہیں موت سے جاگا تھا۔ وہ میوزک اور وہ روشنی۔ اسے لگا وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ میوزک اس نے امامہ کی کالر آئی ڈی کے ساتھ محفوظ کیا ہوا تھا۔

If Tomorrow Never Comes

رونان کیٹنگ کے مشہور گانے کی کالر ٹیون۔

سیل فون پر اس کا مسکراتا چہرہ اور اس کا نام۔ سالار کو لگا تھا۔ وہ واقعی جنت میں کہیں تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کال ریسیو کی۔ لیکن ہیلو نہیں کہہ سکا۔ وہ امامہ نے کہا تھا۔ بے قرار آواز میں۔ وہ بول ہی نہیں سکا۔ سانس لے رہا تھا تو بڑی بات تھی۔ اپنے قدموں پر کھڑا تھا تو کمال تھا۔

وہ دوسری طرف سے بے قراری سے اس کا نام پکار رہی تھی۔ بار بار۔ سالار کا پورا وجود کانپنے لگا تھا۔ وہ آواز اسے ہرا کر رہی تھی۔ کسی بنجر سوکھے۔ ٹنڈ منڈ پیڑ پر بارش کے بعد بہار میں پھوٹنے والی سبز کونپلوں کی طرح۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا لیکن اس کے سامنے رو نہیں سکتا تھا۔ وہ مرد تھا۔ بولنا مشکل تھا۔ پر بولنا ضروری تھا۔

"امامہ!" اس نے اپنے حلق میں پھنسے ہوئے نام کو آزاد کیا تھا۔

دوسری طرف وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ وہ عورت تھی۔ یہ کام بڑی آسانی سے کر سکتی تھی کیونکہ اسے بہادری اور مردانگی کے جھنڈے نہیں گاڑتے ہوتے۔ وہ بے آواز رو تا رہا تھا۔ وہ دوزخ سے گزر کر آئے تھے اور کسی نے دوسرے سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ دوسرا کہاں تھا۔ کیوں رو رہا تھا۔

بے آواز روتے ہوئے سالار نے اسی طرح کھڑے کھڑے اس کمرے کے درمیان میں امامہ کی ہچکیاں اور سسکیاں سنتے اپنے جوتے اتارے تھے پھر وہ گھٹنوں کے بل سجدے میں جا گرا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا اللہ کہاں

تھا۔ اور کیسے سنتا تھا۔ اس کی شہ رگ کے پاس۔ اس سے بھی قریب۔
کئی سال پہلے وہ ریڈ لائٹ ایریا میں امامہ کے نہ ہونے پر اسی طرح ایک طوائف کے کوٹھے پر سجدے میں جا گرا تھا۔ آج وہ امامہ کے ہونے پر سجدے میں گرا تھا۔
بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ مشرق۔ مغرب۔ ہر چیز اس کی متاع ہے۔
وہ کن کہتا ہے اور چیزیں ہو جاتی ہیں۔
گمان سے آگے۔ بیان سے باہر۔
بے شک اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔
بے شک اللہ ہی سب سے طاقت ور ہے۔



"ہی از کیوٹ۔"
جبریل نے حمین پر ایک نظر ڈالنے کے بعد تین لفظوں میں بڑے محتاط اور "مفصل" انداز میں اپنے خاندان میں اس نئے اضافے پر تبصرہ کیا تھا۔ جو فی الحال اسی قسم کے انکوبیٹر میں تھا جس میں اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ اس کے برعکس عنایہ بڑے اشتیاق سے والہانہ انداز میں اس "چھوٹے بھائی" کو دیکھ رہی تھی جس کی آمد کے بارے میں وہ مہینوں سے سن رہی تھی اور جسے ایک پری پرستان سے ایک رات ان کے گھر چھوڑ کر جانے والی تھی۔
امامہ کی باتیں سن سن کر اسے چھوٹے بھائی سے زیادہ اس پری کو دیکھنے میں دلچسپی ہو گئی تھی جو ان کے گھر روز یہ دیکھنے آتی تھی کہ انہیں بھائی کی ضرورت تھی یا نہیں۔ وہ امامہ سے بھائی سے زیادہ پری کے بارے میں اشتیاق سے کرید کرید کر پوچھتی تھی۔ جبریل البتہ پاس بیٹھا اپنی اسٹوری بکس کے صفحے الٹتے پلٹتے ان دونوں کی گفتگو سنتا رہتا تھا۔ اس نے کبھی نہ بھائی کے بارے میں سوال کیا تھا نہ پری کے بارے میں۔ کیونکہ اسے پتا تھا "ممی" جھوٹ بول رہی تھیں۔ کیونکہ نہ پریاں ہوتی ہیں اور نہ بھائی کو پری نے لانا تھا۔ بھائی کو اسپتال سے آنا تھا۔ اور اسپتال خود جانا پڑے گا۔ اور وہ بھی کار سے سڑک کے ذریعہ اس اسپتال میں جہاں وہ ممی کے ساتھ جاتے تھے۔ لیکن اس نے اپنی یہ معلومات صرف عنایہ کے ساتھ تنہائی میں شیئر کی تھیں امامہ کے سامنے نہیں۔
"کیا ممی جھوٹ بولتی ہیں؟" عنایہ نے اس سے پوچھا۔
"نہیں۔ وہ جھوٹ نہیں بولتیں لیکن تم چھوٹی ہو اس لیے وہ تم سے یہ کہتی ہیں۔"
اس نے بڑے مدبرانہ انداز میں بہن کو سمجھایا تھا جس نے بھائی کی فراٹے دار زبان اور سوال سن سن کر بہت جلدی بولنا شروع کر دیا تھا۔
وہ سب اس وقت امریکن ایمبیسی کے اندر موجود ایک چھوٹے سے میڈیکل یونٹ میں تھے۔ وہ طوفان جو ان کی زندگی اڑانے آیا تھا۔ کچھ بھی تہس نہس کیے بغیر قریب سے گزر کر چلا گیا تھا۔
امامہ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ سالار سے بات چیت کے بعد اب پرسکون تھی۔ اس نے وقفے وقفے سے پاکستان میں سب سے بات کی تھی سب کو اپنی خیریت کی اطلاع دی تھی اور سب سے حمین کی پیدائش پر مبارک باد وصول کی تھی۔ بچے کی جنس کا پتا چلنے کے بعد وہ کوئی مہینے پہلے ہی اس کا نام طے کر چکے تھے۔ حمین کی حالت بہتر تھی۔ وہ کمزور تھا لیکن صحت مند اور ایکٹو تھا۔
اگر اس کی پیدائش قبل از وقت نہ ہوئی ہوتی اور امامہ کی سرجری نہ ہوئی ہوتی تو سالار فوری طور پر ان کو وہاں

سے واشنگٹن بلوانے کی کوشش کرتا۔ لیکن فوری طور پر امامہ اور حمین ایئر ٹریول نہیں کر سکتے تھے اس لیے سالار کانگو آنے والا تھا اور وہ اب اس کے انتظار میں امریکن ایمبیسی میں تھے جہاں بہت سے اور بھی لوگ پناہ لیے ہوئے تھے' جب تک انہیں کانگو سے نکالنے کے انتظامات نہ ہو جاتے یا حالات پر قابو نہ پالیا جاتا۔ امامہ اور اس کے بچوں کو ہائی پروفائل گیسٹ کا اسٹیٹس ملا ہوا تھا۔ امامہ کو اگر یہ پتا ہوتا کہ اس ہائی پروفائل اسٹیٹس سے پہلے اس کے شوہر پر امریکہ میں کیا گزری تھی تو وہ مر کر بھی امریکن ایمبیسی کی شکل نہ دیکھتی۔

سالار نے اسے ہر بات سے بے خبر رکھا تھا۔ فون پر ان کی بہت لمبی بات نہیں ہو سکی تھی۔ سالار نے اسے آرام کرنے کے لیے کہا تھا۔ اسے خود فوری طور پر ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی۔ اس نے امامہ سے کہا تھا۔ کوئی سگنلز اور سیٹلائٹ کا مسئلہ تھا جس کی وجہ سے اس کا رابطہ اس سے نہیں ہو پا رہا تھا اور اسی وجہ سے وہ اس قدر پریشان تھا۔

امامہ نے پیٹرس ایباکا کے حوالے سے بات کی تو اس نے اسے تسلی دی کہ سب کچھ ٹھیک ہے' وہ پریشان نہ ہو۔ اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔ وہ اس سلسلے میں پولیس سے بھی رابطے میں ہے۔

امامہ مطمئن ہو گئی تھی۔ اگر سالار کی پریشانی کا باعث صرف اس سے رابطہ نہ پانا تھا تو وہ مسئلہ تو وہ سمجھ سکتی تھی۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ سو نہیں سکی تھی۔ تکلیف میں سکون آور دوائیں لیے بغیر سو نہیں سکتی تھی اور اب وہ دوائیں لے کر سونا نہیں چاہتی تھی۔ پیڈی اب بھی وہیں اس کے پاس تھی اور وہ کمرے میں چلتے ہوئے ٹی وی پر کانگو کے حالات کے حوالے سے چلنے والی خبریں دیکھ رہی تھی۔ مختلف ملکی اور غیر ملکی چینلز کو بدل بدل کر۔ جہاں پیٹرس ایباکا کے حوالے سے ذکر آ رہا تھا وہاں سالار سکندر کا ذکر بھی ہو رہا تھا اس انٹرویو کی جھلکیاں بھی بار بار چل رہی تھیں' جن میں پیٹرس نے بار بار سالار کے بارے میں اچھے الفاظ میں بتایا اور اس کی اور اپنی زندگی کے حوالے سے لاحق خطرات کا ذکر بھی کیا تھا۔

سالار سے بات کرنے کے بعد امامہ کی جو پریشانی ختم ہوئی تھی' وہ پریشانی ایک بار پھر سر اٹھانے لگی تھی۔ سالار نے اسے ان سب معاملات سے بالکل بے خبر رکھا ہوا تھا۔ وہ پچھلے کئی مہینوں سے کانگو کے جنگلات میں پیٹرس ایباکا کے ساتھ بہت زیادہ سفر کرتا رہا تھا۔ وہ صرف یہ جانتی اور سمجھتی تھی کہ یہ آفیشل کام تھا لیکن ورلڈ بینک کے اس پروجیکٹ کے حوالے سے سالار سکندر کی اختلافی رپورٹ کے بارے میں اسے پہلی بار پتا چلا تھا۔ وہ بھی پیٹرس ایباکا کے اس انٹرویو کے ذریعے۔ معاملات اتنے صاف اور سیدھے نہیں تھے جتنے واشنگٹن میں بیٹھا سالار اسے بتا رہا تھا۔

وہ مصیبت میں تھا لیکن اسے کیوں بے خبر رکھ رہا تھا۔ امامہ کو اس کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ وہاں کنشاسا میں بیٹھ کر اس سے ان سب چیزوں کے بارے میں فون پر سوالات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ کر اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔

"ممی!" جبریل نے اسے مخاطب کیا' وہ سوچوں سے چونکی۔

"Who wants to kill Papa"

"پاپا کو کون مارنا چاہتا ہے؟"

وہ اس کے سوال پر منجمد ہو گئی تھی۔

چار سالہ وہ بچہ بے حد تشویش سے اس سے پوچھ رہا تھا۔ امامہ کو ٹی وی دیکھتے ہوئے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ بیٹھا ٹی وی پر یہ سب کچھ سن اور دیکھ رہا تھا اور اپنے باپ کے حوالے سے ہونے والی ایسی کسی گفتگو کو وہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ بلا کا ذہین تھا اپنے باپ کی طرح۔ امامہ اور سالار اس کے سامنے گفتگو میں بہت محتاط

رہتے تھے۔
امامہ نے ٹی وی آف کر دیا۔ وہ اب اسے ٹالنا چاہتی تھی۔

No one wants to kill papa

(کوئی آپ کے پاپا کو مارنا نہیں چاہتا؟)
اس نے جبریل کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔
"اللہ آپ کے پاپا کی حفاظت کر رہا ہے اور ہم سب کی۔" وہ اسے تھپتھپاتے ہوئے بولی۔
"اللہ نے پیٹرس ایبا کا کی حفاظت کیوں نہیں کی؟"
امامہ لاجواب ہو گئی۔ بڑوں کے سوالوں کے جواب آسان ہوتے ہیں' بچوں کے نہیں۔
جبریل کے سوال اسے ہمیشہ ایسے ہی لاجواب کرتے تھے۔ وہ بحث نہیں کرتا تھا۔ بات پوچھتا تھا۔ جواب سنتا تھا۔ سوچتا تھا۔ اور خاموش ہو جاتا تھا۔ مگر امامہ یہ نہیں سمجھ پاتی تھی' اس کے جواب نے اسے قائل کیا تھا یا نہیں۔ وہ بچہ گہرا تھا۔ اس کا احساس اسے تھا۔ وہ بہت حساس تھا۔ وہ اس سے بھی لاعلم نہیں تھی۔ لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے حوالے سے بہت ساری باتیں سوچتا تھا جو وہ ان سے پوچھتا کبھی نہیں تھا۔
"دیکھو' تمہارا چھوٹا بھائی۔ کیسا لگتا ہے تمہیں؟"
امامہ نے اب اس کی توجہ ایک دوسرے موضوع کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔
"ہی از کیوٹ۔"
اس نے جواب دیا تھا حمین کے بغور جائزے کے بعد لیکن اس جواب میں جذباتیت' خوشی اور حیرانی مفقود تھی۔
"تمہارے جیسا لگتا ہے نا؟" امامہ نے اسے خوش کرنے کی کوشش کی۔
"مجھے تو نہیں لگتا۔"
جبریل نے کچھ اور احتیاط سے بغور اس کا جائزہ لینے کے بعد ماں کو فوراً" جواب دیا تھا۔ اسے شاید ماں کا یہ تبصرہ اور مماثلت اچھی نہیں لگی تھی۔
"اچھا تم سے کیسے ڈفرنٹ ہے؟" امامہ نے دلچسپی سے پوچھا۔
"اس کی مونچھیں ہیں۔ میری تو نہیں ہیں۔"
امامہ بے ساختہ ہنسی۔ وہ حمین کے چہرے اور بالائی لب پر آنے والے روئیں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
عنایہ اب بھی امامہ کے بیڈ کے بالکل قریب پڑے انکیوبیٹر کی دیوار سے چپکی کھڑی تھی یوں جیسے حمین چڑیا گھر کا کوئی جانور تھا جسے وہ گلاس وال سے ناک اور ہاتھ ٹکائے اوؤ والے تاثرات کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔
"یہ میری طرح لگتا ہے۔" اس نے بہت مدھم آواز میں اٹکتے ہوئے امامہ کو مطلع کیا تھا۔
وہ عنایہ کی مدھم آواز پر ہنس پڑی تھی۔ وہ احتیاط کر رہی تھی کہ سویا ہوا بھائی بیدار نہ ہو جائے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا۔ وہ سویا ہوا بھائی نہیں تھا سویا ہوا جن تھا جو بیدار ہونے کے لیے اپنے باپ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔
سالار سکندر اور امامہ ہمیشہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی اولاد دی تھی جو بالکل مشکل نہیں تھی نہ ہی ان دونوں نے انہیں کسی بھی لحاظ سے تنگ کیا تھا۔ ان کے خاندان' دوستوں اور جبریل کے اسکول میں بھی ان دونوں کے بچوں کو مثالی بچے اور انہیں مثالی والدین مانا جاتا تھا۔
کانگو کے فسادات میں پیدا ہونے والا وہ تیسرا بچہ ان کا وہ سکون اور چین چھین کر انہیں واقعی مثالی بنانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ سی آئی اے نے جس بچے کو تین ہفتے پہلے دواؤں کے ذریعے قبل از وقت دنیا میں لانے کی کوشش کی

تھی؟ انہیں اگر محمد حمین سکندر کا تعارف ہو جاتا تو وہ اس پیدائش کو کم از کم تین سو سال تک روکتے۔
مستقبل سے بے خبر امامہ بڑی محبت سے اسے خود سے کچھ فاصلے پر سوئے دیکھ رہی تھی جو دو دن بعد ہی خراٹے لے رہا تھا۔
"کیا یہ خراٹے لیتا ہے؟" یہ جبریل تھا جس نے پہلی بار اس کے خراٹے نوٹس کرتے ہوئے بڑی بے یقینی سے ماں کو دیکھا تھا۔
امامہ اس کے مشاہدے پر حیران ہوئی تھی۔ جبریل کے احساس دلانے پر اس نے پہلی بار غور کیا تھا۔ انکیوبیٹر سے اس کے خراٹوں کی آواز نہیں آرہی تھی۔ لیکن اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ بہت نمایاں تھا۔
"نہیں۔ وہ بس گہرے سانس لے رہا ہے۔"
امامہ نے جبریل کا چہرہ بھی حیرانی سے دیکھا تھا۔ اس نے کیسے اندازہ لگایا تھا اس کے سانس لینے کی رفتار سے کہ وہ خراٹے لے رہا ہوگا۔
"ممی! کیا یہ آپ کا لاسٹ بے بی ہے؟" سوال ڈائریکٹ آیا تھا اور بے حد سنجیدگی سے کیا گیا تھا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ ہنسے یا شرمندہ ہو۔ بیڈی ہنس پڑی تھی۔
"ہاں سویٹ ہارٹ! یہ لاسٹ بے بی ہے۔" اس نے جیسے جبریل کو تسلی دی تھی۔
"ہم دو بھائی اور ایک بہن ہے۔" جبریل جیسے مطمئن ہوا اور اس نے انگلیوں کو چھو کر گنا۔
"ہاں ڈیئر۔" امامہ نے اس کا منہ چوم کر اسے یقین دلایا۔ اسے پتا نہیں تھا اس کے گھر ایک اور بچی نے پرورش پائی تھی۔ کنیز غلام فرید عرف چنی۔



سکندر عثمان کے گھر آنے والا وہ مہمان غیر متوقع نہیں تھا' ناقابل یقین تھا۔ وہ ان کے گھر کئی بار گئے تھے۔ ہمسائے کے طور پر۔۔۔ مصالحت کے لیے۔۔۔ تعزیت کے لیے' لیکن ہاشم مبین زندگی میں کبھی ان کے گھر نہیں آئے تھے۔ آج وہ آگئے تھے تو انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ اب ان کے پڑوس میں نہیں رہتے تھے۔ وہ گھر چھوڑ کر جاچکے تھے۔ اس گھر میں اب کوئی اور رہتا تھا اور گھر بکنے کی خبر پر سالار نے بے حد کوشش کی تھی کہ سامنے آئے بغیر در پردہ کسی اور کو درمیان میں رکھ کر وہ گھر خرید پاتا۔۔۔ وہ ناکام رہا تھا۔۔۔ ہاشم مبین کے بیٹے اب بہت طاقت ور تھے اور ہاشم مبین بہت کمزور ہو چکے تھے۔۔۔ ان کے دل میں فیصلے کی خواہش تھی۔ ہاتھ میں طاقت نہیں تھی جن پراپرٹی ڈیلرز کے ذریعے سالار سکندر ان سے رابطہ کررہا تھا' وہ بھی اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ گھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکا تھا' کیونکہ وہ بہت بڑا تھا۔۔۔ آٹھ کنال کا وہ گھر تین حصوں میں بٹ کر بکا تھا اور اس کے باوجود اس پر بھی اور کیسز تھے جو امامہ کی بہنوں نے اپنے حصے کے حوالے سے کیے تھے۔

سکندر عثمان نے سالار کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ اس حق میں نہیں تھے کہ وہ متنازعہ جائیداد خریدی جاتی' خاص طور پر اس لیے کیونکہ وہ امامہ کے والدین کی تھی اور دونوں فیملیز کے درمیان تنازعات تھے' جو سالار کے خود پس پردہ رہ کر سامنے کسی اور کو رکھ کر اس کے ذریعے ایسی کسی خرید و فروخت کے شدید مخالف تھے' خاص طور پر اس لیے بھی کیونکہ سالار کے پاس اتنا بڑا گھر خریدنے کے وسائل نہیں تھے۔ وہ قرضہ اور ادھار لیے بغیر ایسی کوئی خرید و فروخت کر نہیں سکتا تھا اور سکندر عثمان زندگی میں کبھی قرض اور ادھار پر عیاشیاں اور اللے تللے کرنے کے حق میں نہیں رہے تھے۔

اور اب وہ ایک لمبے عرصے کے بعد جس ہاشم مبین کو اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس رعونت' تمکنت کا سایہ تھے جو کبھی ان کے ہمسائے میں رہتے تھے اور جو ان سے بات تک کرنے کے روادار نہیں ہوتے تھے۔

چہرے پر جھریوں کا جال لیے زرد رنگت' کمر میں خم کے ساتھ جو ضعیف آدمی ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ پہلی نظر میں انہیں پہچان نہیں پائے تھے۔ ان کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا کہ وہ ان کے ساتھ کیا رویہ رکھیں۔ آخر اب کیا شے تھی جو انہیں کھینچ کر یہاں لائی تھی۔

"مجھے امامہ سے بات کرنی اور ملنا ہے۔" چند ہی جملوں کے بعد ہاشم مبین نے ان سے کہا تھا۔

"وہ یہاں نہیں ہے۔" سکندر عثمان نے بڑے محتاط انداز میں انہیں بتایا۔

"میں جانتا ہوں۔ وہ کانگو میں ہے۔۔۔ میں وہاں کا نمبر لینا چاہتا ہوں۔ وہاں کے حالات خراب ہیں۔۔۔ وہ ٹھیک ہے؟"

انہوں نے رک رک کر۔ لیکن ایک ہی سانس میں ساری باتیں کہی تھیں۔ سکندر کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ کیا کہیں۔

"ہاں۔۔۔ وہ' سالار اور بچے ٹھیک ہیں۔"

اگر وہ تشویش میں یہاں آئے تھے تو سکندر عثمان نے ان کی وہ تشویش دور کردی تھی۔ وہ فون نمبر کا مطالبہ گول کرگئے تھے۔

"میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں' ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" ہاشم مبین اپنا مطالبہ نہیں بھولے تھے۔

"میں امامہ سے پوچھے بغیر اس کا نمبر' ایڈریس آپ کو نہیں دے سکتا۔" سکندر عثمان نے کوئی تمہید نہیں باندھی تھی۔

"میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اب۔" انہوں نے بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"آپ اسے بہت زیادہ نقصان پہلے ہی پہنچا چکے ہیں۔" سکندر عثمان نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "وہ اب اپنی زندگی

میں سیٹ ہے۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ بہت خوش' بے حد مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔ آپ یہ بات ایک بار پھر اس کو ڈسٹرب کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی بیٹی نے پہلے ہی آپ کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ آپ اب اسے چھوڑ دیں۔ اسے بخش دیں۔"

ہاشم مبین کے چہرے کی جھریاں یک دم بڑھی تھیں' پھر انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔

"میں جانتا ہوں' مجھے احساس ہے۔"

سکندر عثمان ہوں نہیں تھے' وہ ان کے منہ سے یہ جملے سننے کی توقع نہیں کر رہے تھے۔

"بس ایک آخری بار ملنا چاہتا ہوں اس سے۔ اس کی ایک امانت ہے' وہ دینی ہے مجھے۔ اور اس سے معافی مانگنی ہے۔"

"آپ مجھے اپنا فون نمبر اور ایڈریس دے دیں' میں اس سے بات کروں گا' پھر آپ سے رابطہ کروں گا۔ آپ کہاں رہتے ہیں اب۔" سکندر نے اس سے پوچھا۔

"ایک اولڈ ہوم میں۔" سکندر چپ کے چپ رہ گئے۔ ہاشم مبین اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"امامہ کو بتا دیں۔ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ پھر وہ مجھ سے ضرور بات کرے گی۔"

اپنی نشست سے کھڑے ہوتے سکندر عثمان ان کے اگلے جملے پر دم بخود رہ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

جینی بے اختیار ہنسی۔ جواب غیر متوقع نہیں تھا۔ کوئی مرد اس کی کشش کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ مگر اس نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی مرد نہیں دیکھا تھا' جس نے اس کی اتنی کھلی دعوت کو رد کیا ہو۔

وہ نیویارک کی مہنگی ترین Escorts میں سے ایک تھی اور مہنگی ترین کا لفظ اس کے لیے بہت چھوٹا پڑ جاتا تھا۔ اس کی خدمات حاصل کرنے والے دنیا کی مشہور ترین کمپنیز کے سربراہان شامل تھے۔ کیونکہ جینی کی خدمات ہر کوئی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے "کلائنٹس" محدود تھے اور Forbes کے 100 امیر ترین لوگوں کی فہرست میں شامل تھے۔ وہ ان کلائنٹس کے علاوہ صرف چند لوگوں کے لیے کام کرتی تھی اور آج اسے ایک ڈنر پارٹی میں بیٹھے ہوئے اس ایک شخص کے ساتھ رات گزارنے کے لیے پیسے دیے گئے تھے جو اس وقت مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنے گلاس میں موجود اورنج جوس کا آخری گھونٹ لے رہا تھا۔

"او۔۔۔ ڈونٹ۔۔۔ گریٹ۔" جینی نے شیمپئن کا ایک اور گھونٹ بھرتے ہوئے قاتلانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔

"لیکن صرف حوروں کے ساتھ۔" اس شخص کا اگلا جملہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ اب اپنے ہاتھ کی پشت پر سر رکھے اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔

"کون۔۔۔ حور کون ہے؟" جینی سمجھ نہیں سکی' لیکن اسے یک دم اس "حور" کو جاننے میں دلچسپی نہیں ہوئی' جس کا وہ ذکر کر رہا تھا۔ جو 37 سال کی عمر میں ورلڈ بینک کی تاریخ کا سب سے کم عمر ترین وائس پریذیڈنٹ تھا اور جو ورلڈ بینک کے چند افراد کے ساتھ موجود تھا' جو اس وقت بار کے قریب ڈانس فلور پر تھرک رہے تھے۔ یہ "لیل" "تھرک" رہے تھے۔

سالار سکندر نے اپنے والٹ سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی پشت پر ایک پین سے کچھ لکھا اور میز پر انگلیوں سے تھپتھپاتے ہوئے اسے جینی کی طرف کر دیا۔ جینی نے وزیٹنگ کارڈ کی پشت پر عربی میں لکھا ایک جملہ

دیکھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے سالار سے کہا۔
"یہ کیا ہے۔؟ میں اسے پڑھ اور سمجھ نہیں سکتی۔" اس نے کندھے اچکا کر سالار کو دیکھا جو اب اپنے گلاس کے نیچے کچھ نوٹ دباتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔
"میں نے تمہاری سروسز کی ادائی کر دی ہے۔"
جیکی نے انگلی اور انگوٹھے میں دبے اس کارڈ کو سالار کو دکھایا اور دوبارہ کہا۔ "میں یہ پڑھ اور سمجھ نہیں سکتی۔"
"جنہوں نے آپ کو بھیجا ہے 'وہ پڑھ بھی لیں گے' سمجھ بھی لیں گے' سمجھا بھی دیں گے۔"
جیکی کو اس کے جملے پر کرنٹ لگا' اس کی قاتلانہ مسکراہٹ سب سے پہلے غائب ہوئی تھی۔
"ایکسکیوزمی۔" (معاف کیجئے) اس نے ایک بار پھر اپنی لاعلمی اور بے خبری ظاہر کرنے کی کوشش کی۔
"Excused" (معاف کیا) وہ مسکراتے اور کہتے ہوئے اٹھ گیا۔
سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے اس ہوٹل کے ایک کمرے کو کنڈکٹ کرتے اور خفیہ کیمرے اور مائیکروفون کی مدد سے گفتگو سنتے ان پانچ لوگوں کو ایک لمحہ کے لیے پسینہ آیا تھا۔ ان پانچ کے پانچ نے ایک وقت میں ایک دوسرے کو بے اختیار دیکھا' پھر ان سب نے بے اختیار اس شخص کو گالی دی تھی۔ وہ اس شخص کو پیش کیا جانے والا پہلا ہنی ٹریپ نہیں تھا۔ وہ اس پھندے سے بچ کر نکلنے والے مردوں میں پہلا تھا۔
"اس کارڈ پر کیا لکھا ہے؟" سی آئی اے کی اسٹنٹ ٹیم کے لیڈر نے آدھ گھنٹے بعد جیکی کے اس کمرے میں آنے سے پہلے وہاں بلوائے عربی مترجم سے پوچھا تھا۔
"اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔" اس مترجم نے وہ تحریر پڑھی۔
"مطلب۔"
"میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔" مترجم نے اس بار روانی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔
ان سب لوگوں نے جیکی اور جیکی نے انہیں دیکھا' پھر قاتلانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔
"

"I am sure he wasn't referring to me"

(مجھے یقین ہے کہ یہ میرے بارے میں نہیں ہے۔)

⁂ ⁂ ⁂

آپریشن کے دوران وہ نیورو سرجن چند لمحوں کے لیے رکا تھا۔ ایک نرس نے بڑھ کر اس کے ماتھے پر ابھرنے والے پسینے کے چند قطروں کو ایک ٹیشو پیپر سے خشک کیا۔ وہ شخص ایک بار پھر اپنے سامنے آپریشن تھیٹر کی ٹیبل پر لیٹے ہوئے اس دماغ پر جھکا جو دنیا کے ذہین ترین دماغوں میں سے ایک تھا اور جو ایک گولی کا نشانہ بننے کے بعد اس کے سامنے اس میز پر پڑا تھا۔ دنیا کی اہم ترین پوزیشنز پر فائز رہنے والے اس شخص کے لیے اسے ایمرجنسی میں بلوایا گیا تھا۔ وہ نیورو سرجن اب تک (27) انتہائی نازک ترین کامیاب سرجریز کرنے کے بعد اس وقت امریکہ کی درجہ اول کا سب سے قابل سرجن تھا۔ لیکن آج پہلی بار اسے لگ رہا تھا کہ اس کا ہنڈرڈ پرسنٹ کامیابی کا ریکارڈ ٹوٹنے والا تھا۔ وہ ایک بار پھر گہرا سانس لے کر ٹیبل سے ہٹا۔ اسے کسی چیز کی ضرورت پڑی تھی اس آپریشن میں کامیاب ہونے کے لیے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، پھولوں کی خوشبو، گھاس کی نمی، ننھی ننھی سر اٹھاتی کونپلیں، یہ موسم بہار کے آغاز کے دن تھے۔ وہ لان میں بیٹھی گہرے گہرے سانس لیتی فضا کی خوش گواری کو اپنے اندر اتارنے لگی۔ اس کا موڈ خود بخود ہی خوش گوار ہو گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھی اور چائے کا خالی کپ لیے اندر

عائشہ رباب

رقصِ دوراں



آ گئی۔

"بہو! آج دال گوشت بنالینا۔" لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اس نے اپنی ساس کی آواز سنی۔ دفعتاً" اس کی مسکراہٹ سمٹی اور غصہ کا گراف بلند ترین مقام پر پہنچ گیا۔

"دال' دال اور دال۔۔۔ دال کے سوا کچھ کھانا ہی نہیں آتا ہے ان لوگوں کو۔" اس نے زور سے کپ پٹخا۔

اور کچن کاؤنٹر سے ٹیک لگائے گہرے سانس لیتی وہ اپنے محسوسات کو قابو کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

آج پھر دال کی فرمائش' کھڑے کھڑے وہ ماضی میں کھو سی گئی۔ ابو کی جاب اچھی تھی۔ گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ کبھی کسی چیز کی تنگی نہیں ہوئی۔ دستر خوان پر گوشت نہ ہو' ممکن ہی نہیں' پھر دال جیسی چیز کو کون پوچھے۔ جب احمد کا رشتہ آیا تو ابو بہت خوش ہوئے۔ مناسب چھان بین کروا کر انہوں نے ہاں کردی۔ برسرروزگار' اپنا گھر' مختصر سا سسرال' ہر طرح سے بہترین رشتہ تھا۔ "میری بیٹی کو کبھی کسی چیز کی پریشانی نہیں ہوگی۔" ابو کی خالص سوچ۔

اور واقعی دال کے علاوہ کوئی پریشانی تھی بھی نہیں۔ اب وہ ابو کو کیا بتائے؟ اسے اپنے سسرال والوں کی "دال" سے محبت کے بارے میں شادی کے دوسرے ہفتے ہی اندازہ ہو گیا تھا جب لگاتار تیسرے دن پھر دال بنی اور سب خاموشی سے کھانے بیٹھ گئے۔ اس کا حلق سے نوالہ اتارنا مشکل ہو گیا۔ اس کے میکے میں برسوں میں دال بنا کرتی تھی۔ صرف اپنے چاولوں کے ساتھ۔۔۔ یہاں روز بنتی ہے۔ "توبہ کیسے کھا رہے ہیں۔ جیسے مرغ مسلم مل گیا ہو غریبوں کو۔" اپنے سسرال والوں کو رغبت سے کھانا دیکھ کر اس نے منہ بنا کر سوچا۔

"کیا ہوا بہو؟ کھانا نہیں کھا رہی ہو تم۔" اچانک اس کی ساس نے اسے مخاطب کیا۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں ہوا تھا' وہ اب تک پہلا نوالہ ہاتھ میں لیے مسلسل سوچے جارہی تھی۔

"جی۔۔۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ کیا بولے۔

"میں دال نہیں کھاتی۔" اس نے بالآخر شرمندہ شرمندہ کہہ ہی دیا۔

"تو بیٹھی کیوں ہو' اپنے لیے کچھ اور بنالو۔ زبردستی تھوڑی ہے کہ یہ ہی کھانا ہے۔ چلو شاباش اٹھو' جلدی سے اپنے لیے انڈا بنالو۔" اس کی ساس نے اتنے پیار سے اسے ڈپٹتے ہوئے کہا کہ وہ حیران ہی رہ گئی۔ دن میں انڈا کھانا اسے پسند نہیں تھا۔ وہ اپنے لیے کیا بنائے یہ سوچنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"اماں! کتنے دن سے میں نے دال نہیں کھائی۔ آج میں دال کی بریانی بناؤں گی۔" بڑی نند نے میکے میں قدم رکھتے ہی گویا اعلان کیا۔ اس کے سینے میں سانس اٹک گئی۔

"دال کی بریانی؟" دال کی بریانی کون بناتا ہے۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ان سات مہینوں میں اس نے دال کا کیا کیا نہیں کھالیا تھا جو اس نے پورے اکیس سالوں میں نہیں کھایا تھا۔ "پیلے مونگ کی دال' ہرے مونگ کی دال' لال مسور کی دال' کالے مسور کی دال' ماش کی دال' مٹر کی دال' ارہر کی دال' چنے کی دال' پتلی دال' پھریری دال' بھگاری دال' ٹماٹر کی دال' دالوں کا قورمہ' دال گوشت' کڑاھی دال' فرائی دال' دال انڈا' دال ساگ' دال کی بڑی' جب سب سے دل بھر جائے تو ساری دالوں کو ملا کر اس کا حلیم بنالو اور اب دال کی بریانی' یہ ہی کھانا باقی رہ گئی تھی۔ وہ اپنے لیے کیا بنائے یہ سوچنے لگی۔

اس نے دال چولہے پر چڑھائی تھی کہ لاؤنج میں رکھے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ گھر پر کوئی نہیں تھا۔ فون اسے ہی اٹھانا تھا۔ وہ آنچ دھیمی کر کے لاؤنج میں آگئی۔

"ہیلو۔" اس نے کہا۔

"فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھیں' کب سے فون

کررہی ہوں میں 'کیا کررہی ہو؟'" بھابھی نے چھوٹتے ہی سوالوں کا ڈھیر لگا دیا۔

"کھانا بنارہی ہوں' فون کمرے میں چارج پر لگا ہے' سائلنٹ پر ہے۔" اس نے تفصیلی جواب دیا۔

"کیا پکا رہی ہو؟" جواب مکمل ہونے سے پہلے ہی بھابھی نے دوسرا سوال کرڈالا۔

"ماش کی دال" اس نے بے زار سے لہجے میں جواب دیا۔

"ہائے! ماش کی دال اللہ! تمہارا گھر قریب ہوتا تو میں فوراً" آجاتی۔ امی اتنی اچھی دال پکاتی تھیں۔ یہاں تو پکتی ہی نہیں ہے۔" بھابھی کی زبان جاپانی ٹرین کی رفتار سے چلنے لگی' جسے روکنا کم از کم اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا بھابھی مذاق اڑا رہی ہیں یا سچ بول رہی ہیں۔ اس نے سر جھٹک کر تمام منفی خیالات کو دور کیا۔ دال تو سب کھالیں گے۔ وہ اپنے لیے کیا بنائے۔ یہ سوچنے لگی۔

***

"آج کون سی دال پلی ہے؟" فون سے ہنستی کھنکھلاتی ایک نسوانی آواز برآمد ہوئی۔ اس نے فون کان سے ہٹا کر فون کو گھورا۔

"دال نہیں بنی ہے کڑھی بنی ہے۔"

"چلو شکر ہے' آج تمہارے گھر میں دال نہیں بنی۔" ایک بلند قہقہے کے ساتھ آواز پھر برآمد ہوئی۔

"کڑھی میں خساری دال کے پکوڑے ڈالے ہیں۔" اس نے جیسے اسے خوش فہمیوں کے پہاڑ سے دھکا دے دیا۔

"خساری دال کے پکوڑے؟ یار ہم نے ساری زندگی بیسن کے پکوڑے کھائے ہیں۔"

"میں نے بیسن کے ہی پکوڑے کھائے ہیں۔ لیکن یہ میرا سسرال ہے۔ یہاں دن پورا نہیں ہوتا دال کے بنا۔" دال نامہ شروع ہوتے ہی اسے رونا آنے لگا۔ اس نے اپنی دوست کو کوسا کہ اس نے یہ موضوع شروع ہی کیوں کیا تھا۔ اس نے غصے میں فون کاٹ کر دور پھینکا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ سامنے پڑے کشن میں سر مار مار کر اپنا سر پھوڑ ڈالے۔ اب اس کا کڑھی کھانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اپنے لیے کیا بنائے یہ سوچنے لگی۔

***

"دال' دال' دال..." جانے کب پیچھا چھوٹے گا اس دال سے' اس نے سارے کپڑے اٹھا کر الماری میں ٹھونسے اور زور سے الماری کے پٹ بند کیے۔

"کیا ہوا' غصے میں کیوں ہو؟" اپنے شوہر کی آواز پر وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔ شاید وہ بھول گئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کمرے میں کوئی موجود ہے۔

"کو... کچھ نہیں' نہیں۔" وہ شرمندہ ہوگئی۔ کہیں انہوں نے کچھ سن تو نہیں لیا۔

"اور جب دال پکتی ہے تمہارا موڈ اور بھی آف ہوجاتا ہے۔" اس کی بڑبڑاہٹ سن کر اس نے اندازہ لگایا تھا۔ وہ حیران رہ گئی۔ کیا واقعی انہوں نے یا سب نے ہی محسوس کیا۔ اسے اتنی چڑ ہوگئی تھی دالوں سے؟ اور آج پھر چنے کی دال بنی تھی۔ اسے تو نفرت محسوس ہونے لگی۔ اس دال سے کیوں کہ اس کی سسرال کی من پسند دال یہ ہی تھی۔ تب ہی وہ ضرورت سے زیادہ تپ رہی تھی۔

"نہیں... وہ... آپ لوگ دال زیادہ کھاتے ہیں نا تو کبھی کبھی عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔" اس نے ہر ممکن جملے کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

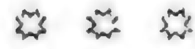
"ہاں... عادت ہوگئی ہے۔" وہ آنکھیں موندے بستر پر لیٹ گیا۔

"جب ابو کو فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ ہمارے حالات بہت خراب تھے۔ امی کے پاس روز کے سبزی خریدنے کے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے۔ امی زیادہ دالیں ایک ساتھ خرید لیتی تھیں تو دکان دار رعایت

کردیتے تھے۔" وہ چھت کو گھورتے اپنے دکھ اس سے بانٹ رہا تھا۔ وہ دم سادھے سنتی رہی۔

"بیمار شوہر' چھوٹے بچوں کا ساتھ' امی نے بہت مشکل وقت گزارا ہے' ہم نے تقریباً" دو سال تک صرف پتلی دال کھائی ہے۔ پھر ابو ٹھیک ہوگئے۔ حالات بہتر ہوگئے۔ لیکن دال کی ہمیں عادت ہوگئی۔ اب دسترخوان پر دال نہیں ہو تو کھانا ادھورا سا لگتا ہے۔" وہ پشیمان سی سنے گئی۔ اسے بہت افسوس ہو رہا تھا لیکن اچانک اسے خیال آیا اور اس نے بے زار سا منہ بنا کر کہا۔

"مطلب اس دال سے کبھی پیچھا نہیں چھوٹے گا۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا۔



اس نے خوشی خوشی بیل بجائی۔ وہ آج کافی دنوں بعد رکنے کے لیے آئی تھی۔ شوہر گھر پر نہیں تھے تو ساس نے رکشہ کروادیا۔ اس نے خوشی میں تمام باتوں کو نظرانداز کردیا۔ لیکن دروازہ کھلتے ہی اس کی تمام خوشی کافور ہوگئی۔

"گھر پر کوئی نہیں ہے؟" اس نے خاموشی بولتے گھر کو دیکھا۔

"امی... بھابھی مارکیٹ گئی ہیں۔" چھوٹی بہن نے جواب دیا۔

"اف..." آج مہینے کی آخری تاریخ تھی۔ امی' بھابھی راشن' سودا اور مختلف چیزوں کی خریداری کرنے گئی تھیں۔ تین' چار گھنٹوں سے پہلے واپسی ممکن ہی نہیں تھی۔

"اچھا ہوا آپا! آپ آگئیں۔ میں سینٹر جارہی ہوں... اوکے بائے۔" چھوٹی بہن نے اس کے حیرت زدہ چہرے کو دیکھے بغیر لمحے بھر میں کتابیں سمیٹیں اور نو دو گیارہ... وہ خالی گھر میں اکیلی رہ گئی۔ ابھی سوچ ہی رہی تھی کیا کرے کہ لاؤنج کا فون بج اٹھا۔ اس نے فون ریسیو کیا۔

"ہیلو کون..." انجان نمبر دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"اچھا جی ٹھیک ہے۔ جی اللہ حافظ۔" دوسری طرف کی بات سن کر اس نے فون رکھ دیا۔ اس کے دور پار کی رشتہ کی خالہ تھیں۔ اپنی آمد کا بتارہی تھیں۔ اس نے کھٹاک سے فون بھابھی کو ملایا۔ فون بجتا رہا لیکن ریسیو نہیں ہوا۔ اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے جیسے ہی اٹھ کر بھابھی کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اس کے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ فون چارجنگ پر لگا۔ مدھم مدھم سا بج رہا تھا۔ اس نے امی کو فون ملایا تو فون بند تھا۔ بھائی شہر سے باہر تھے۔ ان کو فون کرنا ہی بے کار تھا۔

"کیا کروں' کیا کروں۔" اس نے ٹہلتے ہوئے سوچا۔ بھاگ کر کچن میں چلی آئی۔ سارے کیبنٹ خالی' فریج خالی' مہینے کا آخر' ہفتے کا آخر' کچھ نہیں تھا گھر میں۔ بالآخر اسے ڈبے میں چنے کی دال مل گئی۔ ایک کلو تھی۔ یقیناً" یہاں مہینے میں ایک بار بھی دال نہیں پکی تھی۔ جب ہی موجود تھی۔ فریج سے آدھا کلو گوشت کا پیکٹ مل گیا۔ اس نے جھٹ پٹ دال گوشت اور زیرے والے چاول پکالیے۔ ابھی فارغ ہی ہوئی تھی کہ امی' بھابھی' خالہ' ان کا بیٹا' بھائی' چھوٹی بہن سب ایک ساتھ ہی آن وارد ہوگئے۔ خالی گھر ایک دم سے بھر گیا۔ اس نے فوراً" ہی کھانا لگا دیا۔ واقعی اتفاق میں برکت ہے۔ ذرا سا کھانا بھی کم نہیں پڑا۔ جس دال گوشت سے وہ اتنی نفرت کرتی تھی۔ اسی کی سب نے اتنی تعریف کی کہ وہ اپنی نفرت پر شرمندہ ہوگئی۔

اسے احساس ہوا تھا کہ خرابی کسی چیز میں نہیں۔ اس کی زیادتی میں ہوتی ہے۔ انسان فطرتاً" تنوع پسند ہے۔ خواہ کتنی اچھی چیز ہو۔ وہ یکسانیت سے بہت جلد اکتا جاتا ہے۔





بشریٰ احمد

بیلا کا بھائی

بیلا اسے آج کل مستقل اپنے بھائی کے رشتے کے لیے راضی کرنے کی تگ و دو میں لگی ہوئی تھی لیکن فی الحال اس کا انکار اقرار میں نہ بدلا تھا۔ حالانکہ پاپا اور مما بھی اس رشتے کے زبردست حق میں تھے۔ مما کا بس

چلتا تو وہ زبردستی اس کا رشتہ بیلا کے بھائی سے طے کردیتیں، ظاہر ہے سبکتگین ان کا سگا بھانجا تھا اور انہیں بہت عزیز تھا، لیکن سگا بھانجا، سگی بیٹی سے زیادہ پیارا تھوڑی ہوتا ہے، وہ اس رشتے کے لیے اکلوتی لاڈلی بیٹی کی مرضی کی بھی خواہش مند تھیں اور پھران کے شوہر نے بھی انہیں سختی سے جتا دیا تھا۔

"سبکتگین مجھے بھی بہت پسند ہے، لیکن عنائزہ کی مرضی کے بغیر میں اس کا رشتہ طے کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"بیٹی کو خودسر کرنے میں سراسر آپ کی شہ ہے، جو وہ ماں، باپ کی مرضی اور پسند کو خاطر میں ہی نہیں لارہی۔" مما خفگی سے گویا ہوئیں۔

"زندگی بیٹی نے گزارنی ہے تو مرضی اور رائے بھی اسی کی چلنی چاہیے۔" پاپا مسکراتے ہوئے مما کو سمجھاتے۔

"تو آخر میں بھائی صاحب کو کب تک ٹالوں، پہلے عنائزہ کی پڑھائی کا بہانہ تھا کہ ہماری بیٹی یکسوئی سے اپنی تعلیم مکمل کرلے، پھر اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے، اب خیر سے پڑھائی مکمل ہوگئی تو بھائی صاحب نے دوبارہ یہ بات چھیڑی ہے۔ اب بتائیں، میں انہیں کیا جواب دوں۔"

"فی الحال مہلت مانگ لیں اور بیٹی کو راضی کرنے کی کوشش کریں ورنہ سہولت سے انکار کردیں۔" پاپا رسانیت سے بولے تھے۔

"سگے بھائی کو انکار، اتنا آسان ہے کیا؟" مما تلملا ہی تو گئی تھیں یہ مشورہ سن کر۔

"اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں۔" پاپا کی رائے اٹل تھی۔

اور یہ پاپا کی مورل سپورٹ ہی تھی کہ عنائزہ اپنے انکار پر بدستور قائم تھی، حالانکہ سبکتگین سے اسے کوئی ذاتی پرخاش نہ تھی۔ وہ اس کا فرسٹ کزن تھا۔ خوبرو تھا، تعلیم یافتہ تھا، بظاہر سلجھی ہوئی عادتوں والا اور مہذب شخص لگتا تھا، لیکن عنائزہ کو اصل تحفظات اپنے ننھیالی خاندان کے ماحول سے تھے۔

پڑھنے لکھنے کے باوجود وہ لوگ روشن خیالی سے کوسوں دور تھے۔ مسئلہ گاؤں کی رہائش کا نہ تھا، مسئلہ سوچنے کے انداز کا تھا۔ ایسا گھرانہ جہاں نہ تو عورتوں کو برابر کا رتبہ دیا جاتا تھا، نہ ان کی رائے کو کوئی اہمیت دی جاتی تھی۔ حالانکہ عنائزہ کے ددھیال والے بھی زمیندار اور جاگیردار ہی تھے، لیکن وہ نسبتاً" روشن خیال لوگ تھے اور پاپا کی روشن خیالی تو مثالی تھی۔

مما کی خوش قسمتی کہ وہ گھٹے ماحول والے میکے سے نکل کر پاپا جیسے محبت کرنے والے، شاندار شخص کی زندگی میں شامل ہوگئیں، وہ اپنی خوش بختی کا برملا اقرار بھی کرتی تھیں اور خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتیں۔ پھر جانے کیوں وہ اسی ماحول میں اپنی بیٹی کو بھیجنا چاہ رہی تھیں جس سے نجات ملنے پر انہوں نے ساری عمر شکر ادا کیا تھا۔ عنائزہ نے جب یہ ہی سوال مما سے پوچھا تو ان کے لبوں پر تھکی تھکی سے مسکراہٹ بکھر گئی۔

"میں خود میں اتنی ہمت نہیں پاتی عنائزہ جان! کہ اکلوتی بیٹی انجان، اجنبی لوگوں کے سپرد کردوں۔ ددھیال میں کوئی تمہارا ہم عمر نہیں ہے۔ ننھیال والے اتنے مان اور محبت سے رشتہ مانگ رہے ہیں۔ اپنوں میں تمہارا رشتہ طے کروں گی تو دل کو تسلی رہے گی۔ سیانے کہتے ہیں نا کہ اپنا تو مار کر بھی چھاؤں میں ہی ڈالتا ہے۔"

"مرنے کے بعد دھوپ، چھاؤں سے کیا فرق پڑتا ہے مما۔" اس دقیانوسی فلسفے کو سن کر عنائزہ چڑ ہی تو گئی تھی۔

"سبکتگین بہت اچھا لڑکا ہے عنائزہ۔ تم خود بتاؤ اپنے پورے سوشل سرکل میں تم نے سبکتگین جیسا شاندار شخص دیکھا ہے کیا؟" بھتیجے کا ذکر کرتے ہوئے مما کی آنکھیں محبت سے جھکی تھیں۔

"بظاہر بیلا کے بھائی میں کوئی برائی نہیں مما، لیکن بس میرا دل اس کے ساتھ پر راضی نہیں۔" وہ رسانیت سے کہتی ہوئی مما کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔

سبکتگین اس سے دو چار برس بڑا ہی تھا، لیکن دوسرے کزنز کے برعکس وہ اس کے نام کے ساتھ بھائی

کالفظ نہ جوڑتی تھی۔ وہ بچپن سے ہی اس کے لیے بیلا کا بھائی تھا۔ بیلا، سبکتگین کی چھوٹی بہن اور آفاق ماموں کی بیٹی جو بچپن سے ہی عنائزہ کی گہری سہیلی تھی اور صرف بیلا کی وجہ سے ہی وہ تعطیلات کے کچھ ایام ضرور ہی ننھیال میں گزارتی تھی۔

معصوم اور بھولی بھالی بیلا ہمیشہ سے اس کے دل کے بہت قریب رہی۔ بیلا بھی پھوپھی زاد بہن کو سگی بہنوں کی طرح چاہتی تھی۔ اپنے دل کا ہر راز اس نے صرف اور صرف عنائزہ کے ساتھ ہی بانٹا کیا تھا اور خیر راز داں تو وہ خود بہت اچھی تھی۔ سبکتگین کے لیے عنائزہ کے انکار سے وہ ایک عرصے سے واقف تھی۔ اگرچہ تمکنت (عنائزہ کی مما) نے اب تک بھائی کو کوئی واضح جواب نہ دیا تھا، لیکن ان کے انداز سے ڈھکے چھپے اقرار کا اظہار ہو جاتا تھا۔ یہ بیلا بھی جو اندر کے حالات جانتی تھی۔ یہی کہ پھوپھی تو اس رشتے کے لیے سو فی صد راضی ہیں البتہ وہ ابھی تک اپنی بیٹی کی رضامندی حاصل نہ کرپائی تھیں اور عنائزہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے تو بیلا بھی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ گہری سہیلی بھابھی بن کر ان کے گھر آجائے۔

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں بیلا! میں تمہارے گھر کے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر سکتی۔" عنائزہ، بیلا کے اصرار پر بار بار رسانیت سے یہی جواب دیتی تھی۔

"اور میں تمہیں کیسے سمجھاؤں عنائزہ! کہ بھائی کی سنگت میں تم ایک مطمئن اور خوش گوار ازدواجی زندگی گزارو گی۔ میرے بھائی سے زیادہ محبت کرنے والا اور خیال رکھنے والا شوہر تمہیں کوئی اور نہیں ملے گا۔"

"ہاں جیسے تمہاری حویلی کے سارے مرد ہیں۔ اپنی بیویوں سے بے پناہ محبت کرنے والے اور ان کا بہت خیال رکھنے والے۔" اس نے طنزیہ انداز میں جتایا تھا۔

"میرا بھائی حویلی کے سب مردوں سے بہت مختلف ہے۔" بیلا کو اس کے انداز پر ہنسی آگئی تھی، لیکن اس نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بھی بھائی کی وکالت جاری رکھی۔

"تمہارے بیان پر یقین کرنے کی کوئی بھی وجہ۔"

عنائزہ اس کے یوں کھلکھلانے پر چڑ ہی تو گئی۔

"کیا یہ وجہ کافی نہیں کہ میرا بھائی حویلی کے کسی بھی مرد سے زیادہ اپنی ماں، بہن سے محبت کرتا ہے اور ان کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے تو جو بندہ اپنی ماں، بہن کے لیے اتنا کیئرنگ ہے تو وہ اس عورت کے ساتھ کیوں مخلص نہ ہوگا جو اس کی بیوی بن کر اس کی زندگی میں شامل ہوگی۔" بیلا نے اسے قائل کرنے کے لیے کیا اچھا نکتہ اٹھایا تھا اور ایک لمحے کے لیے تو عنائزہ بھی لاجواب ہو کر خاموش ہوگئی۔

"اچھا اب تم اپنے بھائی کا مقدمہ لڑنا بند کرو اور اپنی سناؤ۔ تمہاری خالہ نے اس سنڈے کو آنا تھا شیر دل کا رشتہ لے کر۔ نہیں آئیں کیا؟" عنائزہ نے موضوع ہی بدل ڈالا۔ اب خاموش ہونے کی باری بیلا کی تھی۔

"کیا ہوا بیلا۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔ خالہ سنڈے کو آئی تھیں نا؟" عنائزہ اس کی خاموشی سے گھبرا گئی تھی۔

شیر دل، بیلا کی خالہ کا بیٹا تھا اور اس کی محبت بھی۔ بیلا کی خالہ اسٹیٹس کے اعتبار سے کچھ کم تھیں۔ وہ بیلا کو نہ صرف بہت چاہتی تھیں بلکہ اپنے بیٹے اور بیلا کی چاہت سے بھی بخوبی واقف تھیں، لیکن انہیں یقین تھا کہ بہن، بہنوئی ان کے بیٹے کے رشتے کو سند قبولیت نہ بخشیں گے بس اسی لیے وہ شیر دل کے لیے بیلا کا ہاتھ مانگنے سے ہچکچا رہی تھیں۔ شیر دل نے بیلا کو یقین دلایا تھا کہ وہ ماں کو رشتہ مانگنے ہر قیمت پر بھیجے گا آگے ان دونوں کا نصیب۔ عنائزہ ساری صورت حال سے بخوبی آگاہ تھی اسی لیے گھبرا کر بیلا سے اس بارے میں استفسار کر رہی تھی۔

"شیر دل نے تو وعدہ نبھا دیا عنائزہ۔ خالہ نے امی، بابا کے سامنے شیر دل کا رشتہ پیش کر دیا ہے، لیکن بابا نے خالہ کو بتایا ہے کہ میرے تین رشتے اور بھی آئے ہوئے ہیں اور وہ غور و فکر کر کے انہیں جواب دیں گے۔"

"ایک رشتے کا تو مجھے پتا تھا۔ ماموں جان کے دوست کا بیٹا تبریز۔ یہ باقی دو کہاں سے ٹپک پڑے۔" عنائزہ حیران ہوئی۔

"نائلہ چچی نے اپنے چھوٹے بھائی کا پرپوزل پیش کیا ہے اور شازیہ چچی نے اپنے بھتیجے کا اور تمہیں تو بخوبی علم ہے کہ یہ فیملیز ہر لحاظ سے ہمارے خاندان کے ہم پلہ ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ شیر دل کے پرپوزل پر تو شاید سنجیدگی سے غور بھی نہ کیا جائے۔" بیلا کا بھیگا بھیگا لہجہ عنائزہ کو بری طرح مضطرب کر گیا۔

"تم کیا چیز ہو بیلا! اتنی دیر سے مجھے اپنے بھائی کے لیے قائل کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہو اور یہ بتایا ہی نہیں کہ تم پر کیا بیت رہی ہے۔" عنائزہ خفگی سے گویا ہوئی۔

"اب بتا تو دیا، لیکن بتانے سے کیا حاصل۔ تم بھی پریشان ہونے کے سوا کچھ کر تو نہیں سکتی نا۔"

"ٹھیک ہے، میں کچھ نہیں کر سکتی، لیکن وہ تمہارا عزیز از جان بھائی جس کی وکالت کر کر کے تم میرا مغز چاٹ لیتی ہو کیا وہ اکلوتی بہن کے لیے کسی قسم کا کوئی اسٹینڈ نہیں لے سکتا۔ ماموں جان کو مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ شیر دل کے رشتے پر فوراً "ہاں کردیں۔" اس نے طنزیہ انداز میں بیلا کو مخاطب کیا۔

"فیصلے کا اختیار تو بابا جان کے پاس ہی ہے نا۔ بھائی بے چارے کیا کر سکتے ہیں۔" وہ دکھے دل سے بولی۔

"تو تم اس "بے چارے" کو میرے پلے باندھنا چاہ رہی ہو۔ جو شخص بہن کی خوشیوں کے لیے کسی قسم کا اسٹینڈ نہیں لے سکتا۔ اس کی بیوی کی خوشیوں کی گارنٹی کون دے گا۔" عنائزہ پوچھ رہی تھی۔

"بھائی کو کیا پتا کہ میں شیر دل کو پسند کرتی ہوں۔" اس نے دھیمے سے لہجے میں اب بھی اپنے بھائی کی وکالت جاری رکھی۔

"نہیں پتا تو اسے بتاؤ۔ صرف وہی ہے جو ماموں کی رائے پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔" عنائزہ نے بیلا کو سمجھانا چاہا۔

"میں بھائی کو یہ بتاؤں کہ میں شیر دل کو پسند کرتی ہوں۔" بیلا نے یہ فقرہ بولتے ہوئے یقیناً" آنکھیں پھاڑیں ہوں گی۔

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ بھائی ہے وہ تمہارا۔ زندگی کے اس موڑ پر اسے تمہاری سپورٹ کرنی چاہیے۔ اگر ماموں شیر دل کے رشتے کو انکار بھی کرتے ہیں تو تمہارے بھائی کو اس فیصلے کے خلاف تن کر کھڑا ہونا چاہیے۔"

"بھائی بابا کا بہت ادب و احترام کرتے ہیں عنائزہ! بابا کے کسی فیصلے کے خلاف بغاوت نہیں کریں گے۔" بیلا دھیرے سے بولی تھی۔

"میں تمہیں کہے دے رہی ہوں بیلا! آئندہ اپنے بھائی کے رشتے کے لیے مجھے قائل کرنے کی ہرگز کوشش نہ کرنا۔" عنائزہ نے اس بار غصہ ضبط کرنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد بھی اس کا غم و غصہ کم نہ ہوا۔ یہ غصہ بیلا کی بے بسی پر تھا۔ کتنا چاہتی تھی وہ شیر دل کو اور اس چاہت کو پانے کے لیے نہ خود کوئی ہمت دکھا رہی تھی اور نہ کسی اور کی مدد مانگ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتی تھی کہ یہ سب بے سود ہے۔

غصہ کم ہوا تو شدید قسم کے پچھتاوے نے عنائزہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس وقت بیلا کو اس کی ڈھارس کی ضرورت تھی۔ کیا تھا کہ وہ تسلی کے دو بول ہی بول لیتی، چاہے جھوٹے ہی سہی۔ اس نے اپنی ہمجولی کو دوبارہ فون کرنا چاہا، مگر پھر رک گئی۔ دو دن بعد پاپا نے آفیشل ٹور پر اسلام آباد جانا تھا۔ غالب امکان تھا کہ مما بھی ان کے ساتھ جائیں گی۔ عام طور پر وہ مما، پاپا کی عدم موجودگی میں اپنے تایا کے ہاں رہنے چلی جاتی تھی (تایا جان کا گھر قریب ہی تھا) لیکن اس بار اس نے گاؤں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مما اس کا فیصلہ سن کر خوش ہو گئی تھیں۔

"اچھی بات ہے چار، پانچ دن وہاں گزار لو۔ سبکتگین کے ساتھ تھوڑی بہت گپ شپ لگا کر اس کا مزاج سمجھنے کی بھی کوشش کرنا ہو سکتا ہے تمہیں کسی فیصلے پر پہنچنے میں آسانی ہو جائے۔"

"بیلا کا بھائی ہرگز میرے لیے اجنبی نہیں مما! اور فیصلے پر تو میں پہنچ چکی ہوں یہ اور بات ہے کہ آپ وہ فیصلہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں بہرحال صرف آپ کی خاطر میں ایک بار غیر جانبداری سے اس معاملے پر مزید سوچوں گی۔" اس نے ممی کی خوش گمانی قائم رہنے دی۔

☼ ☼ ☼

ڈرائیور اسے گاؤں چھوڑ آیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ بیلا بھی اس کی اچانک آمد پر ششدر رہ گئی تھی۔

"بس مجھے لگا میری سہیلی کو اس وقت میری ضرورت ہے' سو میں آگئی۔" اس نے بیلا کے حیران چہرے کو بہت محبت سے دیکھا تھا۔

"مجھے تمہاری واقعی بہت ضرورت تھی عنائزہ! مجھے کم از کم ایک کندھا تو ایسا میسر ہوتا جس پر سر رکھ کر میں اپنے سارے آنسو بہا سکوں۔" بیلا دھیرے سے بولی تھی۔

"کیوں؟ کیا فائنل فیصلہ ہو گیا۔" اس نے متوحش ہو کر پوچھا۔

"کل ہو جائے گا۔" بیلا نے کرب سے آنکھیں موندیں۔ جیسے وہ متوقع فیصلے سے پہلے ہی آگاہ ہو۔

"بابا جان کل اپنے سب بھائیوں کو اکٹھا کر کے تینوں پرپوزلز پر غور کریں گے اور امید ہے ان تینوں میں سے ایک کو منتخب کر لیا جائے گا۔"

"کون سے تینوں؟" عنائزہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"شیر دل کے علاوہ تینوں۔" بیلا کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ چھیلی۔

"لیکن کیوں؟" عنائزہ چیخ ہی تو پڑی۔

"رات کو چچا جان اور بابا کی باتیں سنی تھیں۔ وہ تینوں رشتوں کو ہی ڈسکس کر رہے تھے۔ شیر دل کا تو نام تک نہ لیا بابا جان نے۔"

"اور اس خاندانی میٹنگ میں میری مما کو مدعو ہی نہیں کیا گیا۔" وہ اچھنبے سے گویا ہوئی۔

"پھوپھو حویلی کی بیٹی ہیں اور ان معاملات میں بیٹیوں سے مشورہ نہیں لیا جاتا۔" بیلا نے جیسے اس کی کم عقلی پر تاسف کا اظہار کیا۔

"اور تمہارا بھائی وہ تو حویلی کا بیٹا ہے نا۔ وہ تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔" عنائزہ نے بے چینی سے استفسار کیا۔

"بھائی کا یہاں کیا ذکر۔" بیلا نے نگاہیں چرائیں اور اس سے عنائزہ کو اس کی بے بسی پر رونا ہی آگیا۔

"اچھا تم پریشان مت ہو۔ دونوں مل کر اللہ سے دعا کرتے ہیں' جو بھی فیصلہ ہو اللہ اس فیصلے کو تمہارے لیے بہترین ثابت کرے اور تمہارا دل خود بخود اس فیصلے پر راضی ہو جائے۔" اس نے بیلا کے ہاتھ تھام کر اسے تسلی دینے کی اپنی سی کوشش کی۔ بیلا نے تو دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا' لیکن عنائزہ کے اپنے دل کو کسی طور قرار نہ مل رہا تھا۔ بیلا کی بے بسی اسے شدید اضطراب میں مبتلا کر رہی تھی۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ وہ بیلا کے بھائی کو جا کر کھری کھری سنائے۔

وہ کیسا بھائی تھا اپنی بہن کے دل کی حالت سے سرے سے بے خبر تھا یا حویلی کے دوسرے مردوں کی طرح بے حس۔

عنائزہ کا جب اس سے آمنا سامنا ہوا تو اتفاق سے وہ اکیلا نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا طلحہ اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں کسی کام سے حویلی سے باہر جا رہے تھے۔ عنائزہ کو دیکھ کر بیلا کا بھائی رکا۔ شائستگی سے اس کا حال احوال دریافت کیا۔ مما' پاپا کی خیریت جانی اور رسمی سی ایک دو باتوں کے بعد چلا گیا۔

عنائزہ اس کی چوڑی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔

کتنا شاندار شخص تھا۔ کاش یہ اس حویلی کا مکین نہ ہوتا۔ دل کی اس انہونی سی خواہش پہ وہ خود ششدر رہ گئی تھی۔

اور اگلے روز حویلی کے ہال کمرے میں بیلا کی قسمت کے فیصلے کے لیے میٹنگ بلائی گئی تھی۔ بیلا' عنائزہ کے ساتھ ہال کمرے سے ملحق کمرے میں موجود

تھی اور سفید پڑتے چہرے کے ساتھ اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کی منتظر تھی۔

سب سے پہلے شبیر ماموں نے اپنے سالے کے حق میں دلائل دینا شروع کیے تھے۔ چھوٹے ماموں کا ووٹ تبریز کی طرف تھا اور امجد ماموں نے ظاہر ہے اپنی بیوی کے بھتیجے کی ہی تعریفیں کرنی تھیں۔ بڑے ماموں عجب تذبذب میں مبتلا تھے۔ کسی ایک بھائی کا مشورہ مان کر وہ باقی دو کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بحث جب طول پکڑ گئی تو سبکتگین نے مداخلت کی تھی۔

"آپ لوگ اس معاملے کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے دادا جان والا طریقہ اختیار کیوں نہیں کر لیتے۔" اس کی بات پر کمرے میں موجود تمام نفوس اسے تکنے لگے۔

"بابا ہی تو بتاتے ہیں کہ جب دادا جان کو کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہوتا تھا، جس کے ایک سے زیادہ ممکنہ حل ہوتے تھے تو وہ قرعہ ڈال کر کسی فیصلے پر پہنچتے تھے۔"

"او میرے خدا! بیلا کی زندگی کا فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا۔ کیا نادر حل تجویز کیا تھا بیلا کے بھائی نے۔" اشتعال کی شدید لہر نے عنائزہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور حیرت کا مقام یہ تھا کہ ہال کمرے میں بیٹھے سب افراد سبکتگین کی تجویز سے فوراً" متفق ہو گئے تھے۔ ملازم کو آواز دے کر فوراً" شیشے کا کھلے منہ والا جار منگوایا گیا تھا۔ اب سبکتگین کاغذ پر امیدواروں کے نام تحریر کر رہا تھا۔

"خالہ جان بھی تو شیر دل کا رشتہ لائی تھیں۔ آپ کہیں تو بابا، شیر دل کے نام کی پرچی بھی ڈال دوں۔" اس نے جیسے برسبیل تذکرہ پوچھا تھا۔

"ہاں، ہاں لڑکا تو وہ بھی اچھا ہے اس کا نام بھی لکھ لو۔" تجویز کی فوری تائید کرنے والے چھوٹے ماموں تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کا کوئی سسرالی رشتہ دار امیدواروں کی فہرست میں نہ تھا، وہ قدرے غیر جانب دار تھے۔ بڑے ماموں نے بھی سر ہلا کر اس بات سے اتفاق کر لیا۔

بیلا کے چہرے پر خوش امیدی کے بڑے خوب صورت رنگ پھیلے تھے۔ عنائزہ نے صدق دل سے اس کے لیے دعا کی تھی۔ شیر دل کا ساتھ ملنے کا ایک امکان تو پیدا ہوا تھا۔ اس نے پھر دروازے کی جھری سے جھانکنا شروع کر دیا۔ بیلا کا بھائی اب جار میں پرچیاں ڈال رہا تھا۔

کتنا بزدل شخص تھا وہ۔ اس نے شیر دل کا نام لیا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہن کے دل کی خوشی سے کسی حد تک آگاہ تھا، لیکن وہ اپنے بڑوں کے سامنے لاڈلی بہن کے لیے کوئی اسٹینڈ نہ لے سکا۔ قرعہ اندازی کے ذریعے شیر دل کا نام نکلنے کا بس اک موہوم سا امکان ہی تھا نا۔ کیا بیلا کا کڑیل جوان بھائی اپنی بہن کی خوشیوں کے لیے اتنی سی ہی کوشش کر سکتا تھا۔

وہ دروازے کی جھری میں سے سبکتگین کو طیش کے عالم میں گھورے جا رہی تھی۔ اس کی بزدلی پر اسے شدید ترین تاؤ چڑھ رہا تھا۔

بیلا کے بھائی نے جار میں پرچیاں ڈال کر جار کو اچھی طرح ہلایا، پھر چھوٹے ماموں کے سب سے چھوٹے بیٹے ریان کو ان پرچیوں میں سے ایک پرچی نکالنے کا کہا۔

"جو قرعہ نکلے گا وہی حتمی تصور ہوگا نا بھائی جان؟" چھوٹے ماموں بڑے ماموں سے پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آجاؤ بیلا دیکھ لو۔ تمہاری قسمت کا فیصلہ ہوا چاہتا ہے۔" عنائزہ نے بیلا کے لیے جگہ خالی کی۔ اب عنائزہ کی جگہ بیلا آن کھڑی ہوئی۔ عنائزہ تاسف سے بیلا کو دیکھنے لگی۔

آج کے دور میں کسی لڑکی کی ایسی بے بسی سمجھ سے بالاتر تھی۔ جو حق اسے شریعت نے دے رکھا تھا وہ اس کے اپنے بڑوں نے سلب کر لیا تھا۔ جیون ساتھی کے انتخاب کے لیے اس کی مرضی پوچھنے کی زحمت کے بجائے پرچیاں ڈال کر اس کے ہونے والے شوہر کا انتخاب کیا جا رہا تھا اور مما چاہتی ہیں کہ ایسے فرسودہ رسم و رواج رکھنے والے خاندان میں میری شادی ہو جائے، اس نے استہزائیہ انداز میں سوچا تھا۔

"شیر دل۔" اتنے میں بڑے ماموں کی بارعب آواز گونجی تھی۔

ریان نے پرچی نکال کر انہیں تھمائی تھی اور انہوں نے پرچی کھول کر اس پر لکھے نام سے سب کو آگاہ کیا تھا۔ بیلا کی خوشی کے مارے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ جوش مسرت میں عنائزہ نے اسے اپنے ساتھ لپٹالیا۔

"دیکھا بیلا! اللہ نے ہماری دعائیں سن لیں۔ انہونی ہونی بن گئی۔" عنائزہ کی خوشی بھی دیکھنے کے لائق تھی اس کی ہمجولی کے من کی مراد پوری ہو گئی تھی۔ وہ خوش کیوں نہ ہوتی۔

"شیر دل بہت اچھا لڑکا ہے بابا جان۔ آپ اس کا نام نکلنے پر اتنے دل گرفتہ کیوں ہو رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری بیلا اس کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزارے گی۔" سبکتگین باپ کا مایوس چہرہ دیکھ کر انہیں تسلی دینے لگا۔ یہ مایوسی اس کے دونوں چچاؤں کے چہرے پر بھی دیکھی جا سکتی تھی، لیکن انہوں نے خاموش رہنے پر اکتفا کیا۔

"ہاں برخوردار فیصلہ تو ہو گیا اب اللہ سے یہی دعا ہے کہ اس فیصلے کو ہمارے حق میں بہترین ثابت کرے۔" آفاق صاحب کہتے ہوئے اٹھ گئے۔ باقی سب نے بھی ان کی پیروی کی۔ میٹنگ توقع سے جلد برخاست ہو گئی تھی۔

عنائزہ گھر کی جملہ خواتین کو خبر دینے لگی جو سب لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ بیلا نے شکرانے کے نفل ادا کرنے کے لیے جائے نماز سنبھال لی۔

لاؤنج سے ہوتی ہوئی عنائزہ پھر ہال کمرے کی طرف آنکلی اب وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ کمرے کے وسط میں آبنوسی میز پر شیشے کا جار دھرا تھا۔ اس نے بلا ارادہ ہی وہ جار اٹھالیا۔ شیر دل کے نام کی پرچی نکالی جا چکی تھی باقی تین پرچیاں اب بھی جار میں موجود تھیں۔ عنائزہ نے ویسے ہی ایک اور پرچی نکال کر کھولی تھی۔ بنا ارادے کے کیے جانے والا کام حیرت کے شدید ترین جھٹکے کا سبب بنا تھا۔

بیلا کے بھائی کی خوب صورت ہینڈ رائٹنگ میں اس پرچی پر بھی شیر دل کا نام ہی تحریر تھا۔ عنائزہ نے عجلت میں باقی دو پرچیاں کھول کر دیکھیں ان پر بھی شیر دل کا نام ہی جگمگا رہا تھا۔ وہ حیران ہو کر ان پرچیوں کو دیکھے جا رہی تھی کہ اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔

عنائزہ نے حواس باختہ ہو کر پرچیاں مٹھی میں دبا لیں آنے والا سبکتگین تھا جو یقیناً "سب کے جانے کے بعد "ثبوت" مٹانے آیا تھا۔ عنائزہ کو دیکھ کر وہ ٹھنک کر رکا۔ پھر اس نے خالی جار پر نگاہ ڈالی۔ اگلی سوالیہ نگاہ عنائزہ کے چہرے پر ڈالی تھی۔ اس نے چپ چاپ ہتھیلی کھول کر آگے کر دی، دونوں چند لمحوں تک ایک دوسرے کو تکتے رہے، پھر سبکتگین مسکرا دیا۔

"چلو شکر ہے یہ تم ہی تھیں۔"

"ایک فاؤل پلے کے ذریعے آپ نے اپنی بہن کو اس کی خوشیاں دلوائیں۔ کیا یہ کام سیدھے طریقے سے نہیں ہو سکتا تھا؟ اس کا تو یہ ہی مطلب ہوا کہ آپ میں جرات اور ہمت کا فقدان ہے۔" عنائزہ نے طنز کیا۔

سبکتگین کے چہرے پر جاندار مسکراہٹ بکھر گئی جیسے اس نے عنائزہ کا طنز انجوائے کیا تھا۔

"میری بات کا جواب نہیں ہے نا آپ کے پاس۔" عنائزہ اس مسکراہٹ پر تپ ہی تو گئی۔

"ذہانت کے بل پر جو کام آسانی سے ہو سکتا تھا۔ جرات اور ہمت دکھا کر اس کام میں مشکل پیدا کرنا میری نظر میں حماقت تھی، لیکن اگر جرات اور ہمت ہی واحد آپشن ہوتا تو اس کا مظاہرہ کرنے میں بھی مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوتی کیوں کہ بہر طور مجھے اپنی بہن کی خوشیاں کسی بھی دوسری چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔" وہ سادہ سے انداز میں کہتا واپس پلٹ گیا۔

اور دو ماہ بعد بیلا اور شیر دل کی منگنی کے ساتھ عنائزہ اور سبکتگین کی منگنی کی رسم بھی ادا کی جا رہی تھی۔ عنائزہ نے یہ فیصلہ دل کی پوری آمادگی اور رضا مندی کے ساتھ کیا تھا۔ بیلا کے بھائی جیسے شخص کا ساتھ ٹھکرانا ایک حماقت ہی تو تھی اور صد شکر کہ عنائزہ یہ حماقت کرنے سے بال بال بچ گئی تھی۔

مصباح علی



بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے مسلسل ان کے مشاہدے سے وہ کنفیوژڈ ہو رہا تھا اور وہ جو سوچ رہی تھیں وہ دکھائی دینے لگا۔ کسی کام میں ان کا جی لگنا مشکل تھا۔ ہر خوشی کرکری، بدمزہ۔ شادی میں صرف پندرہ دن تھے۔ کس سے پوچھیں، کس کو بتائیں۔ دو دن میں ان کے دماغ کی رگیں تک دکھنے لگیں اور پھر اس دن وہ عتیق الرحمان کے ساتھ شادی ہال کے انتظامات کے سلسلے میں منیجر سے مل کر گھر آیا ہی تھا کہ شام تک اسے بخار ہو گیا۔ رملہ کے شک کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھک گئی۔ وہ بہت دیر خاموشی سے اسے دیکھے گئیں پھر چائے بنا کر دی اور خود باہر آ گئیں۔ انہیں اپنی بے بسی پر رونا آ رہا تھا کہ اللہ نے ایک اولاد دی، وہ بھی... آہ! وہ بہت دیر آنسو بہاتی رہیں پھر ذہن میں کوندا لپکا۔

ہو سکتا ہے اتنا بڑا مسئلہ نہ ہو جتنا مجھے لگ رہا ہے، اب وہ مجھے تو کچھ بتا نہیں رہا، بس تسلی پہ تسلی... کیوں نہ ریان سے پوچھوں شاید اس سے ڈسکس کیا ہو، اگر نہیں بھی کیا تو شاید وہ خود کرے، دونوں بچپن کے گہرے دوست ہیں، پھر بے تکلف بھی۔



وہ اور برکہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں برکہ نے جو بھی پوچھا وہ بجھے دل سے "ہاں، نہیں" میں جواب دیتی رہیں۔ غالباً وہ ریان کا انتظار کر رہی تھیں جو خاصی دیر سے اپنے دوستوں کی طرف نکلا ہوا تھا جب وہ یہ کہہ کر جانے لگیں۔

"بھابھی! ریان آئے تو اسے میری طرف بھیجنا، ایک ضروری کام ہے۔" وہ گلاس ونڈو سے اندر کی جانب آتا دکھائی دیا۔ وہ پھر سے بیٹھ گئیں۔

وہ شکل سے خاصا الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ دیر مناسب نہیں لگا اس سے بات کرنا۔ آخر اندر کی ممتا بے کل ہونے لگی۔

"ریان بیٹا..." وہ چونکا۔

"بیٹا تم اس دن کیا بات کر رہے تھے "کیا ٹینشن ہے وجی کو..."

"آپ نے اس سے نہیں پوچھا...؟" الٹا سوال داغنے پر یکایک ان کا لہجہ بھی بدل گیا۔

"اگر وہ بتاتا تو تم سے پوچھتی... دیکھو بیٹا، میں ماں ہوں اس کی، اسے مجھ سے شیئر کرنا چاہیے تھا۔ اور اگر اسے کوئی عار محسوس ہو رہا ہے تو تم دوست ہو اس کے، بھائیوں کی طرح ساتھ رہے ہو، کھیلے کودے ہو، ایک دوسرے کو جانتے ہو، بیٹا! کسی طرح... تم اسے اعتماد میں لو۔" رازدارانہ انداز اختیار کرتے ہوئے ان کی آواز لحہ بہ لحہ مٹھنے لگی۔

"دیکھو بیٹا! آج کل میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے، بڑے بڑے قابل ڈاکٹرز ہیں، ہر طرح کا علاج ہو جاتا ہے، تم اس سے پوچھو تو سہی، میں بھیا سے کہہ کر شادی نکاح میں بدل دوں گی..."

"جج... جی..."

ان کے جملوں کا مطلب سمجھ میں آتے ہی اس کی چیخ نکلی، آنکھیں ابل پڑیں۔ برکہ ہونقوں کی طرح باری باری دونوں کو دیکھ رہی تھیں اور رملہ نے تو اب باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں بھابھی، میں بہت پریشان ہوں، مجھے آج سے پہلے کبھی سیف اتنے یاد نہیں آئے، کبھی اتنی کمی محسوس نہیں ہوئی جتنی ان چند دنوں میں محسوس ہوئی، کون پوچھے اس سے، بات بھی تو ایسی ہے۔ میرا تو دل ہول رہا ہے۔"



"او مائی گاڈ" چچی کی سمجھ پر ریان کا ماتم کرنے کو دل چاہا' ان کے ماں ہونے پر حقیقتاً "شبہ ہوا تھا۔

"چچی جان! جو آپ سوچ رہی ہیں' ایسا خدانخواستہ کچھ بھی نہیں ہے اور اگر اسے پتا چل گیا کہ آپ کیا سمجھ رہی ہیں تو۔۔۔ ویسے اسے پتا چلنا چاہیے۔ اچھا ہے' مزہ لے اپنی فرمانبرداریوں کا۔ جب ڈاکٹروں کے ہتھے چڑھے اور الٹے سیدھے ٹیسٹ ہوں۔" اس نے آخری جملے منہ میں بدبدائے۔ رملہ بھی گھبرا گئیں جانے کیا بڑبڑا رہا ہے۔

"کیا۔۔۔ کیا مطلب ایسا کچھ نہیں۔۔۔؟" انہوں نے ٹشو سے اپنی آنکھیں' ناک دونوں رگڑیں۔

"مطلب یہ کہ رشتہ کرنے سے پہلے اس کی مرضی پوچھی تھی؟"

"ہاں بیٹا! بات پکی کرنے سے پہلے میں نے اسے خود بتایا تھا' اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔"

"بتایا تھا۔۔۔ پوچھا تو نہیں تھا نا۔" وہ یک لخت بولا تھا۔

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو' کھل کر بات کرو ریان۔" بر کہ کے ناصحانہ انداز پر رملہ نے پہلے انہیں دیکھا پھر ریان کو دیکھتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں چچی' آپ نے اپنی خواہش کے اظہار سے پہلے اس کی مرضی پوچھی تھی' وہ کیا چاہتا ہے' اسے کون پسند ہے۔۔۔"

"بیٹا اس نے آج تک شرٹ' ٹائی' کوئی ڈرنک اپنی مرضی سے نہیں آرڈر کیا' ہر چیز میں کہتا ہے مما پہلے آپ بتائیں۔ اب یہ معاملہ میں نے پہلے بتا دیا تو کون سی قیامت آگئی۔"

انہوں نے اپنا رونا چھوڑ کر ناک سڑکی' ہر جملے پر لہجے کا اتار چڑھاؤ بدل رہا تھا۔

"مجھے تو خواہش ہی رہی کہ کبھی تو وہ ضد کرے مگر وہ تو اپنی مرضی تک نہیں کرتا۔"

"میری بھولی چچی۔۔۔" وہ ان کے شانوں کے گرد بازو پھیلاتا' بہت محبت سے اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔

"یہ اس کی زندگی ہے' کوئی شرٹ' ٹائی' یا ڈرنک نہیں۔ اس کی پل پل بدلتی کیفیت' اس کے دل کی ضد ہی ہے' مگر آپ تو کچھ سمجھ ہی نہیں رہیں۔" رملہ نے ناسمجھی سے بھنویں سکیڑیں۔

"چچی جان! وہ آپ کی محبت و فرمانبرداری میں منہ سے کچھ نہیں کہہ رہا' اوپر سے آپ نے چچا جان کی خواہش کا حوالہ دے کر کہنے کے لیے چھوڑا ہی کیا ہے' حالانکہ تب حائقہ بمشکل دو سال کی ہوگی' ایسے میں وہ بے چارہ اور کیا کہے۔" اس نے گود میں رکھا میگزین اٹھایا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"اگر اولاد تابعداری میں اپنی مرضی والدین کی پسند میں ڈھال لے' تو کیا ضروری ہے' اس کے دل سے نکلتے ہر راستے پر والدین اپنے سرپرست ہونے کا خراج وصولتے رہیں۔" اس کے سوالیہ سے طنز پر وہ بوکھلا گئیں۔

"تم سے کچھ کہا اس نے؟"

پھر جو وہ شروع ہوا' ہر کہ تو معمول کی طرح سنتی رہی گویا سب جانتی ہوں' مگر رملہ کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا' ایک جارہا تھا' دماغ سن ہونے لگا یادوں کے جھماکے شروع ہوئے۔

جس دن بھیا سے بات ہوئی تب وہ پہلے دن آفس گیا تھا' پھر سیدھا اپنے کمرے میں۔۔۔ میں تھکن سمجھتی رہی' اف خدایا! نخبہ کا اس کی پسندیدہ ڈشز سیکھنا اور اولاد کے ذکر پر وجہی کا قہقہہ' نخبہ کا کھسک جانا۔۔۔ لاؤنج میں بھی ان دونوں کے بیچ کوئی بات ہوئی تھی۔ وجہی کی الجھی شکل' نخبہ کا لاہور فرار' اب ریان کی آمد' دونوں الجھے ہوئے' دبی دبی گفتگو' انہوں نے سر تھام لیا۔

"نخبہ اس سے چند ماہ ہی بڑی ہے' اتنی فرینک نیس میں یہ جذبہ تو پنپ سکتا تھا' میری سمجھ پر پتھر کیوں پڑ گئے تھے' بھیا کی طرف خواہ میری ہی خوشی کے لیے جاتا ہو۔۔۔ اب کیا کروں۔۔۔ بڑا میرا فرینڈ بنا پھرتا ہے' فرمانبردار کا دل تو قابو میں نہیں' اسے تو میں اب بتاؤں گی۔"

ان دونوں کے روکنے کے باوجود وہ سراسیمگی کی کیفیت میں وہاں سے اٹھی تھیں۔

☼ ☼ ☼

گھر تک کے چھوٹے سے فاصلے میں ایک ہی جملہ ذہن میں گردش کرتا رہا۔

"بتایا تھا۔۔۔ پوچھا تو نہیں تھا نا۔" واقعی! آج تک میں نے کسی معاملے میں اس کی مرضی نہیں پوچھی۔ صرف بتاتی ہی آئی۔

کیا اچھا ہے' کیا برا ہے' کیا کھانا ہے' کہاں کھیلنا ہے' کس سے ملنا ہے اور یہ سب اسی کے لیے کیا تھا' ڈرتا بھی تو اتنا تھا۔ بس انگلی پکڑ کر ساتھ لپٹائے رکھا۔

حالانکہ برسوں پہلے His first flight (ہز فرسٹ فلائٹ) میں چھوٹے سے بگلے نے بتا دیا تھا' اولاد کو خود اعتمادی دینے کے لیے ہلکا سا دھکا دینا پڑتا ہے اور میں نے محبت میں اسے اپنے پروں میں دبا کر رکھا' احسان مندی کے خوف سے نجات ہی نہ دی۔

جانے میرے بچے نے کہاں کہاں نہ چاہتے ہوئے میری پسند کا احترام کیا۔ وجہی! مجھے احساس کیوں نہ ہوا کہ تمہاری پسند جاننے کی کوشش کرتی۔ ہاں ایک بار پوچھا تو تھا "چکر" کر" تب تو کہا تھا آپ پروپوز کریں گی' اب مجھے کیا پتا وہ مذاق تھا یا مناسب وقت کا انتظار۔۔۔ کاش! ایک بار پھر پوچھ لیتی۔

☼ ☼ ☼

اس کا سیل بہت دیر سے تھرتھرا رہا تھا۔ پھر نانی اماں نے ریسیو کیا۔ رسمی سلام دعا کے بعد بتانے لگیں۔

"بیٹا وہ شاید اندر ہے' میں بلاتی ہوں اسے۔۔۔"

انہوں نے نخبہ کو پکارا اور پھر اسے سیل تھماتے ہوئے بتایا تھا۔

"وجہی کا فون ہے۔۔۔"

پل بھر میں اس کا سرخ و سفید رنگ لٹھے کی مانند ہو گیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں کے گرد وقتی حلقے ابھرتے محسوس ہوئے۔ کتنی دیر نازک ہتھیلی اسپیکر پر ثبت رہی پھر سائیڈ پر ہوتے ہوئے سیل کان کو لگا لیا تھا۔

دونوں جانب مکمل سناٹا۔

سماعتیں دل کی دھڑکن بن گئیں' دونوں اس دھڑکن کو جذب کر رہے تھے۔

کان اک دوجے کی گویائی کے منتظر تھے۔ آخر وجہی نے کمبل سر تک تانتے ہوئے کروٹ بدلی اور پہل کی۔

"خاموش کیوں ہو' کچھ تو بولو۔۔۔"

"کہنے کو کچھ رہا ہی نہیں۔۔۔" جملہ بمشکل ادا ہوا تھا۔

"کب آؤ گی۔۔۔؟" ٹوٹی پھوٹی کھوکھلی آواز اسے خود بھی اجنبی محسوس ہوئی۔

"مجھے اپنی بے بسی کا تماشہ نہیں دیکھنا۔۔۔"

"اپنی کا نہ سہی' میری کا دیکھنے آجاؤ۔۔۔"

"مشکل تو یہی ہے، تمہیں بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔۔۔ جب محسوس ہوگا، تم اپنی زندگی میں مطمئن ہو تو آجاؤں گی۔" نخبہ کی آواز پاتال میں اترتی گئی۔

"ہونہہ، مطمئن۔۔۔؟" اس نے حظ اٹھاتے ہوئے کروٹ بدلی۔

"نخبہ! ایک بہت پرانی بات یاد آرہی ہے، شاید تمہیں بھی یاد ہو، ایک دن میں اسکول سے آیا اور مما گھر میں نہیں تھیں، تب پاپا کی ڈیتھ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، ماموں جان بھی آئے ہوئے تھے، وہ مما کو کسی بات کے لیے قائل کررہے تھے، شاید دوسری شادی کے لیے، کوئی پروپوزل تھا شاید۔۔۔ وہ اکثر کہتے تھے، وجہی کو میں رکھ لوں گا، اس کے تایا رکھ لیں گے، بس تم اپنی زندگی آباد کرو، پہاڑ سی زندگی، مشکلات، تنہائی جانے کیا کیا۔۔۔ شاید مما ایگری بھی ہوگئیں تھیں یا مجھے لگیں اور اگلے دن میں اسکول سے آیا اور مما، ماموں دونوں غائب۔"

اس نے توقف کے دوران لمبی آہ بھری۔ "میں نے بیگ پھینکا اور تمہارے گھر دوڑ لگائی، تائی امی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئیں۔۔۔ نخبہ! میں اس وقت کی اپنی کیفیت کبھی ایکسپلین نہیں کرسکتا، جیسے سانس رکنے لگا ہو، جیسے کنویں میں گر گیا ہوں، پوری دنیا میں تنہا۔۔۔ مجھے پاپا بہت یاد آئے اور دنیا کا ہر شخص ہر مرد، ماموں سمیت برا لگا، مجھے شدت سے اپنی بے بسی پر رونا آیا اور میں بہت رویا بھی تھا، اس دن کا رونا میں کبھی نہیں بھولا، میں نے رو رو کر اللہ سے دعا کی، میری مما آجائیں، میں انہیں کبھی تنگ نہیں کروں گا، ہر بات مانوں گا، یقین کرو نخبہ، جب وہ آگئیں تو میری نکلی سانسیں بحال ہوگئی تھیں۔" وہ کچھ دیر بعد پھیکا سا مسکرایا۔

"یار پتا ہے، مما، ماموں جان کے ساتھ بازار گئی تھیں، گھر کا کچھ سامان لینے۔ میں جانے کیا کیا سمجھا بلکہ رات کو خوف سے ٹمپریچر بھی ہوگیا تھا، اس رات مما نے مجھے بہت پیار کیا اور ایک ہی بات سمجھائی تھی کہ ہمیں کوئی الگ نہیں کرسکتا، اگر تم میری بات مانو گے، گندے بچوں کی طرح روؤ گے نہیں، ضد نہیں کرو گے تو۔۔۔ کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی، انہوں نے تو شاید ویسے ہی بات کہی تھی مگر میرے دل پر نقش ہوگئی، جتنا رونا تھا اس دن رو لیا تھا پھر کبھی نہیں رویا، صرف اس خوف سے کہ مما چلی نہ جائیں خواہش، پسند، مرضی سب میری ڈکشنری سے نکلنا شروع ہوگئے کہ بس مما کو خوش رکھنا ہے، یس مما، اوکے مما، جی مما روٹین بن گئی، ریان اور تم سے دوستی بھی اسی لیے ہوئی کہ تم دونوں مما کو پسند تھے، یہ پسند جانے کب دل کی ضرورت بن گئی مجھے پتا ہی نہ چلا۔۔۔" وہ خاموش کسی بت کی طرح سنتی جارہی تھی۔

"نخبہ میں مما کو ہر بات بتاتا تھا، صرف یہی بات چھپائی تھی، وہ بھی اس لیے کہ ابھی میں پڑھ رہا ہوں، اپنے پیروں پر نہیں کھڑا، وہ جلدی میں تایا ابو سے ذکر نہ کردیں، اگر انہوں نے اس وجہ سے انکار کردیا، تو مما کو بہت تکلیف ہوگی اور ان کی تکلیف میں برداشت نہیں کرسکتا اور جب میں کسی قابل ہوا تو بہت دیر ہوگئی تھی، میں ہزار چاہتے ہوئے بھی ان کی خواہش رد نہیں کرسکتا۔"

وہ کسی ٹرانس کی صورت بولنے کے بعد بہت دیر چپ رہا آنسو کن پٹی سے بہہ کر تکیے میں جذب ہوتے رہے۔

"یار! اس دن بھی ایک عورت کے بچھڑ جانے کے خوف نے مجھے رلا دیا تھا، اب اتنے برس گزر جانے کے بعد آج بھی اتنی ہی شدت سے اپنی بے بسی پر رونا آرہا ہے۔۔۔ صرف ایک عورت کے بچھڑ جانے کے خوف سے، تب مما تو میرے لیے آگئی تھیں مگر تم، تم شاید کبھی بھی میرے لیے نہ آؤ۔۔۔ آئی ایم سوری یار۔۔۔ یہ یتیمی بہت بری چیز ہے، انسان سے اس کی پسند اور فیصلے کا ہر حق چھین لیتی ہے۔۔۔ آہ۔"

"ٹھہر جا کمینے! تجھے اپنی یتیمی پر رونا آرہا ہے، اچھی طرح رلاتی ہوں۔۔۔"

رملہ مختلف سوچوں میں الجھی جانے کون کون سے

تانے بانے بنتی گھر تک آئیں اور سیدھی اسی کے کمرے میں آگئیں۔ جہاں وہ بخار میں پھنکتا کمبل میں لیٹا تھا اور رندھی آواز میں کسی سے فون پر اپنی بے بسی بگھار رہا تھا۔ کمبل سے ٹکرا کر آواز پھیلتی محسوس ہوئی وہ سمجھنے کے لیے مزید آگے آئیں مگر وہ اتنا محو تھا کہ ان کی آمد محسوس نہ کرسکا۔

اس کے لہجے اور جملوں پر جہاں ان کا جی بھر بھر کے آتا رہا' اپنی عقل کو کوستی رہیں وہاں فیصلے اور پسند کے حق کا سن کر جی چاہا کمبل میں لپٹے کو ہی دھنک دیں' پھر سوچا چلو جہاں اتنا چھپایا ہے تو فرمانبردار اولاد چھپا ہی رہنے دے' ویسے بھی اب ہو کیا سکتا ہے' شادی سر پر ہے' تیاریاں ہو گئیں۔ آدھے کارڈ بٹ گئے' آدھے رہ گئے۔ تمہیں تو ویسے ہی صبر کرنے اور اپنی خواہش کا گلا گھونٹنے کی عادت ہے' میں تو جابر ماں ہوں' من مرضی کرنے والی۔



شادی میں ہفتہ تھا اور تمام تیاریاں عروج پر تھیں۔ اس کے بخار کو زیادہ خاطر میں لایا گیا بس تایا ابو ہی صبح شام میں یاد سے پوچھنے آتے اور دوا کا یاد کرواتے رہے۔ دوا سے بڑی بڑی بیماری دور ہو جاتی ہے۔ یہ تو بخار تھا' بھاگ گیا البتہ نقاہت کافی تھی۔ ماموں جان کا شاہدرہ سے اسلام آباد چکر لگا' ایک اس کی طبیعت پوچھنا تھی پھر کچھ چیزوں کے سائز وغیرہ چیک کرنا تھے۔ تایا ابو کو بھی اسی سلسلے میں اچانک وہاں جانا پڑا۔ واپسی پر لاہور بھی یقیناً" گئے ہوں گے' مگر وہ ساتھ نہیں آئی تھی۔

ادھر ادھر سے تمام مہمان آگئے تھے۔ خاصی پر تکلف مہندی کی رسم ادا ہوئی۔ ہر کوئی خوش تھا۔

خلاف توقع ریان نے بھی اس حقیقت کو قبول کرلیا اور بھائی کی سرا بندی پر بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ اس کی بارات اسلام آباد سے براستہ موٹروے شاہدرہ کی طرف روانہ تھی۔ شاہدرہ کے ٹول پلازہ سے اتر کر گاڑی' پیٹرول پمپ پر کچھ دیر کے لیے رکی۔

ماموں جان اپنی چھوٹی بیٹی کے ہمراہ وہاں پہلے ہی منتظر تھے۔ وہ اپنی گاڑی سے اتر کر وہاں آئے۔ سہرا بندی کی مبارک باد دی۔ غالباً" انہوں نے بارات کا استقبال کرنے کے بجائے یتیم بھانجے کا باراتی بننا پسند کیا تھا۔ مبادا بیوہ بہن کے دل میں تنہائی کا خیال نہ آجائے۔ بیٹی کی بارات کا استقبال کرنے کے لیے گھر پر بہت سے عزیز تھے۔ پھر وہاں ہی جانا تھا' اپنوں میں کیا فرق پڑتا ہے۔ چھوٹی بیٹی نے آگے بڑھ کر وجی سے باگ پکڑائی (نیگ) کا مطالبہ کیا۔ وہ کوفت سے ماں کو دیکھنے لگا تھا۔

"ہاں بیٹا دو اسے' یہ بہنوں کا حق ہے' بارات چڑھنے سے پہلے ہی دیتے ہیں۔"

"اور کیا بھائی" چھوٹی چہکی۔ "اب آپ کی کوئی بہن تو ہے نہیں جو وہاں وصول کرتی' ایمرجنسی میں مجھے ہی بننا پڑا' اسی لیے بابا جان کو بھگا لائی ہوں' آخر وہاں جاکر دودھ پلائی میں سالی کے فرائض اور پھر واپسی پر دروازہ رکائی بھی تو لینا ہے۔"

"ارے واہ!" قریب ہی سجا سنورا ریان چلایا۔ "شام تک تو خوب ٹول ٹیکس اکٹھا ہو جائے گا۔"

وجی نے اسے گھورا' آج اسے معمول سے ہٹ کر ریان پر غصہ آرہا تھا اس کی نک سک تیاری پر گھر میں بھی کڑھتا رہا۔

"تم کس خوشی میں اتنا سنور رہے ہو۔" اپنا دل کیا جل رہا تھا ہر کسی کی تیاری کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔ اوپر سے زلفیں سنوارتا ریان۔

"یار! اب تیرا کوئی چھوٹا بھائی تو ہے نہیں' جو شہ بالا بنتا' چل پھر اپنے سے بڑے پر ہی اکتفا کر بچہ' تو بھی کیا یاد کرے گا۔"

اس نے وجی کی کمر پر تھپکی لگائی جواباً" اس نے آنکھیں نکالیں۔ اب اس وقت بھی اس کے چمکتے دانت اسے سب سے برے لگ رہے تھے۔ اس نے گھورتے ہوئے جیب سے پیسے نکالے اور بغیر پس و پیش کے چھوٹی کو تھما دیے اور اس نے بھی شرافت

سے رکھ لیے۔ غالباً "پیٹرول پمپ پر ٹینگ وصولنا خاصا
عجیب سا تھا۔ خواہ مخواہ لوگ سمجھ رہے ہوں گے بی بی
بلیک میں پیٹرول فروخت کر رہی ہے۔

☆ ☆ ☆

بارات شاہدرہ کراس کرکے لاہور کے مشہور میرج
ہال کی طرف بڑھ رہی تھی غالباً "شاہدرہ (لاہور کا نواحی
علاقہ) کا میرج ہال ماموں کو پسند نہیں آیا تھا۔ پھر پہلی
بیٹی کی شادی، برات بھی اچھے خاصے گھرانے کی تھی تو
زبردست ہوٹل بک کروایا تھا۔

برقی قمقموں سے تمتماتی ہوٹل کی پارکنگ، لان
کے پودوں میں لگی وائٹ لیزر لائٹس اور راہداری کے
دونوں جانب میوزیکل بینڈ کی رومانٹک دھن،
زبردست سماں بندھا تھا۔

وہ تایا ابو، ماموں جان اور مما کے ہمراہ ہال کی داخلی
سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے چونکا۔ سامنے موتیے،
گلاب کی خوب صورت مالا پکڑے تائی امی، ریان،
ممانی، چھوٹی اور بھی بہت سی خواتین کھڑی تھیں۔
اسے حیرانی ہوئی۔ ابھی تو یہ لوگ بارات میں شامل
تھے۔ سارا رستہ شہ بالا کی گردان کرتا آیا اور اب
استقبال لپٹا لپٹا کر کر رہا ہے۔

اپنوں میں رشتے کرنے کی عجیب ہی صورت حال
ہے۔ جب جس رشتے میں فائدہ دیکھا بھاگ کر اپنا لیا۔

وہ پھولوں کی بارش میں نہاتا اسٹیج تک پہنچا تھا۔ کچھ
ہی دیر بعد قاضی صاحب بھی رجسٹر بغل میں دابے آن
موجود ہوئے۔ انہوں نے نکاح کا خطبہ شروع کیا تھا۔
وجی کی دلچسپی کسی چیز میں نہیں تھی۔ صرف جوتوں کی
نوک کا زور کارپٹ کے فر پر نکل رہا تھا۔ جب قاضی
صاحب نے کہا قبول ہے۔ تو وہ جیسے نیند سے جاگا اور
انہیں غور سے دیکھا۔

"وجاہت سیف الرحمان آپ کو بعوض حق مہر
فاطمی نخبہ عتیق الرحمان اپنے نکاح میں قبول
ہے...." ہونٹ وا، سانس پھیپھڑوں میں، روبوٹ کی
صورت ایک نظر سب کو دیکھا اور پھر نظر سیٹی کے انداز
میں ہونٹ سکیڑے ریان پر ٹک گئی۔

"اب تو پھوٹ دے یا مما سے ہی پوچھے گا خبیث،
اپنی فرمانبرداریوں میں مجھے کیوں رگڑا دے رہا ہے۔"
ریان نے کان میں سرگوشی کی۔

کنپٹی، بھنویں، تنے اعصاب "اقرار" کرتے ہوئے
ڈھیلے پڑ گئے۔

غالباً "یہ اس کی اور رملہ کی ملی بھگت تھی کہ جب
نے ہم سے سب چھپایا تو ہم بھی کیوں نہ چھپائیں۔
اتنی سزا تو بنتی ہے۔ ہم خیال تایا ابو اور تائی امی نے
بھیا کو اسی لیے اچانک اسلام آباد بلا کر سارا معاملہ
عتیق الرحمان نے سامنے رکھا تھا۔

"دیکھو میاں، میرے تین ہی بچے ہیں، صرف ایک
غلط فیصلے سے تینوں زندگی گزاریں گے ضرور مگر ٹوٹے
پھوٹے بجھے دل سے اور تمہیں کون سا اچھا لگے گا کہ
تمہاری پہلی اولاد ایک ان چاہی بیوی بن کر وقت
بتائے، جب کہ اس کے لیے خوشیوں کے در کھلے ہوں
اور کوئی صدق دل سے چاہ رہا ہو، گھرانہ وہی ہے، فرق
صرف اتنا ہے میرا چھوٹا بیٹا نہیں بڑا بیٹا۔"

ماموں نے سوچنے کا وقت مانگا۔ تین دن بعد عتیق
الرحمان رسماً "رشتہ مانگنے شاہدرہ گئے تھے۔

بچپن میں نانی اماں نے کہا تھا کہ اپنی بڑی نواسی کو
میں خود رخصت کروں گی، کبھی کی کہی عین وقت پر
پوری ہوئی۔

لاہور کے ہوٹل میں ریان اور وجی دونوں کی
ماموؤں نے مشترکہ انتظام کیا تھا۔ دونوں کا باری باری
نکاح ہوا۔ ریان کی چھٹی ختم ہو رہی تھی اور چند ماہ بعد
وہ اتنی چھٹیاں لے کر ضرور آئے گا کہ حائقہ کو
رخصت کروا کر ہمراہ دبئی لے جائے۔ البتہ نخبہ کی
رخصتی آج ہی تھی۔

زرتار۔۔۔ گلابی دوپٹے سے اس کے سرخ رخسار
جھانک رہے تھے۔ اس نے پلکوں کی بھاری ردا اٹھا کر
بیک ویو مرر میں وجی کی آنکھوں میں دیکھا، جہاں
زندگی کے داؤ پیچ سے بھرے کنارے مسکرا کر اسے
خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

☆

آسیہ رزاقی

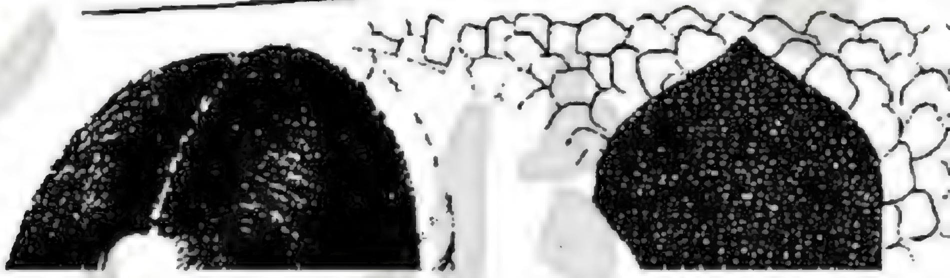
فیصلہ سامنے ہی تھا

وہی محلہ تھا' وہی گلی' وہی رہائش' لیکن کل کے مقابلے میں آج سب کچھ بہت اچھا۔ بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ کل موسم گرم تھا۔ آج وہ بھی نرالی ردا اوڑھ کر بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگا تھا۔ سورج کی کرنوں نے بادلوں کے اندر سے شرمائی ہوئی چھب دکھلائی اور یکدم نارنجی رنگ کی گوٹ نے بادلوں کے کنارے سجادیے۔ ہر سمت گلابیاں بکھر گئیں۔ خود بہ خود ایک سرشاری کی کیفیت طاری ہو گئی۔

کل بھی یہی گلی یہی محلہ تھا' لیکن دل گرفتی کے عالم میں بیٹھی سوچتی رہی کیا کروں۔ گرد آلود برآمدہ۔ پتوں سے بھرا آنگن۔ کمروں کی حالت بھی چنداں اچھی نہ تھی۔ چند گھنٹے گزارنے مشکل ہو گئے۔ دیوار پر لگی تصویروں کی گرد کپڑے سے صاف کی۔ اور اکتا کر بھاگی رافعہ کی طرف۔ لیکن آج جسم میں چونچالی تھی۔ مستعدی اور سرخوشی۔ بڑا معرکہ سر کیا تھا اس نے آج۔ زاہد ماموں کی مہربانی اور تعاون کی وجہ سے۔ رافعہ کے گھر سے اماں کو لانے میں کامیابی ہوئی۔

چار دن پہلے وہ لندن سے آئی تھی۔ مستقبل سے خوف زدہ۔ اندیشے اور تفکرات۔ معلوم تھا بلکہ اندازہ تھا کہ یہاں کوئی اس کی آمد سے خوش نہیں۔

مکمل ناول



ائیرپورٹ کی وسیع دنیا، بے شمار لوگوں کا جم غفیر۔ کوئی عزیزوں کو الوداع کہنے آیا تھا تو کوئی خوش آمدید کے لیے۔ کسی کو وطن روانگی کی خوشی تو کسی کی پلکیں خدا حافظ کہتے ہوئے بھیگی بھیگی تھیں۔ کوئی اپنوں سے ملاقات پر شاداں و فرحاں۔ کوئی جدائی کے غم سے نڈھال۔ مگر اس کو خوش آمدید کہنے والا کوئی نہ تھا۔ حالانکہ وہ رافعہ کو اطلاع دے چکی تھی۔ لیکن.....

ماموں جان تو مصر تھے کہ وہ واپسی کی حماقت نہ کرے۔ اتنی شان دار جاب چھوڑ کر.... غیر یقینی حالت میں واپس جانا۔ جہاں کوئی اس کے اس اچانک پروگرام سے متفق نہ تھا۔ خود ماموں جان اسے یقین دلاتے رہے کہ وہ اس کے لیے اچھے علاقے میں اپارٹمنٹ لے کر اسے وہاں سیٹ کر دیں گے۔ وہ بہت آرام سکون سے رہ سکتی ہے۔ یا پھر کسی معقول مشرقی لڑکی کے ساتھ رہ لے تنہائی کا مداوا ہو سکتا ہے۔ یا پھر۔

"اپنی اماں کو بلا کر رکھو۔ چند ماہ رہ کر وہ بھی دیکھ لیں گی۔ پھر کچھ دن بعد بلا لینا۔ انہیں بھی اطمینان ہو جائے گا۔"

لیکن.... ماموں جان کے احسانات کے باوجود۔ وہ ان سے متفق نہ ہوئی۔ فیصلے کی گھڑی آگئی تھی۔ یہ ملک اس کے لیے پانچ سال بعد بھی اجنبی تھا۔ نہ یہاں کے ماحول سے مانوس ہوئی۔ نہ معاشرت سے۔ وہ بذات خود یہاں مستقل قیام کی نیت سے نہیں آئی تھی۔

ماموں جان نے اس کی قابلیت کو صیقل کرنے کے ارادے سے یہاں کی تعلیم ضروری سمجھی۔ اب بعد میں سب نے کچھ اور پروگرام بنا لیا۔ تو اس میں وہ خود ذمے دار ہرگز نہ تھی۔ اپنا ملک بہت غیر ترقی یافتہ سہی۔ وہاں ترقی کا امکان کم سہی۔ دولت کا حصول مشکل.....

تو وہ کب دولت کمانے گئی تھی۔ وہ تو صرف ماموں جان کی خواہش پر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آئی تھی۔ بے شک ماموں جان اور مامی نے اس کا بہت خیال رکھا۔ ہر طرح کا آرام دیا۔ لیکن لندن کی پرانی عمارت۔ شہر کی خوب صورتی۔ بازاروں کی رونق، شاہراہوں کی جگمگاہٹ۔ یہاں تک کہ افسانوی موسم سے بھی ربط نہ ہو سکا۔ اجنبی تھی اجنبی رہی۔ دھند میں لپٹا اداس شہر کوئی خوشی نہ دے سکا۔ چند دوست وہ بھی تعلیمی اداروں سے متعلق.... ہاں بس ایک سارا تھی۔ جو کبھی کبھار اسے ساتھ لے جاتی تھی سیر کے لیے۔ موسم کا لحاظ کر کے۔ ورنہ شانی کو بارش اور دھند بالکل پسند نہ تھی۔ خصوصاً" لندن کی بارش۔ اف کبھی جب سورج چمک کر رونق بکھیرتا تو لندن کے لوگ خود ہی جشن منانے تفریح گاہوں کی رونق بڑھانے آجاتے۔

اور اب..... دھند کی اداس فضا۔ سیلی ہوئی پرانی عمارتیں، کائی زدہ سوگوار ہوا۔ وہ سب کچھ چھوڑ آئی۔ ترقی، دولت، رنگینی، شہر، شاندار مستقبل۔ کسی لالچ نے سدراہ ہونے کی کوشش نہ کی۔ یا اس نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کامیاب ہونے نہ دیا۔ ایک احساس قوی تر تھا۔ یہ شہر اس کے لیے سازگار نہیں۔ وہ خود کو بدلنے کے لیے تیار نہ تھی اور کوئی اس کی فرسودہ خیالی کا حامی نہ تھا۔ خود اپنے پاکستانی لوگ مذاق اڑاتے۔

"دیکھنا ہے۔ یہ دوپٹہ کب تک تمہارا ساتھ دیتا ہے۔" دوپٹہ نہیں تو شال۔ اسکارف یا ٹوپی، اماں نے آتے وقت نصیحت کی تھی۔

"دیکھ بچی! جا تو رہی ہے۔ ایک بات یاد رکھنا۔ یہ دوپٹہ سر سے الگ نہ ہو۔ یہ دوپٹہ عورت کی حیا کی علامت ہے۔ کہنے کو معمولی کپڑا ہے۔ مگر دیکھنے والوں پر اس کا رعب پڑتا ہے۔ وہاں تو یہ نظر نہیں آئے گا۔ مگر تم کو یاد رکھنا ہے۔ کہ تم یہاں پڑھنے آئی ہو۔ وہاں کا فیشن سیکھنے نہیں۔"

وہ اماں کی ہربات پر عمل کرتی تھی۔ خواہ کوئی کتنا ہی مذاق اڑائے اور اب ماموں جان کی محبت اور احسانات کا بوجھ اٹھائے۔ واپسی کا سفر.... ہاں۔ اپنا ملک.... گرم

موسم۔ چمک دار سورج۔ گرد آلود ہوائیں۔ لوگوں کا جوش اور مجمع کی ہلچل بہت ہی دل خوش کن تھی۔

ٹیکسی کے سفر میں پرانی یادوں کا پٹارہ کھل گیا۔ وہ کیسی معصوم اور بے فکر تھی۔ ہنستی، کھلکھلاتی شوخ لوگ اسے بلبل ہزار داستان کہتے۔ اماں اس کی باتوں کو بکواس۔ ہائے اماں کی بدگمانیاں اور اس کی بے نیازیاں۔

☼ ☼ ☼

رافعہ کا رشتہ آیا ہوا تھا تو اماں ابا سر جوڑے کچھ حساب کتاب کر رہے ہوتے۔ کپڑے 'زیور' برتن' دعوت' اخراجات' وہ چپکے چپکے آکر کن سوئیاں لیتی۔ جو بات پلے پڑ جاتی۔ جھٹ جا کر پھپھو کے ہاں سناتی۔ ابھی رافعہ کا بی اے کا امتحان ختم ہوا کہ منگنی کا سلسلہ چل پڑا' ساتھ ہی پھپھو اور اماں میں سخت ناچاقی۔ ہر وہ بات جو اماں ابا کے درمیان رازداری سے طے ہوتی۔ پھپھو کو اس کا علم ہو جاتا۔ اماں حیران ہو کر ابا سے پوچھ گچھ کرتیں۔

"کتنا منع کیا تھا میں نے کہ کسی کے سامنے ذکر نہ کرنا۔ مگر آپ کیا مجال کہ کوئی بات پیٹ میں رہنے دیں۔ بہن کے آگے ضرور ہی اگلنا ہے۔"

"لو بھلا... میں نے تو کسی سے کچھ کہا ہی نہیں' پاگل ہوں جو بیکار باتیں کروں گا۔ میرے اپنے مسائل کم ہیں' جو ہر کسی کے سامنے رونا روؤں۔"

"تو انہیں پلاٹ کے فروخت کی خبر کس نے دی۔ آ گئی تھیں اپنا حق جتانے۔"

"پلاٹ... حق... کیوں بھئی۔ میرا اپنا پلاٹ ہے۔ ترکہ تو نہیں جو..."

"ہاں مگر ان کا کہنا ہے کہ بھائی کے ہر معاملے میں بہنوں کا حصہ ہوتا ہے۔ جائداد موروثی ہو یا ذاتی۔ پلاٹ میں ان کا بھی حصہ ہے۔"

"چلو پھر۔ میں اسے فروخت کروں گا ہی نہیں۔"

پھر ایک دن جہیز میں زیور دینے کا بھی ذکر ہوا۔ جو اس نے سنا۔ جا کر منی آپا کو سنا دیا۔ پھپھو پھر آ موجود ہوئیں۔

"اے بھاوج! یہ کیا سن رہی ہوں میں۔ رافعہ کو دو سیٹ دیے جائیں گے؟ تمہارے دو سیٹ ہیں ایک جہیز ایک بری کا۔ ایک رافعہ کو دینا۔ ایک شافعہ کے لیے رکھنا۔ ضروری ہے کہ قرض ادھار کر کے سمدھیانہ خوش کرو۔ ایسی کون سی اعلا سسرال مل رہی ہے بچی کو۔"

"آپا' بری کا سیٹ تو یوں بھی دینے کے لائق نہیں۔ چھلکا سا تو تھا۔ زنجیر اس کی ٹوٹ گئی۔ پتے اس کے جھڑ گئے۔ رہ کیا گیا اس میں' ذرا سی جگنی بس۔"

"مگر میں نے سنا ہے تم قرض لے کر دوسرا سیٹ بھی دو گی۔ میرے بھائی پر تو بوجھ ہو گا ناں' آئندہ کا بھی سوچنا چاہیے۔ مگر سلیقہ اور عقل ہو تب۔"

اماں بے چاری بوکھلا گئیں۔ رات ہی ابا سے سرگوشیاں کر رہی تھیں کہ قرض لے کر ایک سیٹ بنوا لیں گی۔ پھر کمیٹیاں ڈال کر ادائیگی کر دیں گی۔ انہیں

راتوں رات یہ خبر کہاں سے ملی۔ جو آگئیں صبح صبح۔

"پوچھتی ہوں بھائی سے۔ کیسے بھائی ہو' بہنوں کا خیال نہیں۔ بہنوں کا تو میکہ بھائی کا گھر ہوتا ہے۔ بہنوں کو بھائی پر مان ہوتا ہے۔ یہ کیا کہ اپنی چھٹنکی سی بٹی کا رشتہ کرنے بیٹھ گئے۔ بھانجیوں کا ذکر ہی نہیں۔ فکر ہی نہیں۔ میری تو تین بیٹھی ہیں۔ نہ تمہیں ان کے رشتے کی پروا نہ جہیز کا خیال۔"

"آپا' میں برابر فکر میں ہوں۔ کیوں پریشان ہوتی ہیں آپ۔ ماشاء اللہ آپ کی بچیوں میں کوئی کمی تو نہیں۔ اپنے وقت پر سب کے رشتے ہو جائیں گے ان شاء اللہ۔" ابا بھی گڑبڑا گئے۔

"ارے ہاں بھئی۔ تمہارا کوئی بیٹا ہوتا۔ تو مجھے کیا فکر ہوتی۔ ایک لڑکی تو تمہارے گھر نپٹ جاتی۔ دو ہوتے تو دو۔ مگر نہ جی نہ' اولاد تو مرد کے نصیب کی ہوتی ہے۔ تمہارے نصیب بھی تو لڑکیوں کی فوج لکھ دی گئی۔"

پھپھو زیادتی کر گئیں۔ خود تو چار بیٹیاں لیے بیٹھی تھیں اور دو بھتیجیوں کو فوج بنا دیا۔ گو کہ ایک بے چاری اور بھی تھی۔ مگر پیدا ہوتے ہی ختم۔ جب سے اماں اور بھی رنجیدہ رہنے لگیں۔ اس سے پہلے بھی ایک صدمہ اٹھا چکی تھیں۔ رافعہ کے بعد جڑواں بچوں کی خبر ملی۔ ایک لڑکا ایک لڑکی کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ شافعہ تو پیدا ہو گئی ٹھیک ٹھاک۔ لڑکا سانس نہ لے سکا۔ نانی اماں نے کہا۔

"ارے یہ۔۔۔ شانی کی بچی۔ اپنے ساتھ آنے والے بھائی کو کھا گئی۔"

اسے متلی ہوتی تھی یہ سن کر بھائی کو کھا جانا۔ آخ تھو۔ سارا الزام شافعہ کے سر آیا کہ یہ ہی منحوس جو آنے والے بھائی کا راستہ روک لیا۔ ایک کو کھا گئی۔ اگلا کوئی آیا نہیں۔ بہن آئی تو وہ نہ رہی۔ ارے یہ مر جاتی۔ لڑکا زندہ ہوتا۔ کم از کم ساس نندوں کے طعنوں سے تو بچی رہتی ماں۔"

رافعہ تو سب کی لاڈلی دلاری' آنکھ کا تارا۔ شافعہ منحوس ہونے کے باعث نظروں سے گری ہوئی مخلوق

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شافعہ نحوست کی "پوٹلی" کے طعنے سن سن کر ڈھیٹ ہوتی گئی۔ ڈھیٹ سے ڈھیٹ تر۔۔۔ ہنستی رہتی۔ ہنساتی رہتی۔ لوگوں کو لطیفے سنا کر خوش کرتی۔ اماں مزید ناراض۔ وہ ان کے خود جا کر لاڈ کرتی۔ اس قدر ہنسانے کی کوشش کرتی۔ بہت ہوا تو منہ پھیر کر مسکرا دیتیں۔ بس اتنی ہی محبت کافی تھی۔

نانی اماں ایک بار آئیں۔ سیڑھی سے پھسل کر گرتے گرتے بچیں۔ شافعہ نے ہی انہیں سنبھال لیا۔ ورنہ۔ نصیحت سے باز نہ آئی۔

"نانی اماں! اب یہ غرارے پہننا چھوڑ دیں۔ ابھی گر گئی ہوتیں تو ہڈی پسلی چورا چور ہو جاتی۔" پائنچے میں انگوٹھا پھنسا تھا۔ وہ اور بھی خفا۔

"اوئی۔ بد بخت۔ خدا نہ کرے' کاہے کو چورا چور ہوتی ہڈی پسلی۔ کوئی آج پہلی دفعہ غرارا پہنا ہے۔ بچپن سے پہن رہی ہوں۔ اے سمیعہ! سن رہی ہے اپنی فتنی کی باتیں۔ بڈھی نانی کا مذاق اڑا رہی ہے۔ لو بھلا اس عمر میں غرارا چھوڑ کر چوڑی دار پہننے لگوں گی۔ تو ایڑی پر سے سرکائے گا کون؟ یہ ایڑی ہی تو نگوڑی' چوڑی چکلی ہے۔"

"میں' نانی اماں میں سرکاؤں گی۔ ایک شاپر ایڑی کو پہنا کر۔ پائنچہ ڈالا۔ سڑک کر کے اوپر۔ منٹ نہ لگے گا۔"

مگر نانی بھلا کب اس کی مانتیں۔

اگلے دن وہ اپنی شلوار لے آئی۔

"اچھا آج یہ پہن لیں۔ نہ ایڑی پھنسے۔ نہ پائنچہ اٹکے۔" رافعہ نے بھی اصرار کیا۔

"جی نانی اماں غرارے کے پائنچے زمین سے رگڑ کھا کر جلدی میلے ہو جاتے ہیں۔ شلوار ٹھیک ہے۔"

"اصل میں نانی اماں۔ اب آپ کا قد سکڑ گیا ہے۔ ہماری ٹیچر نے بتایا تھا۔ بڑھاپے میں انسان کی ہڈیاں سکڑ جاتی ہیں۔ گوشت نرم اور کم ہو جاتا ہے۔ کپڑے بڑے ہو جاتے ہیں۔ ہیں نا آپی؟"

نانی اماں ہرگز نہ مانتیں اگر رافعہ گواہی نہ دی ہوتی۔

گو کہ وہ خود محسوس کر رہی تھیں کہ صحیح ناپ کے کپڑے اب ان پر ٹھیک نہیں آتے۔ آستین لمبی۔ غرار السا بکند ھے لٹکے ہوئے۔ شلوار، انہیں آرام آیا۔ مگر قدرت خدا کی دیکھیے۔

شام کو خالہ مریم سے ملنے جانا تھا۔ ٹیکسی بلائی گئی۔ انہونی ہو رہی۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے دروازے کے کسی ابھرے ہوئے پین میں پائنچہ پھنسا۔ نانی امی نے زور لگایا تو ہاتھ چھوٹ گیا۔ دھڑام سے گرتے گرتے بچیں۔ وہ بھی ڈرائیور کی پھرتی سے انہیں پکڑنے کی وجہ سے۔ اس نے پائنچہ بھی آزاد کیا۔ اور انہیں کھڑا کیا۔

احسان ماننے کی تو خیر بزرگوں کو عادت نہیں ہوتی۔ جونہی سنبھل کر کھڑی ہوئیں۔ ایک عدد مکا ڈرائیور کے بازو پر جڑ دیا۔ (ضعیف ہاتھ کا کمزور سا مکا) مگر زبان تیز اور رتخ۔

"اے نگوڑے۔ ہٹ پرے منحوس۔ کیا تیرے گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں۔ نامحرم کمبخت۔ کیا سوچ کر ہاتھ لگایا مجھے۔ ہائیں! میں نے ساری زندگی کسی غیر مرد کو چھونے نہ دیا۔ تو کہاں سے ٹپک پڑا میری عاقبت خراب کرنے کو۔ اری سمیعہ تانگہ منگالے۔ اس غارتی موئے کی تو نیت ہی خراب ہے۔"

ڈرائیور کھلکھلا کر ہنسا۔ پھر آواز میں لجاجت پیدا کر کے بولا۔

"اماں جی! آپ کے پوتے نواسے جیسا ہوں۔ خدا کی قسم۔ بزرگوں کی بہت عزت کرتا ہوں۔ بے غیرت نہیں ہوں۔ آپ کو گرتے دیکھ کر رہا نہیں گیا۔ اللہ کو جواب دینا ہے۔ معاف کر دیں۔"

رافعہ شافعہ منہ پر ہاتھ رکھے ہنسی روکتی رہ گئیں۔ بارے اسی ٹیکسی پر سفر جاری رکھا گیا۔ لیکن گھر آ کر وہ ابا سے شکایت کرنے پہنچیں۔

"سن رہے ہو میاں صداقت! آپ کی یہ بیٹی۔ مجھے مارنے کے جتن کیے بغیر بھلا کیسے رہے؟ آئیں ۔۔۔ لو دیکھو ذرا۔ اچھا بھلا غرارا عیب لگا کر مجھے شلوار لا کر دی کہ لو پہنو۔ اچھا جو اگر وہ موا مسٹنڈا ڈرائیور مجھے پکڑ نہ لیتا۔ تو میں عین سڑک پر چاروں خانے چت پڑی ہوتی۔ لوگ تماشا دیکھتے الگ۔ اور جو کوئی سائیکل والا ٹکر مار دیتا سو الگ اور ڈاکٹر ہسپتال کے چکر آپ کو ہی لگانے پڑ جاتے۔ وہ الگ۔"

ابا میاں بے چارے۔ معمہ حل کرنے کی صلاحیت سے عاری۔ آنکھ کے اشارے سے اماں سے ماجرا پوچھا۔ انہوں نے زیادہ ہی تفصیل بتائی۔ ساتھ ہی اعتراض۔

"یہ لڑکی ہر جگہ اپنا دخل ضروری سمجھتی ہے۔ سمجھ بوجھ سے واسطہ نہیں۔ سمجھتی ہے خود کو عقل کل۔ زبردستی کر کے اپنی شلوار اماں کو پہننے کو دی۔ کچھ ہو جاتا۔ خدا نہ کرے۔ میں تو بھائیوں کے سامنے سر نہ اٹھا پاتی۔"

سارا الزام شافعہ کے سر رہا۔ باتوں باتوں میں نانی اماں نے یہ بھی وضاحت کی کہ شافعہ کی نحوست نے اس قدر ہنگامے برپا کیے کہ سمیعہ نے میاں صداقت سے کہا۔ "اسے کہیں پھینک آؤ۔ میں اب اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ نہ جانے کیا کیا گل کھلائے گی اس کی نحوست۔" ابا بے چارے یقیناً" خوشامد کرتے رہے ہوں گے۔ لیکن اماں ایک ڈکٹیٹر۔ میں نہ مانوں والی پالیسی کے زیر اثر۔ ابا مجبور۔ اسے اٹھا کر لے گئے اور پھپو کی گود میں پھینک کر آ گئے یہ کہہ کر کہ چار تمہاری پل رہی ہیں۔ یہ بھی پل جائے گی۔

دو تین مہینے وہ پھپو کے گھر پلتی رہی۔ منجھی آپا کی مہربانی سے پھر واپس کر دی گئی۔ وجہ نحوست۔۔۔ پھپھو کی نند اپنی پہلی زچگی ۔۔۔ کرنے آئی ہوئی تھیں۔ ان کے گھر لڑکی پیدا ہوئی۔ جبکہ ان کی سسرال میں کسی کے گھر پہلوٹھی کی بیٹی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ساری نحوست شافعہ کی اُن بے چاری پہ سرائیت کر گئی۔ وہ سسرال میں نکو بن گئیں۔

شافعہ نے یہ قصہ پہلی بار سنا۔ حیران ہو کر پوچھا۔

"آپ لوگ لڑکیوں سے اتنی نفرت کس لیے کرتے ہیں نانی اماں۔ کیا آپ اور اماں پہلے مرد ہوتے تھے؟"

"جوتی کھینچ کر ماروں گی۔ فتنی کہیں کی۔ سوال جواب کرتی ہے بزرگوں سے۔ سمیعہ اسے تمیز تہذیب سکھا۔ کیسے بات کی جاتی ہے بڑوں سے۔" جواب صاف ٹال گئیں۔

"اچھا۔ تو میں پھپھو سے پوچھ لوں گی۔" یہ کہنا غضب ہو گیا۔ آپے سے باہر ہو گئیں۔

"لو۔ اب یہ ہمیں جھٹلائے گی۔ سنا۔ اے بھئی جو سچ ہے۔ وہ حق ہے۔ لڑکی ذات کوئی فخر کرنے والی چیز تو نہیں۔ سر جھک جاتا ہے باپ' چچا کا برادری کے آگے۔"

اس کی عقل سے باہر فلسفہ تھا۔

"نانی اماں۔ قرآن شریف میں تو عورتوں کی عزت اور احترام کی تلقین کی گئی ہے۔ اور اگر ہر کسی کے گھر لڑکے ہی پیدا ہوں۔ کہیں لڑکی نہ ہو۔ تو دنیا بڑھے گی کیسے؟ اتنے کے اتنے مر وہ جائیں گے نکمے۔"

"دیکھ لو۔ کیسی پٹر پٹر زبان چل رہی ہے۔ سمیعہ اس کو تو جلدی سے ٹھکانے لگا۔ نہیں معلوم آگے کیا ہونے والا ہے۔" اور اماں اتنی خفا کہ اس سے بات کرنا ہی چھوڑ دی۔ رافعہ بھی اس پر خفا ہوئی۔

"کیوں بحث کرتی ہو تم۔ پہلے زمانے میں لڑکیوں کی قدر نہیں ہوتی تھی۔ نانی اماں اسی زمانے کی ہیں۔"

"آپی! کیا اب قدر ہوتی ہے؟" سوال تیکھا تھا رافعہ سے جواب نہ بن پڑا۔

"مرد طاقت ور ہے۔ مرد کما کر کھلاتا ہے۔ گھر بناتا ہے۔ گھر بساتا ہے۔ عورت کی حفاظت کرتا ہے۔ اس سے نسل چلتی ہے۔"

"افوہ' بھئی عورت بھی یہی سب کر سکتی ہے بلکہ کرتی ہے۔ سوائے نسل چلنے کے اور یہ کونسا کمال ہے۔ مرد اکیلا نسل چلا سکتا ہے؟ عورت کی مدد کے بغیر؟" مگر کوئی اس سے متفق نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر یک لخت ابا ختم ہو گئے۔

گھر میں جیسے سناٹے گونجنے لگے۔ اندھیرا ہو گیا۔ پھر اماں کے ایک خالہ زاد بھائی ان کے گھر آ گئے۔ اماں ڈرتی تھیں اس لیے ان کا وجود غنیمت تھا۔ گھر میں مرد کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔

رافعہ کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ اماں نے اپنے بھائیوں کو بلا کر مشورہ کیا۔ رافعہ کی سسرال والوں نے بھی تعاون کی پیش کش کی۔ انہیں جہیز کے سامان کی ضرورت نہیں۔ سادگی سے شادی ہو سکتی ہے۔ نہ پلاٹ بکا۔ نہ زیور آیا۔ ہاں پھپھو کو اس کا بہت قلق تھا کہ... پلاٹ کے عوض ابا نے ایک چھوٹا سا بنگلہ حاصل کر لیا تھا۔ وہ رافعہ کو بطور جہیز دے دیا گیا۔ اس مکان کے کاغذات دولھا کے ہاتھ میں دیے تو وہ شرمسار بھی تھے۔ خوش بھی' مشکور بھی' توقع کے خلاف تھا یہ تحفہ۔

رافعہ سسرال چلی گئی۔ نہیں بلکہ اپنے گھر ہی لیکن چند دن سسرال میں گزار کر۔ گھر فرنشڈ تھا... سسرال والے مختصر تھے اور بہت خوش بھی۔

اب گھر میں شافعہ تھی اور اماں کا مستقل ہدف' ماموں اس کی معصوم باتوں سے بہت خوش ہوتے۔ اماں ناراض۔ اسکول سے آتے ہی۔ بستہ پٹخ کر۔ وہ ٹیچرز کے قصے۔ لڑکیوں کی لڑائیاں منہ زبانی سنائے جاتی۔ اپنا ہر قصہ ہر سزا بھلا کر۔

میٹرک میں صوبے بھر میں فرسٹ آئی۔ صحن میں چھلانگیں لگائیں۔ چیخ چیخ کر ہنسی۔ خوب شور مچایا۔ اماں سر تھامے بیٹھی رہیں۔ پھر سر اٹھا کر کہا۔

"اچھا' اچھا بہت خوشی منالی۔ اب یہ جو صحن میں کوڑا پھیلا ہوا ہے۔ اسے سمیٹنے فرشتے نہیں آئیں گے۔ چلو اٹھاؤ جھاڑو اور ہو جاؤ شروع۔"

ساری خوشی ملیامیٹ کر کے چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔ رات کو ماموں صاحب نے دو بڑے پیکٹ چاکلیٹ کے لا کر دیے۔ شافعہ اچھل کر بیٹھ گئی۔

"ہیں؟ ماموں صاحب یہ سب یعنی کہ اتنے بہت سے چاکلیٹ... میرے ہیں؟" دل کی کلی کھل کھل گئی۔

"تو رزلٹ بھی تو اتنا زبردست آیا ہے۔" صبح ہی ماموں صاحب نے گھر گھر جا کر اس کی بے مثال کامیابی

کا اعلان کیا۔ لوگ مبارک باد کو آنے لگے۔ اماں کی تیوری چڑھ گئی۔

"لو یہ نیا خرچا۔ اب سب کی خاطر مدارات کہاں سے کروں گی۔"

وہ قدرے جھجک کر بولی۔ "تو سب لوگ تحفے بھی تو لا رہے ہیں۔ سوٹ سوئٹر۔ سینڈل اور میک اپ کا سامان اور' اور خالہ مریم نے تو۔ رقم بھی دی ہے۔ انعام کہہ کر۔ چچا چچی نے بھی رقم۔"

وہ تو تحائف سے اثاث بھر گئی تھی۔ اماں ہر کسی کو انکار کرتی رہیں۔ مگر کسی نے مانا نہیں۔

"بھئی بچی کے انعام ہیں یہ۔"

اس نے اماں سے دبی زبان سے کہا "اماں! خوشی سے دے رہے ہیں۔ میں نے مانگے تو نہیں ہیں۔ یہ بھی اپنائیت ہوتی ہے۔ خالہ ماہ رخ خفا ہو رہی تھیں۔ انہیں آپ کا انکار اچھا نہیں لگا۔"

اماں کمر پر ہاتھ رکھ کر تنک کر بولیں۔

"دیکھو بی بی! صاف بات ہے۔ لیتے ہوئے تو اچھا لگتا ہی ہے۔ مگر اس کو لوٹانا مشکل ہوتا ہے۔ اب میں تو سب کی مقروض ہو گئی۔ میرے پاس کون سے قارون کی دولت رکھی ہے۔ جو میں موقع پر سب کو لوٹاؤں گی۔ اس سے بہتر ہے کہ لیا ہی نہ جائے۔"

بات تو درست تھی۔ اسے افسوس بھی ہوا مگر سب اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ کیسے سب کو منع کیا جاتا۔ ادھر رات کو رافعہ سے اماں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

"دیکھ لو جو سنتا ہے۔ مبارک باد کو آتا ہے۔ نہ آئیں تو تمہاری پھپو۔ اے بھئی ان کے گھر کب کسی نے فرسٹ پوزیشن لی تھی۔" یعنی اماں خوش تھیں مگر...

رافعہ نے اسے سونے کی بالیاں دی تھیں۔ جو اماں نے جھٹ اپنے قبضے میں کر لیں۔

شانی کو بھی کئی دن انتظار رہا۔ نہ پھپو نہ منتہیٰ آیا۔ نہ ماہ نور آیا۔ کسی نے فون کرنے کی بھی زحمت نہ کی اور جب اس کا داخلہ دولہا بھائی نے کالج میں کرایا۔ تو اس کی خبر شاید سب سے پہلے پھپو کو ہی ہوئی۔ اکیلی آئیں ادھر ادھر دیکھا۔

"ہاں بھئی سنا ہے، بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئی ہے شانی۔ سے کدھر یاری کر لوں۔"

اماں نے خاکساری کا مظاہرہ کیا۔

"بس آپا آپ سب کی دعا ہے۔ باپ کو بہت شوق تھا کہ وہ اچھے نمبر لے۔ محنت بھی کی تھی اس نے۔ نہ کوئی پڑھانے والا تھا نہ مدد کرنے والا۔ بس اپنی محنت کا صلہ ملا ہے۔ کالج گئی ہوئی ہے۔"

پھپھو اچھل پڑیں۔ (بقول اماں کے) "اوئی بھاوج' باؤلی ہوئی ہو۔ باپ موجود نہ کوئی سرپرست اب اسے کالج بھیجو گی؟ کون کرے گا اس کی نگرانی' پہلے ہی اچھال چھکا دیدہ ہے' کوئی گل نہ کھلائے۔ تمہارے بھائیوں کا مشورہ ہو گا یہ۔"

اماں کو غصہ آگیا۔ مگر ضبط کر کے کہا۔ "آپا اتنے اچھے نمبر آئے ہیں اور سب لڑکیاں کالج جایا ہی کرتی ہیں۔ اللہ رکھے بہن بھائی سرپرست ہیں۔ میں زندہ ہوں۔ اسے بھی اپنی اور خاندان کی عزت کا احساس ہے۔ کبھی کوئی بے حیائی کسی نے دیکھی؟"

"رہنے دو بھاوج! کل تک گلیوں میں کدکڑے لگاتے دیکھا ہے ہم نے اور بھائی کون؟"

"اللہ رکھے رافعہ کا میاں' وہی کالج لے کر گیا تھا۔ بہت مشہور کالج میں داخلہ کرایا ہے۔ خوش خوش آیا تھا۔ ہاتھوں ہاتھ لیا سب نے۔ منٹ نہ لگا داخلے میں۔"

"چلو۔ بہنوئی بھائی ہی ہوتا ہے اور خرچہ کون اٹھائے گا کالج کا۔"

"اللہ مالک ہے۔" اماں نے بات ٹالی۔ دراصل پھپو پلاٹ کے بارے میں اماں سے پوچھنے آئی تھیں۔ اماں نے بتا دیا۔ "وہ پلاٹ دے کر مکان حاصل کیا تھا جو رافعہ کو دے دیا۔ اب یہ گھر شافعہ کا ہے۔"

"تو اب شافعہ کی شادی کیسے کرو گی؟"

"میں کہاں سے کروں گی آپا! وقت آئے گا تو آپ لوگ ہی کریں گے۔ میرا اور ہے بھی کون۔"

پھپھو کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ کچھ کہے بغیر چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

ایک دن منجھلے ماموں جان آگئے۔ بغیر اطلاع لندن سے آئے تھے۔ ارے بابا اس قدر لمبے تڑنگے۔ گورے چٹے۔ بہت ہی شاندار 'امیرالامراء'۔

شانی تو سن سی ہو گئی۔ برسوں کے بعد آئے تھے۔ اماں ان سے گلے مل کر رو رہی تھیں۔ وہ بھی رنجیدہ تھے۔ شام کو شانی کو بٹھا کر اس کی سرگرمیوں پر گفتگو ہوئی۔ بہت خوش تھے۔ اماں سے کہنے لگے۔

"آپا! یہ تو بہت ہی قابل 'لائق فائق ہے' اسے تو انگلینڈ میں ہونا چاہیے۔ بہت ترقی کرے گی۔ میں ساتھ لے جاؤں گا۔"

وہ رات کو یہیں رہتے۔ دن میں ملنے ملانے چلے جاتے۔ رافعہ اور رؤف بھائی سے باتیں کرتے رہے۔ مشورے۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی اور اس کے لندن جانے کا انتظام ہو گیا۔ وہ اماں کو دیکھنے لگی۔ انہوں نے نظر چرا لی۔ رافعہ بھی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"اور اماں؟" اس نے ہچکچا کر پوچھ ہی لیا۔

"بیٹا' وہ تو ابھی نہیں جا سکیں گے۔ آپ تو اسٹوڈنٹ ویزے پر جاؤ گی۔ پھر کبھی آپا کو بلا لینا۔ کبھی آ کر مل لینا۔"

اسے بے چینی تھی۔ اماں کے بغیر اتنی دور اور اماں تو یوں بے فکر تھیں۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ شانی مگر شدید مضطرب تھی۔ ماموں جان اسے بٹھا کر سمجھانے لگے۔

"بیٹا! آپ کا وہاں داخلہ ہو گیا ہے۔ ویزا آ چکا ہے۔ یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں' اس میں آپ کی اماں کا ہی فائدہ ہے۔ آپ کی اتنی اچھی تعلیم آپ کے ہمیشہ کام آئے گی۔ چند سالوں کی بات ہے۔ لندن اتنا دور بھی نہیں۔ چھٹیوں میں آ کر مل جایا کرنا۔۔۔ پڑھائی میں لگ جاؤ گی تو سب بھول جاؤ گی۔ میں جانتا ہوں ماں بہن سے جدائی کا کیا دکھ ہے۔ مگر یہ وقتی جدائی ہے۔ کبھی تم آ جانا کبھی آپا آ جائیں گی۔ اعلا تعلیم ترقی کے ہزار موقع دے گی۔ فون چاہو تو روز کر لینا۔"

وہ سنتی رہی سمجھ میں نہیں آیا۔ ماموں اس پر کیوں مہربان ہوئے ہیں۔ وہ آس بھری نظر بس اماں پر ڈالتی۔ ادھر ایک بے نیازی۔ پتا نہیں اس کے لیے وہ کیوں سنگدل تھیں۔ خود ہی سوٹ کیس میں کپڑے ڈالتی رہیں۔ نصیحتیں کرتی رہیں۔

"آپ اماں اکیلی۔۔۔" آواز رندھ گئی۔

"تو کون سا بھیڑیا کھانے آ رہا ہے۔ تمہارے باپ کے بعد سے ہی اکیلی ہوں میں۔"

ماموں صاحب نے سمجھایا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں آپا کے ساتھ ہی رہوں گا۔"

وقت روانگی کتنے ہی رشتے دار آ گئے۔ وہ مڑ مڑ کر اماں کو دیکھتی۔ وہ ماموں جان سے مخاطب ہو جاتیں۔ آخر باہر نکلتے ہوئے ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

"ہائے اماں! اس دل سے بھیج رہی ہیں مجھے اتنی دور۔"

"کوئی دور نہیں۔ ماموں کے گھر جا رہی ہے۔ رافعہ بھی تو سسرال گئی تھی۔ میں نے کیا کر لیا۔ چلو اب ہنسی خوشی ماموں کے ساتھ جاؤ۔ میرے بھائی کو تنگ نہ کرنا۔" اماں اسے تھپک رہی تھیں۔ اسے اور بھی رونا آیا۔

بڑے ماموں ابا نے بھی اسے پیار کیا ان کا بیٹا محسن ہنس کر کہنے لگا۔

"لگتا ہے آج شانی کی رخصتی ہو رہی ہے۔"

آخر کار۔۔۔ جہاز میں بیٹھ کر کچھ سکون ملا۔ باوجود جدائی کے غم کے۔

ہیتھرو ایئرپورٹ پر ماموں جان کے ایک دوست آئے تھے۔ لندن' خوابوں کا شہر۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ سڑکیں۔ اونچی عمارتیں۔ ٹریفک۔۔۔ بسیں تک بے حد شفاف اور خوب صورت۔ خوب صورت لوگ۔

"ماموں جان۔ گھر میں اور کون کون ہے؟"

"بس بیٹا۔ میں اور تمہاری ممانی۔ بیٹی کوئی ہے

نہیں۔ بیٹا ہے وہ دوسرے شہر میں اور کبھی دوسرے ملک میں دو سال سے تو آیا بھی نہیں۔"
کتنی عجیب بات تھی۔

وہ کچھ اداس ہو گئے۔ ہائے بے چارے ماموں جان۔ اسے ترس آگیا۔ گھر میں مامی ملیں بے حد تپاک سے۔ معذرت کرنے لگیں کہ ایئرپورٹ اسے لینے نہیں جاسکیں۔ بالکل انگریز لگیں۔ پینٹ شرٹ پہنے۔ کٹے ہوئے چھوٹے بال گھر جیسے شیشے کا چمکتا دمکتا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود۔

ماموں جان نے اماں سے اس کی بات کرائی۔

"پھپو آئی تھیں تمہاری، تمہارے جاتے ہی۔ کہتی ہیں گوجرانوالہ نند کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ بہت خفا تھیں کہ اتنی دور بچی کو کیوں بھیجا۔ لو میں کیوں بھیجتی وہ خود گئی ہے اپنی خوشی سے۔"

اماں کہہ رہی تھیں۔ وہ چیخ پڑی۔

"میں؟ اپنی خوشی سے؟ اماں...."

انہوں نے سنا ہی نہیں۔ اپنی کہے گئیں۔

"کہنے لگیں ذرا دیر تو رک لیتیں میں مل لیتی لو بھلا، میں جہاز روک لیتی کہ بھیا ابھی ٹھہر شانی کو پھپو سے ملنا ہے۔ سب خار کھا رہے ہیں۔ ایک غریب بیوہ کی بیٹی تعلیم کے لیے لندن گئی ہے۔ کہتے ہیں۔ یہاں لاہور میں کالجوں کی کمی ہے کیا؟ اب کس کس سے کہوں۔ میری بیٹی ہے ہی اتنی لائق۔"

وہ خوشی سے پھول گئی۔ جو کہنے والی تھی کہ اماں میں بھی کہتی ہوں وہاں کالجوں کی کمی ہے کیا؟ مگر اماں کا ایک تعریفی لفظ سب کچھ بھول گئی۔

☆ ☆ ☆

ماموں مامی دونوں جاب کرتے تھے۔ روکھی پھیکی زندگی نہ کوئی بچہ۔ نہ کوئی شور۔ ہفتہ مامی کا خاصا مصروف گزرتا۔ صفائی، کھانا پکانا۔ بلکہ کیک بسکٹ وغیرہ بھی خود بناتیں۔

اتوار کو مہمان آتے۔ بہت شوق سے اس کا تعارف کرایا جاتا۔ کچھ انگریز بھی آجاتے۔ شور شرابا تو نہیں۔ ہاں رونق خوب ہوتی۔ پاکستانی اور انڈین بھی انگریزی میں گٹ پٹ کرتے۔ وہ ان لوگوں کی باتوں کا جواب اردو میں دیتی تو سب ہنستے۔ سمجھتے سب تھے مگر.... احساس کمتری کے مارے لوگ۔ مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ بھی مجبوراً "انگلش" سے کام چلانے لگی۔ ہاں رات کو ماموں مامی سے گپ شپ ہوتی۔ اردو میں خوب باتیں۔ رشتے داروں کی پرانے ملنے والوں کی۔ ماموں جان کئی سالوں سے یہاں تھے۔ وہ سب کے بارے میں پوچھا کرتے۔

"اپا تو کہہ رہی تھیں۔ تم بہت بولتی ہو۔ بک بک کر کے کان کھا جاتی ہو، مگر تم تو بس جواب دیتی ہو سوالوں کے۔ کیوں بیٹا۔ کیا خوش نہیں ہو؟ کوئی بات ہو تو بتاؤ۔"

وہ شرمندہ ہو گئی۔ کیا کہتی۔ اماں اور رافعہ کی یاد۔ وطن کی یاد۔ دوری کا غم۔ ابھی تو زیادہ عرصہ ہوا نہیں اور وہ پریشان ہو گئی۔

کالج بہت بڑا۔ بے حد وسیع اور نہایت خوب صورت تھا۔ لڑکے، لڑکیاں سب ساتھ بہت انہماک سے پڑھتے تھے۔ شرارتیں بھی ہوتیں اور کسی اور پر الزام بھی لگایا جاتا۔ سزا بھی ملتی۔ سب کچھ ویسا ہی تو تھا۔ لیکن اس کی کسی سے دوستی نہ ہو سکی تھی، سب اجنبی لگتے، لیکن وہ وہاں کے نظام میں دل جمعی سے داخل ہوئی۔ قانون سخت۔ لیکن ضروری بھی تھے۔ بہت کچھ مختلف ہونے کے باوجود وہ سمجھ گئی اور دل لگا کر پڑھتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ مقصد کو سامنے رکھ کر دل بھی لگانا ضروری تھا۔ ایک دن ماموں جان نے مامی سے کہا۔

"بچی بے چاری گھر اور اسکول کی ہو کر رہ گئی ہے۔ اسے سیر تو کرانے لے جاؤ کہیں۔ موسم بھی اتنا اچھا ہے۔"

مامی نے کہا "ہاں سوچ رہی تھی اسٹور لے جاؤں۔ یہ بھی خریداری کے گر سیکھ لے اور اپنی پسند کی کوئی چیز لینا ہو تو لے لے۔ اچھا خیر۔ سارا آئے گی۔ تو اس کا تعارف کراؤں گی وہی سیر کرا لے گی۔ دوستی بھی کر لے

گی شانی سے۔"

سارا مامی کی بھانجی تھی۔ لندن میں ہی پیدا ہوئی۔ یہیں پڑھ لکھ کر فارغ ہوئی۔ بہت ہی ایڈوانس۔ شانی نے اسے دیکھا۔ اور سوچتی رہ گئی۔ اس سے کیسے دوستی ہو گی۔ ٹانگوں سے چپکی ہوئی اتنی پینٹ۔ بغیر آستین کھلے گلے کی شرٹ۔ جو پیٹ سے اوپر تک ہی رک گئی۔ یعنی کچھ چھپا نہ رہا۔ بھورے بالوں کا سر پر چھتا۔ تیز چمکتی آنکھیں۔

ماں باپ میں علیحدگی ہو چکی تھی اور سارا اب باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ آئے دن باپ سے لڑ کر آجاتی۔ پھر باپ کا فون آجاتا۔ تو چلی جاتی۔ اسے دیکھ کر شانی کو حیا آگئی۔ اس نے دوپٹے کو جسم پر لپیٹ لیا۔ وہ بھی اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر ہنس پڑی۔ ہنستی رہی۔

"یہ چیز کیا ہے؟" یہی الفاظ اس پر بھی صحیح بیٹھتے تھے۔ شانی کے خیال میں۔

"وہ جیسی بھی ہے۔ تم اسے لندن کی سیر کرا دو۔ دوستی کر لو۔"

"اس حلیے میں؟ اوہ نو۔ میں اسے ساتھ لے جا کر تماشا بننا پسند نہیں کروں گی۔"

یہی بات وہ بھی کہہ سکتی تھی۔ مگر چپ رہی۔ انگریز لڑکیاں بھی کچھ اس قسم کے حلیے میں نظر آتی تھیں۔ مگر... گھر کے اندر سارا ہی پہلی بار اس حلیے میں نظر آئی تھیں۔

اسے ماموں کے سامنے بہت شرم آئی۔ اور یہ شرم اس کا پیچھا نہ چھوڑ سکی۔ نہ دوپٹہ اس سے جدا ہوا۔ اسکول میں بھی عجائبات کی کمی نہ تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی سمجھ میں آتی گئی۔ ہر لڑکی کا بوائے فرینڈ تھا۔ اسے بھی بہت سنبھل کر چلنا تھا۔ ماموں جان اس کی جھجک دیکھ کر سمجھاتے۔

"تمہیں تعلیم سے غرض ہونی چاہیے۔ نہ نقل کرو نہ اعتراض۔ اپنا رویہ اور راستہ درست رکھو۔ یہ سمجھو تم ابھی پاکستان میں ہو۔ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس سے غرض نہ رکھو۔"

ایک رات اس کی آنکھ کھلی۔ ماموں جان فون پر تھے۔ وہ سمجھ گئی۔ اماں کا فون ہو گا۔ اٹھ کر بیٹھ گئی یہ بتانے کے لیے کہ وہ جاگ رہی ہے۔ اماں سے بات کرنے آتی ہے۔ ابھی دوپٹہ اوڑھ رہی تھی کہ ماموں جان کی آواز آئی۔

"ارے نہیں آپا۔ نحوست کیا ہے۔ صرف وہم ہے آپ کا۔ یہاں تو کوئی خرابی نہیں ہوئی اس کے آنے سے۔ کوئی نحوست نہیں پھیلائی اس نے۔ چلو پھر میں ثابت کر کے دکھاؤں گا کہ وہ منحوس نہیں ہے۔ کروں گا یہ کہ فہد سے شادی کر کے اپنے پاس رکھ لوں گا' پیاری بیٹی ہے۔ پھر اور بھی عزیز ہو جائے گی۔"

وہ اپنی جگہ دم سادھے بیٹھی رہی۔ تو اماں کے دل سے وہ وہم ابھی نکلا نہیں۔ تو اماں نے اس کی نحوست کی وجہ سے اسے دور پھنکوا دیا ہے۔ ماموں جان فون بند کر کے کمرے میں جا چکے تھے۔ خاموش آنسو بہتے رہے۔ نہ کوئی دیکھنے والا تھا نہ خشک کرنے والا۔ فہد سے شادی تو یہ نئی بات۔ وہ باقاعدہ اماں سے خفا ہو گئی۔

کئی دن بعد مامی نے کہا۔

"تم نے کافی دن سے پاکستان بات نہیں کی۔ آج کر لو۔"

وہ ٹال گئی اور ٹالتی ہی رہی۔ سخت ناراضی۔ ماموں جان نے ایک دن ریسیور اس کے ہاتھ میں دے ہی دیا۔ نمبر ملا کر۔ مجبور ہو کر بات کرنی پڑی۔ مگر بات کیسی؟ اماں کی آواز سن کر ہی رونا آگیا۔ ادھر اماں کی پریشان آواز آئی۔

"ارے کیا ہوا شانی؟"

"اماں! میں واپس آنا چاہتی ہوں آپ کے پاس۔" بھرے گلے سے کہا۔

"کیا؟ اتنا خرچا جو میرے بھائی نے کیا ہے۔ پاسپورٹ' ویزا۔ جہاز کا ٹکٹ۔ اتنی محبت سے لے کر گیا ہے۔ کوئی احساس ہے؟ کہ نہیں۔ بیٹھی رہو آرام سے وہیں۔ خبردار جو میرے بھائی کو تنگ کیا۔" فون بند۔

رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ کوئی ماں اتنی بے نیاز

اور ظالم نہ ہوتی ہوگی۔ رونا بھی آیا غصہ بھی۔ خفگی بڑھ گئی۔ بس ٹھیک ہے۔ اب بات کروں گی ہی نہیں۔

اب پڑھائی میں جھونک دیا خود کو۔ دن رات بس اسے یہی فکر تھی۔ کیسے سب سے زیادہ نمبر لے کر حیران کرے اور کامیابی بھی ہوئی۔

ماموں جان نے شاباش دی۔ مامی نے بڑا خوب صورت لاکٹ گفٹ کیا۔ وہ جھینپ گئی۔

☼ ☼ ☼

ایک روز کالج سے آئی تو لاؤنج میں کوئی بیٹھا تھا۔ گٹار ہاتھ میں لیے ہو و ... ہاہا ... کر رہا تھا۔ بد رنگ کپڑے بے ہنگم داڑھی۔ بڑھے ہوئے بال۔ وہ چپکے سے کچن میں آگئی۔ جہاں مامی گنگناتے ہوئے کچھ بنا رہی تھیں۔

"مامی۔ لاؤنج میں کون بیٹھا ہے۔ اول جلول سا۔" کچن میں گھستے ہی بولی۔

مامی نے مڑ کر اسے دیکھا ہنس رہی تھیں۔ "میرا بیٹا آج کتنے دن کے بعد آیا ہے۔ وہ سامنے بیٹھا ہے۔ گٹار کا دیوانہ۔"

وہ سٹپٹا گئی۔ خدا کرے۔ جوش جذبات میں کہے الفاظ انہوں نے سنے نہ ہوں۔ وہ تو خوشی سے سرشار تھیں نہ جانے کیا کیا بتاتی رہیں۔ باہر سے پر شور گٹار کے ساتھ شور کے سوا اسے کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر لاؤنج میں لائیں۔

"اے فہد! ادھر دیکھو یہ کون ہے۔ گٹار تو ہٹاؤ سامنے سے۔" وہ تو آنکھیں بند کیے اپنا راگ الاپ رہا تھا۔ مامی نے خود اس سے گٹار چھینا۔ تب اسے ہوش آیا۔ آنکھیں بھی لال لال۔

"آ' آ ماما اف بڑی نیند ہے۔ سونے جا رہا ہوں میں۔" اٹھتے اٹھتے اس کی نظر شافی پر پڑی۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"کون ہے یہ؟"

"ارے منگیتر ہے تمہاری۔ چلو اسے کمپنی دو۔ سو جانا رات کو۔"

اور وہ فرماں برداری سے گردن ہلانے لگا۔

شافی نے مامی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ الگ کیا۔

"میں ... وہ ... کچھ پڑھ لیتی۔ ہاں مگر بھوک بھوک لگی ہے۔"

مامی اسے وہیں چھوڑ کر کچھ غور کیے بغیر کچن کی طرف لپک گئیں اور شافی بھی فوراً" اپنے کمرے میں جا گھسی۔ لیکن ... وہ اس کے پیچھے آگیا تھا۔ تیز تیز امریکن لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ سمجھی نہیں۔ تو ماتھے پر انگلی مار کر بولا۔

"او ... تم ... میں نے تم کو کبھی دیکھا نہیں۔" اب اردو میں بولا۔ "رنگ ... کس نے پہنائی تمہیں؟"

غور سے اس کے ہاتھ دیکھ کر کچھ حیران ہوا۔

"کدھر ... کدھر رنگ؟ پہنتی نہیں۔"

وہ چپ رہی اور قریب آیا۔ "تم 'تم ہو کون؟" شافی پیچھے ہٹی۔

"میں ... شافی 'شافعہ ... پاکستان۔" وہ ہکلائی۔

سنتے ہی کمرے سے باہر نکلا اور کچن میں مامی سے نہ جانے کیا سوال جواب کرنے لگا۔ شافی کو یاد نہ تھا کہ کبھی گھر میں اس نے اس کا نام یا ذکر سنا ہو۔ ہاں ماموں جان نے اسے بتایا تھا۔ جس دن وہ آئی تھی کہ ان کا ایک بیٹا ہے۔ جو کسی اور شہر یا شاید کسی دوسرے ملک میں رہتا ہے۔ اسے افسوس ہوا تھا۔ شاید اسی لیے گھر میں اداسی کی فضا قائم رہتی تھی۔ شاید ... یہاں لوگوں کا خون واقعی سفید ہو گیا ہے۔

باہر اس کی گونج دار آواز بحث میں اور اونچی ہو گئی تھی۔ مارے ڈر کے وہ کمرے سے نکلی نہیں' نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ یا لڑ رہا تھا۔

وہ کتاب کھولے بیٹھی رہی۔ ٹی وی دیکھتی رہی۔ پھر رات کے کھانے کے لیے مامی نے بلایا۔ کھانا واقعی بے حد لذیذ تھا۔ اور کئی طرح کی ڈشز تھیں۔ ماں کی ممتا کا رنگ گھلا ہوا تھا۔ واقعی مامی نے بہت ہی دل لگا کر محبت کے تمام عناصر حل کر کے اپنے عزیز ترین بیٹے کے لیے کس قدر محنت سے کھانا تیار کیا تھا اور وہ بہت ہی لاپروائی سے کھا رہا تھا۔ کوئی تعریف نہ توصیف۔

نظر اٹھا کر ماں کو سراہنے والی نگاہ سے دیکھ لیتا۔ مگر نہیں، کھانا تو مر بھکوں کی طرح ٹھونس رہا تھا دھڑا دھڑ۔ آواز مگر ندارد۔۔۔ شانی ہر ڈش کو چکھ کر جی بھر کے تعریف کرتی۔ مامی کے چہرے پر رونق آجاتی کاش بیٹا بھی۔۔۔ مگر وہ کھانا ختم کر کے اٹھ کر چلا گیا۔
مامی نے کہا۔

"میری بیٹی کو آج بہت مزا آیا۔ میری ساری محنت وصول ہو گئی۔"

انہوں نے اسے لپٹا کر پیار کیا۔ شانی کو پھر تاسف نے گھیر لیا۔ کاش بیٹا بھی دو لفظ کہہ کر ماں کا دل خوش کر دیتا۔ جس کے اعزاز میں اتنا زیادہ کھانا بنایا تھا ماں نے پڑھتے پڑھتے سو گئی۔

درمیان میں آنکھ کھلی۔ باتوں کی آوازیں۔۔۔ بیڈ روم میں اب ماموں جان سے بحث کر رہا تھا۔ پتا نہیں کس قسم کا بیٹا تھا۔ کبھی کبھار کے آنے والے مہمانوں کو میزبانوں کی نیند آرام کا خیال تو کرنا چاہیے۔

صبح وہ باہر آئی۔ ماموں جان کا کمرہ بند تھا۔ نہ جانے کب سوئے ہوں گے سب۔ اب نیند پوری کر رہے ہیں۔ فہد کا کمرہ بھی بند تھا۔

وہ کچن میں آگئی۔ رات کا بچا ہوا بہت کچھ رکھا تھا۔ گرم کر کے کھالیا، چائے بنائی۔ پھر تیار ہو کر گھر سے باہر آگئی۔ موسم شدید تھا۔ سرد اور دھند میں لپٹا ہوا۔ گرم کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ گرم نہ ہوئے۔

اسکول جا کر گرم کمرے میں سکون ملا۔ واپسی میں بھی ویسا ہی سرد موسم تھا۔ لیکن ٹریفک رواں دواں۔ بازار کھلے ہوئے۔ خریدار موجود۔ ریستوران آباد۔

گھر میں سناٹے نے استقبال کیا۔ کچن خالی۔ بھوک کے تدارک کے لیے وہ فریج کھول کر بیٹھی تھی کہ ماموں جان کی آواز آئی۔

"آگئی ہو بنو۔" ماموں جان اسے لاڈ میں بنو کہتے تھے۔

"آپ کہاں تھے ماموں جان۔ میں سمجھی آپ اور مامی کہیں چلے گئے ہیں۔ مامی کہاں ہیں؟"

"ہاں وہ اصل میں انہیں تو ڈپریشن کا دورہ پڑا ہے۔ بستر سے اٹھی ہی نہیں۔"

"ارے۔ میں کھانا گرم کرتی ہوں۔ آپ اور مامی بھی کچھ کھالیں۔ مامی کو کوئی دوا دینی ہو گی۔"

"نہیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں نے سینڈوچ بنا کر کھالیا تھا۔" وہ پھر کمرے میں چلے گئے۔

فہد کے بارے میں پوچھتے پوچھتے رہ گئی۔ پتا نہیں اس نے کچھ کھایا ہے کہ نہیں۔ کمرہ تو بند تھا۔

وہ بھی سینڈوچ بنا کر کمرے میں لے آئی۔ کھا کر کپڑے تبدیل کیے۔ لاؤنج میں آواز آئی۔ باہر نکلی۔ ماموں جان متفکر سے کھڑے تھے۔

"چائے بنا دوں۔ مامی کو بھی پلا دوں گی۔ آپ بھی پی لیں۔ مامی کو دوا۔۔۔"

"نہیں۔ وہ کچھ کھانے پینے کو تیار نہیں۔ چائے تو بالکل نہیں۔ سارا آجائے تو وہ کچھ کر لے گی۔ تم فکر نہ کرو۔ میں نے فون کر دیا ہے اسے۔ یہاں سے قریب ہی ہے اس وقت۔" اور چند منٹ بعد ہی وہ آگئی۔ ماموں جان کے چہرے پر رونق آگئی۔ بلند آواز سے اعلان کیا۔

"بیگم۔۔۔ سارا آگئی ہے۔" سارا بھی لپکتی ہوئی بیڈ روم کی طرف چلی۔ دروازہ کھلا۔ مامی سامنے نمودار ہوئیں۔ بکھرے الجھے بال۔ رنگ سفید۔ آنکھیں سرخ۔ عجیب حلیہ تھا ان کا۔ وہ سارا کو دیکھتے ہی ہاتھ پھیلائے آگے بڑھیں۔

"سارا! وہ چلا گیا۔ دیکھا تم نے۔ پھر چلا گیا۔ کچھ پروا نہ کی اس نے۔۔۔" آنسو بھل بھل بہنے لگے۔

سارا انہیں لپٹا کر اندر چلی گئی کہتی ہوئی۔

"میری پیاری آنٹی۔ جانے دیں گیا تو۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں ہوں نا۔۔۔" کمرہ بند۔ ماموں جان مسکرائے۔

"ماموں جان۔ کیا۔۔۔ فہد بھائی چلے گئے۔ ارے کیا ایک دن کے لیے آئے تھے؟"

ماموں جان نے افسردگی سے سر ہلایا۔ "کیا کہہ سکتے ہیں۔ اتنا بھی غنیمت ہے۔ آتو گیا۔ دو سال پہلے آیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے۔ ہر بار اس کے جانے کے بعد بیمار

ہو جاتی ہیں بیگم۔ پھر سارا آتی ہے اور سمجھاتی ہے۔ کیا کروں۔ اسی کی ضد پر امریکہ بھیجا تھا پڑھنے۔ وہاں صحبت اچھی نہ ملی۔ بری عادتوں میں پڑ گیا۔ پڑھنا پڑھانا کیسا... نہ جانے کیا بن گیا۔ ہماری تو اسے پرواہی نہیں اور اس بار تو خفا ہو کر گیا ہے۔ تم سے منگنی کا سن کر بگڑ گیا کہ میں نے رنگ نہیں پہنائی۔ اب کیا کہوں' ہم نے تو کہا۔ اب پہنا دو۔ مگر... ضد۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ ماں باپ سے ضد کر کے... اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ یہ بات آپ سمجھاتے اور منگنی جس طرح ہوئی' اسی طرح لفظوں سے توڑی جا سکتی ہے۔"

"میں نے اسے بتایا کہ شانی کو میں یہاں لا کر پڑھا کر تم سے باقاعدہ منگنی کروں گا۔ آپا سے میں نے وعدہ کیا ہے۔ سمجھایا کہ شانی ابھی کم عمر ہے۔ اس لیے اور اس کی تعلیم بھی پوری نہیں ہوئی۔ مگر وہ ضدی بگڑا ہوا بچہ ہے۔ اسے امریکہ بھیج کر ہم نے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔ مگر اب... کیا کریں۔"

ماموں جان بے چارگی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد سارا اور مامی باہر آ گئیں۔ مامی کا حلیہ بدل چکا تھا۔ اور وہ اب سنجیدہ بیٹھی تھیں۔ سارا نے شانی سے کہا۔

"میری آنٹی صبح سے بھوکی بیٹھی ہیں۔ تم نے ان کو کھانا نہیں کھلایا۔ چائے نہیں پلائی کیسی بیٹی ہو۔"

شانی شرمندہ ہو گئی۔ دوڑی کچن کی طرف۔ جو کچھ تھا گرم کر کے لائی۔ مامی نے اسے پاس بلا کر پیار کیا۔

"سارا تم کو خبر نہیں' یہ بہت پیاری بچی ہے۔ اسے کیا علم کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔"

"میں اسکول سے آئی تو سناٹا تھا۔ میں سمجھی آپ لوگ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ابھی ماموں جان نے بتایا۔ فہد بھائی کے جانے کی وجہ سے مامی بیمار ہو گئی ہیں۔"

"وہ تو ایسا ہی ہے۔ لاپروا۔ ضدی اسی لیے ہم نے چاہا کہ کچھ ایسا انتظام ہو جائے کہ وہ گھر رہنے پر مجبور ہو جائے۔ کوئی کشش اسے یہیں کا کر دے۔ لیکن... اسے یہ بھی... منظور نہیں پتا نہیں۔ اولاد کی محبت کیوں اتنی ظالم ہوتی ہے۔ کاش اولاد کے دل میں بھی ماں باپ کے لیے اتنی گنجائش ہوتی۔ ترسی ہوئی زندگی کو قرار مل جائے۔ یہی چاہا تھا۔ اسی لیے شانی کو لا کر رکھا کہ اس کی وجہ سے ہی وہ ہمارا کلیجہ ٹھنڈا کرے گا۔"

پھر بے بسی بے چارگی۔ مامی کے لہجے میں محرومیاں بین کر رہی تھیں۔

کاش اماں کو خبر ہو۔ نالائق اولاد ایک سزا ہوتی ہے۔ نہ جانے ماموں جان' مامی نے کون سا غلط کام کیا تھا جس کی سزا جھیل رہے ہیں۔ اپنی معصوم غرض کے لیے شانی کو لانا۔ تعلیم دلا کر بیٹے سے شادی کرنا بلکہ شاید تعلیم کے بہانے سے لا کر رکھنا۔ تاکہ... بیٹا اس کی کشش سے ماں کا کلیجہ ٹھنڈا کرے۔ اس کے آنے سے بھی انہیں کوئی فائدہ ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ محروم محبت۔ ہاہ' ماں باپ کتنے بے بس ہوتے ہیں۔ ان کی کوشش۔ خواہش۔ خوش فہمی۔ سب دم توڑ گئیں۔ بیٹا ان کے ارمانوں کے گلشن کو ٹھکرا کر اپنی خوشیاں تلاش کرنے چلا گیا۔ انسان اپنی غرض کے لیے کیا کیا قدم اٹھاتا ہے۔ لیکن قسمت... اپنی من مانی کر کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔

شانی کو اب علم ہوا۔ ماموں جان اسے لائے ہی اس غرض سے تھے۔ اماں پر احسان بھی کر دیا اور... اماں سمجھتی ہیں۔ انہوں نے اس کی نحوست کی داستان سنا کر ماموں جان کو شانی پر ترس کھا کر شاید اعلا تعلیم کے بہانے لانے پر مجبور کر دیا۔ بیٹے سے شادی کا عندیہ بھی دے دیا۔ وہ اپنی جگہ خوش اور مطمئن بھی ہو گئیں۔

یہ تو اس کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ اپنا گھر' اپنا وطن' خاندان سب چھوڑ کر... انجانے ملک کے انجانے معاشرے کی نذر کر دیا۔

غصے سے نیند اڑ گئی۔ تعلیم کیا وہاں نہ ہوتی۔ لیکن... یہاں آ کر اب واپسی کا سوچنا... اتنا غلط نہ سہی۔ فہد سے رشتہ جوڑنا بھی ہرگز منظور نہیں' اور جو ماموں جان نے سوچ لیا ہے۔ اس پر کبھی بھی عمل کروا سکتے ہیں۔ خواہ بیٹے کو کسی طور راضی کر کے۔ شانی پر احسانات کا

احساس دلا کر دبا ڈال کر۔



"ماموں جان! مجھے واپس بھیج دیں۔ میں اب وہیں وہ کر پڑھ لوں گی۔"

صبح ہی یہ دھماکہ خیز اعلان کر کے وہ ناشتہ کرنے لگی۔ مامی حواس باختہ ہو گئیں۔ ماموں جان نے اسے سمجھانا شروع کر دیا۔ یہاں کی تعلیم کی اہمیت' ترقی کے امکانات لوگ تو یہاں آ کر پڑھنے کے لیے تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ قسمت سے ہی موقع ملتا ہے۔

"جی' مجھے علم ہے ماموں جان! آپ کا بھی اتنا خرچا ہو رہا ہے اور اب وہاں اماں بالکل اکیلی ہیں۔ ماموں صاحب چلے گئے ہیں۔ اور میں بھی اب ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"اچھا چلی جانا۔ مگر ایک سال یہاں اپنی کلاسیں پوری کر لو۔ ابھی تو ادھر کی نہ ادھر کی۔ سب مذاق اڑائیں گے کہ گئی تھیں کچھ بننے اور سب ادھورا چھوڑ کر آ گئیں۔"

وہ چپ ہو گئی۔ فی الحال سال دو سال کے لیے فہد سے تو چھٹکارا مل گیا تھا۔

اور وہ اپنے امتحانی نتائج سے خود ہی حیران ہوتی رہی۔

سارا سے دوستی پکی ہو گئی تھی۔ اس کا ایک بوائے فرینڈ تھا۔ غالباً "فریج" تھا۔ وہ ہر جگہ ساتھ ہوتا تھا۔ پہلے پہل وہ گھبرائی۔ پھر اس کے شریفانہ رویے سے اطمینان ہو گیا۔ اچھا لڑکا تھا۔ لیکن پھر بھی ہر جگہ اس کے ساتھ جانے میں 'اسے اعتراض ہوا تو سارا نے اسے منع کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی جتا بھی دیا کہ اس کے اپنے خالہ' خالو یا باپ کو اعتراض نہیں ہے۔ لیکن تمہاری وجہ سے اسے منع کر دیا ہے۔

شانی کو چونکہ سارا کے ساتھ کہیں جانے سے تسلی ہوتی تھی۔ اس لیے اب اس نے بھی نکلنا کم کر دیا۔ ورنہ مامی کو آسانی ہو گئی تھی وہ سارا کے ساتھ جا کر ہر طرح کی شاپنگ کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی پکنک پر بھی چلی جاتی موسم خوشگوار ہونے پر۔ لیکن اب اس کا ساتھ بس اسٹور تک رہ گیا' جہاں وہ گھر کے لیے سودا لے آتی تھی مامی کی مدد کے خیال سے۔ اب اس کی کئی لڑکیاں دوست بن گئی تھیں۔ ازابیلا اور میری صبوحی کی ماں انگریز' باپ پاکستانی تھے۔

میری کو وہ مریم کہتی۔ تو وہ حیران ہوتی۔ "تمہیں میرا نام پسند نہیں آیا۔" تب اس نے سمجھایا کہ "یہ نام حضرت عیسیٰ کی والدہ کا تھا اور ہماری الہامی کتاب قرآن مجید میں ان کو مریم کہا گیا ہے۔ جس طرح تمہاری کتاب بائبل ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی کتاب قرآن کریم ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جس دن سے نازل ہوا۔ اس میں آج تک ایک حرف کیا زیر زبر تک کا فرق نہیں ہوا۔"

ازابیلا نے بھی مریم کو بتایا اور صبوحی نے گواہی دی کہ مسلمانوں کی معلومات مذہب کے متعلق ہم کرسچنز سے زیادہ ہیں۔ خصوصاً "اسٹوڈنٹ لڑکے لڑکیاں' لیکن عموماً" وہ مذہب کے متعلق گفتگو کم ہی کرتی تھیں۔

ایک بار اس نے جب بتایا کہ "ہمارے ملک میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں اور مجھے سب آتی ہیں۔"

تو انہیں یقین نہ آیا کہا کہ "تم بول کر سناؤ۔ کیسی زبانیں ہیں۔ ان کی آپس میں کوئی مشابہت ہے یا نہیں؟"

مارے جوش کے اس نے اردو۔ سرائیکی۔ سندھی' پنجابی کے دو ایک جملے سنائے۔ پشتو سے نابلد ہونے کے باوجود جب اس نے سنے سنائے دو تین لفظ ادا کیے' ترااماشادا روڑا کنا نشتہ۔ تو ازابیلا چلا پڑی۔

"او میرے خدا۔ یہ تو ہمارے پڑوسی بھی بولتے ہیں۔ بڑے مزے کی بولی ہے۔"

وہ ہنس دی۔ پشتو کے دو چار لفظ ہی سنے تھے۔ لیکن ستم یہ ہوا کہ اگلے دن ازابیلا اپنے پڑوسی کو لے کر آ گئی۔ ایک لڑکا۔ وہ بھی اس خوشی میں آ گیا کہ کوئی ہم زبان ہو گی۔ ازابیلا نے اصرار بھی کیا تھا۔ وہ مریم کے ساتھ بیٹھی تھی جب ایک لمبا گورا چٹا لڑکا سامنے آ کر

کھڑا ہو گیا۔ ازابیلا نے تعارف کرایا۔ اس لڑکے نے انگلی سامنے اٹھا کر شانی سے کہا۔

"دنا سختو پخو شنا زا خازا۔"

کم از کم شانی کی تو سمجھ میں یہی آیا تھا۔ کہا تو کچھ اور تھا اس نے ایک تو تیز لہجہ پھر.... شانی سٹپٹا گئی۔ بے وقوفوں کی طرح اسے دیکھنے لگی۔ دوبارہ اس نے پھر کچھ کہا تو شانی نے کہا۔

"میں پشتو سمجھ نہیں سکتی۔ آپ اردو میں بات کریں۔" اس پر ازابیلا تالیاں بجانے لگی۔

"لیکن آپ نے ازابیلا سے کہا آپ کو اپنے ملک کی ہر زبان پر عبور حاصل ہے۔"

"نہیں جی ایسا نہیں ہے۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔ بس ایسے ہی۔"

"اچھا۔ تو آپ شیخی بانک رہی تھیں اور میری زبان کا مذاق اڑا رہی تھیں۔"

شانی کو ہنسی آ گئی۔ "آپ کی اردو خاصی بہتر ہے بلکہ بہت اچھی ہے' میری پشتو سے۔"

وہ بھی ہنسا "آپ کی پشتو؟ یعنی میری زبان آپ کی ہوئی۔ واہ بھئی۔ یہ تو بہت نیک شگون ہے۔ میری اردو' آپ کی پشتو ہاہاہا۔"

پھر اس نے پشتو میں کچھ کہا۔ جو شانی نے سنا' وہ یہ تھا۔ شالا مارا زا خند امزاجا۔

"آپ کی سمجھ میں آیا؟ جو میں نے کہا؟" اس نے شانی سے مشکل سوال کیا۔

"ہاں۔ شالا مارا زا خند امزاجا۔" "وہ سر اونچا کر کے ہنسا۔ مریم اور ازابیلا بھی تالیاں بجانے لگیں۔

"ازابیلا۔ تمہاری دوست بہت بہت دلچسپ ہے۔" اس نے انہیں اپنی گفتگو سنائی اور کہا۔

"یہ اچھا شگون ہے۔ یعنی پہلی ملاقات میں یہ میری ہو گئیں۔ میں ان کا' یعنی ہم زبان یہ میری میں ان کا ہم زبان کیسا؟"

وہ چڑ گئی۔ "آپ تو بہت ہی بے دھڑک انسان ہیں۔"

ازابیلا' مریم بہت خوش تھیں۔

"ازابیلا نے آپ کا نام بتایا ہے شافعہ۔ آپ اس اتفاق کو کیا کہیں گی؟ میں ہوں شفیع احمد۔"

چند منٹوں کی ملاقات۔ میں شفیع احمد سو جان سے اس پر عاشق ہو گئے۔ یہ مریم اور ازابیلا کا خیال نہیں یقین تھا۔ انہوں نے آج کے واقعے کے بعد اسے بہترین لو اسٹوری قرار دیا۔ ان کے خیال میں یہ اتفاق۔ قدرت کی طرف سے طے تھا اور اب اسے پایہ تکمیل تک پہنچنا چاہیے۔

شانی ان کی طے کردہ لو اسٹوری کے سراب سے دور ہو گئی۔ حالانکہ اس کے بعد بھی کئی بار شفیع احمد صاحب سے سر راہ ملاقات ہوئی مگر وہ اسے اہمیت دیے بغیر اپنی راہ ہو لی اور اب.... ایک عرصہ گزرنے کے بعد وہ مطمئن تھی کہ اس نے جو فیصلہ جلد بازی میں کیا تھا۔ وہ مشیت ایزدی کے عین مطابق۔ وہ کسی بڑے سانحے سے بچ کر واپس اپنے مسکن پہنچ گئی تھی۔



اماں زاہد ماموں پر خفا ہو رہی تھیں اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ بے چارے مسکین آدمی۔ اماں کے زیر عتاب رہتے ہی تھے۔ اور کبھی خفا بھی نہ ہوتے کیونکہ اماں ان کو چاہتی بھی بہت تھیں۔ خود کہتے تھے۔ ایسا نہ ہوتیں تو ہم سڑک پر پڑے ہوتے۔

"کیا ہوا ماموں؟ اماں کیا بات ہے۔ کیوں خفا ہو رہی ہیں؟"

اس نے ماموں کی مدد کے لیے فوری پہنچنا ضروری سمجھا۔ ماموں سامنے کھڑے ہتھیلیاں مسل رہے تھے۔ عادتاً" اماں گوشت کی بوٹیوں کا معائنہ کر رہی تھیں۔ سخت ناراضی۔

"لو دیکھو نری ہڈیاں اور چھیچھڑے اور پردے کی تلی بوٹیاں' یہ ہے کھانے کے لائق بھلا؟ پھینک آؤ چیل کوے ہی کھائیں۔ زاہد بڈھے ہو گئے' سودا لینا نہ آیا۔"

انہوں نے گوشت کی تھیلی ماموں کی جانب پھینکی۔ جو انہوں نے فوراً" کیچ کر لی کسی ماہر فیلڈر کی طرح اور

وہاں سے بھاگنے میں لمحہ نہ لگایا۔ شانی نے اماں کو کندھوں سے تھاما۔ ان کا غصہ کم کرنے کے لیے۔

"اماں! ماموں سے خفا نہ ہوا کریں۔ اتنے معصوم ہیں۔ کتنا کام کرتے ہیں۔"

اماں نے تنگ کر کندھے جھٹکے۔ اس کا ہاتھ ہٹانے کے لیے۔ "ایک وہ معصوم ایک تم ان کی چمچی۔"

وہ ہٹ گئی جانتی تھی۔ ابھی تک اماں اس سے ناراض ہیں۔ لندن سے واپسی کا پروگرام۔ ان کے خیال میں خاصا گستاخانہ تھا۔ نہ ماموں ممانی کی مہربانیوں کا احساس نہ ان کے احسانوں کا خیال آئی ... جیسے یہاں کوئی خزانہ باپ دادا گاڑ گئے ہیں۔

اور وہ کسی طرح اپنے اقدام کو صحیح ثابت نہ کر سکی۔

"اچھا پھر۔ اب کیا پکاؤں۔" اماں کی گود میں ٹرے رکھی تھی جس میں ثابت مونگ تھی جسے وہ صاف کر رہی تھیں۔ آج مونگ گوشت کے پکانے کا پروگرام تھا جسے اماں "مش قلیا" کہتی تھیں۔ خواہ ماش ہو یا مونگ۔ اماں مونگ صاف کرنے لگیں۔ "وہی ہڈی چھیچھڑے جو وہ لائے ہیں۔ پکالو۔"

"وہ تو ہم پھینک آئے آپا! آپ کے حکم کے مطابق۔" ماموں باہر سے بولے۔

اماں ہڑبڑا گئیں۔ ایسا صدمہ پہنچا۔ مونگ کی تھالی ڈگمگا گئی۔ اب تھالی زمین پر۔ دال ہر طرف بکھر گئی۔ سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔

"نیستی میں آٹا گیلا... لو دال بھی گئی۔ ارے زاہد میاں کیا ہوں تمہیں۔ عقل سے بالکل ہی پیدل ہو گیا؛ سینکڑوں کا گوشت تھا۔ جا کر پھینک آئے۔ جاؤ اب جہاں پھینکا تھا اٹھا کر لاؤ تھیلی۔"

ماموں کے ہنسنے کی آواز آئی۔

"لو کدھر؟ آپ نے جیسے ہی کہا۔ ہم نے لپک کر تھیلی پکڑی اور سڑک پر ڈال دی۔ جیسے ہی ڈالی۔ نہ جانے کہاں سے چیلیں آ گئیں۔ جھپٹا مار یہ جا وہ جا۔ نہ کوئی ہڈی بچی نہ چیتھڑا اور لوگ کہتے ہیں کہ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔"

شانی کو ماموں کی سادگی سے زیادہ اماں کے چہرے کے بدلتے رنگوں پر ہنسی آ رہی تھی۔

"اس لیے ماموں! کہ چیل چٹ کر جاتی ہے گوشت، گھونسلے میں کیوں رکھے گی بھلا۔"

"تم سے تو خدا ہی سمجھے گا۔ ارے زاہد! حماقت کی انتہا ہے کہ نہیں اور بھانجی کو دیکھو۔ دانت ہی اندر نہیں ہو رہے۔ اب کون پورا کرے گا یہ خسارہ۔"

شانی پھر ان کے کندھے دبانے لگی۔

"اب اتنا بھی نقصان نہیں ہوا ہے۔ صدقہ ہو گیا۔ بھوکی چیلوں کے پیٹ بھرنے کے انعام میں اللہ اس سے بہتر چیز کھلائے گا۔ یہ نقصان نہیں ہے۔ بھوکے کا پیٹ بھرنا ثواب ہے۔"

اماں نے پھر کندھے جھٹک کر اس کے ہاتھوں سے چھڑائے۔ "ارے ثواب پکے گا کیا؟ زاہد یہ تو سوچا نہ ہو گا تم نے۔"

"سوچنے کا موقع دیا کب آپ نے۔ کہا کہ پھینک آؤ۔ نافرمانی کیسے کرتے؟"

"اُفوہ! ذرا جو شرمندگی ہو اپنی حرکت کی۔"

اور ماموں شرمندگی کے ازالے کے لیے فوراً جھاڑو لے آئے۔ دال سمیٹنے کے لیے۔ جو اماں نے ان سے چھین لی۔ اور غصے میں ان کو زور سے رسید کی۔

"خدا کی پناہ۔ اب رزق کو جھاڑو لگاؤ گے؟"

شانی نے ماموں کو وہاں سے ہٹایا اور ایک کپڑا لا کر دال سمیٹی۔ تھالی میں ڈال کر کچن میں لے گئی۔ وہاں بحث جاری تھی۔ اس نے دال صاف کی۔ دیگچی میں ڈال کر ہلکا سا بھون کر دھویا۔ پھر مسالہ اور پانی ڈال کر کوکر میں چڑھا دیا اور خود جا کر کمروں کی صفائی کرنے لگی۔ برآمدہ صاف کر کے ذرا دم لینے بیٹھی تو اماں کو اچھا نہیں لگا۔

"اب آکر کیوں بیٹھ گئی ہو۔ دال بھی جلا کر پھینکنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"کہا ہے نا۔ غلطی سے نقصان ہو جائے اللہ اس سے بہتر نعمت عطا کرتا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے۔ بس انسان کو صبر کرنا چاہیے۔"

وہ بے فکر تھی۔ اس نے صبر کو فرض بنا لیا تھا۔

اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ رافعہ اور روفی بھائی اندر آتے نظر آئے۔ افوہ انہیں بھی اسی وقت آنا تھا۔ حلیہ بہت ہی خراب تھا۔ مگر اٹھ کر فوراً" رافعہ کی گود سے اس کے گولو کو گود میں بھر لیا۔ اماں نے نواسے کو اس سے چھینا۔

"چلو جا کر دال دیکھو۔"

دال تیار تھی۔ اس کا سنگھار کرنا تھا۔ پسا ہوا گرم مسالا ڈالا۔ ہرا دھنیا' ادرک کاٹ کر ڈالا۔ بہت سے گھی سے پیاز کا بگھار لگا کر آئی تو اماں آج کی واردات کا حال رافعہ کو سنا رہی تھیں۔

"دکان کے سامنے جا کر آسمان پر دیکھتے رہیں گے۔ ہاتھ ملتے جائیں گے۔ اب دکاندار کی مرضی پانی ملا دودھ ہو یا کنکر بھری دال۔ یا باسی کھٹا دہی۔ جو کوئی گاہک نہ لے۔ یہ لے کر آجائیں گے۔"

گوشت کا قصہ سنایا جا چکا تھا شاید۔

"اماں! کیوں فکر کرتی ہیں۔ شافی چاول بنالو۔ میں چکن جل فریزی اور چکن کڑاہی لایا ہوں۔ نان بھی ہیں۔" روفی بھائی نے تسلی دی۔

شافی نے اماں کو دیکھا۔ "سن لیا اماں! میں نے کیا کہا تھا۔"

لنچ زوردار تھا۔ مگر گرم مسالے اور پیاز کے بگھار کی خوشبو والی دال سب کو زیادہ پسند آئی۔ ماموں نے دال ہی کھائی۔

"میرے حصے کا سالن رات کے لیے رکھ دو۔" انہوں نے تاکید کی۔

اماں کو داماد کے سامنے یہ فرمائش پسند نہ آئی۔ گھور کر رہ گئیں۔ روفی کھانا کھا کر چلے گئے۔ رافعہ رات رکنے کے خیال سے آئی تھی۔ بچے کا بیگ دیکھ کر شافی پریشان ہو گئی۔ "اتنا سامان۔"

"ہاں تو ضروری چیزیں ہیں۔ کپڑے' پاؤڈر۔ دوائیں' دودھ کا سامان۔ کہیں گر کر جائے چوٹ لگ جائے۔ یا کھانسی' نزلہ' بخار سب دوائیں رکھتی ہوں۔ کون ڈاکٹر کی طرف بھاگے گا لے کر۔" رافعہ نے تفصیل بیان کی۔

"ہونہہ۔ ان کو سلیقے سے کیا واسطہ۔" اماں نے بے موقع غیر متعلق رائے زنی کی۔ خفگی ظاہر کرنے کا کوئی موقع کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھیں۔

رات کو رافعہ کے سر میں درد ہو گیا اماں نے کہا۔ "گولی کھالو۔" مگر وہ دوا کے معاملے میں خاصی محتاط تھی۔

"ہمارے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔ دوائیں پیٹ میں جا کر ایک دوسرے سے لڑتی ہیں۔ ایک وقت میں ایک دوا کھانی چاہیے۔ میں تو الرجی کی کھا رہی ہوں۔ ہماری ساس کہتی ہیں۔ شہد کھاؤ۔ غرارے کرلو۔ گلا خراب ہو تو جوشاندہ پی لو اور یا پھر زیادہ سے زیادہ یہ کرو کہ اسٹیم لے لو۔ بڑے ٹوٹکے آتے ہیں انہیں۔"

"ہاں ساری مصیبت اٹھاؤ۔ ایک گولی نہ نگلو۔" اماں کو یہ کر پسند نہیں آیا۔

ماموں دار چینی کا ایک ٹکڑا پیس کر لائے۔ رافعہ کے ماتھے پر لگانے لگے۔ ساتھ ہی اپنی مجبوری اور عادات پر سیر حاصل تبصرہ بھی جاری تھا۔

"ہاں یہ تو ہے کہ میں ہاتھ ملتا رہتا ہوں۔ مگر یہ میری عادت ہے۔ تمہاری اماں سمجھتی ہے یہ پچھتاوے ہیں۔ کیسے پچھتاوے بھئی۔ قسمت کے لکھے پر شاکر ہیں۔ راضی برضا۔ اب دیکھ۔ بھائی کے گھر سے دانہ پانی اٹھ گیا۔ شافی آگئی رحمت کا فرشتہ بن کر۔ اپا کے لیے۔ ہمیں بھلا کیا عذر تھا۔ ان کی تنہائی بانٹنے کے لیے چلے آئے۔"

"ماموں۔ اماں بھی آپ کی تنہائی بانٹ رہی ہیں۔ ہر وقت آپ سے لڑ جھگڑ کر۔"

"ہاں اعتراض کے گولے برساتی ہیں۔ آپ چپ۔" شافی نے دل دہی کے خیال سے کہا۔

"ارے بیٹا تم کیا جانو محبت کے گولے کیسی طاقت بحال کرتے ہیں۔ ہمارا دل حاضر ہے۔ جتنا چاہیں نشانے لگاتی جائیں۔"

"آپ نے بھی فرماں برداری کی حد کر دی۔ سنتے رہتے ہیں جواب نہیں دیتے۔ اپنی بیگم کی بھی ایسی فرماں برداری کرتے تھے؟"

رافعہ نے ٹٹولا۔ وہ چپ ہو گئے۔

دراصل چند سال پہلے اماں نے ان کی شادی کروائی تھی۔ اپنی کسی ملنے والی کی بیٹی سے۔ ان صاحبہ کی سات بیٹیاں تھیں۔ اماں نے ہمدردی میں یہ کام کیا تھا۔ ان کی بیگم خاصی تیز طرار تھیں۔ انہیں سادہ دل، سادہ مزاج دولہا پسند نہ آئے۔

ماموں کا کوئی گھر نہ تھا۔ اماں رخصت کرا کے اپنے گھر لے آئی تھیں۔ آنے والی نے اماں سے ہی بیر ڈال دیا۔ اپنی بربادی کا ذمہ دار اماں کو ٹھہرانے لگیں۔ اماں کو زاہد ماموں سے بہت محبت تھی۔ دراصل اماں کی خالہ کافی عرصہ پڑوس میں رہیں۔ زاہد ماموں سب سے چھوٹے تھے بے حد لاڈلے۔ آٹھ سال کی عمر تک اماں اور بھائی بہن کی گود میں ہی لٹکے رہے بہانہ یہ کہ بچارا بچہ بیمار رہتا ہے۔ کمزور ہے بھائی بہن شادی شدہ ہو گئے۔

اماں ابا فوت ہو گئے۔ تو لا محالہ ماموں کو بڑا ہونا ہی پڑا۔ رینگ رینگ کر میٹرک پاس کیا۔ چھوٹی موٹی ملازمت بھی مل گئی۔ شادی ہو گئی جو راس نہ آئی۔ وہ خاتون اپنی ماں کی پریشانی اور بہنوں کے مسائل سے بے نیاز ماموں کو چھوڑ کر چلتی بنیں خلع لے لی اور بیوہ ماں کے بیٹوں کے در پر جا بیٹھیں۔ جہاں انہیں رات دن ملامت کی جاتی۔

آخر انہیں ایک بڑی عمر کا چلتا پرزہ آدمی مل گیا۔ پہلی دو بیویوں کا ڈسا ہوا۔ تیسری کی تلاش میں نئی نئی خلع شدہ مل گئیں۔ اور اس نے خوشامد چاپلوسی سے کام لے کر انہیں پر چالیا۔ نکاح کر کے لے گیا اور پہلی دو بیویوں کا بدلہ تیسری سے لینے لگا۔ غرضیکہ بہت سنگ دل نکلا۔ میکے جانے، گھر سے جانے بلکہ جھانکنے پر بھی پابندی لگا دی۔ ان کی اماں تین بیٹیوں کو کسی طور بیاہ کر فوت ہو گئیں۔ تو بقیہ چھوٹی بہنیں نوکریاں کر کے گزارا کرنے لگیں، بڑی بہن کو مطلع کر دیا۔ چاہے جیسے حالات ہوں۔ ہمارے گھر کی طرف تو دیکھنا بھی مت۔ بے چاری کے نخرے رہے نہ کس بل۔ ظالم شوہر کے ظلم کا شکار اب ماموں یاد آتے ہیں۔ کسی کے ذریعے پیغام بھیجا۔ "کہ وہ اب اگر اس شخص سے جان بچا کر آ جائیں۔ تو اپنی پناہ میں لے لو گے۔"

ماموں بہت آزردگی سے داستان غم سنا رہے تھے۔ رافعہ شافعہ بہت دل جمعی سے سن رہی تھیں۔

"کتنا رگڑو گے ماتھا۔ دیکھتے نہیں۔ بچی کا ماتھا لال ہو گیا ہے۔"

اماں نے ان کی داستان میں بریک لگایا۔ رافعہ کے ماتھے پر جلن ہو تو رہی تھی مگر وہ ماموں کی داستان میں محو تھی۔

"سنا رہے ہوں گے اپنی سرگزشت۔ دیکھو ذرا۔ ماتھا چھیل کر رکھ دیا۔ اسی کم عقل نے اپنی قسمت بھی پھوڑی ہے۔"

شافعہ حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اماں نے ماموں کو ہٹا کر رافعہ کے ماتھے کو آنچل سے پونچھا۔ پھر پاؤڈر لے آئیں۔ پاؤڈر لگاتی جا رہی تھیں اور ماموں کو لفظوں کے تیروں سے زخمی کر رہی تھیں۔ شافی کے سر میں بھی ایک دن درد کا علاج ماموں نے اسی دار چینی سے کیا تھا۔ رگڑے مارے تھے کہ وہ چیخ اٹھی۔ اماں ترچھی نظروں سے دیکھ رہی تھیں" اور ایک تو نگوڑا ماموں ہو کر خدمت کر رہا ہے۔ یہاں بھانجی صاحبہ کے نخرے ہی ختم نہیں ہوتے۔" کہہ کر منہ موڑ لیا۔

ارے اب ایک بار پھر اس کے دل نے دہائی دی۔ اماں کو کیا واقعی شافی سے محبت نہیں۔ پہلے نہ اب... اسے بخوشی اپنے سے دور بھیجا۔ وہ آئی تو شدید خفا... رشک سے رافعہ کو دیکھ رہی تھی۔

رافعہ ہنس کر بولی۔ "اوہو اماں۔ ماموں کے ہاتھ میں جادو ہے۔ درد اڑنچھو ہو گیا سچ۔"

اماں نے پھر اسے کن اکھیوں سے دیکھا۔ "اچھا شافی تو چیخیں مار رہی تھی۔"

آج اس کے دل میں پھر پرانا درد جاگا۔ جب اسے نحوست زدہ کہہ کر اماں اس سے بے نیاز رہتی تھیں۔ آج رافعہ سے ان کا التفات اسے دکھی کر رہا تھا۔ رافعہ تو سب کی لاڈلی تھی۔ اس نے کبھی مقابلہ کیا بھی نہ تھا۔ وہ ہمیشہ زیر رہی۔ صرف ابا ہی اس پر مہربان تھے۔

ماں کی نظر میں تو اولاد کا درجہ برابر ہونا چاہیے۔ لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ اس کی نالائقیوں میں اضافہ ہو رہا تھا اور یہ والی حرکت۔ انگلینڈ سے واپسی کی۔ اس کی گستاخیوں پر مہر لگا چکی تھی۔ اپنی محرومی پر رونا آرہا تھا۔ مگر وہ صبر برداشت کی عادی تھی۔

صبح دکھے دل کے ساتھ اماں کی فرمائش پر۔ رافعہ کی خاطر۔ اس نے بھرپور ناشتہ بنایا۔ حلوہ پوری چنے اور آلو کی ترکاری۔ بھانجے کو بہلانے کے بہانے سب کو ناشتہ کرتا چھوڑ کر باہر آگئی۔ رافعہ نے آکر کہا۔

"اسے مجھے دے دو۔ اس کے سونے کا ٹائم ہے۔ تم بھی ناشتہ کرلو۔"

رافعہ بچے کو بستر پر لٹا کر سلانے لگی مگر اس کا موڈ نہ تھا۔ کھلنڈرا۔ رافعہ کو تھکا دیا۔

اماں نے کہا۔ "کیوں سلا رہی ہو اسے ابھی سے۔"

"بہت سویرے کا جاگا ہوا ہے۔ ابھی نہ سویا تو۔ اس کا وقت بدل جائے گا۔ تنگ کرکے سوئے گا۔"

"اولی۔ بچے کو نیند آتی ہے۔ خود ہی سو جاتا ہے۔ زبردستی کرنے سے ضدی ہو جاتا ہے بچہ۔"

"ابھی سے ٹائم کا پابند نہ ہوا تو کبھی نہ ہو گا۔ وقت کی قدر کیسے ہوگی پھر۔" رافعہ کا فلسفہ۔

"انسان اور جانور میں کچھ فرق ہونا چاہیے۔ نیند بھوک سب وقت پر۔ ورنہ جانور ہی جب چاہا سو گئے۔ جب چاہا جاگ اٹھے۔ اس طرح انسان کو کسی اور کام کا وقت ملے گا ہی نہیں۔"

"یہ تم پڑھی لکھی لڑکیاں۔ اپنی سہولت کے لیے بچے پر زبردستی کرتی ہو۔" اماں نے بچے کو اٹھالیا اور باہر چلی گئیں۔

رافعہ فکر مند ہو گئی۔ "اب بے وقت سو کر مجھے تنگ کرے گا۔ تم سے بات کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ اب تم مجھے بتاؤ۔ وہاں کیا ہوا کہ تم بغیر پروگرام کے آگئیں۔"

وہ منتظر نظروں سے شانی کو دیکھنے لگی۔

"کچھ نہیں ہوا۔ میں کسی مرضی کے خلاف۔ مگر آئی اپنی خوشی سے ہوں۔ میں وہاں مرنے تو نہیں گئی تھی۔ آنا تو یہیں تھا۔ اس میں اتنے اچنبھے کی کیا بات ہے۔"

مصروفیت دکھانے کو وہ بستر درست کرنے لگی۔ پھر الماری کھول کر وہاں بھی کوئی کارروائی کرنے لگی۔ رافعہ بغور دیکھ رہی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ ماموں جان کس چاہت سے تمہیں لے گئے۔ پڑھایا شوق سے۔ بہو بنانا چاہا۔ اس کے بعد۔ تمہیں وہاں جاب بھی اتنی زبردست ملی۔"

"اس کے بعد میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ ماموں جان نے پڑھایا۔ کیونکہ اس میں ان کا مفاد تھا۔ وہ چاہتے تھے۔ میں ان کے نکمے' ناکارہ' نکھٹو' سوسائٹی کے بگڑے ہوئے بدنام زمانہ بیٹے کو کما کر کھلاؤں۔ تاکہ ان کی عزت برقرار رہے۔ تو میں نے ان کا پروگرام نامنظور کردیا۔ بس۔"

"ماموں جان کا اتنا پیار' مہربانی' محبت کچھ خیال نہیں آیا؟؟"

"محبت میں غرض شامل ہو جائے تو وہ روح سے خالی ہو جاتی ہے۔ بے روح محبت کا خیال لاحاصل ہے۔ ان کا پروگرام یہیں سے بن گیا تھا۔ مجھے وہاں جا کر علم ہوا۔ اگر مجھے یہیں خبر ہو جاتی۔ تو میں کیوں جاتی۔ ہاں ماموں جان کا احسان مانتی ہوں' انہوں نے زبردستی روکا نہیں مجھے۔ اگر پاسپورٹ نہ دیتے۔ لیکن خیر۔" وہ رک گئی۔

"وہاں کیسی عیش آرام کی شاندار زندگی گزار رہی تھیں۔ یہاں کیا ملا؟"

"ماں بہن۔ وطن اور سارے اپنے۔"

وہ کچن میں آگئی۔ رافعہ کو مطمئن کرنا مشکل لگا۔ ماموں آگئے۔

"میں مدد کرتا ہوں' تمہاری۔ صبح سے لگی ہوئی ہو۔ تھک گئی ہوگی۔" اسے ان پر پیار آگیا۔ کتنے ہمدرد۔ مخلص انسان ہیں۔ قسمت سے مار کھا گئے۔ کسی نے ان کا اندرونی چہرہ پہچانا ہی نہیں۔ بیگم بھی ظاہری حلیے کو ٹھوکر مار گئیں۔ اب پچھتا رہی ہیں۔ آخر انسان عقل سے کیوں کام نہ لے۔ صبر کیوں نہ کرلے۔

وہ جب لندن سے آکر سب رشتے داروں سے ملاقاتیں کررہی تھی۔ زاہد ماموں کے بڑے بھائی کے گھر ملنے گئی وہاں ان کو دیکھا تھا۔ ایک بے تنخواہ کا ملازم۔ بھابھی اور ان کے بچوں کا مزاج دیکھ کر بات کرنے والا۔ اور جب وہ اماں کو رافعہ کے گھر سے اپنے گھر لانے کی تگ و دو کررہی تھی۔ اماں کے اعتراض پر۔

"دو عورتیں۔ بغیر کسی مرد کے۔ دنیا کا رنگ بہت خراب ہوگیا ہے۔ کیسے رہیں گے۔"

اس کو زاہد ماموں کا خیال آیا۔ اماں سے بہت سنجیدگی سے بات کی۔ وہاں ان کی حالت زار کا بتایا۔

"اماں ہم ان کی عزت تو کریں گے۔ آپ تو ہمیشہ ان سے محبت کا ذکر کرتی ہیں۔"

پھر ان کو نیم رضامند دیکھ کر ماموں سے بات کی۔

"دیکھیں ماموں۔ پہلے کی بات اور تھی۔ میں نہیں تھی ماموں صاحب کو اللہ نے بلالیا... اب... داماد کے گھر رہنا۔ کم از کم میں تو نہیں رہ سکتی اور اکیلی اپنے گھر میں بھی کیسے رہوں گی۔ آپ اگر مہربانی کرکے۔ اماں کو سمجھائیں کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں گے۔"

ماموں کا چہرہ کھل گیا۔ پھر اماں کو انہوں نے سمجھایا اور اس طرح... وہ اپنا بکس لے کر آگئے۔ سادگی سے رہنے لگے۔ جیسے ہمیشہ سے رہتے رہے ہوں۔

اماں بھی رورعایت کا تکلف کیے بغیر یوں ان سے الجھنے لگیں جیسے وہ کبھی ان سے الگ ہوئے نہ تھے۔ البتہ رات میں دونوں بہن بھائی پرانے قصے۔ گزرے ہوئے واقعات دہرایا کرتے۔ بہت ہی یگانگت کا سماں ہوتا۔ دن بھر کی لاگ لپٹ۔ ڈانٹ ڈپٹ پس پشت۔

شانی گھر کا سودا اسٹور جاکر خود لے آتی۔ لندن میں اسے خوب تجربہ ہوگیا تھا۔ کبھی کبھی ہی ماموں اپنی خدمات پیش کرتے۔ اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے۔ کہ کس طرح کس کس موقع پر انہوں نے ہر چیز بے حد سستی اور اعلا خریدی۔ اور کس طرح دکاندار کی بے ایمانی پکڑی۔ مگر افسوس۔ ان کی عقل مندی اور قابلیت کی اماں کو ذرا قدر نہ تھی نہ پروا۔ ان کی لائی ہوئی ہر چیز اماں کو مہنگی اور پھینک دینے والی لگتی۔

"یہ دیکھو یہ انار لائے ہیں۔ موئے داغی۔ اے بھئی۔ آنکھیں تو گھر پر چھوڑ جاتے ہیں۔ عقل سمیت۔ دکاندار کی ہمدردی۔ اس کا بھی تو فائدہ واجب ہے۔ جو گلا سڑا مال وہ کوڑے میں پھینکنا چاہتا ہے۔ ان کے حوالے کردیتا ہے۔ یہ آجاتے ہیں۔ شاداں و فرحاں۔ کہ جی دو فائدے ہوئے۔ ایک دکان دار کا۔ دوسرے چیونٹے چیونٹیوں کا۔ بچارے بھوکے رہتے تھے۔ پھل تو زاہد میاں کی مہربانی سے انہیں ملتے ہیں۔"

شانی نے ماموں کو دیکھا۔ شاید برا مانا ہو۔ مگر وہ نہایت انہماک سے اناروں کا معائنہ کررہے تھے۔

"اب... یہ پھینکے جائیں گے تو چیونٹے چیونٹیوں کا ہی فائدہ ہوگا۔ انسان کے کھانے لائق تو ہیں نہیں۔"

شانی نے آرام سے انار چھیلے۔ کہیں کہیں سے داغی تھے۔ وہ خراب دانے پھینک دیے۔ (چیونٹیوں کے لیے نا) بقیہ دانوں پر نمک کالی مرچ چھڑک کر اماں کے سامنے رکھے۔ انہوں نے فوراً" ماموں کو شرکت کی دعوت دی۔

"آجاؤ زاہد میاں! اب اپنی لائی ہوئی انار دانیاں بھی کھالو خوبی بھری۔"

ماموں فوراً" حاضر۔ اب انار دانیاں (دانے چھوٹے لگے اماں کو) دونوں بہن بھائی کھا رہے ہیں تعریف کے ساتھ۔

شانی کہتی "اماں! ہر وقت نہ ماموں کے پیچھے پڑی رہا کریں۔ برا مان کر چلے گئے۔ تو ہم کیا کریں گے۔"

اماں ان دیکھی مکھی کان پر سے اڑاتیں۔ شانی ماموں کی دل دہی کرتی۔

"ایسے ہی عادت نا" اماں آپ پر اعتراض کرتی ہیں۔ دیکھ لیں۔ پھر کھاتی بھی شوق سے ہیں۔"

"ارے ہاں ہم کیا جانتے نہیں۔ سدا کی نخریلی ہیں۔ دولھا بھائی سے بھی اسی طرح لڑتی تھیں۔"

"ایسا ہے؟" وہ حیران ہوگئی۔

"ہاں... تو اور کیا ہم جانتے ہیں۔ اسی لیے تو بچارے اتنی جلدی گزر گئے۔"

اماں نے سن لیا۔ وہیں سے آواز لگائی۔ "ہاں تم تو میرے ہم زاد ہو۔ یوں کہو کہ میں قیامت تک کی خبر لائی ہوں۔ جو تمہیں سناتی رہتی ہوں۔"

ماموں فوراً لپکتے۔ اماں کے کندھے دبا رہے ہیں۔ تیل لا کر بالوں کی مالش کر رہے ہیں۔ خوشامد آخر اماں کو ہنسا دیتے۔

"کتنے اچھے ہیں ماموں۔ ایسے قیمتی لوگوں کے نصیب میں محرومیاں کیوں ہوتی ہیں؟"

☼ ☼ ☼

شانی کو ایک امریکن کمپنی میں بہت اچھی جاب مل گئی۔ مہینہ بھر سے کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ شکرانے کے نفل اماں نے پڑھے۔ یہ خبر ماموں نے اسے پہنچائی۔ وہ حیران ہو گئی۔ اچھا اماں کسی معاملے میں اس پر مہربان بھی ہوتی ہیں؟ انہیں فکر تھی؟

ایک دن ایک صاحبہ اپنی بیٹی کے ہمراہ ان کے گھر آ گئیں۔ اماں نے عینک کے پیچھے سے انہیں پہچانا۔ جلدی سے کھڑی ہو کر بڑھیں۔ بے حد دلچسپ سین تھا۔ اماں نے لپک کر ان کے گلے لگنا چاہا۔

"اے میری بچپن کی گیاں۔" (سہیلی یہ شانی نے نتیجہ اخذ کیا) ایک کندھے پر گردن رکھی تھی کہ آنے والی کے منہ سے نکلا۔

"ناہیں۔ پہچانی نہیں.....؟"

اماں نے گردن اٹھا کر ان کا چہرہ دیکھا پھر دوسرے کندھے پر گردن ڈالی اور کہا۔

"کیوں نہ پہچانوں گی عالیہ ہو۔"

"ناہیں۔" انہوں نے گردن بھی انکار میں ہلائی۔ "میں زینب ہوں۔"

"اے ہے۔ پتھر پڑے میری عقل پہ۔ ادھر ذہن گیا ہی نہیں۔ بھولنے لگی ہوں۔" پھر جو بیٹھ کر باتیں ہوئیں تو نہ جانے کب کب کے قصے یاد آتے گئے۔

"اچھا یہ تو بتاؤ خیریت سے رہیں۔ انڈیا سے کب آئیں۔"

"بس بہنا کیا بتاؤں۔ خیریت ہوتی تو میں بھلا یہاں کہاں ہوتی۔" پھر انہوں نے بہت آزردگی سے بتایا۔

"چار سال پہلے آئی تھیں۔ یہاں ان کی بڑی بہن تھیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے سے ان کی بیٹی کا رشتہ مانگا۔ یہ آئیں اور بیٹی کی شادی کر کے واپس چلی گئیں۔ ادھر یہ ہوا کہ بہن بھی گزر گئیں۔ اور داماد نکھٹو تھا۔ کام چور۔ کاہل، مدحت میری بیٹی نے اسکول میں نوکری کی۔ کسی طرح گزارا ہوتا رہا۔ مگر وہ لالچی تھا۔ اسے کوئی امیر لڑکی مل گئی۔ مدحت کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ طلاق بھیج دی۔ کرائے کا گھر تھا، زیور جو کچھ تھا۔ بیچ کر کئی ماہ کا کرایہ ادا کیا۔ سامان کچھ بکا کچھ بانٹ دیا۔ ایک استانی اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ مجھے خبر بھی اسی نے دی۔ میں اب آئی ہوں۔ تو کسی نے بتایا کہ اس گھر میں ماں بیٹی رہتی ہیں۔ اوپر کمرے خالی ہیں۔ میں نے سوچا قسمت آزماؤں۔ یہ توقع نہ تھی کہ تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ اب نہ تو میں یہاں زیادہ رک سکتی ہوں۔ نہ یہ انڈیا جا سکتی ہے۔ کوئی مناسب رشتہ مل جائے تو اس کا گھر بسا دوں۔ فی الحال تو سر چھپانے کا ٹھکانا چاہیے بہن۔ بڑی امید لے کر آئی ہوں۔"

وہ دیر تک رہیں۔ رات کا کھانا کھا کر ہی گئیں۔ مدحت بہت سنجیدہ اور معصوم سی لگی۔ عمر میں رافعہ سے بڑی تھی۔ شاید اس کی بڑھتی عمر کے پیش نظر بے چاری نے بھانجے سے شادی کر دی تھی۔

"میں نے ان سے کہہ دیا ہے۔ اوپر دو کمرے ہیں۔ آ جاؤ۔ مگر ملاقاتی کوئی نہیں آئے۔ آج کل زمانہ خراب ہے۔ صبح آ جائیں گی۔ اصل میں انڈیا میں وہ بعد میں گئیں۔ یہیں ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں۔ ان کا سسرال دلی میں تھا۔ بعد میں میاں کے ساتھ چلی گئیں۔" شانی کو مدحت اچھی لگی۔ اور پھر وہی سوال ذہن میں چکر لگانے لگا۔ "اچھے لوگوں کے نصیب کیوں برے ہوتے ہیں؟"

☼ ☼ ☼

اگلے دن دونوں ماں بیٹی آ گئیں۔ سامان مختصر ہی

تھا۔ اور پلنگ، بستر پردے وغیرہ تھے ہی۔ میز کرسیاں بھی تھیں۔ بہت ممنون ہوئیں۔ اماں نے کرایہ لینے سے انکار کردیا۔ اور کہا۔

"جیسی میری بیٹی۔ ویسی تمہاری۔ جو دال دلیہ گھر میں ہم کھائیں گے۔ اسے بھی کھلا دیں گے۔" وہ رونے لگیں لپٹ گئیں۔

اب شانی اور مدحت صبح ساتھ ہی گھر سے نکلتی تھیں۔ مدحت اسکول سے سہ پہر کو آتی تھی۔ شانی کو دیر ہو جاتی۔ کئی دن کے ساتھ سے پتا چلا کہ مدحت تو بہت ہی نیک اور کار گزار قسم کی خاتون ہے۔ گھر کے کام میں ماہر۔ اسکول سے آکر کتنے کام کر لیتی تھی۔ پھر شانی نے رانعہ سے مشورہ کیا۔ اور اماں کو بھی راضی کر لیا۔

"اے مگر۔ یہ تو نکھٹو ہیں۔ کیا اس بے چاری کی قسمت میں نکھٹو مرد ہی لکھا ہے۔"

"میرے آفس میں ایک کلرک کی ضرورت ہے۔" اور اگلے دو دن ماموں کو آفس میں کام دلانے کی کوشش ہوئی۔ کامیابی مل گئی۔ تو زینب بی بی سے مدحت کا ہاتھ مانگا۔ ماموں شرما رہے تھے مگر راضی برضا۔

زینب کی تو دلی مراد بر آئی۔ اماں کی مہربانی کی مشکور تھیں۔ جھٹ منگنی کی ضرورت نہ پڑی۔ پٹ نکاح ہو گیا۔ ماموں کے بھائی بھابھی شریک ہوئے اور ماموں کو اوپر مدحت کے کمرے میں رخصت کردیا گیا۔

زینب اماں کی ساتھی بن گئیں۔ ان کو اندیا جانا تھا۔ اماں کی بہت خوشامد کر رہی تھیں کہ "مدحت کا خیال رکھیں۔ بہت دکھ اٹھائے ہیں اس نے صبر کے ساتھ وقت گزارا۔ نہ کسی سے شکوہ نہ شکایت۔ خدمت کرے گی آپ کی۔ زاہد کی کنیز بن کر رہے گی۔" اماں کو ایسی باتیں پسند نہ تھیں۔

"اے بہن! کنیزوں کا دور اب نہیں رہا۔ ہم تو سر آنکھوں پر رکھیں گے۔ عزت اور محبت دیں گے۔ فکر نہ کرو۔" بے چاری روتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔

مدحت واقعی بہت کار گزار اور خدمت گزار تھی۔ گھر کے کاموں میں لگی رہتی۔ پھر شانی نے ایک عورت کا انتظام کردیا۔ جو صبح سے مدحت کے اسکول سے آنے تک گھر میں رہتی۔ کھانا پکا کر کچن کا سارا کام کرتی۔ اماں کی تنہائی کا مداوا ہو گیا۔

اماں مدحت سے بہت خوش تھیں۔ ماموں پر بھی مہربان ہو گئیں۔ (کیسی مہربان؟) ماموں اور اماں کچن میں محو گفتگو تھے۔ آوازیں ماشاء اللہ۔ مدحت لاؤنج میں صفائی کر رہی تھی۔

"اوہو۔ ایا یہ آم تو خراب ہے۔ کیڑے ہیں اس میں تو۔" ماموں کی آواز۔

"تو تمہیں کاٹ لیں گے کھالو۔ پھلوں کے کیڑے کچھ نہیں کہتے۔" اماں کی آواز۔

"ارے ایا۔ ایک کیڑا باہر آگیا۔ گردن اونچی کیے مجھے گھور رہا ہے کہ بندے ہٹ راستہ دے۔"

"اچھا دے دو راستہ پھینک دو۔"

"آم کو؟"

"نہیں کیڑے کو۔ اب کیڑا نکال کر کھالو کیا اتنے منگے آم پھینکے جائیں گے؟"

شانی نے گھبرا کر مدحت کو دیکھا۔ جو دوپٹہ منہ میں ٹھونسے ہنسی روک رہی تھی۔

"اماں! کیوں بیمار ڈالیں گی ماموں کو۔" وہ اپنی جگہ سے چیخی۔ "ماموں! پھینک دیں۔ گلے سڑے پھل کھانے سے ہیضہ ہو جاتا ہے۔"

"خود لاتے ہیں۔ میں ہوتی تو دیکھ کر لاتی۔ اسی لیے کہتی ہوں کبھی عقل استعمال کر لیا کرو۔ کبھی آنکھیں مگر۔"

شکر ہے ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔

ایک دن شانی آفس سے آئی۔ تو دیکھا اماں کھڑی ہو کر صفائی کروا رہی ہیں۔ کام والی سکینہ کو روکا ہوا تھا۔ وہ اور مدحت صفائی میں جتی ہوئی تھیں۔ اماں ہدایت دے رہی تھیں۔

"چلو اب ختم کرو۔ تھک گئی ہو گی۔ بیٹھو آرام کر لو۔"

سکینہ وہیں فرش پر مدحت صوفے پر اماں کے حکم

کے مطابق بیٹھ گئیں۔

"اچھا اب چائے کون بنائے گا۔ میرا بھیا زاہد۔ جا بھیا۔ تھکی ہوئی ہیں۔ دونوں اور مجھے طلب ہو رہی ہے۔ چائے بنا لاؤ۔" اماں کا حکم۔

"ماموں جز بز ہوئے۔" اتنی عورتوں کی موجودگی میں میں چائے بناؤں؟"

"گھس نہیں جاؤ گے جاؤ پھیلاوا نہ پھیلے۔ سمجھے۔" ماموں چپکے سے کچن میں گئے۔ شافی آفس سے تھکی ہوئی آئی تھی۔ دفتر کا کام ختم ہی نہیں ہوا تھا۔ چپ چاپ ماموں کی بنائی چائے پینے لگی۔ مدحت نے بعد میں بتایا۔ اماں کی کوئی پرانی سہیلی آنے والی ہیں۔ "افوہ سہیلیاں"

دوسرے دن وہ ذرا جلدی گھر آ گئی۔ آفس کا کام گھر لے آئی تھی کمرہ بند کر کے رجسٹر کھول لیے۔ اماں کو اس کا گھر لا کر کام کرنا پسند نہ تھا۔ اس لیے کمرہ بند کیے بیٹھی تھی۔ لیکن پین کی ضرورت پڑی تو اماں یاد آئیں۔ ان کے پاس ضرورت کی ہر چیز کا اسٹاک رہتا تھا۔ ڈرائنگ روم سے اماں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اندر گھستی چلی گئی۔

"اماں! آپ کے پاس کوئی پین ہو گا نیا۔" اندر تو۔ ایک مہمان بیٹھا چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شافی کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

اور۔۔۔ جہاں شافی اپنی جگہ منجمد ہو گئی۔۔۔ وہ بھی تیزی سے کھڑا ہوا۔ اماں نے مڑ کر شافی کو دیکھا۔

"ارے شافی آؤ۔ دیکھو کون آیا ہے۔ شیر دل خان یہ میری بیٹی ہے۔"

اماں بہت خوش دلی سے تعارف کرا رہی تھیں۔ وہ خواب میں چل کر آگے آ رہی تھی۔ بلا ارادہ۔

"تم کہاں پہچانو گی بھلا۔ ارے کبریٰ کا بیٹا ہے۔ میں نے بتایا تھا نا۔ پشاور چلی گئی تھی کبریٰ۔ میں اس کے بیٹے کے عقیقے میں گئی تھی پشاور۔ یہ وہی ہے۔ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ میری تو شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ابا لے کر گئے تھے۔ میں نے ضد ہی اس قدر کی کہ۔۔۔ اچھا کیا ہوا۔ پین تم بیٹھو۔"

اماں خوش تھیں بہت۔ وہ باہر چلی گئیں۔ تو سوئی جاگی کیفیت میں وہ کرسی پر جا بیٹھی۔

"آ۔۔۔ آپ یہاں۔"

"ہاں۔ مجھے علم نہ تھا کہ۔۔۔ وہ تو امی نے خالہ جی کو فون کر کے گھر کا ایڈریس لیا۔ مجھ سے کہا گھر دیکھ آؤ۔ اس لیے آیا تھا۔ جانتا نہ تھا۔ یہاں میری تلاش ختم ہو جائے گی۔" وہ بھی خواب کی سی کیفیت سے دوچار۔ جلدی جلدی بول رہا تھا۔

"تو۔۔۔ یہ شیر دل خان۔۔۔ کون ہے؟"

"میں ہوں، ہمارے دو نام ہیں۔ ننھیالی۔ ددھیالی۔ نانا نے شفیع احمد رکھا تھا۔ دادا نے شیر دل خان۔ میرے بھائی بہن کے بھی دو نام ہیں۔ میں نے وہاں تمہیں بہت تلاش کیا۔ بہت انتظار کیا۔ میں سمجھتا تھا، تم مجھے ضرور نئے پروگرام سے باخبر کرو گی۔"

وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ اماں بولتی ہوئی آئیں۔ "کبریٰ سے کہنا۔ جب لاہور آ ہی گئی ہو۔ تو بلا تکلف جب چاہے آ جایا کرو۔ گھر دیکھ لیا ہے تم نے۔"

وہ انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر باہر آئی اور کمرے میں بند ہو گئی۔ دل عجیب سی کیفیت میں دھڑک رہا تھا۔ گھبراہٹ ہونے لگی۔ کام میں دل نہ لگا۔ لیٹ گئی۔

کیوں؟ آخر کیوں؟ یہ اب یہاں کیوں آ گیا۔ بغیر کوشش۔ کیسے دامن چھڑاؤں اس سے۔ کسی کو خبر نہ ہو جائے۔ کھانے کے لیے رات کو باہر نکلی۔

مدحت نے بغور دیکھا۔ "کیا بات ہے۔ طبیعت کیسی ہے۔ چہرہ کیسا پھیکا پھیکا سا ہو رہا ہے۔"

"تھوڑے دفتر کا کام جو اٹھا لائی ہے۔ تھکن ہو گئی ہو گی۔" اماں نے کہا۔

☆ ☆ ☆

رات سنسان تھی۔ لیکن دماغ میں شور بپا تھا۔ کسی کو ابھی تک رازدار نہ بنایا تھا۔ اب۔۔۔ شاید کچھ راز نہ رہے۔ پھر۔۔۔ کیا ہو گا۔ کس کس سے معافی مانگے گی۔ کس کس کو صفائی دے گی۔ وہ سکھ چین کے چند سال۔ کس آسانی سے گزر گئے۔ پانچ سال بھی نہ وہ

پاکستان آئی نہ اماں آئیں۔ وہ اماں کے لیے تڑپ رہی تھی۔ مگر ماموں جان کے ایک دوست کی معرفت اسے بہت اچھی جاب مل گئی۔

مامی ماموں جان تو اس کو نظر سے اوجھل ہونے کا موقع دینے کو تیار نہ تھے۔ اولاد کی محبت کے ترسے ہوئے لوگ۔

پاکستان جانے کا نام لیتی تو مامی کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ماموں جان اداس ہو جاتے۔ جاب ملنے سے اس کو کچھ تقویت ہوئی۔ جب اس نے پہلی تنخواہ مامی کے ہاتھ پر رکھی۔ وہ جذباتی ہو گئیں۔ ماموں جان نے خوشی کا اظہار کیا۔ بنک میں اس کا اکاؤنٹ کھلوا دیا۔ پھر جب وہ ان دونوں کے لیے گفٹ لائی۔ مامی باقاعدہ رونے لگیں۔

ماموں جان نے کہا۔

”یہ ہوتی ہے اچھی تربیت کی نشانی۔ ہم نے اپنے بیٹے کی ایسی تربیت کی ہوتی تو کیوں ترستے اس کے التفات کے لیے۔“

اس کے دوران قیام دوبار فہد آیا اور مامی کو پیار کر کے چلا گیا۔ سارا نے ہی ایک دن راز کھولا۔ فہد مامی سے رقم اینٹھنے آتا ہے۔ ماموں جان اس کے ڈراوے میں آتے نہ تھے۔ مامی کو بلیک میل کیا کرتا۔ کبھی نہیں آؤں گا۔ خودکشی کرلوں گا۔ کبھی شکل نہیں دکھاؤں گا۔ وغیرہ

اس کے مزاج میں خودسری کے علاوہ عیاشی کا جنون بھی کارفرما تھا۔ اور بے حسی، خود غرضی خود بخود اوصاف بن گئے۔ واہ کیا اولاد ہے۔ اور کیوں لوگ لڑکے کے لیے تڑپا کرتے ہیں۔

وہ خود بھی یہی تصور نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی زندگی میں تلخ تجربات سے واسطہ پڑے گا۔ ناقابل برداشت اذیت اور انہونیوں سے سابقہ پڑ سکتا ہے۔ شروع میں چند واقعات اس کی فطرت اور مرضی کے خلاف ہوئے تو سوچ لیا کہ اپنے گھر اور وطن سے دوری کی تکلیف دہ واقعات کا باعث ہو سکتی ہے۔ زندگی میں بہت سے تلخ واقعات ہوتے ہیں۔ اسے اندازہ تھا۔ یہ زندگی گوناگوں مصروفیات کی حامل ہے۔ زندگی کے ہزار پرت ہیں۔ وقت بااختیار ہے۔ جس پرت کو کھولنا چاہے۔ تلخ، شیریں، اذیت ناک، یا پرمسرت یہ اس قضائے قدرت کے اشاروں پر منحصر ہے۔ جس سے انسانی طاقت ہمیشہ شکست سے دوچار ہوتی ہے۔ بے بس اور بے اختیار۔ وہ اتنی باہمت تو تھی کہ تکلیف دہ حالات کو برداشت کرلے۔ لیکن۔۔۔

ایک ایسی رات بھی اس کی زندگی میں آئے گی، جو اسے موت کی دعا پر مجبور کردے۔ شانی کی زندگی کی اندوہناک۔ شب سیاہ۔ کسی آہٹ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ یک لخت ہوشیار ہو گئی۔ کوئی تھا۔ کون...

نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں اس کو صاف نظر آیا۔ فہد، ہاں وہی، اب وہ اس کا کمبل کھینچ رہا تھا۔ خطرہ... وہ پھرتی سے اٹھ بیٹھی۔ اور بزور کمبل کی پناہ حاصل کی۔

”کیا ہے؟ کیا ہے؟“ چیخی تھی۔

”اٹھو صبح ہونے والی ہے۔ میں یہاں سے جارہا ہوں اور تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔“

وہ یقیناً نشے میں تھا۔ ورنہ آج سے پہلے اس نے کبھی ایسی حرکت کی نہ تھی۔

”کیا۔۔۔؟ کہاں؟ نہیں مجھے کہیں نہیں جانا۔ نیند، نیند آرہی ہے۔“

”نہیں بیبی۔۔۔ ایک ہفتے کے لیے جارہے ہیں۔ سیر تفریح کریں گے۔ تمہیں لینے آیا ہوں میں۔“

”لیکن مجھے آفس سے چھٹی لینی پڑے گی۔ میں نہیں۔“

”گولی مارو آفس کو، میں تمہیں بہت سیر کراؤں گا۔ ہم نے ایک اسٹیمر لے لیا ہے۔ بہت مزا آئے گا۔ میں کبھی کسی پاکستانی لڑکی کے ساتھ نہیں گیا۔ اب تم جو ہو۔“

وہ بزور اس کا کمبل کھینچ چکا تھا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا سختی سے۔ شانی چیخنے لگی۔ اور چیختی ہی گئی۔ ماموں، مامی اندر آگئے۔ مامی نے فہد سے اس کا ہاتھ چھڑا لیا۔

"کیا بدتمیزی ہے فہد۔ بچی کو کیوں ڈرا رہے ہو۔"

"میں اسے اپنے ساتھ آؤٹنگ کے لیے لے جاؤں گا۔ منگیتر ہے میری۔ ظلم نہیں کر رہا۔"

"ہاں مگر... تم اسے بتاؤ... اچھا ہٹو۔ اگر وہ نہیں جانا چاہتی۔ تو تم زبردستی نہیں کر سکتے۔"

مامی اسے ہٹا رہی تھیں۔ ضدی ہٹیلا۔ گستاخ اولاد ماں کو دھکا دے کر پھر شانی کو پکڑ لیا۔

ماموں جان نے شانی کی خوف زدہ شکل دیکھی۔ وہ مسلسل نونو نہیں نہیں کہہ رہی تھی۔

"اچھا صبح ہونے دو۔" ماموں جان نے اسے سمجھایا۔ "کسی کو نیند سے زبردستی اٹھانا اچھا نہیں۔ آرام کرنے دو اسے۔ صبح بات کرنا۔"

ان کی نرمی نے اسے حوصلہ دیا۔

"صبح نہیں ابھی جانا ہے۔ رات ہوٹل میں رہیں گے۔ صبح تو ہم اسٹیمر پر ہوں گے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے دوست بھی ہیں۔ سب کے ساتھ ان کی گرل فرینڈ ہیں۔ میں اکیلا کیوں جاؤں۔ ڈیڈ آپ ہٹ جائیں۔" وہ جن تھا۔ جس پر کوئی منتر اثر کرتا تھا نہ وظیفہ۔

"اگر یہ میرے ساتھ نہ گئی۔ تو میں پھر کبھی شکل نہیں دکھاؤں گا۔" وہی بلیک میلنگ۔ ماموں جان نے کہا۔

"نہ دکھانا' ابھی نکلو یہاں سے شانی کہیں نہیں جائے گی۔"

انہوں نے اس کو ہٹایا۔ مامی فوراً" آگے آئیں۔

"کیا کر رہے ہیں آپ۔" وہی ماں کی کمزوری۔ "اگر وہ اپنی منگیتر کو اپنے دوستوں سے ملوانا چاہتا ہے۔ تو کیا حرج ہے۔ آج نہیں تو شادی کے بعد ملوائے گا۔ جو ہونا ہی ہے۔ اسے ہونے دیں۔ کوئی خوشی تو میرے بیٹے کی پوری ہو۔ اٹھو شانی۔ کوئی بات نہیں کل آجانا پھر۔" وہ اب شانی کو اٹھا رہی تھیں۔

"نہیں' نہیں مامی! میں نہیں جانا چاہتی۔ پلیز یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" وہ مامی سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر ہائے۔ ماں کی ترسی ہوئی ممتا۔

"کہہ رہا ہوں۔ میں اکیلا نہیں دوست ہیں ساتھ۔ ان کے ساتھ لڑکیاں ہیں۔"

"مگر میں... تمہاری گرل فرینڈ نہیں کزن ہوں۔" ہمت پیدا کر کے احساس دلانا چاہا۔

"منگیتر بھی تو ہو۔" خباثت سے ہنسا۔ "ماما! اس کے چار جوڑے کپڑے بیگ میں رکھیں۔ ایک ہفتہ لگ جائے گا۔"

شانی کی جان نکلنے کو تھی اس نے ماموں کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھا۔ وہ آگے آئے۔ فہد کو تھپڑ رسید کیا۔ دانت پیس کر کہا۔

"بے غیرت۔ منحوس۔ یہ منگیتر ہے۔ تمہاری عزت۔ گرل فرینڈ نہیں ہے۔ دفع ہو یہاں سے۔ اگر زیادہ بے ہودگی کی تو پولیس بلا لوں گا۔"

"بلا لیں پولیس۔ یہ ارمان بھی پورا کر لیں۔ بھیج دیں جیل' اکلوتے بیٹے کو اور پاکستانی باپ سے کیا امید کی جا سکتی ہے۔ ہمیشہ آپ کی وجہ سے ذلت اٹھائی میں نے۔"

وہ شانی کو بیڈ سے کھینچ چکا تھا۔ ماموں جان کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ مامی بیگ میں کپڑے بھر کر لے آئی تھیں۔ اب وہ اسے کوٹ پہنا رہی تھیں۔ شال لپیٹ رہی تھیں۔ گرم ٹوپی بھی پہنا دی۔ گھبرائی ہوئی تھیں۔

"چھوڑیں فرسودہ روایات کو یہ نیا زمانہ ہے۔ اور ہمیں اپنے بیٹے کی خوشی دیکھنی ہے صرف۔ خاندان کون سا یہاں موجود ہے۔ جیسے ہی یہ آئیں گے۔ شادی بھی کر دیں گے۔"

خون رگوں میں جم گیا تھا۔ شانی بے جان ہو رہی تھی۔ مامی اسے تیار کر چکی تھیں۔ موزے جوتے بھی پہنا کر۔ ایک طرف ماموں جان احتجاجاً" مامی سے کچھ کہہ رہے تھے' دوسری طرف مامی اسے فہد کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ چیختی چلاتی روتی ہوئی شانی ماموں کو پکار رہی تھی۔

فہد' طاقتور دیو۔ اسے گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف لے گیا۔ ماموں جان لاؤنج میں کرسی پر بیٹھ گئے

بے بسی۔۔۔ دروازہ کھلتے ہی سرد ہوا چہرے سے ٹکرائی۔ وہ پھر چیخی۔

"اب تم نے آواز نکالی۔ جان نکال لوں گا۔ باہر آکر شور کیا تو اپنا انجام دیکھنا۔"

بیگ اس نے مامی سے لے کر کندھے پر لٹکا لیا تھا اور شانی کا بازو پکڑ کر لفٹ تک کھینچ لایا۔ شانی برف کا تودہ بن گئی۔ سڑک پر ٹیکسی موجود تھی۔ فہد نے پچھلا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیلا اور خود بھی دھنس گیا۔

"خبردار جیسا کہوں۔ کرتی جانا۔" غرا کر بولا۔ اسے انجام کا خوف نہ تھا۔ ایسی لاچاری بے بسی کم ہمتی ٹیکسی چل پڑی تھی۔ اب آخر پھر حوصلہ جمع کیا۔

"پلیز، فہد بھائی مجھے گھر جانے دو۔ میں صبح آپ کے دوستوں سے مل لوں گی۔ پلیز نکل۔"

"ہرگز نہیں میرے دوست مذاق اڑاتے ہیں۔ اب تو تم میری گرل فرینڈ ہو۔ چپ چاپ بیٹھی رہو۔ ہوٹل میں کمرہ لے لیا ہے۔ قریب ہے یہاں سے۔" وہ پھر غرایا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے مفلر کے اندر سے آواز نکالی۔

"صاحب کوئی مسئلہ ہے؟"

شانی کو موقع مل گیا۔ "بھائی ٹیکسی والے۔ دیکھو یہ زبردستی مجھے لے جا رہا ہے۔ میری مدد کرو۔ پلیز اللہ کے واسطے۔"

فہد اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ جملہ پورا کر چکی تھی۔ ڈرائیور کو اللہ سن کر بھی احساس ہو گیا۔ ٹیکسی رک گئی۔

"دیکھو صاحب، میں غریب بندہ ہوں۔ مزدور ہوں۔ مگر میری بیٹی نے اللہ کا واسطہ دیا ہے۔ اتنا کر سکتا ہوں کہ پلیز آپ دوسری ٹیکسی لے لیں۔"

فہد اسے منہ مانگا انعام دینے کی بات کر رہا تھا۔ ڈرائیور لجاجت سے بولا۔

"آپ یہیں اتر جائیں صاحب، میں کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ آپ غلط کام کر رہے ہیں۔"

فہد مغلظات بکتا ہوا نیچے اترا۔ شانی کو کھینچا باہر شدید ٹھنڈ تھی۔ کوئی ٹیکسی نظر نہ آئی۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ رات کے اس پہر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اسے کھینچتا ہوا لے جا رہا تھا۔ وہ التجا کر رہی تھی۔ اس شخص پر شیطان سوار تھا۔ اللہ اللہ کے سوا اب کون مددگار تھا۔ ٹھٹھری ہوئی آواز میں وہ پوری طاقت سے اللہ کو پکارنے لگی۔

"اللہ۔۔۔ اللہ کوئی فرشتہ بھیج دے۔" اب فٹ پاتھ پر وہ گر گئی تھی۔ فہد اس کا بازو کھینچتا جا رہا تھا۔ دن میں یہاں رونق ہوتی ہو گی۔ مگر۔۔۔ دکانیں بند تھیں۔ دھند میں لائٹیں بھی مدھم تھیں۔ کہیں کوئی بندہ نہ بشر اور پھر کلینک کا دروازہ کھلا۔ دو آدمی اندر سے باہر آئے۔ وہ چلائی۔

"اللہ جی۔۔۔ کوئی مدد کرو۔۔۔ پلیز بھائی۔"

دونوں نے سامنے کا منظر دیکھا۔ قریب آ گئے۔

"کیا بات ہے مسٹر، کلینک جانا ہے؟ مدد چاہیے۔۔!"

شانی نے چیخ کر کہا۔ "میں اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔ زبردستی لے جا رہا ہے۔ بھائی میری مدد کرو۔"

دونوں ٹھٹکے۔ فہد کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"دیکھو تم اس معاملے میں دخل نہ دو۔ چلو۔۔۔ یہ میری بیوی ہے۔ ناراض ہے بس۔"

"نہیں۔ میں اس کی کزن ہوں بھائی۔ زبردستی مجھے۔۔!"

فہد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کمبخت کی ہتھیلی اتنی بڑی تھی شانی کا پورا منہ چھپ گیا۔ سگریٹ کی بو سے اٹی ہوئی سڑی ہوئی ہتھیلی اور جو وہ کر سکتی تھی۔ وہ اس نے کیا۔ زور لگا کر ہتھیلی پر دانت گاڑ دیے۔ پھرتی سے فہد نے ہاتھ ہٹایا اور زناٹے کا تھپڑ دے مارا۔ وہ گر گئی۔ آنے والوں میں سے ایک نے فہد کا کالر پکڑ لیا۔

"شرم نہیں آتی۔ عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بے غیرت۔ اپنی کزن کی عزت کا بھی خیال نہیں۔"

فہد نے جھٹکا مار کر گلا آزاد کیا اور گالیاں بکنے لگا۔ اس دیو کے سامنے بھی صرف ہمت والا نہیں کوئی

غیرت مند جوان تھا۔ جو عورت کی عزت کے لیے جھپٹ پڑا تھا۔ دوسرا بھی فہد کو برا بھلا کہنے لگا۔ تھپڑ کی چوٹ سے وہ فٹ پاتھ پر گر گئی تھی۔ شرم کے مارے منہ اوپر اٹھایا نہ گیا۔

"تمہیں یقین کیوں نہیں آتا۔" فہد نے پھر انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "یہ میری بیوی ہے۔ ذرا سی بات پر نخرے کرنے لگی۔ دیکھو ہم تو اکثر کہیں ہوٹلنگ پر جاتے ہیں۔ اب اس نے.... بیگ میں کپڑے رکھ کر خود مجھے دیے ہیں۔ چیک کر لو۔ بس لڑائی ہو گئی راستے میں تو خفا۔ یار اٹھو شانی چلتے ہیں۔ فضول میں ان لوگوں...."

دونوں مرد پیچھے ہو گئے۔ مگر ایک نے یک دم آگے آ کر کہا۔

"شانی...؟ او شافعہ احمد؟ تم ہو؟ او میرے خدا۔ یہ کیا عذاب ہے۔" بے ساختگی میں اس نے آخری جملہ پشتو میں ادا کیا تھا۔

شانی اپنی جگہ منجمد ہو گئی۔ شفیع احمد... یہ کہاں سے ٹپک پڑا۔

"نہیں، نہیں جھوٹ بول رہا ہے یہ ہمکزن ہے بس۔ نہیں جانا چاہتی۔ پھر بھی...."

"او ہو۔" اب فہد مضحکہ اڑانے کے انداز میں بولا۔ "میں جھوٹا ہوں؟ ایں؟ جھوٹا ہوں۔ بتا دوں؟ اس کی کمر پر تل ہے۔ اس کی گردن کے نیچے ایک مسہ ہے۔ میں نے وہ کہاں دیکھا کیسے دیکھا؟ بتاؤ۔ میں جھوٹا ہوں۔ ہاہاہا۔"

قہقہے لگا رہا تھا۔ شانی کے لیے وہ جگہ قبر بن جاتی۔ تو وہ خوش ہوتی۔ وہ مارے حیا کے مردہ سی ہو گئی موت کی دعا کرنے لگی۔ کاش میں ابھی مر جاؤں یہیں منہ زمین پر رکھ کر بے بسی سے رونے لگی۔

"نہیں، نہیں یہ جھوٹا ہے۔" وہ بلک رہی تھی اور شفیع احمد بے بسی سے کھڑا اسے روتا دیکھ رہا تھا۔

تب یک لخت کربناک لمحوں میں سناٹے کو توڑتی دھند کو چیرتی پولیس کی وین ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ وین سے ایک کانسٹیبل اترا تھا۔ فہد کا نام۔ پوچھ کر۔ شفیع سے کچھ سوالات کیے۔ شفیع کا دوست بھی گواہ تھا۔ سارجنٹ نے فہد کا ہاتھ پکڑ کر وین کی طرف دھکا دیا۔ دوسرے سارجنٹ نے کاغذ نکال کر شفیع احمد کو دکھایا۔ کچھ دیر بات چیت کے بعد فہد کو لے کر وین چلی گئی۔ وہ چیختا جا رہا تھا۔ وین کے پیچھے ایک پولیس کار تھی۔ دوسرا سارجنٹ شانی کے پاس آ کر بولا۔

"آپ محفوظ ہیں۔ ہمیں رپورٹ کی تصدیق کے لیے آپ کا بیان ضروری ہے۔ آپ کے گھر حوالگی کے لیے مسٹر شفیع اور مسٹر مراد میں سے کوئی بطور گواہ ہمارے ساتھ جائے گا۔"

وہ کھڑا تھا۔ شانی اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی اسی جگہ سجدہ کر کے۔ جہاں ابھی چند منٹ پہلے دفن ہونے کی دعا کر رہی تھی۔ شفیع احمد نے اس کی نقاہت ناطاقتی کا احساس کر کے۔ اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا۔ اور دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ماموں جان کے گھر کے سامنے گاڑی سے اتر کر وہ لفٹ میں پہنچے۔ اب اس کا بیگ شفیع کے کندھوں پر تھا۔ اس نے شال سے منہ چھپایا ہوا تھا۔ وہ شفیع کا سامنا کرنے پر مجبور تھی۔ منہ دکھانے پر نہیں۔ ماموں جان کے گھر کا دروازہ زندگی بن گیا۔

سارجنٹ نے یا شاید انسپکٹر تھا۔ شفیع سے کہا۔

"آپ بھی آئیے۔ موقع کے گواہ ہیں۔ حوالگی کے بھی گواہ ہیں۔"

دروازہ آغوش مادر کی طرح وا ہوا اور وہ اندر کھڑے ماموں جان کے سینے سے لپٹ گئی۔

"تھینک یو آفیسر۔" قانونی کارروائی کے بعد ماموں جان نے کافی کی پیش کش کی۔ مگر دونوں شکریہ کہہ کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد اسے کچھ ہوش آیا۔ اندر کمرے سے مامی کے رونے بلکنے کی آواز آ رہی تھی۔ ماموں جان اس کے بال سنوارتے رہے۔

"بٹو کچھ تکلیف تو...؟" ہچکچا گئے۔

"فہد بھائی نے مجھے فٹ پاتھ پر گھسیٹا۔ تھپڑ مارا دو لوگوں کے سامنے۔"

"پولیس... کب پہنچی؟" بے چینی سے پوچھا۔

"وہیں۔ جب میں فٹ پاتھ پر گری پڑی تھی۔ تھپڑ کھا کر۔ فہد بھائی جھوٹ بول رہے تھے کہ... میں نے بیگ میں سامان رکھ کر انہیں خود دیا ساتھ جانے کے لیے۔ میں نے تو بیگ نہیں دیا تھا ناماموں جان۔" وہ معصومیت سے منہ اٹھائے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"وہ بہت گندی گالیاں... اور بہت جھوٹی باتیں کر رہے تھے۔" وہ شرم سے چپ ہو گئی۔

مامی اندر سے نکل کر آئیں اور چیخنے لگیں۔ "تم نے ہمیشہ میرے بیٹے کے ساتھ زیادتی کی۔ ہمیشہ اس کی ہر خواہش رد کی۔ اور اب پولیس کے حوالے کر دیا۔"

"چپ رہو روزی۔" ماموں جان نے نرمی سے کہا۔ "میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ اپنے خاندان کی عزت کی خاطر۔ میں اپنی بچی کی حفاظت کر سکتا ہوں۔ کسی بھی طرح۔"

"اور بیٹے کو۔ اپنی اکلوتی اولاد کو جیل پہنچا دیا اور یہ لڑکی تم اس لیے لائے تھے کہ اسے بہو بنائیں گے۔ اسے کیا خبر نہ تھی۔ اس نے کیا کیا؟ مر نہ جاتی اگر اس کی خواہش پوری کر دیتی۔"

بلک رہی تھیں۔ وہ منہ چھپائے بیٹھی رہی۔

پو پھٹ رہی تھی۔ دھند میں کمی آ گئی تھی۔ شاید سورج نے بھی کرنوں کا جال پھینکا... روشنی سی پھیل رہی تھی چار سو۔ وہ کمرے میں نماز شکرانہ ادا کرتی رہی۔

سارا دوپہر میں آئی... بہت خفا تھی۔

"تم اسی لیے لائی گئی تھیں۔ پھر کیا اعتراض۔ وہ ان کا بیٹا ہے۔ کبھی کبھار شکل دکھاتا ہے۔ اب... اغوا کا مقدمہ ہے۔ اب تک جیل بھگتے گا... آنٹی بیمار ہیں۔ آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ میرا نہیں میری عزت میری حرمت میری مرضی کا ہے۔ میں نے ماموں مامی کے فیصلے پر کبھی اقرار نہیں کیا۔ اس ملک کا قانون... میرا ساتھ دے گا۔ تم جانتی نہیں ہو۔ فہد نے کتنی غلط باتیں میرے بارے میں کی تھیں۔ ان دونوں کے سامنے میں تو مرنے کے قریب ہو گئی تھی یقین کرو۔"

"میں... اتنا جانتی ہوں، آنٹی ایک ماں ہیں، انہیں کینسر ہے۔ وہ اس واقعے کے بعد مر جائیں گی۔ یا پاگل ہو جائیں گی۔" وہ بے حد متفکر بیٹھی تھی۔

"میرے لیے آنٹی کی زندگی بہت اہم ہے۔ وہ... صرف وہ ہیں جو میری اپنی ہیں۔ میری ماں مجھے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ آنٹی نے مجھے سہارا دیا تھا۔ اب بھی... تم اگر مان جاؤ۔ ہم اسے پولیس سے چھڑا لیں گے۔ تمہاری طرف سے ایک اپلی کیشن جانا ہے ہو گی۔ مقدمے کی واپسی۔ فہد کی رہائی۔ آنٹی کو زندگی مل جائے گی۔ تمہاری طرف سے ان کے لیے تحفہ۔ آخر انہوں نے اتنا عرصہ تمہیں پناہ دی۔ محبت دی۔"

وہ آنسو بھری نظروں سے شافی کو دیکھ رہی تھی۔ اور اس کے بعد اس نے کچھ نہ سوچا۔ ماموں جان اسے تسلی دیتے رہے۔ تحفظ کا یقین دلاتے رہے۔ لیکن اب نہیں تو کبھی نہیں۔ وہ مامی کی نفرت انگیز نظروں سے دور... واپس وطن آ گئی۔

اماں اس سے ناراض۔ وہ مامی کے ہر لفظ پر یقین کر چکی تھیں۔ جو انہوں نے پر الزام لگائے۔

اور اب... شفیع احمد یہاں... کیسے بتائے۔ وہ اس معاشرے کے سسٹم کا حصہ بننے کے بجائے۔ موت قبول کر سکتی ہے۔ اور یہ شفیع احمد عرف شیر دل خان بھی اچھی طرح سمجھتا ہے۔ جانتا ہے۔ لیکن وہ... کم از کم اس واقعے کے بعد شفیع احمد کا سامنا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ نہ ہی توقع تھی کہ وہ اپنے گھر میں اس سے ملے گی۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ ندامت سے پسینہ پسینہ ہو گئی۔ لندن میں ہی وہ اس کے بعد اگر چاہتا۔ گھر آ سکتا تھا۔ ماموں جان سے مل کر گیا تھا۔ لیکن وہ نہیں آیا تو شافی نے شکر ادا کیا تھا۔

اب تو اماں کی دوست۔ عزیز سہیلی کا بیٹا تھا۔ اسے کیسے روکتی۔ بیٹا بھی وہ۔ جس کے شاندار عقیقہ کی دعوت پر وہ اپنے ابا کے ساتھ گئی تھیں۔ اپنی شادی سے پہلے۔ ان دونوں کی انسوئی۔



اور پھر۔

اگلے دن ہی وہ اپنی والدہ کو لے کر آگیا۔ اماں کے حکم یا خواہش کے بموجب۔ اماں کی مسرت بیان سے باہر تھی۔ وہ اور مدحت ماں بیٹے کی خاطر میں بچھی جا رہی تھیں۔ پرانے قصے دہرا کر دونوں قہقہے لگا رہی تھیں۔ کبھی اماں کو اتنا خوش۔ قہقہے لگاتا دیکھا نہ تھا۔ شانی تو ان کی ہنسی کی آواز سن کر کمرے سے نکلی تھی۔ ڈرائنگ روم میں رونق لگی ہوئی تھی۔

زاہد ماموں۔ مدحت۔ شفیع احمد معہ والدہ اور اماں۔ رافعہ پتہ نہیں سب آئی۔ اس کا پہلوان بیٹا بھی سب کے ساتھ خوشی کے اظہار میں چیخیں مار رہا تھا۔ سب کی نگاہوں کا مرکز ہونے کی خوشی میں بہت چونچال ہو رہا تھا۔ شانی کو رافعہ نے آواز دے کر بلایا تو وہ اندر آگئی۔ خالہ کبریٰ نے کھڑے ہو کر اسے پیار کیا۔ خوش قسمتی کی دعائیں دیں۔ ان کا بیٹا۔ پراسرار طریقے سے مسکراتا رہا۔ پھر وہ آفس کے کام کا بہانہ کر کے بھاگ آئی۔ کتنا مشکل ہے۔ کسی کے سامنے سر جھکا کر شرمندہ ہوتے رہنا۔ منع کرنا پڑے گا۔

اگلے دن۔ رافعہ نے بتایا۔ "ہم ان کے جانے کے بعد۔ دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ اماں نے روبی کو بلوایا۔ اور ماموں کے ساتھ لمبی میٹنگ کی۔

"انہوں نے' خالہ کبریٰ نے 'تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ شیر دل خان کے لیے۔"

دھماکہ۔۔۔ دماغ سن ہو گیا۔ "یہ جو کبریٰ خالہ ہیں۔ اماں کی تھرڈ کزن۔ کلاس فیلو دوست۔ شادی کر کے پشاور بلکہ مردان چلی گئیں۔ تو پانچ سال بعد میکے آئیں۔ پھر بہت عرصے کے بعد۔ اپنے بھتیجے کی شادی میں آئیں۔ تو انہیں میں پسند آگئی۔ میرا رشتہ دے دیں۔" رافعہ ہنس ہنس کر سنا رہی تھی۔ ابا نے کہا۔ ہرگز نہیں' بہت سخت لوگ۔ اجڈ ماحول ہے اور میری رافعہ نازک مزاج بہت ہے۔ ہاں شانی کے لیے ممکن ہو سکتا ہے۔ دیکھا تم نے قسمت کا لکھا۔ کبھی زبان پر آ ہی جاتا ہے۔"

"واہ۔ رافعہ نازک مزاج ہے۔ اور شانی مردمار بہادر جنگجو ہے۔ چاہے اسے پھپھو کی گود میں پھینک آؤ' چاہے مردان کے سخت کھردرے ماحول کی نذر کر دو۔ خواہ لندن بھجوا دو مرنے کے لیے۔ واہ۔ کیا انصاف ہے۔" اماں نے پھر بھی اپنا خیال ظاہر کیا۔

"سچی بات ہے۔ اب میں بوجھ اٹھانے کے لائق نہیں رہی۔ نہ گھر سنبھلتا ہے۔ نہ اپنا آپا۔ ہاں بھئی بڑھاپا جو ہے۔ برا آیا۔۔۔ گھٹنے قابو میں نہ دل' ادھر بھائی کے احسان تلے دبی پڑی ہوں۔ کیسے اتاروں گی اس محبتوں کا قرض اب کبریٰ آئی۔ تو ہاں کر دوں گی۔"

وہ سن کر آفس چلی گئی راستے میں آنسو رک نہ سکے۔ آفس میں کام بھی نہ ہو سکا۔ کیا ستم ظریفی ہے۔ عزت و افتخار سے جینے کی خواہش دم توڑتی نظر آ رہی تھی۔ انسان کے ضمیر کی قیمت کیا ہے۔ جو چاہے خرید لے۔ توڑ پھوڑ کر ٹکڑے کر دے یا۔۔۔ اس توڑ پھوڑ کو عمل جراحی سے تقویت پہنچائی جائے۔ قسمت کے نام پر۔ زندگی بھر کی خواری۔ راز۔۔۔ جب راز نہ رہے۔ اور ایسا راز جس کی بھنک بھی یہاں کسی کو نہ مل سکی۔ وہ۔۔۔ عام ہونے کا خدشہ۔ نہیں۔ ایسی زندگی۔۔۔ گوارا نہیں۔



گھر میں اماں اور ماموں میں بحث چل رہی تھی۔

"ارے تو پہلی بیوی سے کیوں نہ نبھی۔ ایسے ہی معصوم تھے تم۔ وہ بے چاری۔ ماں بھی نہ رہی غم سے۔"

"بے چاری؟" ماموں نے طنز سے ہنکارا بھرا۔ "وہ بے چاری تھی؟ جس نے نتھنوں میں تیر دے رکھے تھے۔ یہ آپ کے الفاظ ہیں آپا اس کے بارے میں۔"

"ہاں خیر۔ اب چپ رہو۔ پیٹھ پیچھے برائی کرنے کا گناہ۔۔۔ نہ جانے کہاں گئی ہو گی۔"

"جانا کہاں تھا۔ دولت مند بڈھے کو پھانس لیا۔ شادی کر لی۔ اب پچھتاتی ہے۔ مجھے پیغام بھیجا کرتی ہے کہ۔۔۔ معاف کر دو' اب پھر آنے کو تیار ہے۔"

"اونہوں بڈھا نہیں چھوڑنے والا۔ خیر تم کو ہزار گنا بہتر بیوی مل گئی ہے زاہد۔ قدر کرو اس کی۔ قدرت کی طرف سے انعام ہے۔"

"اپیا۔" مدحت اندر سے نمودار ہوئیں۔ "آپ کہتی ہیں بہتر۔ یہ تو اب بھی یاد کرتے ہیں۔ کہتے ہیں وہ ان کا سب لوٹ کر لے گئی۔ زیور، کپڑا، یہاں تک کہ دل بھی۔"

اماں نے تیکھی نظروں سے ماموں کو گھورا۔ "اے دل؟ دل نگوڑا لے جا کر کیا اچار ڈالے گی؟ بیماریوں سے اٹا۔ اللہ بخشے خالہ نے دل رہنے دیا نہ دماغ۔ مارے لاڈوں کے گود میں ٹانگے پھرتی تھیں کہ بچہ بیمار ہے۔ دل کمزور ہے۔ آٹھ برس کا لونڈا۔ گود میں ہی بڑا ہو گیا۔ ٹانگیں سوکھ گئی تھیں لٹکنے لگے۔ پانچ برس میں بولنا آیا۔ دس برس کے تھے تو چلنا سیکھا۔ خالہ جنتی نے ریوڑیاں بانٹیں کہ ننھے میاں پیروں پر کھڑے تو ہوئے۔ اللہ آمین سے بسم اللہ ہوئی۔ یہ تو تم ہو جو خوشی دے رہی ہو۔ سہارا بھی۔ اولاد بھی اللہ رکھے۔"

ماموں سہارا کے نام پر جز بز ہوئے اولاد کے ذکر پر شرما گئے۔ مدحت کھلکھلا کر بولیں۔

"تو اپیا! پھر دل کون لے گیا۔ کہتے ہیں۔ اس کے بعد دل دل نہ رہا۔"

مدحت میں یہ بھی خوبی تھی۔ ہر حال میں پر سکون اور خوش رہتی تھیں۔ واقعی ماموں کے لیے انعام تھیں۔

شانی نے مدحت سے کہا "اماں سے کہہ دیں۔ کبریٰ خالہ۔۔ کو انکار کر دیں۔"

گلاس چھن سے مدحت کے ہاتھ سے گرا۔ شیشہ دور تک بکھر گیا۔

"ک۔ کیا؟ شانی۔۔ اتنا خوب صورت ہینڈسم دولت مند۔ تعلیم یافتہ اور۔۔"

"سب صحیح۔ میرا انکار اماں کو پہنچا دیں۔"

مدحت کو حواس باختہ کر کے کمرے میں بند۔ وہ جو گواہ ہے اس کی کیفیت کا۔ اس کی ستم ظریفی کا۔ اس الزام کا۔ نند کے الفاظ کا (ستمگر) کیا وہ ان کا یقین نہیں

کرے گا۔ میری پاک دامنی کا گواہ اللہ ہے۔ مگر کس کو کیسے یقین دلایا جا سکتا ہے۔ محسن بھائی جب آتے۔ اسے بڑے سے دوپٹے میں ملفوف دیکھ کر ہنستے۔

"ارے بھئی کیا اب انگلینڈ میں دوپٹہ چل پڑا ہے جو لپیٹے پھرتی ہو۔ کوئی نیا فیشن۔ دکھاوا؟ یا کوئی تلخ تجربہ مجبور کرتا ہے۔"

وہ پسینے میں ڈوب جاتی۔ "آپ نے کب دوپٹے کے بغیر مجھے دیکھا ہے؟"

"لیکن اس طرح۔ پہلے تو نارمل طریقے سے اوڑھتی تھیں۔ اب گھر کے اندر بھی کون اس طرح پردہ پوش ہوتا ہے۔"

کوئی کسی کی زبان نہیں روک سکتا۔



اماں کی شدید خفگی اور غصے کے باوجود۔ رات کو ان کے بستر میں گھس کر اس نے ہر ہر بات بیان کر دی۔

"ماموں جان کا منصوبہ۔ مامی کی خواہش اور اس رات۔ عذاب رات کی اذیت۔ شفیع احمد کی موجودگی۔ لوگ تو اندازے سے ہی الزام بلکہ بہتان تراشی کر لیتے ہیں۔ یہ تو پھر... وہیں موجود تھا۔ گواہ تھا۔ اس اندوہناک واردات کا۔ مرد۔ کانوں کا کچا ہوتا ہے۔ وہ تو اس رات اس کے حلیے اور ذلت کا بھی عینی گواہ تھا۔ اس کے سامنے سر اٹھا کر جینا۔ زندگی بھر کی تحقیر اور ذلت سہنا مر جانا بہتر ہے۔"

اماں دم بخود اس کی بات سن رہی تھیں۔

"آپ کو یقین نہ ہو۔ تو ماموں جان سے تصدیق کر لیں۔ انہوں نے ہی۔ پولیس کو فون کیا تھا۔ لیکن پلیز کبریٰ خالہ سے معذرت کر لیں۔"

اماں گم صم بیٹھی رہیں۔

وہ تو دل ہلکا کر کے سو گئی اماں کے پاس ہی۔ اماں کی نیند اڑ گئی۔ میری معصوم بچی کتنی اذیتیں برداشت کرتی رہی۔ زبان پر حرف شکایت نہ لائی۔ ماں کا دل تڑپ اٹھی۔ ان کی اس سے ساری شکایتیں حرف غلط کی طرح مٹ گئیں۔ وہ کتنی صابر ہے۔ اف۔

صبح آفس جاتے ہوئے پھر یاد دہانی کی۔ کل کا کام آج ہی کرنا تھا آفس کا۔ بے حد مصروف تھی۔ دندناتا ہوا کمرے میں ہی چلا آیا۔ اب۔ کوئی کام کیسے ہو۔

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

لہک کر شعر پڑھا۔

"تم نے انکار کیوں کیا۔" میز پر مکا مارا۔ وہ ڈری، شیشہ نہ ٹوٹ گیا ہو۔

"شیشہ نہیں ٹوٹا۔ البتہ میرا دل ضرور ٹوٹ گیا۔ اسے جوڑنے۔ جواب لینے آیا ہوں۔"

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ "جب جب تم سے ملا... پہلی ملاقات سے ہی تم سے متاثر ہو گیا۔ وہ جملہ میری پشتو آپ کی اردو نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ میری امی خود اردو اسپیکنگ۔ مجھے ان کی خواہش پوری کرنی تھی۔ تم مل گئیں۔ میں ہر بار متاثر ہوتا گیا۔ تمہارا گریز۔ لیا دیا رویہ۔ لندن کے آزاد معاشرے میں محتاط انداز۔ میں نے کبھی تمہارے ساتھ کوئی لڑکا نہیں دیکھا۔ میں ایک غیرت مند پاکستانی ہوں۔ میں ان چیزوں کو نوٹ کرتا ہوں۔ وہاں بے شمار مشرقی لڑکیاں مجھے ملیں۔ سب مجھے پسند کر کے خود آگے بڑھتی تھیں۔ لیکن تم... تمہارا ظاہری حلیہ ڈھکا چھپا۔ کیا میں اندھا تھا۔ میں بہت فرسودہ خیالات کا آدمی ہوں۔ مجھ میں کوئی کمی ہو... تو بتا دو۔"

اس نے ابھی تک اس رات کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ شانی کو حیرانی ہوئی۔

"میں بار بار تم سے ملا۔ جہاں ایک بار مل جاتی تھیں، میں روز جاتا کہ شاید آج بھی مل جاؤ۔ تم نے... اپنا پتا نہیں بتایا کہ تلاش سے بچ جاتا۔"

شانی نے گلا صاف کیا۔ بہتر ہے کہ بات صاف کر لی جائے۔

"دیکھیے مسٹر شیر دل... میں ذرا۔ مختلف مزاج ہوں۔ تنک مزاج یا بددماغ کہہ لیں۔ خود پر ذرا سا میل برداشت نہیں کر سکتی۔ مطلب کردار پر ذرا سی چھینٹ مجھے گوارا نہیں اور کوئی مجھے شک کی نظر سے دیکھے۔

برداشت نہیں۔"

"میں خود ایسا ہی ہوں۔" تیزی سے بات کاٹی۔

"مجھے اندازہ ہے۔ اسی لیے بہتر ہے آپ اپنے مزاج اور ماحول کے مطابق شریک زندگی کا انتخاب کرلیں۔ میں شاید آپ کی توقعات پر پوری نہ اتروں۔"

"یہ میرا مسئلہ ہے اور میں نے پہلی ملاقات میں جو نتیجہ آپ کے کردار اور مزاج کا نکالا تھا۔ اس پر قائم ہوں۔ زخندان شائنزانا زما (پتا نہیں کیا) پشتو اف مشکل زبان۔

"اس۔ واقعے کے بعد...." شانی ہچکچائی۔ "میں آپ کے سامنے شرمندہ رہوں۔ یہ میرا مزاج نہیں۔ میں سربلند رہنا چاہتی ہوں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں اور اس واقعے کا مجھ سے یا تم سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ وہ ایک جھوٹ... سازش کا حصہ تھا۔ ایک باپ پولیس کو رپورٹ کرے۔ بیٹے کی بدکرداری کی گواہی دے۔ اس سے زیادہ سچائی اور پاک دامنی کا ثبوت۔ مجھے نہیں چاہیے۔"

کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ وہ ہکا بکا بیٹھی رہ گئی۔ کوئی سوال نہیں اس رات کے بارے میں۔ کوئی تحقیق جستجو نہیں گویا حتمی نتیجہ اخذ کیے بیٹھا تھا عجیب۔

گھر میں رافعہ ملی۔ اماں نے مشورے کے لیے بلایا تھا۔

"سنا تم نے۔ ماموں جان کا فون آیا تھا۔ اپنے بیٹے کی شادی کی خبر دینے کے لیے۔" (کیا؟ رہا ہو گیا؟)

"شادی کی خبر۔ کس سے شادی ہوئی؟"

"ممانی کی کوئی بھانجی ہے سارا۔ اس سے۔ ممانی کا آپریشن ہوا ہے کوئی۔ بیٹا بہو بہت خدمت کر رہے ہیں۔ بتا رہے تھے کہ ان کا بیٹا بہت بدل گیا ہے' پتا نہیں میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تم سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کرلینا ممانی کا حال پوچھ لینا۔"

"ماموں جان۔" پہلی فرصت میں اس نے فون کیا۔ "مامی کیسی ہیں؟" فہد کا نام لینے کی ہمت ہوئی نہ خواہش۔

"ہاں بنو۔ اب بہتر ہیں' فہد جیل سے سزا بھگت کر آ گیا۔ تو ہم نے شادی کر دی۔ بہت بہتر ہو گیا ہے۔ دماغ درست ہو گیا اس کا۔ ماں باپ کی قدر اب ہوئی۔ معافی مانگتا رہتا ہے۔ سارا سے شادی کر دی۔ روزی کے لیے یہی سب سے بڑی خوشی تھی۔"

سارا؟ مگر ماموں جان وہ۔ اس کا تو دوست شادی کرنے والا تھا۔"

"شادی۔ ان لوگوں کو شادی کی ضرورت کب ہوتی ہے۔ ایک بچی کا تحفہ دے کر بھاگ گیا۔ بے پتا' بے نشان۔ اب ماں بیٹی۔ ہمارے ساتھ ہیں۔ تمہارا شکریہ۔ تمہاری وجہ سے سدھرا ہے وہ۔"

نہ جانے کیا کیا بتا رہے تھے۔ وہ غائب دماغی سے ریسیور کو گھور رہی تھی۔ وہ فہد ہی کی باتیں کرتے رہے۔ گویا۔

"اور پاکیزہ عورتیں۔ پاکباز مردوں کے لیے۔ بدکردار عورتیں۔ بدکردار مردوں کے لیے۔"

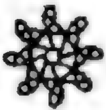
قرآن کو چوم کر وہ فون کی طرف متوجہ ہوئی۔ فیصلہ سامنے تھا۔ اب شفیع احمد عرف شیر دل خانا کو حیران اور خوش کرنے کی باری اس کی تھی۔

"زخندا شانزا ما زنا۔ نہ جانے کیا؟" اس نے فون پر یہی کہا ادھر سے قہقہہ بلند ہوا۔

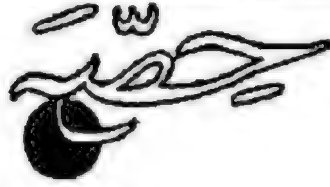
"آتا ہوں۔" خوشخبری۔

"یقیناً"۔ میری اردو آپ کی پشتو سے بدرجہا اعلیٰ ہے۔"

"میں سیکھ لوں گی۔" وہ ازحد شرمائی۔ (اب پتا نہیں کیا کیا سیکھنا ہوگا)



قرۃ العین رائے



"اورامی! صالحہ پھپھو کو عیدی نہیں بھجوانی؟" سوئیوں کے دو دو کلو کے پیکٹ چاول' چینی کے ساتھ شاپر میں رکھتی عذرا سے رومیرہ نے پوچھا تھا۔

"ارے کم بخت ماری کی کیسی عید' بے غیرتوں کی طرح اپنے بھائیوں سے زمین میں سے حصہ مانگ لیا' اب اس کا اس گھر کی ہر خوشی اور عید شب برات میں سے حصہ ختم ہوگیا۔ ہم لوگ اس بے شرم کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں' عیدی بھجوائیں گے بھلا۔"
عذرا بیگم تو بھڑک ہی اٹھیں۔

"لیکن امی! یہ تو ان کا قانونی حق تھا اور یہ انہیں اللہ نے دیا ہے۔" یاسر جو دونوں پھوپھیوں کے گھر عیدی دینے جارہا تھا' اسلامیات کی کتاب میں سے عورت کا جائیداد میں حصہ کے متعلق معلومات پڑھ کر جھٹ بولا تھا۔ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد آج کل محلے کے قاری صاحب سے فارغ وقت میں دینی کتابیں لا کر پڑھ رہا تھا۔

"ہاں تو جتنا اس کا حصہ بنتا تھا ساری عمر اس میں سے عید' شب برات نہیں جاتی تھی اور جہیز بھی تو اس کے بھائیوں نے مل کر بنایا' ماں باپ تو مر گئے اب یہ بھائی ہی اپنی بہنوں کا خیال رکھیں گے' لیکن ان کی بھی کون سا فیکٹریاں لگی ہیں۔ تینوں ہی معمولی سرکاری ملازم ہیں اور تین ایکڑ زمین کے ٹھیکے میں تینوں بھائی اپنی دال روٹی دیکھیں' بہنوں کی خوشی غمی میں شریک ہوں' عید' شب برات علیحدہ جائے اور صالحہ کی شادی بھی تو تینوں نے مل کر کی' بلکہ زیادہ خرچا ہم لوگوں کا ہوا' کہ بڑا بھائی ہے زیادہ ذمہ داری ہے' تو کب بڑے بھائی نے اپنی ذمہ داری سے انکار کیا۔ ابھی بارہواں روزہ ہے اور انہوں نے صبیحہ اور نعیمہ کو عیدی بھجوانے پر زور دینا شروع کردیا' صالحہ سے تو ان کا اپنا دل کھٹا ہو گیا اور یہ بھی تینوں بھائیوں کا ہی فیصلہ ہے' فیصلہ کیا بلکہ اصولی بات ہے' جب اس نے میکے کی لاج نہ رکھی' بھائیوں کا خیال نہ کیا اور بے شرمی سے حصہ آن مانگا تو اب بھلا ہم اس کا کیا خیال کریں' ہماری طرف سے مرے یا جیے۔"

عذرا' صالحہ کے خلاف بولنے پر آئیں تو پھر بولتی ہی چلی گئیں' چند ماہ قبل جو اس گھر میں صالحہ کا حصہ مانگنے پر ہنگامہ مچا تھا اس کی تپش انہیں پھر سلگا گئی تھی۔ کتنی لعن طعن کی تھی سب نے صالحہ پر' بہنوں تک نے آکر اسے سمجھایا تھا' لیکن وہ تو بس روتے ہوئے یہی کہے جارہی تھی کہ اس کے سسرال والوں نے مجبور کیا ہے۔
صالحہ کے شوہر اختر کو کاروبار میں نقصان ہوا تھا اسی کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے صالحہ کو اپنا حصہ مانگنے پر مجبور کیا تھا اور وہ تو طلاق کی دھمکی بھی دے چکے تھے' ناچار صالحہ کو اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں اور گھر کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے بے حد مجبور اور بے بس ہو کر میکے آکر اپنا حصہ مانگنا پڑا تھا اور اپنا حق لے کر ہی چھوڑا تھا' بھائیوں کے پاؤں پکڑ کر روتے ہوئے اپنی بات منوائی تھی لیکن انہوں نے اسے حصہ دے کر اپنے گھر سے ہی نہیں' اپنی خوشیوں سے بھی بے دخل کر ڈالا تھا۔ اب میکہ اس کے لیے ممنوعہ علاقہ قرار دیا جاچکا تھا' دلگرفتہ صالحہ بے حد دکھی ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا میکہ چھوڑ کر زمین کو فروخت کرکے ملنے جتنی رقم لے کر چلی گئی تھی۔ تینوں بھائیوں نے جیسے تیسے رقم اکٹھا کرکے اسے دے دی تھی اور زمین فروخت نہیں کی تھی' اس کے بعد انہوں نے تینوں بہنوں سے دستخط بھی کروالیے تھے اور زمین اپنے نام کروالی تھی۔



باقی دونوں بڑی بہنوں نے بخوشی ایسا کیا تھا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے میکے سے جڑی رہنا چاہتی تھیں اور میکے سے آنے والی عید شب برات سسرال میں جتنا مان بڑھاتی ہے وہ اس احساس کو ہرگز کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ صالحہ کی طرح وہ اپنا جائز حق مانگ کر حق سے بے دخل نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ تینوں بھاوجوں کو بھی اب صالحہ سے بڑی خار تھی' خاص طور پر بڑی بھاوج عذرا کو' رقم کا جو حصہ انہوں نے ادا کیا تھا وہ عذرا کی بالیاں بیچ کر ادا ہوا تھا فی الفور اور کہیں سے انتظام ممکن نہیں تھا اور عذرا کو یہی بات صالحہ سے متنفر کر گئی تھی' حالانکہ۔ چند دنوں بعد اختر نے کمیٹی نکلنے پر عذرا کو ویسی ہی بالیاں پھر بنوادی تھیں' لیکن نند بھاوج کا بیر بھلا

کب ایسی تاویلوں میں آتا ہے۔ اس لیے صالحہ کے لیے اب اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے تھے' موقع ملنے پر عذرا' صالحہ کے خلاف بڑھ چڑھ کر بولتی اور اختر کا دل بہن کے خلاف اور بھر جاتا۔

"چلیے چھوڑیے امی! آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا خون جلاتی ہیں' صبح میری ہونے والی نند کا فون آیا تھا' آج شام کو وہ لوگ میری عیدی لے کر آرہے ہیں۔ میں آپ کو وہ بتانے آئی تھی' افطاری پر کیا خاص اہتمام کرنا ہوگا۔ اس کے متعلق بتادیں۔" رُدمیرہ نے ان کے کندھے دباتے ہوئے شرمگیں مسکراہٹ سے بتایا اور عذرا بیگم' یاسر کو رخصت کر کے جھٹ رومیزہ کے ساتھ مل کر اسپیشل افطاری کی تیاری کرنے میں لگ گئیں۔



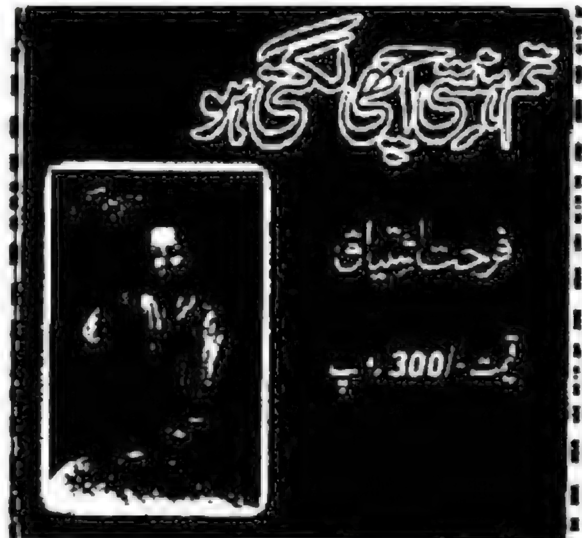
بم تھا جو رومیزہ کے حواسوں پر گرا تھا اور ہر سو ایک پل کو اندھیرا چھا گیا تھا جنید اسے کیا کہہ رہا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا' اس کا تو بس دل بند ہوا جا رہا تھا اور جسم سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی وہ چکرا کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی تھی۔

آنسوؤں سے لبریز بیڈ پر سوئے اپنے دو سال کے جڑواں بچوں کی جانب دیکھا تھا اور پھر وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی' جنید کب کا کمرے سے جا چکا تھا۔

✲ ✲ ✲

بلکتی ہوئی رومیزہ کو عذرا بیگم سے چپ کروانا مشکل ہو گیا تھا ان کی سب سے لاڈلی اور بہنوں میں چھوٹی بنی آج ایسا مسئلہ ان کے پاس لے کر آئی تھی جس کا کوئی حل ان کے پاس موجود نہ تھا۔ کیا وہ آج کے بعد اپنی رومی کو دیکھ نہ پائیں گی آج کے بعد کبھی رومی ان کے گھر آئے گی نہ یہاں سے کوئی جائے گا' بھائی عید' شب برات بھی نہ دینے جائیں گے۔ ظالم معاشرے کے بنائے اصول اور بلاوجہ فرسودہ رسموں نے آج ان کی بیٹی رومیزہ کو پابند سلاسل کر ڈالا تھا تب ہی انہیں صالحہ کا خیال آیا تھا پانچ سال ہو گئے تھے' صالحہ کے

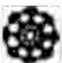
ساتھ ان سب نے ابھی تک بائیکاٹ کر رکھا تھا اور اب رومیزہ۔ یہ سوچ کر انہیں جھرجھری آگئی تھی کیا کریں کیا نہ کریں' ان کے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ اختر صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد فراغت اور معمولی پنشن کے ساتھ شوگر اور بلڈ پریشر کی بیماریوں کو نبھا رہے تھے۔ ان سے کیسی مدد مانگتی؟ ریٹائرمنٹ کا پیسہ رومیزہ اور جاوید کی شادی پر لگ گیا تھا باقی کا بیسیوں پر وہ دونوں عمرہ کر آئے تھے' اب تو گھر جاوید اور یاسر کی تنخواہ پر چل رہا تھا یا زمین سے آنے والے ٹھیکے پر' ایسے میں رومیزہ کا جائیداد میں سے حصہ مانگنا اف توبہ' جاوید کی بیوی تو ویسے ہی بڑی تیز طرار تھی جینا حرام کر دیتی' پہلے ہی اسے آدھی تنخواہ دینے پر بڑا اعتراض تھا۔ عذرا بیگم کو

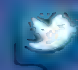


رومیزہ میں صالحہ اور جاوید کی بیوی میں خود اپنا عکس نظر آرہا تھا۔ آج ان کی بیٹی اپنے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دیے گئے حق کو مانگنے پر مصلوب کی جانے والی تھی بالکل اسی طرح جس طرح صالحہ کو ان سب نے مل کر پانچ سال پہلے مصلوب کیا تھا۔

کچھ لمحے کو تو وہ چکرا کر ہی رہ گئی تھیں' پھر یاسر کی بیوی کے لیے اچھے وقتوں میں بنایا سیٹ اور کانوں کی بالیاں کو اتار کر رومیزہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا' ماں بیٹی یالا ہی بازار جا کر بیچ آئیں۔ لیکن جنید کی بتائی ہوئی رقم سے ابھی بھی آدھی رقم کم تھی تب ہی رومیزہ کو ترکیب سوجھی اس نے اگلے روز جاوید سے تیس ہزار ادھار مانگ لیے' ایک مہینے کے بعد لوٹانے کے وعدے پر۔ جاوید نے عذرا بیگم کے اصرار پر انتظام کر ڈالا۔ رومیزہ کی اگلے مہینے کمیٹی نکلنے والی تھی جو اس نے عید کی شاپنگ کے لیے ڈال رکھی تھی' وہی اس نے جاوید کو دینے کا سوچا اور جنید یا سسرال والوں کو اس کے متعلق کیا کہنا ہے وہ بعد میں سوچ لے گی' وہ کسی صورت بھی حصہ مانگ کر خود کو میکے سے الگ کرنے پر تیار نہ تھی' اسی لیے ماں بیٹی نے خاموشی سے رقم کا انتظام کیا اور آج رومیزہ کو اپنی پھپھو کا درد صحیح معنوں میں سمجھ آرہا تھا' شوہر نے طلاق کی دھمکی دے کر میکے

سے حق مانگنے پر مجبور کر ڈالا' لیکن یہ حق اس کے کس کام کا' رقم تو کاروبار میں ہونے والے نقصان کو پورا کرنے کے لیے استعمال ہو گئی اس کے تو نہ ادھر سے کچھ ہاتھ آیا نہ ادھر سے' کاش لوگ جہیز کی جگہ بیٹیوں کو ان کا حصہ ادا کر دیا کریں' جو صرف ان کے نام ہو اور ہمارے معاشرے میں یہ رسم بھی ہو کہ وہ شوہر جو بیویوں سے ان کا حصہ مانگیں' انہیں معاشرہ ان ہی نظروں سے دیکھے اور وہی سلوک روا رکھے جو ایک بیٹی کا اپنا حصہ مانگنے پر اس کے میکے والے رکھتے ہیں۔







نمرہ احمد

نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حنین اور اسامہ 'سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر 'سعدی کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن



مُکمل ناوِل

ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔

فارس غازی' ہاشم کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے' رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔

والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی' ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہرین اپنے دیور نوشیرواں سے' جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا ہے' بہانے سے پاس ورڈ حاصل کرکے سعدی کو سونیا کی سالگرہ میں دے دیتی ہے۔

پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی' ہاشم کے کمرے میں جاکر اس نے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور' ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے' جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے' ہاشم' خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے' لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گردہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔

بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پر فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمیج ہو جاتی ہیں۔

سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے۔ حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "ٹمس ایور آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس، زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فہد سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی، ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پر کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی، ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم، خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم، خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث، فارس کو وہ سارے شواہد میل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم، فارس پر ڈلواتا ہے۔

زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ زرتاشہ مر جاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی، زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی سیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاق "بچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔

حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین، وارث کیس کی ایل بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

زمر فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ گھر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں جس کی بنا پر زمر کو دکھ ہوتا ہے۔

جواہرات زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے۔ اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھاتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کر سکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکالرشپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر پڑھنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

زمر کو کوئی گردہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گردہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہو جاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی' علیشا کو راضی کر لیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہو گی۔

ہاشم' حنین کو بتا دیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کاردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہو جاتی ہے۔

ہاشم' علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کروا چکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مروا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔

جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کر رہا ہے۔

فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا جا رہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے' لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کر لے جا چکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے' کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے' لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا' جسے انکار کر دیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہو جاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر' جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہو چکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو مار دیں گے۔

ہاشم' حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری سچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے' کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم' جا کر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے' جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً" بعد کی تصویر ہوتی ہے' جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔

تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔

حنین' نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے' وہ کہتی ہے کہ نوشیرواں پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔

سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔ سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔

سعدی' زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

"مثلاً "کون؟" زمر نے پوچھا۔

"مثلاً"... مثلاً "ہاشم کاردار..." سعدی نے ہمت کرکے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہوگئی۔

زمر کو ہاشم کاردار کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلجی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔

حنین علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کرلی ہے۔ جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو ان کا ہے۔

ہاشم کی بیوی شہرین ایک کلب میں جوا کھیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد لیتی ہے۔

ریحان خلجی عدالت میں زمر کو لاجواب کردیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔

فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔

زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتا کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔

جیل سے علیشا حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کے علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔

حنین کو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے بڑھنے سے انکار کردیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔

اورنگ زیب نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصے سے پاگل ہوجاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کردیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کرکے ________ پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کرلیتی ہے۔

۱۴ چودھویں قسط

من خشت بہ ملکہ داد

ابھی تو دل میں ہے جو کچھ بیان کرنا ہے
یہ بعد میں سہی کس کس بات سے مکرنا ہے

دروازہ کھلا تو تاریک سا کمرہ سامنے آیا۔

فارس نے سوئچ پہ ہاتھ مارا۔ بتیاں روشن ہوئیں اور... چوکھٹ میں کھڑی زمر کی آنکھوں میں تحیر اتر آیا۔ وہ قدم بہ قدم چلتی آگے آئی اور گردن گھما کر دیکھا گو کہ اس نے کسی ایسے ہی منظر کی توقع کی تھی مگر اس کا حجم اتنا زیادہ ہوگا' یہ اسے اندازہ نہیں تھا۔

اس کمرے میں کاغذ تھے۔ بے شمار کاغذ... تین دیواریں کاغذوں سے بھری ہوئی تھیں۔ نوٹس' تصاویر اخبار کے تراشے' اوپر نیچے چپکے تھے۔ اسٹڈی ٹیبل پہ لیمپ کے ساتھ کچھ فائلز دھری تھیں اور کچھ جدید آلات۔ دو مزید لیپ ٹاپس۔ زمر نے چہرہ فارس کی طرف موڑا تو وہ اسی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"جو میں کرتا رہا ہوں۔ پچھلے چار سال سے۔"

زمر کی نظریں پھر سے کاغذوں سے ڈھکی ایک دیوار تک گئیں۔ وہاں بہت سے لوگوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ کچھ کو تو وہ پہچانتی تھی۔ جسٹس سکندر (فارس کے کیس کا جج) اے ایس پی سرمد شاہ، وارث غازی کا باس "الیاس فاطمی" ڈاکٹر توقیر بخاری (جنہوں نے سعدی کا آپریشن کیا تھا) کی بیوی ڈاکٹر ایمن بخاری ... اور بھی کچھ لوگ جن کو وہ پہچانتی نہیں تھی۔ وہ ڈاکٹر ایمن کی تصویر پہ نظریں مرکوز کیے آگے آئی۔

"تو تم واقعی ڈاکٹر توقیر کی بیوی کو جانتے تھے۔ وہ تمہاری..." اس نے تصویر کے اوپر نیچے لگے کاغذوں پہ نظر دوڑائی۔ "وہ تمہاری سائیکولوجسٹ تھی!"

فارس خاموش رہا۔

"اس نے کورٹ میں بیان دیا تھا کہ تم نے اس کے سامنے اعتراف جرم کیا ہے اور یہ سب وہ لوگ ہیں جنہوں نے تمہیں جیل بھجوایا اور جیل سے نکلنے نہیں دیا۔" وہ اوپر سے نیچے تک ان دیواروں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "تم... اِتم واقعی چار سال سے فارغ نہیں بیٹھے تھے۔" زمر کہتے کہتے چونکی۔ "تم انتقام پلان کر رہے تھے؟" فارس طہیر غازی نے اثبات میں سر کو خم دیا۔ اب وہ چوکھٹ سے ٹیک لگائے، بازو سینے پہ لپیٹے کھڑا تھا۔

"اور یہ لوگ..." وہ ایک دوسری دیوار پہ چسپاں کاغذ دیکھنے لگی۔ "یہ کون ہیں؟"

"جیل کے ساتھی!"

زمر نے اچنبھے سے ان تصاویر کو دیکھا۔ "یہ وہ کرمنلز ہیں جن کو جیل میں جب کسی سے لڑنا ہوتا یا کام نکلوانا ہوتا، یہ تمہیں آگے کر دیتے، یہ تمہارے غصے اور جارحیت کو استعمال کرتے تھے مگر یہ لوگ... ان کا تمہارے اس... اس انتقام سے کیا تعلق؟"

"آپ سے کس نے کہا کہ یہ مجھے استعمال کرتے تھے؟" وہ تلخی سے مسکرایا تو زمر چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"زمر بی بی! کسی نے ایک دفعہ مجھے کہا تھا کہ تمہاری کمزوری تمہارا غصہ ہے۔ سو اپنی کمزوری کو اپنی طاقت بنا لو۔ میں نے اتنے سال یہی کیا ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے، اتنا بے وقوف ہوں میں کہ بنا سوچے سمجھے پرائے پھڈوں میں کودوں گا؟"

وہ ایک دم ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی۔ ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"انہوں نے تمہیں استعمال نہیں کیا، بلکہ تم نے... تم نے ان کو استعمال کیا۔ اوہ...!" لب بے اختیار سکڑے۔ اسے کچھ کچھ سمجھ آنے لگا تھا۔ "میں نے جیل میں چار سال ان کرمنلز، اسمگلرز، کرائے کے قاتلوں اور ڈرگ ڈیلرز کے ساتھ تعلقات بنائے ہیں، ان کے مسئلے سلجھائے، ان پہ احسان کیے، ان کی کمزوریاں بھی جانیں، اور ان کی طاقت بھی، تاکہ وقت پڑنے پہ ان دونوں کو استعمال کر سکوں۔ میں ایک بڑے تالاب میں تھا جس میں گندی مچھلیاں تھیں۔ مجھے باہر کے مگرمچھوں سے لڑنے کے لیے ان کی مدد چاہیے تھی۔"

چوکھٹ سے ٹیک لگائے کھڑے فارس نے زخمی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔ "جب جیل گیا تھا تو اکیلا تھا' اب باہر آیا ہوں تو بہت سے کانٹیکٹس ہیں میرے پاس۔"

"اور وہ سب تمہیں' تمہارے انتقام میں مدد دیں گے؟"

"بالکل!" اس نے شانے اچکائے۔

زمر پھر سے آگے پیچھے گھوم کر اس کمرے کو دیکھنے لگی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں تحیر کے ساتھ الجھن بھی تھی۔

"مگر ان لوگوں نے۔" وہ ڈاکٹر ایمن' اے ایس پی وغیرہ کی تصاویر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "اگر تمہیں جیل میں ڈالا تھا تو تمہارے اپنے جرائم کی وجہ سے اور۔۔۔"

"اوکے' مسز زمر! میں آخری دفعہ آپ کو یہ بات بتانے جا رہا ہوں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا اور بہت تحمل سے بولا۔ "اور اس کے بعد آپ کبھی میری منت بھی کریں گی تو میں نہیں دہراؤں گا' اس لیے ابھی دھیان سے سنیں۔" سنجیدگی سے چبا چبا کر بولا۔ "میں نے وہ قتل نہیں کیے تھے' نہ آپ پہ گولی چلائی تھی۔" ذرا ٹھہرا۔ "مگر مجھے پتا ہے کہ آپ یقین نہیں کریں گی' ٹھیک ہے۔ سو سنیں' مجھ سے زندگی میں ایک ہی بڑی غلطی ہوئی ہے' وہ یہ کہ وارث کی چیزیں جب میری کار سے برآمد ہوئیں تو مجھے احتیاط کرنی چاہیے تھی مگر میں اوور کانفیڈینٹ تھا۔ مجھے لگا مجھے کوئی گرفتار نہیں کر سکتا اور اسی اعتماد نے مجھے جیل پہنچا دیا۔"

تلخی مگر تحمل سے وہ کہہ رہا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

"آپ مجھے قاتل سمجھتی ہیں' ٹھیک ہے بالفرض میں نے وہ قتل کیے بھی تھے' تب بھی کیا مجھے فیئر ٹرائل کا حق نہیں تھا؟"

"تھا!" زمر کا سر خود بخود اثبات میں ہلا تھا۔

"کیا اس بدترین تشدد کی اجازت تھی جو مجھ پہ کیا گیا؟ کیا اس سائیکالوجسٹ کو حق تھا کہ میرے پرائیوٹ سیشنز کورٹ میں بیان کرے؟"

اس کی گردن نفی میں ہلی۔ "نہیں۔"

"کیا اس جج کو حق تھا کہ وہ مجھے نو' نو' دس دس ماہ بعد کی تاریخیں دیا کرے؟ کیا پراسیکیوٹر بصیرت کا فرض نہیں تھا کہ وہ کیس کی پوری تفتیش کرے؟"

زمر نے اب کے بس گردن ہلائی۔

"تو زمر بی بی! میرا بھائی مرا تھا' بیوی مری تھی' میرا خاندان تباہ ہو گیا تھا اور مجھے فیئر ٹرائل کا حق بھی نہیں دیا گیا۔ سو۔" دیواروں کی طرف اشارہ کیا۔ آنکھوں میں تپش سی تھی جو زمر نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ "جیل جانے کے چار ہفتے بعد میں نے یہ سب پلان کرنا شروع کیا تھا اور میں انتقام ضرور لوں گا۔ میری زندگی کے ان چار سالوں کا حساب ان لوگوں کو دینا ہو گا۔"

پراسرار اسٹور روم میں خاموشی چھا گئی۔ بہت دیر بعد وہ بول پائی۔ "تم ان لوگوں کو قتل کرنا چاہتے ہو؟"

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "میں قاتل نہیں ہوں اور قتل کرنے سے یہ لوگ ایک ہی دفعہ مر جائیں گے' اس لیے موت سے نہیں' یہ اپنی زندگیوں سے' اپنے کیے کا حساب چکائیں گے۔"

زمر نے ایک گہری سانس لی اور اسٹڈی ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ وہ گہری سوچ میں دکھائی دیتی تھی۔

"تمہیں جیل سے نکلے ڈھائی ماہ سے اوپر ہو چکے ہیں' مگر یہ لوگ تو آزاد ہیں۔ میرا مطلب ہے' تم نے ابھی تک کچھ کیا کیوں نہیں؟ تم کس چیز کا انتظار کر رہے تھے؟" اس نے دوسری کرسی کھینچی اور سامنے بیٹھا۔

"دو چیزیں۔" اب کے قدرے نرمی سے بتانے لگا۔ "پہلی مجھے فنانشلی اسٹرانگ ہونا تھا' پیسہ چاہیے تھا۔ امی نے ایک فلیٹ چھوڑا تھا میرے نام' لاہور میں۔ اس کو بیچنا تھا' اسی میں لگا تھا۔ اور دوسرا' مجھے ابھی یہ جاننا تھا کہ ان سب لوگوں کو چلانے والا کون ہے؛ کون ان کو حکم دے رہا تھا؟ آپ بے شک یہی سمجھ لیں کہ میں نے وہ قتل کیے تھے' تو پھر کون ہے میرا

دشمن، جس نے مجھے جیل بھجوایا اور باہر نکلنے نہیں دیا؟ اتنا بے وقوف تو نہیں ہوں نا میں کہ ایسے ثبوت اپنی کار میں چھوڑوں گا!"

زمر نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"کسی نے تو مجھے ایسے پھنسایا تھا نا کہ میں باہر نہ نکل سکوں؟"

زمر نے پھر ہاں میں گردن ہلائی۔ اسے پہلی دفعہ اپنا آپ فارس کی ٹیچر جیسا نہیں، اس کی اسٹوڈنٹ جیسا لگ رہا تھا۔

"پھر۔ کیا تمہیں معلوم ہو سکا؟"

فارس نے سچائی سے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، لیکن اگر آپ غور کریں تو یہ تمام لوگ جو مجھے جیل برد کرنے میں ملوث تھے، وہی لوگ سعدی کی گمشدگی سے جڑے ہیں۔ جب وہ ہسپتال لے جایا گیا، تو ڈاکٹر بخاری کی اس دن ڈیوٹی نہیں تھی، مگر ان لوگوں کو معلوم تھا کہ اس ہسپتال میں ان کے کام کا بندہ کون ہے، اس کی بیوی کو پہلے استعمال کر چکے تھے سو انہوں نے ڈاکٹر بخاری کو ہسپتال بھیجا، وہ آیا اور اپنا کام دکھا گیا۔ اگر مجھے اس وقت معلوم ہوتا کہ یہ ڈاکٹر ایمن کا شوہر ہے، تو میں....." بے بسی اور غصے سے اس نے کچھ سخت کہنا چاہا، مگر سر جھٹک کر رہ گیا۔ وہ اسی طرح اسے دیکھے گئی۔

"کیا سعدی کو یہ سب معلوم تھا؟"

"نہیں۔" فارس گردن موڑ کر ان کاغذوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہ ایک دن صبح کے وقت آیا تو میں نے اس کمرے کو لاک کر دیا اور خود باہر والی ٹیبل کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ وہاں چند کاغذ لگا رکھے تھے۔"

زمر نے مڑ کر دیکھا، وہاں چند کاغذ اور الیاس فاطمی کی تصویر اب بھی لگی تھی۔

"وہ یہی سمجھا کہ میں صرف اس ایک ماسٹر مائنڈ کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں اور اسے مارنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی تصحیح نہیں کی۔ میں اسے اس سب سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس کو کچھ معلوم تھا شاید جسے وہ چھپا رہا تھا کیونکہ وہ سعدی تھا، آپ کی طرح تھا!"

زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ دونوں ایک ہی جیسے ہیں، اسٹریٹ فارورڈ۔ مجھے پتا ہے کہ اس نے مجرم تک پہنچ کر کیا کیا ہو گا!" سر جھٹکا۔

"ان لوگوں کو کنفرنٹ کیا ہو گا، دو چار نصیحتیں جھاڑ آیا ہو گا اور ارادہ ہو گا کہ سب کو اپنا کارنامہ بتا کر کہے، فلاں فلاں ملوث ہے اس میں، اس کے خلاف مقدمہ درج کراتے ہیں اور یوں ہمیں انصاف مل جائے گا۔"

اس نے تلخی سے پھر سر جھٹکا۔

"مجھے پورا یقین ہے اس نے ضرور ان لوگوں کو احساس دلایا ہو گا کہ وہ ان کے راز جانتا ہے، اور انہوں نے اسے خاموش کر دیا۔ مگر میں....."

وہ زمر کی آنکھوں میں دیکھ کر سختی سے بولا۔ "میں سعدی یوسف نہیں ہوں۔ میں فارس غازی ہوں۔ میں لمبی لمبی باتیں نہیں کرتا اور جو میں ان لوگوں کا حشر کروں گا، وہ دنیا دیکھے گی۔"

"سو تم اسی لیے ڈاکٹر والا معاملہ ڈلے (ملتوی) کر رہے تھے، کیونکہ تم میرے پلان کے مطابق ان کو صرف اکیلا اور ایکسپوز ہی نہیں کرنا چاہتے بلکہ..... تم ان کو تباہ بھی کرنا چاہتے ہو۔"

"بالکل۔"

"اور تمہیں معلوم تھا کہ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی، اس لیے تم نے یہ سب مجھ سے چھپایا۔"

"ابھی وہ وقت نہیں آیا جب آپ مجھے کسی چیز سے روک سکیں، مگر میں آپ کی بلاوجہ کی بحث نہیں سن سکتا تھا۔" ذرا سے شانے اچکائے۔

"اسی لیے پہلے تم نے مجھے اعتماد میں لیا اور پھر آہستہ آہستہ سارا کنٹرول میرے ہاتھ سے لینے لگے اور جب مجھے شک ہوا، تم نے مجھے غصے میں ٹال دیا، ایکچوئلی فارس....." وہ سر ہلاتے ہوئے سمجھنے والے انداز میں کہنے لگی۔ "میں نے تمہیں کبھی حنہ یا ندرت بھابھی یا سعدی پہ غصہ کرتے نہیں دیکھا، کبھی

ابا سے بھی غصے سے بات نہیں کی' صداقت کو بھی نہیں جھاڑا' سو میں تمہیں بتاؤں مجھے کیا لگتا ہے؟"
اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔
"مجھے لگتا ہے' تم اپنا غصہ کنٹرول کرنا جانتے ہو' مگر تم اسے استعمال کرتے ہو۔ جیسے تم اسے جیل میں استعمال کرتے تھے۔ تم اتنے غصہ ور ہو نہیں' جتنا خود کو ظاہر کرتے ہو' تاکہ لوگ تمہیں زیادہ جذباتی سمجھیں اور تم اپنا کام کر جاؤ۔ اور تم نے دیکھا' وہ اے ایس پی تم سے قطعا" خوف زدہ نہیں ہے جتنا وہ مجھ سے جھجکتا ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔
"تو آپ اتنے دن سے مجھے اسٹڈی کر رہی تھیں؟"

"واٹ ایور!" اس نے شانے اچکائے۔ پھر اٹھ کر ایک کاغذوں سے بھری دیوار کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
"تو اب تم چاہتے ہو کہ ہم ان لوگوں کو صرف استعمال ہی نہ کریں بلکہ ان کو سزا بھی دیں۔"
"میں یہ کام اکیلا کر سکتا ہوں' آپ نہ شامل ہوں تو آپ کی مرضی!"
"ہاں' تم بہت کچھ کر سکتے ہو' مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"تو پھر آپ میرا ساتھ دیں گی؟" وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ زمر دیوار کو دیکھتی رہی۔
"اگر تم سعدی کو واپس لے آؤ تو میں سب کچھ کرنے پہ تیار ہوں۔" اس نے خود کو کہتے سنا۔
"جب میں جیل میں تھا اور یہ سب لوگ میرے خلاف تھے' مجھے اذیت دے رہے تھے تو صرف ایک شخص تھا جس نے میری بات پہ اعتبار کیا تھا اور جس نے مجھے باہر نکالا تھا اس قید سے۔ وہ سعدی تھا اور میں اسے واپس لے آؤں گا۔ لیکن اس کے لیے آپ کو میرے طریقے سے کام کرنا ہو گا' سوز مرلی بی۔" وہ دو قدم چل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور جب بولا تو آنکھوں میں مضبوط عزم تھا۔ "آج سے سارے فیصلے میں کروں گا۔ اور آپ مجھ سے زیادہ بحث نہیں کریں گی۔" چند لمحے زمر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔
"ٹھیک ہے مگر ایک آخری سوال۔" وہ زخمی سا مسکرائی۔ "تمہارے ان سارے مجرموں میں میری تصویر کدھر لگی ہے؟ آخر تمہیں جیل تو میں نے بھیجا تھا نا۔"
فارس کی گردن میں گلٹی سی ڈوب کر ابھری۔
"میرا نمبر ان میں کون سا ہے؟ کب آئے گی میری باری؟" وہ چند ثانیے کچھ کہہ نہیں پایا۔
"جیسا کہ آپ نے خود کہا تھا' جب سعدی مل جائے گا' تب آپ مجھ سے اپنا حساب لیں گی' سو میں بھی تب ہی آپ سے حساب لوں گا۔"
اور اس نے صرف اپنی انا کے باعث وہ کہا جو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اور وہ اس بات سے بے خبر' کہ یہ وہ عورت ہے جسے وہ ایک ہزار دفعہ بھی معاف کر سکتا ہے' سر ہلا کر گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔
"ٹھیک ہے۔ میں تب تک تمہارے ساتھ ہوں جب تک سعدی نہیں مل جاتا۔ مگر آج سے' میں ہر جگہ تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"
"آپ کو مجھ پہ اعتبار نہیں ہے؟"
"نہیں' میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کیسے کام کرتے ہو' کل کو جب تم مجھ سے اپنا حساب لو' تو کم از کم مجھے تمہارے طریقوں کا علم تو ہو نا۔"
قطعیت سے کہتی وہ مڑ گئی۔ فارس خاموشی سے اسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھتا رہا۔ تہہ خانے میں ایک دم اداسی چھا گئی تھی۔



اب جو چاہیں بھی تو اس طرح نہیں مل سکتے
پیڑ اکھڑے تو کہاں بار دگر لگتا ہے

ان سے سینکڑوں' ہزاروں میل دور' اس کمرے میں مقید سعدی یوسف' بیڈ پہ ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تین تصویریں تھیں جن کو وہ بار بار اوپر نیچے کر کے دیکھ رہا تھا۔ ہاشم اپنا زہر اگل کر جا چکا تھا اور سعدی کا سن ہوا جسم بھی آہستہ آہستہ نارمل ہو چکا

تھا۔

(ڈاکٹر سارہ نے کسی کو نہیں بتایا) وہ یاسیت سے سوچ رہا تھا۔ (اس نے اپنا قلم ایک غلط شخص کے ہاتھ میں دے دیا' اسے ہمیشہ سے معلوم تھا وہ کتنی بزدل اور ڈرپوک ہے' مگر یہ سب بنا سوچے سمجھے ہوا۔ اس کی زندگی کی دوسری بڑی غلطی زمر اور حنہ سے جھوٹ بولنا تھی کہ وہ کسی سائنس دان سے ملنے جا رہا ہے اور پہلی بڑی غلطی.... سارہ پہ اعتبار کرنا تھی۔)

مسلسل تصویریں شفل (الٹ پلٹ) کرتے زمر اور نوشیرواں کی تصویر اوپر لایا۔ آنکھوں میں سرخی سی دوڑنے لگی۔ حنین کی تصویر اوپر آئی تو دماغ پھٹنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے گہرے سانس لیے' خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

تب ہی دروازہ کھول کر میری این جیو اندر داخل ہوئی۔ اس کے قریب آکر سپاٹ سا بولی۔ "مجھے ذرا کام ہے' مایا ابھی آئی ہو گی' تمہاری پٹی دیکھے گی۔ زیادہ ہوشیاری مت دکھانا۔ مایا اچھی ہے' بہت اچھی مگر اسے استعمال کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

وہ سر جھکائے تصویریں الٹ پلٹ کرتا رہا۔ اس کی بات گویا ان سنی کی۔ وہ چلی گئی تو مایا اندر آئی۔ میل نرس بھی ساتھ ہی آیا' مگر مایا نے ایک دم اسے مخاطب کیا۔

"وہ.... میرا بلیک بیگ داخلی دروازے کے قریب رہ گیا ہے' ذرا لیتے آؤ۔" وہ سر ہلا کر باہر گیا' تو مایا تیزی سے اس کی طرف آئی۔ بے چینی سے اس کو دیکھا۔

"سنو' میری این جیو گھر پہ نہیں ہے اور میں ابھی سیدھی بازار جاؤں گی' کاردار صاحب کا آدمی بازار کے اندر میرے ساتھ نہیں جائے گا تم مجھے اپنی فیملی کا کوئی نمبر دو' میں ان کو کال کر کے اطلاع کر دوں گی کہ تم کہاں ہو۔" وہ جلدی جلدی بول رہی تھی۔

سعدی نے گویا سنا ہی نہیں' بس ان تصویروں کو ہی دیکھتا رہا۔

"تم سن رہے ہو؟" وہ جھنجلائی اور اس کا کندھا ہلایا۔ "سعدی' مجھے کوئی کانٹیکٹ نمبر دو جہاں میں فون کر سکوں۔ تاکہ تم ان کے پاس واپس جا سکو۔"

سعدی نے اس کے یوں ہلانے پہ آنکھیں اٹھا کر اجنبی نظروں سے اسے دیکھا۔

"میری کوئی فیملی نہیں ہے' نہ مجھے کسی کے پاس واپس جانا ہے!"

مایا دھک سے رہ گئی۔ پھر اس کی شفاف آنکھوں میں بے پناہ دکھ ابھرا۔

"ایسے مت کہو۔ تمہاری فیملی تمہاری منتظر ہو گی۔"

"میں نے کہا نا' میری کوئی فیملی نہیں ہے۔" اس نے وہ تصویریں اکٹھی کیں اور شٹوپ سے پھاڑیں' پھر اکٹھی کر کے دوبارہ پھاڑیں اور دروازے کی طرف اچھال دیں۔ تب ہی نرس واپس اندر داخل ہوا۔ سارے پرزے اس کے قدموں میں گر گئے۔

مایا اب کچھ نہیں کہہ سکتی تھی مگر آنکھوں میں بے پناہ تکلیف اور کرب لیے وہ نرس کو ہدایات دینے لگی۔



اجنبی لگنے لگے خود تمہیں اپنا ہی وجود
اپنے دن رات کو اتنا بھی اکیلا نہ کرو

اس رات انیکسی میں خاموشی چھائی تھی۔ سیم اور ابا اپنے کمرے میں سونے جا چکے تھے۔ فارس گھر پر نہیں تھا۔ اور ندرت کو آج ذکیہ خالہ بہت اصرار سے اپنی طرف لے گئی تھیں۔ ایسے میں حنین اکیلی لاؤنج کے صوفے پہ لیٹی تھی۔ ٹی وی مدھم آواز میں چل رہا تھا مگر وہ چھت کو تکتی سوچے جا رہی تھی۔ ہاشم کے جھوٹ کے بارے میں۔ فلیش کے بارے میں جسے وہ کھول نہیں سکی تھی۔ ہاشم سے بات نہ کرنے کے بارے میں....

تب ہی میز پہ رکھا فون بجنے لگا۔ حنین نے سست روی سے گردن موڑی۔ ہاشم کی کال آ رہی تھی۔ اسی پل دروازہ کھلا اور اس نے فارس کو اندر آتے دیکھا۔ وہ موبائل اٹھانے کے لیے ہاتھ بھی نہ بڑھا سکی۔

"کس کا فون ہے؟" وہ اس کے سر پہ پہنچ گیا تھا۔ وہ بس یک ٹک گردن اٹھائے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"حنین! میں پوچھ رہا ہوں' اس وقت کس کا فون آ رہا ہے؟" وہ غصے سے پوچھ رہا تھا اور حنین کا پورا وجود سُن تھا... دل نے ساتھ چھوڑ دیا تھا' جسم سے جان نکل رہی تھی... فارس نے فون اٹھا لیا تھا۔ اب وہ سب جان جائے گا۔

کرنٹ کھا کر جیسے اس کی آنکھ کھلی اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ پورا جسم پسینے میں ڈوبا تھا۔ ادھر اُدھر گردن گھمائی۔ وہ اکیلی تھی۔ ٹی وی ہنوز چل رہا تھا۔ موبائل ہاتھ میں تھا۔ وہ کب سوئی پتا ہی نہیں چلا۔ پہلے اس نے موبائل دیکھا۔ کوئی کال نہیں تھی۔ اوہ وہ خواب تھا!

آہٹ پہ چونکی۔ فارس دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ اسی طرح متوحش سی بیٹھی تھی۔ اس نے لائٹ لگایا' اور قدم قدم چلتا قریب آیا۔ حنہ کو دیکھ کر آنکھوں میں استعجاب ابھرا۔

"ادھر کیوں سو رہی ہو؟"

"وہ امی... امی ذکیہ نانی کی طرف گئی ہیں نا' تو... میں اکیلی تھی۔"

"ہاں انہوں نے مجھے بتایا تھا' تو تم اکیلی کیوں ہو؟ سیم کو اپنے ساتھ سلانا تھا۔" ایک نظر ابا کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔ "اچھا اب ادھر مت سوؤ۔ صبح ملازم لڑکا آتا ہے' اس کے لیے دروازہ کھولنا ہوتا ہے۔ شاباش' اٹھو اوپر ہمارے کمرے میں آجاؤ۔" ساتھ ہی اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا مگر آنکھوں میں حنہ کے لیے بے حد نرمی تھی۔

حنین کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ ایک دم اٹھی اور اس کے بازو کے گرد ہاتھ لپیٹ کر اس کے کندھے سے ماتھا ٹکا دیا۔

"ماموں! میں آپ کو کبھی نہیں کھونا چاہتی۔ میں نے بہت برا خواب دیکھا۔ میں آپ کو کھونے والی تھی۔" آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

"میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ بہت زیادہ۔"

فارس نے گہرا سانس لیا۔ "نہیں حنہ! میں تمہیں اس وقت کچھ کھلانے باہر نہیں لے جا سکتا۔"

روتے روتے حنہ نے ناراضی سے چہرہ اٹھایا۔ "دنیا میں کھانے سے بڑے مسائل بھی ہو سکتے ہیں۔"

"مثلاً"؟" اس نے غور سے حنین کے چہرے کو دیکھا۔ بالوں کو پونی میں باندھے' اس کی آنکھیں گیلی نظر آ رہی تھیں۔ اس سوال پہ مزید بھر آئیں۔

"میں بہت بری ہوں۔" احساس جرم بہت شدید تھا۔

فارس نے ابرو اٹھائی۔ "شکل میں؟"

حنین ہلکا سا ہنس دی۔ اس کا بازو چھوڑا۔ آنسو رگڑے۔ "آپ کے ساتھ ایموشنل ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"چلو' اب اپنا ڈرامہ ختم کرو اور آؤ۔" وہ مسکرا دی۔ دل ایک دم ہلکا پھلکا سا ہو گیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا تو حنہ نے سوچا' بس اب وہ ہاشم کو یوں چھپ کر ٹیکسٹ نہیں کرے گی۔ بس ختم یہ سلسلہ۔

دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو زیرو بتی جل رہی تھی' اور زمر آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی تھی۔ فارس کی نگاہیں اس کے پاؤں پر جا رکیں' جس کا انگوٹھا ہنوز پٹی میں مقید تھا۔

"زمر!" اس نے پکارا تو اس نے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔

"حنہ آپ کے ساتھ سوئے گی' میں ابا والے کمرے میں جا رہا ہوں۔" اطلاع دیتے ہوئے وہ اپنی چیزیں اٹھا رہا تھا۔ زمر اٹھ گئی۔

"ارے تم اکیلی کیوں تھیں؟ سیم کو بولا تھا میں نے... خیر آجاؤ' اب سو جاؤ۔" وہ نرمی سے کہتی اٹھی اور اس کے لیے لحاف نکالنے لگی۔

حنین چپ چاپ آ کر زمر کے دوسری طرف لیٹ گئی۔ موبائل پہ سحری کا الارم لگا کر اپنے اور زمر کے تکیے کے درمیان رکھ دیا۔ (زمر سے کوئی بات نہیں کی) اور ماتھے پہ بازو رکھ لیا۔ موبائل کی لائٹ جل رہی تھی۔ روشنی بجھنے کا وقت دو منٹ تھا۔ ڈیڑھ منٹ بعد

حنہ نے کروٹ بدل لی۔ تب ہی موبائل تھرتھرایا۔ زمر چونکی۔ موبائل ٹیڑھا پڑا تھا۔ اوپری بار میں نئے میسج کی پہلی سطر نظر آرہی تھی۔
ہاشم کاردار: "کیا میں تمہیں کال کرلوں؟"
حنہ نے کروٹ لی' زمر نے فوراً" آنکھیں بند کرلیں۔ اسے آہٹ سنائی دی۔ پھر فون آف ہونے کی ٹون گونجی۔
پھر وہ سو گئی' مگر زمر یوسف کی نیند اُڑ چکی تھی۔
(ہاشم نے ایسا میسیج حنہ کو کیوں کیا؟)
اگلی شام وہ کمرے میں بیٹھی کیس اسٹڈی کررہی تھی تو دروازہ دستک کے بعد کھلا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ سارہ چوکھٹ میں کھڑی تھی۔ آنکھوں میں اداسی' لبوں پہ نرم مسکراہٹ اور بال نفیس سے فرنچ ناٹ میں بندھے تھے۔ وہ اور ذکیہ خالہ' ندرت کو شاپنگ کے لیے اپنے ساتھ لے جانے آئی تھیں۔ یہ بھی ندرت کا اصرار تھا۔ عید کی تیاری کرنی تھی۔ سعدی کے کپڑے بھی لینے تھے۔ زمر کے لیے کل ہی لے آئی تھیں۔
"آیئے سارہ۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سارہ اس کی فائلز کو دیکھتے قریب آکر بیٹھی۔ وہ ان دو ماہ میں دوسری دفعہ آئی تھی۔ پہلے ادھر اُدھر کی چند باتیں کیں۔ پھر وہی ذکر آیا۔
"سعدی کا کچھ پتا چلا؟" (مٹھی میں پسینہ آیا)
"نہیں' مگر پتا چل جائے گا۔"
"آپ کو اتنا یقین کیسے ہے کہ وہ زندہ ہوگا؟" یہی بات سارہ کے سمجھ نہیں آرہی تھی۔
زمر آزردگی سے مسکرائی۔ "کیونکہ ہم زندہ ہیں۔"
سارہ کے دل کو دھکا سا لگا۔ بدقت چند باتیں کرپائی۔
"کیا کوئی گواہ سامنے نہیں آیا؟ کسی نے کچھ تو دیکھا ہوگا؟" بظاہر سرسری سا پوچھا۔
زمر نے گہری سانس بھری۔ "نہیں' کوئی سامنے نہیں آیا۔ گواہ عموماً" سامنے کم آتے ہیں۔ سب کی اپنی فیملیز ہوتی ہیں۔ ویلکم ٹو پاکستان!"
"تو کیا گورنمنٹ ان کو وٹنس پروٹیکشن (گواہوں کو تحفظ) نہیں دے سکتی؟ ان کی فیملیز کی حفاظت نہیں کرسکتی؟"
"سارہ! ہمارا سسٹم بہت زبوں حال ہے۔ ہم گواہ چھپا دیں' تب بھی لوگ ان کا پتا نکال لیتے ہیں۔ خیر!" اس نے سر جھٹکا۔ "ہر کوئی اتنا بہادر نہیں ہوتا۔"
سارہ کے لیے مزید بیٹھنا دوبھر تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اس کا مطلب ہے گواہوں کو اپنی حفاظت خود کرنی ہوتی ہے۔ خیر! میں چلتی ہوں۔" زمر نے مسکرا کر الوداع کہا اور اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔



ہم خاک نشین' تم سخن آرا سر بام
پاس آکے ملو دور سے کیا بات کرو ہو

رمضان اسی طرح خاموش سا گزر گیا اور عید کی شام قصر اور اس کے سبزہ زار پہ اُتری تو بے پناہ رونقیاں لیے ہوئے تھی۔ بے فکر' خوب صورت اور خوش باش لوگ ٹہل رہے تھے۔ ویٹرز ٹرے اٹھائے' مشروبات سے تواضع کرتے نظر آرہے تھے۔ ایسے میں سبزہ زار کے وسط میں ہاشم' میرون شلوار قمیص میں ملبوس' گلاس تھامے' ہنستا ہوا مہمانوں سے باتیں کرتا نظر آرہا تھا۔ جواہرات بھی قریب کھڑی تھی۔ سبز گاؤن میں' مسکراتی ہوئی' کانوں میں زمرد اور ہیرے جڑے آویزے پہنے۔ کاردارز کی عید کی پارٹی اتنی ہی جگمگاتی ہوئی ہوتی تھی۔
ان سے دور ہٹو تو سبزہ زار کے بالکل کنارے پہ ایک الگ تھلگ میز پہ Yousufs (یوسف) کا ٹیگ لگا تھا۔ وہاں سیم اور حنین کھڑے مدھم آواز میں باتیں کررہے تھے۔ ندرت جو ساتھ بیٹھی تھیں' ابا سے ہلکی پھلکی بات کرتیں' پھر خاموش ہوجاتیں۔ سعدی کی باتیں۔ سعدی کے نہ ہونے کی اداسی۔ امی نے سیم کے آف وائٹ کرتے جیسا بڑا سائز سعدی کے لیے بھی لیا تھا۔ سعدی کی یاد' سعدی کی محبت سے بڑھ گئی تھی۔
سیم بددل لگ رہا تھا۔ بددل تو حنہ بھی تھی۔ لمبی

نیلی قمیص میں ملبوس' بالوں میں ہیئر بینڈ لگائے ہوئے تھی۔ ماتھے پہ تراشیدہ بال ترچھے ہو کر ابرو سے نیچے گرتے تھے۔ (ماموں والے خواب کے بعد اس نے ہاشم سے بات نہیں کی تھی' نہ ہاشم نے پھر ٹیکسٹ کیا) حنہ کی نظریں بھٹکتی ہوئی ہاشم پہ جا ٹھہریں۔ وہ دور تھا' ایفل ٹاور کی طرح۔ اسے دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ ہونہہ' اس نے منہ پھیر لیا۔

قریب میں زمر کھڑی فارس سے بات کرتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے امی کی لائی سرخ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بال جوڑے میں تھے اور صرف دو گھنگھریالی لٹیں گالوں پہ جھکی ہوئی تھیں۔

"کیا تم پارٹی میں شامل نہیں ہو گے؟" خفگی سے فارس سے پوچھا جو ابھی باہر سے آیا تھا اور سیدھا اندر جا رہا تھا۔ جینز پہ سفید کرتا۔ پیروں میں پشاوری چپل۔ منہ میں کچھ مسلسل چباتا ہوا۔ بے نیازی سے ابرو اچکائے۔ "کاردار کی پارٹیز کی عادت نہیں مجھے۔ آپ لوگ انجوائے کریں۔"

وہ گویا کھول گئی۔

"ہم انجوائے کرنے نہیں آئے۔ میں اس لیے تیار ہوئی ہوں تاکہ بھابھی کو یہ نہ لگے کہ میں نے وہ باتیں نہیں بھلائیں۔ اگر تم نہ آئے' تو ان کو یہی لگے گا۔ کیوں میری فیملی کو میرے خلاف کرنا چاہتے ہو؟"

"او کے' یہیں ہوں میں۔" فارس نے تحمل سے اس کی بات سنی' اور چند لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں دیکھا جن میں برہمی تھی۔ (کوئی بیک وقت اتنا خوب صورت' اور اتنا سنگ دل کیسے ہو سکتا ہے؟) پھر رخ پھیر لیا۔ وہ حنہ کی طرف آ گئی۔

"سو یہ یو ایس بی کا کیا قصہ ہے؟ جو اس دن تم نے ہاشم کو دی' وہ سعدی نے تمہیں نہیں دی تھی؟" کچھ دن سے حنہ کو لیپ ٹاپ میں الجھے دیکھ کر زمر نے صبح جب پوچھا تھا تو اس کے جواب سے نکلا نتیجہ' اب سوالیہ انداز میں دہرایا' تو حنین نے بس سر ہلایا۔

"جی' میں بھائی کی چیز ان کو نہیں دے سکتی تھی۔ نہ آپ کو دوں گی۔"

"او کے' مگر جب وہ کھل جائے تو بتانا۔" اور دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ البتہ زمر محسوس کر رہی تھی حنہ کی بار بار ہاشم کی طرف اٹھتی نظریں' کچھ تھا جو اسے بے چین کر رہا تھا۔

دور کھڑے ہاشم نے فارس کو دیکھا تو ساتھ میں موجود خاور سے سرگوشی کی۔ "یہ جیل کب جا رہا ہے؟"

"بس کچھ دن تک۔ میں پکا کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"جلدی کرو۔ مجھ سے یہ ادھر برداشت نہیں ہوتا۔" ناگواری سے کہہ کر گھونٹ بھرا۔

"آپ کی اس سے پھر بات ہوئی؟" خاور نے دبے لفظوں میں پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی تو اسے اس کی بہن کے حوالے سے خوفزدہ کیا ہے۔ کچھ دن سوچے گا وہ۔ پھر بات کروں گا۔"

پھر نگاہیں جواہرات پہ جا ٹھہریں جو ذرا فاصلے پہ کھڑی ہارون عبید سے بات کر رہی تھی۔ ہاشم نے رخ پھیر لیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا کرب اٹھتا تھا' ہارون عبید کو دیکھ کر۔ کوئی بہت شدت سے یاد آتا تھا۔

"مجھے امید تھی' آپ میرے تحفے کو پہنیں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔" ادھر وہ جواہرات سے کہہ رہے تھے۔ وہ دراز قد اور باوقار سے سیاستدان تھے۔ آنکھیں سرمئی تھیں اور ان میں وہی نرم سا شاطر پن تھا جو سیاستدانوں کا خاصا ہوتا ہے۔

"میرے پاس دن بھر میں ڈھیروں تحفے آتے ہیں ہارون! اگر ہر ایک کا دل رکھنے لگ گئی تو ملکہ نہیں رہوں گی۔ حکمرانی "ناں" کرنے کا نام ہے۔ ورنہ "ہاں" تو سب کہہ دیتے ہیں۔"

وہ مسکرائے۔ "میں آپ سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ آپ کے گھر میں کھڑا ہوں۔ آپ ہماری دعوت پہ جب آئیں گی' تو ہم اس گفتگو کو یہیں سے شروع کریں گے۔"

"تب کی تب دیکھی جائے گی!" جواہرات نے انگلی سے بال پیچھے کرتے کہا۔ "اور میرا خیال ہے' ان ٹیبلز

کی طرف بہت سے لوگ آپ کی توجہ کے منتظر ہیں۔"

ہارون عبید نے ذرا کی ذرا اس طرف دیکھا' پھر سر کو خم دیا۔ "آپ اپنے مہمانوں کو اٹینڈ کریں اور میں بھی۔" مسکرا کر پلٹ گئے۔ وہ بھی مسکرا کر ان کو جاتے دیکھتی رہی' انگلی مسلسل نیکلس کے سبز پتھروں پہ پھیر رہی تھی۔

"اس عمر میں بھی آپ سے سیکھنے کو بہت کچھ ہے مسز کاردار۔" شہرین کھنکھار کر کہتی ہوئی اس کے قریب آئی تو جواہرات نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ آسمانی رنگ کی میکسی میں ملبوس تھی' باب کٹ سنہرے بال 'بلو ڈرائے کر کے سیٹ تھے اور آنکھوں میں معنی خیز مسکراتا تاثر تھا۔

"اگر آپ ان کا تحفہ پہن لیتیں' یا ان سے چند فقرے مزید کہہ دیتیں تو آپ کی کشش ماند پڑنے لگتی' کیا ہی اچھا ہنر ہے کسی کو اکسانے کا۔"

جواہرات نے ایک پرتپش نظر اس پہ ڈالی' مگر لبوں پہ مسکراہٹ جمی رہی۔ ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر ویٹر کی ٹرے سے گلاس اٹھایا اور اتنی تیزی سے واپس لائی کہ وہ اُلٹنے لگا' شہری کے اوپر۔۔۔ مگر کسی نے گلاس اور جواہرات کے ہاتھ' دونوں کو سختی سے پکڑ کر مشروب گرنے سے روکا۔ شہری ہل بھی نہ سکی۔ جواہرات نے بھی چونک کر دیکھا۔

فارس اس کا ہاتھ پکڑے' گلاس واپس ٹرے میں رکھ رہا تھا۔ "دھیان سے مسز کاردار' آپ اپنی بہو کے کپڑے خراب کرنے والی تھیں۔"

جواہرات کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ گھور کر فارس کو دیکھا۔

"تمہارا شکریہ فارس' میں اسے یاد رکھوں گی۔" ان دونوں کو گھورتے آگے بڑھ گئیں۔

شہری جو اس غیر متوقع صورت حال کے لیے تیار نہ تھی' بمشکل سنبھلی تھی۔ جوس کے گلاس کو دیکھ کر جھرجھری لی اور پھر فارس کو دیکھا۔

"تھینک یو' تم نے میرا ڈریس بچا لیا۔" اس نے بس ہلکے سے کندھے اچکائے۔ منہ میں کچھ چبا رہا تھا اور گردن موڑے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ذرا اکتایا ہوا' ذرا بے نیاز۔ شہری نے کتنے دن بعد غور سے اسے دیکھا تھا۔

"تمہیں جیل سے باہر دیکھ کر اچھا لگتا ہے فارس بھئی"

پھر نگاہ دور کھڑی سرخ ساڑھی والی زمر پر پڑی' جو مسکرا کر کسی سے بات کر رہی تھی۔

شہری کی آنکھوں میں ناگواری ابھری۔ "تم نے جلدی نہیں کر دی شادی میں؟"

وہ چونکا۔ "کیوں؟"

"یونہی۔ ڈی اے کے چہرے سے لگتا ہے وہ خوش نہیں ہے تمہارے ساتھ۔۔۔"

"کیوں؟ کیا اس کے چہرے پہ وہی ناخوش گوار تاثر ہے' جو تمہارے چہرے پہ ہوتا تھا' جب تم ہاشم کی بیوی تھیں؟"

انگاروں پہ پانی ڈالا تو وہ اور بھڑک اٹھے۔ شہری کی آنکھوں میں چبھن بھری' بے بسی ابھری۔ "تمہیں ان مظالم کا اندازہ بھی نہیں ہے۔ جو ہاشم نے مجھ پہ کیے ہیں' اس نے مجھے اتنے سال ٹارچر۔۔۔"

"چار سال جیل میں رہا ہوں شہری! اپنے ٹارچرز کی اتنی لمبی فہرست ہے کہ کسی دوسرے کے ٹارچرز سننے میں دلچسپی نہیں رہی۔ سی یو!" ذرا اکتا کر کہتا' سر کو الوداعی انداز میں خم دیتا وہ آگے بڑھ گیا۔ شہری کی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ پھر نرمی سے مسکرائی۔ اس کی کوئی بھی بات اسے بری نہیں لگی تھی۔ اپنی میز سے نوشیرواں نے غور سے یہ سب دیکھا تھا' پھر بڑبڑا کر منہ موڑ لیا۔

اسی اثناء میں زمر کو پیچھے سے کسی نے "السلام علیکم" کہہ کر پکارا تو وہ چونک کر پلٹی۔ ڈنر جیکٹ میں ملبوس مسکراتا ہوا احمر وہاں کھڑا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی۔

"آپ ادھر کہاں؟"

"بھول گئیں؟ ہارون عبید کا کیمپین (الیکشن کی مہم) منیجر ہوں۔ جہاں وہ' وہاں ہم۔" سر کو جھکا کر اسٹائل سے کہا۔

"میرے کام کا کیا بنا؟"

"مصروف رہا بہت' جلد اپ ڈیٹ کروں گا' مگر ایک بات.... ہارون عبید کا کمپنی میجر۔ پندرہ ہزار فی گھنٹہ لیتا اچھا نہیں لگے گا' سو۔" ذرا سوچنے کی اداکاری کی۔ "میری فیس بڑھائیں۔ پچیس ہزار فی گھنٹہ!"

"پچیس ہزار فی گھنٹہ؟" زمر نے مسکرا کر دہرایا۔

"ویسے تو یہ بھی کم ہیں مگر چلیں' آپ کے لیے اتنی رعایت کر سکتا ہوں۔"

"تھینک یو سو مچ احمر! آپ بہت اچھے ہیں اور اتنے ہی اچھے لگ رہے تھے اس فوٹیج میں جس میں آپ کریڈٹ کارڈ فراڈ کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ صبح ہی میں نے دیکھی' واحد اور اوریجنل کاپی جو آپ کا کیس بند کرنے کے بعد مجھے ملی' اتنی بڑی نہیں ہے کہ دوبارہ کیس کھولا جا سکے لیکن۔" چہرہ موڑ کر سوچتی نظروں سے ہارون عبید کو دیکھا۔ "اگر ہارون عبید نے یہ ویڈیو دیکھی اور ان کو لگا کہ اس کا ریلیز ہونا ان کی کمپنی کے لیے شرمناک ہوگا تو وہ کیا کریں گے؟ خیر یہ سوچنا میرا کام نہیں ہے۔ ہاں تو ہم آپ کی فیس کی بات کر رہے تھے۔" گھونگھریالی لٹ انگلی پہ لپیٹتے' بڑی تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ وہ لب بھینچے' دانت پیستے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ویسے آپ کا ایک بڑا خوب صورت نک نیم رکھا تھا میں نے' اس وقت بہت یاد آ رہا ہے۔" جبراً "مسکرا کر بولا۔ "اور فیس؟ چھوڑیں بھابھی! آپ میرے دوست کی بیوی ہیں' آپ سے فیس لیتا اچھا لگوں گا۔"

"تھینک یو احمر!" مسکرا کر سر کو خم دیا۔ "میرا کام ہو جائے تو وہ فوٹیج آپ کی ہوئی!" چڑیل آگے بڑھ گئی اور وہ کینہ توز نظروں سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔

"وہ ڈاکٹر جس نے گولیاں لگنے کے بعد اس کو بچایا تھا' اس کو چوک میں کھڑا کر کے پچاس درے تو لگنے ہی چاہئیں!" پھر زور سے جوتا گھاس پہ مارا اور اسی برے منہ سے پلٹا تو سامنے کھڑی لڑکی پہ نظر پڑی۔ وہ نیلی لمبی قمیص میں ملبوس تھی اور دور کچھ دیکھتی سوچ میں گم تھی۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھتا دو قدم قریب آیا۔

"آپ سعدی کی بہن ہیں نا؟" حنہ نے چونک کر گردن موڑی' پھر سیدھی کھڑی ہوئی۔ اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

"جی۔"

"میں نے اس دن آپ کو پہچان لیا تھا' آپ کی تصویر دیکھی تھی ایک دفعہ کسی اخبار میں۔ آپ نے کسی بورڈ میں ٹاپ کیا تھا' ہے نا؟" بالآخر اسے یاد آگیا تھا کہ اس نے حنہ کو کہاں دیکھا تھا۔

حنین یوسف کے چہرے کی رنگت سفید پڑی۔

"جی۔" تھوک نگلا۔

"اچھا تو کیا پڑھ رہی ہیں آپ؟"

"بی اے کیا ہے۔"

وہ حیران ہوا۔ "صرف بی اے؟ آپ کو تو ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہیے تھا' ورنہ بورڈ میں کیوں ٹاپ کیا؟ کیا نقل کر کے کیا تھا؟"

احمر کے لیے بہت سی باتیں صرف مذاق ہوتی تھیں' یہ بات بھی کہہ دی' مگر حنین کی رنگت برف کی طرح ہو گئی۔

"آپ ہیں کون مجھ سے ایسی بات کرنے والے؟" احمر کو ایک دم غلطی کا احساس ہوا۔

"میں غازی کا دوست ہوں۔ سوری مگر...."

"مطلب مجھے ماموں سے بات کرنی پڑے گی۔" ایک دم وہ گھوم کر فارس کی طرف گئی۔

احمر کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ زمر سے بات کر لیتا تھا' وہ جاب کرنے والی' سمجھدار لڑکی تھی' کسی کو خود سے بے تکلف نہ ہونے دیتی' اس کی اور بات تھی' مگر فارس کے گھر کی کسی دوسری لڑکی کو غصہ دلانے کا مطلب اتنے برسوں کی دوستی بھاڑ میں جھونکنے جیسا تھا۔ وہ اسے روکنا چاہتا تھا مگر وہ دور کھڑے فارس تک گئی اور اس کو متوجہ کیا۔ احمر سانس روکے اس طرف دیکھے گیا۔

حنین نے اس سے کچھ کہا' فارس نے فوراً" مڑ کر احمر کی طرف دیکھا۔ وہ تیز تیز بولتی اس کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہے جا رہی تھی۔ فارس نے اچنبھے سے پھر

احمر کی طرف دیکھا، پھر آگے بڑھا (میں دیکھتا ہوں) مگر حنہ نے فوراً اس کا بازو تھام کر روکا، اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر جیسے تسلی کروائی (میں دیکھ لوں گی) فارس نے مڑ کر دو تین دفعہ اس طرف دیکھا اور واپس پلٹ گیا۔
حنہ نے ایک تیز نظر احمر پہ ڈالی (اب مجھ سے بات کرنے کی ہمت نہ کرنا) اور آگے بڑھ گئی۔

احمر کا گلاس کو تھاما ہوا ہاتھ پسینے میں بھیگا تھا۔ وہ شل کھڑا تھا۔ (خدایا، وہ غازی کو کیسے صفائی دے گا؟)
تھوڑی دیر بعد اس نے ہمت کی، فارس کی طرف آیا۔ سمجھ نہیں آیا کیا کہے۔ اس لڑکی نے جانے کس انداز میں بات کی ہو۔ فارس دور جا رہا تھا، وہ روک نہیں سکا، پھر وہاں کھڑے بور ہوتے سیم کو مخاطب کیا۔

"سنو۔۔۔ میں سعدی کا دوست ہوں۔" سیم متوجہ ہوا تو تذبذب سے کہنے لگا۔ "ابھی آپ کی کسسٹر میرے بارے میں جو کہہ رہی تھیں غازی سے، وہ۔۔۔"

"جی؟" سیم نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر مڑ کر دور جاتی حنہ کو۔ "آپ کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا، وہ تو ان کرسیوں کا پوچھ رہی تھی کہ وہ زرتاشہ ممانی کے جہیز کی ہیں نا۔" اس نے ان کرسیوں کی طرف اشارہ کیا جو وہاں رکھی تھیں جہاں ابھی احمر کھڑا تھا۔ "مگر ماموں کہہ رہے تھے کہ انہیں نہیں یاد کہ وہ زرتاشہ کی ہوں، حنہ نے کہا کہ رہنے دیں وہ خود چیک کر لے گی۔ آپ کو تو کچھ نہیں کہا۔" وہ حیران سا صفائی دینے لگا، اور احمر کے اوپر تو مانو ٹھنڈا پانی ڈال دیا کسی نے۔ جلدی سے غلط فہمی کی معذرت کرتا پلٹا تو تلملا رہا تھا۔

"یہ کیا چیز تھی؟"

✡ ✡ ✡

تو بھی ہیرے سے بن گیا پتھر
ہم بھی کل کیا سے کیا ہو جائیں گے

اگلی صبح جب جواہرات ڈائننگ ٹیبل کی مرکزی کرسی پہ براجمان ناشتہ کر رہی تھی، تو سامنے کھڑی فینوتا نے جھکی آنکھوں مگر اٹھی گردن سے کہا۔

"اگر اسٹاف جائے گا تو میں بھی جاؤں گی مسز کاردار!"

گلاس سے گھونٹ بھرتی جواہرات نے آنکھیں اٹھائیں اور مسکرائی۔ پھر ٹیک لگا کر بغور اسے دیکھا۔

"تم فینوتا ہو۔۔۔ جواہرات کاردار نہیں ہو۔ تمہیں خواہش ہے کہ تم جواہرات ہوتیں، مگر تم نہیں ہو۔ تو میں تمہیں پہلی اور آخری بار ایک بات بتاتی ہوں۔ سارے اسٹاف کو نکال کر تمہیں اس لیے رہنے دیا کیونکہ تم وفادار ہو مگر۔۔۔ تم جانا چاہو تو چلی جاؤ، میں تمہارا پے چیک بنا دیتی ہوں۔۔۔ لیکن جاتے وقت تمہیں بونس اور وہ نیکلس چھوڑنا پڑے گا جو تم نے میری اینجبیو سے چوری کروایا اور جو میں نے بعد میں تمہیں دے دیا تھا۔"

فینوتا نے نظریں اٹھائیں۔ ان میں تعجب تھا اور فکرمندی بھی۔

"میں نے وہ آپ کے کہنے پہ چوری کروایا تھا میری سے!"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو، اتنا بڑا الزام۔ فینوتا! اگر یہ بات تم ہاشم کے سامنے کہو تو وہ کیا حال نہ کرے تمہارا؟ چچ چچ۔" افسوس سے کہتے اس نے گلاس لبوں سے لگا لیا۔

فینوتا برے دل سے پلٹ آئی۔ کچن کے قریب راہداری تہہ خانے میں جاتی تھی، جہاں ملازمین کے کمرے تھے۔ چھوٹے مگر صاف ستھرے کمرے۔ اس کے کمرے میں ایک سنگل بیڈ بچھا تھا، ایک سنگھار میز اور ایک الماری تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی اور دراز سے وہ نیکلس نکال کر گردن سے لگایا جو مسز کاردار نے اسے اکیس مئی کی شام بڑی لاپروائی سے دان کر دیا تھا۔

آئینے میں نظر آتے عکس میں ہیروں کی چمک سحر انگیز تھی۔ اس چمک میں اسے وہ گھنگھریالے بالوں والا لڑکا یاد آیا جس کی جیب میں اس نے یہ نیکلس پارٹی کے دوران ڈالا تھا۔ یقیناً اسی نے یہ مسز کاردار کو واپس کیا ہوگا۔ اور اب یہ فینوتا کا تھا۔

ملازموں کی ملکہ نے ہیروں سے جھلملاتے

نیکلس کو گردن پہ لگائے' چہرہ تن کر اٹھائے رکھا تو آنکھوں میں بھی وہی چمک ابھر آئی۔

کچھ دیر بعد وہ مسز کاردار کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"نیا اسٹاف کس تاریخ سے رکھنا ہے میم؟ کیا میں بھی انٹرویو میں شامل ہوں گی؟"

"آف کورس!" جواہرات مسکرائی تھی۔



مرے ہی لہو پر گزر اوقات کرو ہو
مجھ سے ہی امیروں کی طرح بات کرو ہو

ملاقاتی کمرہ آج بھی ویسا ہی تھا مگر ماحول میں تناؤ کا رخ اور تناسب بدل چکا تھا۔ اے ایس پی سرمد شاہ موجود نہیں تھا' اور بالآخر کئی دن بعد وہ دونوں نیاز بیگ سے تنہائی میں مل رہے تھے۔ وہ آگے ہو کر بیٹھا' قدرے بے چین اور مضطرب لگتا تھا۔ ایک آنکھ سوجی تھی' کان تلے زخم' ہونٹوں اور گردن پہ جما خون۔ زمر گھنگھریالی لٹ انگلی پہ لپیٹے اوپر سے نیچے اس کے زخم دیکھ رہی تھی۔

"میں نے اس کو گولی نہیں ماری تھی۔ میں..." وہ کہنے لگا تھا مگر فارس غصے سے میز پہ ہاتھ مارتے ہوئے آگے ہوا۔

"بکواس مت کرو۔ میرے بھانجے کو تم نے مار کر پھینک دیا' اور اب تم اپنا بیان بدل رہے ہو۔"

"فارس! ریلیکس!" زمر نے نرمی سے اسے مخاطب کیا جو غصے سے نیاز بیگ کو گھور رہا تھا۔ "وہ بیان نہیں بدل رہا' میرا خیال ہے وہ ہمیں کچھ بتانے کی کوشش کر رہا ہے۔ تم بولو نیاز بیگ میں سن رہی ہوں۔"

"پہلے مجھے بتائیں' میرے بولنے سے مجھے کیا فائدہ ہو گا؟" وہ زمر سے مخاطب ہوا تو اس کی آنکھوں میں بے چینی تھی۔

"کیا مطلب تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟" وہ گویا کھول اٹھا۔ "مجھے پانچ منٹ مل جائیں تمہارے ساتھ' تم سے سب اگلوا لوں گا' اس لیے زیادہ فائدے' نقصان کی بات مت کرو' کام کی بات پہ آؤ۔"

"فارس! تم غصہ مت کرو' مجھے بات کرنے دو!" تحمل سے گویا اس کو سمجھاتی وہ نیاز بیگ کی طرف متوجہ ہوئی۔ فارس سر جھٹک کر پیچھے ہو کر بیٹھا اور تن دہی سے اس کو دیکھنے لگا۔

"میں تمہیں وعدہ معاف گواہ بنا لوں گی' تم اس کیس سے بھی نکل جاؤ گے' اور شہزا الملک کے کیس سے بھی۔ میں سرکاری پراسیکیوٹر (وکیل استغاثہ) نہیں ہوں مگر سعدی یوسف کیس میں پراسیکیوٹر میں ہی ہوں سو مجھے بتاؤ' ہر بات' جو تم جانتے ہو۔"

"شہزا الملک کیس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ رہا تمہارے لڑکے کا قتل... تو وہ قتل نہیں ہوا۔" وہ بے بسی بھرے اضطراب سے بولنے لگا۔ "اکیس مئی کی رات مجھے اے ایس پی نے فون کیا اور ہسپتال بلایا' پھر اس سرجن بخاری کے پاس لے گیا' بولا کہ یہ لڑکا غائب کرنا ہے مگر جب آپریشن ہو جائے اور اس کی حالت خطرے سے باہر آ جائے' تب! ان کو وہ زندہ چاہیے تھا۔ ساتھ یہ بھی کہا کہ کچھ ماہ کے لیے اس لڑکے کے قتل کے جرم میں اندر جانا ہو گا' پھر ہم تمہیں نکلوا لیں گے۔"

"بدلے میں کیا دیا؟"

"پیسے... اور میرے بھائی علیم بیگ کے اوپر کیس ختم کرنے کی یقین دہانی کروائی۔ میرا بھائی ابھی تک مفرور ہے' پچھلے سال اسمگلنگ کی وجہ سے... خیر... میں نے وہی کیا۔ میرے ساتھ جو دوسرا وارڈ بوائے تھا' وہ ان کا اپنا لڑکا تھا۔ ہم تمہارے لڑکے کو اسٹریچر پہ باہر لائے' ایمبولینس میں ڈالا' اندر سب تھا' مشینیں' ڈاکٹرز' نرس۔ خیر' میں وہیں سے گھر چلا گیا۔ اے ایس پی نے کہا کچھ دن چھپ جاؤ' پھر پکڑیں گے تمہیں۔ یہاں تک سب ٹھیک ہو گیا مگر اس روز اس نے مجھے شہزا ملک کے کیس میں پھنسا دیا۔ اس نے مجھے وہاں بلوایا اور پھر گرفتار کر لیا۔ یہ سب اے ایس پی نے کیا ہے۔"

چند گہری سانسیں لیں، ذرا توقف کیا اور پھر باری باری ان دونوں کو دیکھا جو خاموشی سے سن رہے تھے۔

دفعتاً" زمر اٹھ گئی۔ فارس بھی کھڑا ہوا۔ نیاز بیگ نے چہرہ اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"مجھے کب گواہی دینی ہوگی؟"

"کون سی گواہی؟" زمر نے ساتھ ہی پرس کندھے پہ ڈالا۔

"ابھی۔۔۔ تم نے کہا وکیل صاحبہ! کہ تم مجھے وعدہ معاف گواہ بنا لوگی اور۔۔۔"

"میں نے کب کہا؟" زمر نے تعجب سے فارس کو دیکھا۔

"نیاز بیگ۔۔۔" وہ میز پہ دونوں ہاتھ رکھ کر جھکا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "جو آدمی اپنا بیان اتنی دفعہ بدلے، اس پہ ہم یقین نہیں کرسکتے۔ تم ہی قاتل ہو، ہمیں معلوم ہے۔"

نیاز بیگ ایک دم ششدر رہ گیا تھا۔

"اور اے ایس پی ہمارا دوست ہے، اس نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تم یہ سب کہو گے، اس لیے۔۔۔ دوبارہ ہم سے ملنے کی زحمت مت کرنا۔"

زمر نے کہا اور وہ دونوں باہر کی طرف بڑھ گئے۔ پیچھے وہ بے اختیار اٹھ کر مضطرب سا چلا رہا تھا۔

"میری بات سنو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔۔۔ سرمد شاہ نے کروایا ہے یہ سب۔" مگر وہ باہر نکل آئے۔ دروازے پہ زمر رکی اور اس کی طرف مڑی۔ غور سے اس کو دیکھا۔

"آج اپنی ہیل نہیں ماری آپ نے میرے پاؤں پہ؟"

"اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میری سمجھ میں آگیا تھا کہ تم کیا کر رہے تھے۔" وہ دبی آواز میں بولی۔ "جب ہم ہسپتال سے فوٹیج نکلوانے گئے تھے اور جب پہلی دفعہ ہم نیاز بیگ سے ملنے آئے تھے، تو مجھے واقعی تمہارے غصے سے کوفت ہوئی تھی۔

مگر تم Good cop bad cop کھیل رہے تھے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی کہہ رہی تھی۔

(مشہور زمانہ اور قدیم تفتیشی حربہ۔ جس میں مجرم کے سامنے ایک آفیسر غصے سے بات کرتا ہے، دھمکیاں دے کر ڈراتا ہے اور دوسرا نرمی سے بات کر کے ہمدردی کرتا ہے تاکہ اگر مجرم خوف کا شکار نہ ہو تو ہمدردی کا نشانہ ضرور بن جائے۔) "تمہیں معلوم تھا کہ میں فوٹیج نکلوالوں گی، تم صرف میرے لیے چیزیں آسان کر رہے تھے، مگر یو نو واٹ فارس، اگلی دفعہ کچھ کرنے سے پہلے مجھے آگاہ کر دینا۔"

"اچھا! میں سمجھا آپ کو پہلے سے معلوم ہوگا۔ کیونکہ آپ کو تو میرے ہر جرم کی خبر ہوتی ہے۔" اس کی طرف جھک کر دھیرے سے کہا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ اس کے اندر ابال سا اٹھا مگر ضبط کر کے پیچھے آئی۔

"اس نے وہی کیا جو آپ نے کہا تھا۔ سارا ملبہ آپ پہ ڈال دیا۔ اور اس ڈاکٹر پہ بھی۔" اے ایس پی سے رخصت ہوتے وقت وہ کہہ رہی تھی۔ سرمد شاہ نے گہری سانس لی۔ تنے اعصاب ڈھیلے چھوڑے۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس کا یقین نہیں کیا۔"

"شاہ صاحب، ہم نے اتنا عرصہ ساتھ کام کیا ہے، یہاں روز بیان بدلے جاتے ہیں، پھر اس کی باتوں کی کس کو پروا ہوگی؟" شانے اچکا کر کہتی وہ پرس کی اسٹریپ کندھے پہ ڈال رہی تھی۔ جیبوں میں ہاتھ دیے کھڑے فارس کا مسلسل گم چباتا منہ رکا، اور اس نے آنکھیں تیکھی کر کے اے ایس پی کو دیکھا۔

"سنو، دوبارہ ہمیں یہاں نہ بلانا کیونکہ تمہارے اس کرائے کے غنڈے کی بک بک سن کر میرا دماغ گھوم جاتا ہے۔ اس کا بھائی تمہارے ساتھ کیا کرے گا، مجھے پروا نہیں لیکن اگلی دفعہ اس نے اپنے بھائی کی دھمکی میرے خاندان کے لیے دی تو یہ حوالات سے جیل کے آدھے رستے تک بھی نہیں پہنچ پائے گا۔" درشتی سے کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔ سرمد شاہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اس کے بھائی کا کیا ذکر؟"

"مجھے نہیں پتا، کسی علیم بیگ کے نام کی دھمکی

دے رہا تھا کہ وہ ہمیں 'اے ایس پی اور ڈاکٹر کو دیکھ لے گا وغیرہ وغیرہ۔ واٹ ایور!" وہ موبائل پہ کچھ ٹائپ کرتی باہر نکل گئی۔ سرمد شاہ پُرسوچ نظروں سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔



ہم کو جو ملا ہے ' وہ تم ہی سے تو ملا ہے
ہم اور بھلا دیں تمہیں ' کیا بات کرو ہو؟

اس رات جب آسمان سیاہی سے ڈھک گیا اور سڑکیں 'اسٹریٹ لائٹس سے روشن ہو گئیں تو ایک پرائیوٹ کلینک کے کمرے میں ڈاکٹر توقیر بخاری کے سامنے وہ دونوں بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر توقیر سرمئی قلموں اور تراشیدہ مونچھوں والے درمیانی عمر کے شخص تھے اور اس وقت عینک کے پیچھے آنکھیں سکیڑے وہ دعوت نامہ پڑھ رہے تھے جو زمر نے ان کو دیا تھا۔

"میموریل ڈنر اگلے ہفتے ہے۔ سعدی کے دوستوں نے ارینج کیا ہے۔ چونکہ آپ نے اس کی جان بچائی تھی 'تو میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنی پوری فیملی کے ساتھ آئیں 'اور ہمارے ساتھ کچھ وقت اسے یاد کرنے میں گزاریں۔" وہ نرمی اور امید سے کہہ رہی تھی۔ فارس خاموش بیٹھا ان کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

انہوں نے نگاہیں اٹھائیں 'اداسی سے مسکرائے۔

"ہم ضرور آئیں گے اور مجھے بہت افسوس ہے آپ کے بھتیجے کے لیے۔ کیا آپ لوگوں کی کسی سے دشمنی تھی؟" وہ دعوت نامہ لفافے میں ڈالتے 'سادگی سے پوچھ رہے تھے۔

زمر نے گود میں رکھی مٹھیاں سختی سے بھینچ لیں 'آنکھوں میں تپش سی اٹھی مگر پھر بظاہر یاسیت سے مسکراتے 'نفی میں سر ہلایا۔

"چند پیسوں کے لیے ایک شخص نے اسے مار کر لاش پھینک دی۔ ہم آج اسی سے ملنے گئے تھے 'اس نے اپنا بیان بھی تبدیل کر دیا۔ لوگ پیسوں کے لیے کس حد تک چلے جاتے ہیں۔ ہے نا ڈاکٹر صاحب؟"

"بالکل 'آئی ایگری!" وہ افسوس سے سر ہلا رہے تھے۔ "خدا کرے جو قاتل پکڑا گیا ہے 'وہ اپنے انجام کو پہنچے۔"

"خدا کرے سب اپنے انجام کو پہنچیں۔" وہ نظریں جھکائے دھیرے سے بولا تھا۔ ڈاکٹر توقیر کو کمرے میں ایک دم آکسیجن کی کمی محسوس ہونے لگی۔ زمر کو دیکھتے ہوئے بات کا رخ بدلا۔

"اے ایس پی صاحب کا مجھے فون آیا تھا 'وہ کہہ رہے تھے نیاز بیگ پولیس اور ہسپتال انتظامیہ کو مورد الزام ٹھہرا رہا ہے۔"

"پولیس؟" زمر نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

"پولیس نہیں 'صرف آپ کا ذکر کیا تھا۔"

"مسز زمر 'میرا یا ہسپتال کا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہے 'میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔" سینے پہ ہاتھ رکھ کر وہ فکرمندی سے کہہ رہے تھے۔

"آف کورس ہمیں پتا ہے 'بلکہ جب اے ایس پی صاحب نے کہا بھی کہ ہم ایف آئی آر میں کوئی اور نام درج کروانا چاہتے ہیں 'تو ہم نے۔" فارس کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔ "انکار کر دیا۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ نیاز بیگ جھوٹ بول رہا ہے۔"

"اے ایس پی نے آپ سے... میرا نام ایف آئی آر میں ڈالنے کا پوچھا؟" انہوں نے بروقت فقرہ پکڑا تھا۔

"نہیں 'انہوں نے صرف کسی اور کا نام پوچھا تھا۔ دیکھیں 'وہ ہمارے بہت اچھے دوست ہیں 'وہ صرف انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ہمیں ہمارے تمام حقوق دے رہے تھے 'خیر۔ آپ ڈنر پہ ضرور آیئے گا 'ہماری فیملی اور فرینڈز آپ کے اس جذبے کی بہت قدر کریں گے۔" وہ چائے کا آخری گھونٹ بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

فارس بھی اٹھا 'ڈاکٹر توقیر کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا 'جسے انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے تھاما۔ البتہ ان کے تاثرات میں اضطراب تھا۔ وہ الوداعی کلمات کہتے ہوئے خاصے پریشان تھے۔

اور اسی لمحے دروازہ کھلا۔ فارس کی اس طرف پشت

تھی مگر ایک مانوس سی آہٹ سنائی دی تھی۔ انگوٹھی کے نگینے سے دستک دینے کا انداز ہ ذمر مڑی۔

اندر آنے والی عورت ذرا بھرے چہرے اور بوٹے قد کی حامل تھی' بال کیچو میں بندھے تھے' دلکش شخصیت' بہترین لباس' کانوں میں ٹاپس۔ دونوں ٹاپس میں ایک' ایک موٹا سا Solitaire (سولی ٹائیر) ڈائمنڈ جڑا تھا۔ وہ جھلملاتے ٹاپس اتنے خوب صورت تھے کہ اس عورت کی شخصیت کو کئی گنا مزید نکھار گئے تھے۔

"یہ میری وائف ہیں' ڈاکٹر ایمن۔۔۔ یہ مسز زمر۔ اور۔"

فارس نے آہستہ سے گردن موڑی۔ ڈاکٹر توقیر کے الفاظ کنوئیں میں گونجتی آواز کی مانند دور دور تک سنائی دے رہے تھے' لمحوں میں ساری دنیا ساکن ہو گئی تھی' اور مسکراتی ہوئی ڈاکٹر ایمن قریب آرہی تھیں۔ اس نے اس عورت کے ہلتے لب دیکھے' وہ زمر سے کچھ کہہ رہی تھی' تعارف پھر تعریت بھرے الفاظ۔۔۔ آوازیں بند ہو چکی تھیں۔۔۔ پھر ڈاکٹر ایمن نے چہرہ اس کی طرف موڑا اس کی آنکھوں میں جھانکا' مسکرائی اور ہاتھ سے اس کے کندھے کو ہلکا سا تھپتھپایا۔ جیسے کسی پرانے مریض بچے سے عرصے بعد اس کا ڈاکٹر مل رہا ہو۔ اس کی انگوٹھی کے اندر کی طرف کوئی نوکیلی شے تھی جو فارس کے کندھے پہ چبھی تھی۔ اور وہ چبھن۔۔۔ بہت کچھ تازہ کر گئی۔۔۔ اس کے اردگرد کا منظر بدلا۔ کمرہ بدلا۔ کیلنڈر بدلا۔ ساڑھے تین سال قبل وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا اور ڈاکٹر ایمن چلتے ہوئے اس کے قریب آکھڑی ہوئی تھی۔

"میرے مریض میرے بچوں کی طرح ہیں۔" اس کے کندھے کو تھپکا۔ انگوٹھی چبھی تھی۔ فارس نے بےزاری سے سر جھٹکا۔

"نہ میں آپ کا مریض ہوں' نہ آپ کا بچہ۔ میرا نام فارس غازی ہے۔"

"اور میں ڈاکٹر ایمن بخاری ہوں۔" مسکرا کر نرمی سے کہتی وہ سامنے کرسی پہ جا بیٹھی۔

"مجھے کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت نہیں ہے'

ڈاکٹر ایمن اور مجھے پتا ہے۔ کورٹ مجھے کیوں ان سیشنز پہ مجبور کر رہی ہے۔ اگر آپ کو یہ غلط فہمی ہے کہ اس طرح میں ان جرائم کا اعتراف کر لوں گا' جو میں نے نہیں کیے تو آپ اپنے فیکٹس (اندازے) درست کر لیں۔" وہ ٹیک لگائے بیٹھا' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے خشک سا کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ زخموں کے نشان تھے اور ایک ہاتھ پہ پٹی بندھی تھی۔

"تمہارے خیال میں اس کا مقصد صرف Confession کن فیشن (اعتراف) کروانا ہے؟"

اونہوں!" نفی میں سر ہلایا۔ "Confession وہ واحد C ہے جس کا میرے اور تمہارے ریلیشن شپ سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہیں معلوم ہے' پنجاب پرزن کے چار C کون سے ہیں؟"

وہ کچھ نہیں بولا۔ چپ چاپ آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھتا رہا۔

"کسٹڈی۔۔۔" وہ نرمی سے کہنے لگیں۔ "کیئر۔۔۔ کنٹرول اور Correction (کریکشن)! ہم یہاں ان ہی کے لیے ہیں۔ میں تمہاری طرف کی کہانی سننا چاہتی ہوں' تاکہ تمہاری ذہنی حالت متوازن رہے۔" وہ نوٹ پیڈ سامنے رکھے قلم کھول رہی تھی۔ "تم جو بھی کہو گے' وہ ڈاکٹر پیشنٹ privilige (محرم راز) کے تحت محفوظ رہے گا۔"

"میں پنجاب پرزن کے چار C جانتا ہوں' کیا آپ Confidentiality کے پانچ C جانتی ہیں؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا پوچھ رہا تھا۔

"ہاں' وہ پانچ سی جن کے تحت پری وِلیج توڑا جا سکتا ہے۔

Consent court order comply with the law a threat treatment and communicate continued

(مریض کی اجازت' کورٹ کا حکم' قانون کی پاسداری کے لیے' مریض کے' علاج کے لیے ناگزیر ہونا' یا

مریض کی طرف سے دوسروں کو خطرہ ہونے کی صورت میں سدباب کے لیے۔ ان میں سے کسی وجہ کی بنا پہ سائیکالوجسٹ کسی کو اپنے مریض کی بات بتا سکتا ہے ورنہ نہیں۔)

"کیسے ہو فارس غازی!" انگوٹھی کی چبھن لوٹی اور اردگرد کا منظر پلٹا۔ ماضی تحلیل ہوا اور وہ حال میں ڈاکٹر ایمن کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ عادتاً" اس کا کندھا تھپک کر ہاتھ نیچے گرا چکی تھی۔ ایسی عادت عام طور پہ اس معاشرے کی خواتین ڈاکٹرز میں نہیں ہوتی مگر وہ عورت عام نہیں تھی۔

"آپ..." اس نے سوالیہ نظروں سے باری باری دونوں میاں بیوی کو دیکھا' آنکھوں میں الجھن ابھری۔

"میں ڈاکٹر توقیر کی بیوی ہوں۔"

"اوہ!" اس کے لب سکڑے۔

"آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟" زمر نے بظاہر خوشگوار حیرت سے فارس کو دیکھا' آنکھوں ہی آنکھوں میں گھورا بھی۔ (کتنا اداکار ہے یہ اور ہاشم کہتا تھا' اسے اداکاری نہیں آتی۔)

"یہ... ڈاکٹر ایمن ہیں... میری۔" فارس نے ڈاکٹر ایمن کو دیکھا' آواز ٹوٹ سی گئی۔

"میں فارس کی ڈاکٹر رہی ہوں اور اس کے بھائی کی بھی اور بدقسمتی سے مجھے اپنے پیشنٹ کے خلاف کورٹ میں گواہی دینی پڑی۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔

"اوہ۔ تم تو ان سے خفا ہو گے اس کے لیے۔" زمر کی آنکھوں میں فکرمندی ابھری۔

"ایسا نہیں ہے' ڈاکٹر ایمن نے میرا بہت ساتھ دیا ہے جیل کے وقت میں' ان دونوں میں ذہنی طور پہ متوازن نہیں تھا' اس لیے ان کو کورٹ کو میری ذہنی حالت کے بارے میں بتانا پڑا' انہوں نے جو کیا' اچھا کیا۔" وہ مدافعانہ انداز میں زمر کو کہنے لگا۔

"مسز غازی' فارس صحیح کہہ رہا ہے' اس وقت اس کے لیے یہ ضروری تھا۔" پھر نرمی سے اس کو دیکھا۔

"اب کیسے ہو تم؟"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے اسی نرمی سے جواب دیا۔ "کورٹ نے مجھے بری کر دیا' میں نے اپنے کیے کی سزا کاٹ لی' زمر نے مجھے معاف کر دیا' ہم نے شادی کر لی۔ I Moved on!" (میں نے نئے سرے سے زندگی شروع کی۔)

زمر کے تو سر پہ لگی تلووں پہ بجھی' مگر کچھ کرنے سے قاصر تھی۔

"مجھے بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر فارس!"

"مجھ سے زیادہ نہیں ہوئی ہو گی۔" وہ بظاہر مسکرایا۔ سینے میں کوئی زور سے اسے جکڑ رہا تھا' مگر وہ پرسکون نظر آ رہا تھا۔

"آپ کے ٹاپس بہت خوب صورت ہیں!" جاتے ہوئے زمر نے تعریف کی۔ ڈاکٹر ایمن مسکرائی۔

"توقیر نے لاسٹ منتھ اینی ورسری کا گفٹ دیا ہے۔ مرد عموماً" اپنی محبت کا اظہار ہیروں سے کیا کرتے ہیں۔ ہے نا' فارس؟" مسکرا کر فارس کو دیکھا' اس کی گردن میں گلٹی سی ابھری۔ مگر بولا کچھ نہیں۔ ڈاکٹر ایمن نے زمر کے ہاتھوں کو دیکھا۔

"آپ کی تو ابھی شادی ہوئی ہے' مگر آپ نے کوئی ڈائمنڈ نہیں پہنا ہوا۔"

کمرے میں لمحے بھر کو خاموشی چھائی۔

"مجھے چمکتے پتھروں میں کوئی کشش نظر نہیں آتی!" بس مسکرا کر اتنا کہہ پائی۔



"زمر نے مجھے معاف کر دیا' ہم نے شادی کر لی' واؤ!" باہر کار کی طرف جاتے وہ استہزائیہ انداز میں دہرا رہی تھی۔

"مجھے اس کو یقین دلانا تھا کہ میں موو آن کر چکا ہوں۔" وہ چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ زمر گھوم کر اس کے سامنے آئی اور تیز نظروں سے اسے گھورا۔ وہ رک گیا۔

"تم نے اسی لیے مجھ سے شادی کی ہے نا؟ تاکہ تم ساری دنیا کو یقین دلا دو کہ تم موو آن کر چکے ہو؟ نئی

زندگی شروع کر چکے ہو' کون بے چارے فارس غازی پہ شک کرے گا اب؟" وہ دونوں پارکنگ لاٹ میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"آپ سے شادی کرنے کے لیے میرے پاس تین وجوہات تھیں۔ پہلی آپ کے والد کے احسان ہیں مجھ پر' ان کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری' میں شادی کر کے واقعی سب کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں آگے بڑھ چکا ہوں۔"

"اور تیسری؟" فارس کی نظریں اس کی خفا آنکھوں سے ہوتی' نتھ پہ پھسلیں۔ وہ رخ موڑ گیا۔

"میں آپ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں کیونکہ اس شادی کے معاملات آپ نے شروع کیے تھے میں نے نہیں!" اور ایک طرف سے نکل کر کار کی طرف بڑھ گیا۔

اندر کلینک میں ڈاکٹر توقیر کمرے کا دروازہ بند کر کے ناراضی سے ڈاکٹر ایمن کی طرف گھومے۔

"تمہیں بتایا تھا میں نے کہ وہ آ رہے ہیں' پھر یہاں اس وقت آنے کی کیا ضرورت تھی؟" ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے' وہ ماتھے کا پسینہ صاف کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ایمن سامنے کرسی پہ بیٹھی۔ لاپروائی سے ناک سے مکھی اڑائی۔

"اس کو آج نہیں تو کل پتا چلنا ہی تھا کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔"

"وہ چار سال جیل میں رہا ہے' تم نے اس کی ضمانت نہیں ہونے دی' وہ تھوڑی دیر میں دو جمع دو کرلے گا' پھر کیا وہ یہ نہیں سوچے گا کہ اتفاق سے تمہارے ہی شوہر نے اس کے بھانجے کا آپریشن کیوں کیا ہے؟"

"ریلیکس! میں اس کو جانتی ہوں' اس کا چہرہ پڑھ سکتی ہوں' میں اپنے کام میں بہت ماہر ہوں' مجھے اندازہ تھا کہ کبھی نہ کبھی وہ جیل سے ضرور نکلے گا' یا بھاگے گا' اس لیے میں نے اس کا ایسے برین واش کیا تھا کہ وہ میرے خلوص پہ کبھی شک نہیں کرے گا۔ نہ آج' نہ کل۔ چار سال جیل میں رہا ہے' اب کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو اسے دوبارہ جیل بھجوائے۔" گریبان میں اڑسے سن گلاسز اتار کر ان کو وہ اب بیگ میں ڈال رہی تھی۔

"ایمن۔۔۔ ایمن!" وہ متفکر اور پریشان سے ان کے سامنے آ بیٹھے۔ "ہم نے ان کا بھانجا غائب کروایا ہے اور وہ جعلی وارڈ بوائے ہمارا نام لے رہا ہے' کھلم کھلا۔"

"ڈونٹ وری! سرمد شاہ اسے سنبھال لے گا۔ یہی وقت ہے' جب ہم اس سے مزید ڈیمانڈز منوا سکتے ہیں' ورنہ ہم کسی بھی وقت کہہ سکتے ہیں کہ پولیس نے ہمیں مجبور کیا یہ سب کرنے کے لیے۔" اس نے کندھے اچکائے۔

ڈاکٹر توقیر نے سر جھٹکا' آستین سے پیشانی کا پسینہ صاف کیا۔

"وہ کسی کا بیٹا تھا' ہمارے بھی تین بچے ہیں ہم نے اس کی زندگی داؤ پہ لگادی۔"

"تمہیں ان ہزاروں لوگوں کی زندگیوں کے بارے میں سوچنا چاہیے توقیر جنہیں ہم اپنے اسپتال سے بچائیں گے' صرف دو ماہ رہتے ہیں اس ہسپتال کی اوپننگ میں جس کے لیے میں نے اور تم نے پچھلے کئی سال کام کیا ہے۔ سرمد شاہ نے فارس کے خلاف گواہی دینے کے لیے کیا دیا تھا ہمیں؟ صرف پلاٹ کا قبضہ۔ اس کے اوپر ہر چیز ہم نے خود لگائی ہے۔ اس لیے تم سرمد شاہ سے بات کرو اور اس سے کہو' ہماری ڈیمانڈز پوری کرے!"

وہ دونوں گفتگو کر رہے تھے اور باہر رات قطرہ قطرہ پگھلتی جا رہی تھی' سب کے گناہوں کو چھپائے' سب پر پردے ڈالے!



جب عشق تجھے راس نہیں ہے تو مرے دل
ہونا تھا یہی حال ترا بار دگر بھی

یہ تین دن بعد کا ذکر ہے۔

رات کی تاریکی اس زیر تعمیر گھر پہ بھی چھائی تھی۔ پورچ میں خون کا تالاب بہہ رہا تھا' اس پہ وہ

گھنگھریالے بالوں والا لڑکا اوندھا گرا تھا اور نوشیرواں جا بجا جوتوں سے اسے ٹھوکریں مار رہا تھا۔ پھر تھک کر وہ رکا۔ ایک استہزائیہ نظر اس بے سدھ وجود پر ڈالی اور جانے کے لیے مڑا۔ اسی پل وہ اوندھا لڑکا سیدھا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ خون سے اور آنکھیں نفرت سے سرخ تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے نوشیرواں کو بالوں سے پکڑا اور زور سے اس کا سر دیوار سے دے مارا۔ وہ درد سے چیخا۔۔۔ اور۔۔۔

ایک جھٹکے سے وہ اٹھ بیٹھا۔ کمرہ خاموش پڑا تھا، اے سی کی ٹھنڈک کے باوجود نوشیرواں کا پورا جسم پسینے میں بھیگا تھا، دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، بتی جلائی، پانی کی بوتل لرزتے ہاتھوں سے لبوں سے لگائی، پانی کچھ اندر انڈیلا، کچھ بیڈ پہ چھلکا۔ چند گھونٹ بھر کر وہ گہرے سانس لیتا ٹیک لگا کر بیٹھا۔ (بھول جاؤ اس کو شیرو، یہ صرف ایک خواب تھا۔ سعدی کبھی واپس نہیں آئے گا۔) آنکھیں بند کیے وہ خود کو تسلی دے رہا تھا۔ یہ پہلی دفعہ تھا جب ان ڈھائی ماہ میں اس نے سعدی کو خواب میں دیکھا تھا۔ ڈھائی ماہ ہو گئے سعدی کو کھوئے؟ اس نے موبائل اٹھا کر تاریخ دیکھی۔ اگست کا وسط آ پہنچا تھا اور وہ ابھی تک اکیس مئی والے واقعے کو بھول نہیں پایا تھا۔ اف۔۔۔

نوشیرواں کے کمرے کے باہر سبزہ زار تاریک پڑا تھا۔ انیکسی کی بھی ایک دو کے سوا تمام بتیاں بجھی تھیں۔ اندر جھانکا تو لاؤنج نیم تاریک تھا۔ ایسے میں زمر تہہ خانے کی سیڑھیاں اترتی دکھائی دے رہی تھی۔

نیچے آ کر وہ رکی۔ ایک طائرانہ نگاہ کھلے تہہ خانے میں ڈالی۔ اس کی بتیاں جلی ہوئی تھیں۔ فرش پہ کچھ کاغذ بکھرے تھے، ان پہ ریاضی کے نمبرز اور پتا نہیں کیا کیا لکھا تھا۔ دو لیپ ٹاپ کھلے تھے اور حنین فرش پہ بیٹھی، ملگجے لباس اور گول مول بال باندھے، بے قراری سے ٹائپ کیے جا رہی تھی۔

"حنہ۔۔۔ تم سوئی کیوں نہیں ہو؟" وہ فکر مندی سے کہتی قریب آئی۔ حنین ٹھک ٹھک ٹائپ کر رہی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے اس کی یہی حالت تھی۔ کھانا، سونا، سب چھوڑ کر وہ دن رات یہیں بیٹھی اس یو ایس بی کو کھولنے کی کوشش کرتی رہتی۔

"پھپھو! بھائی غلط تھا، فائلز کرپٹ نہیں ہوئیں۔ بلکہ ہوئی تھیں، مگر میں نے ری کور کر لیں۔ مجھے لگا یہ اسٹینڈرڈ 4096 Bit RSA Encryption ہو گی مگر یہ algorithm جس نے بھی فیکٹر کیا ہے، یہ مختلف ہے۔" وہ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

"حنین!" وہ اس کے سامنے دو زانو بیٹھی۔

"مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہا اس میں مختلف کیا ہے، یہ آر ایس اے لگتا ہے assymteric ہے اس کی دو کیز ہونی چاہئیں ایک پبلک اور ایک پرائیویٹ مگر۔۔۔"

زمر نے فلیش لیپ ٹاپ سے کھینچ لی۔ وہ جو ہوش و حواس کھوئے ہوئے انداز میں بولے جا رہی تھی، ہکا بکا ہوئی۔ زمر نے فلیش کا کور چڑھا کر اسے پرے ڈالا پھر نرمی سے حنہ کو دیکھا۔

"یہ فلیش، اس کی فائلز، مجھے کچھ نہیں چاہیے، کچھ بھی اہم نہیں ہے حنہ! تم سے زیادہ نہیں۔" حنین ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگی۔

"تم نے کہا تھا اگر سعدی کی جگہ تم کھو جاؤ تو میں کیا کروں گی؟ حنہ! تمہیں واقعی لگتا ہے کہ تم کھوئی نہیں ہو؟"

حنین کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے، آنکھوں میں پانی آ گیا۔

"میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میں ایک Failure (ناکام انسان) ہوں!"

"میں جس حنین کو جانتی ہوں وہ ایک سپر گرل تھی، جس نے شیرو کے اغوا کا پول کھولا تھا، مجھے آج بھابھی نے وہ قصہ سنایا۔"

"میں بدل گئی ہوں!" آنسو اس کے گال پہ لڑھکے۔ زمر آزردگی سے مسکرائی۔

"جس دنیا سے میں تعلق رکھتی ہوں، اس میں

انسان نہیں بدلتے۔ بدل سکتے ہیں لیکن وہ نہیں بدلتے۔ صرف اپنے نقاب بدلتے ہیں، سو تم واقعی کچھ بھی نہیں کر سکتیں، تم اگر خود سے بھاگتی رہو گی۔"

"میرے اندر بہت سارا شر ہے۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"تم اس کو نہیں بدل سکتیں۔ سو اس کو اپنی طاقت کیوں نہیں بنا لیتیں؟" ذرا دیر کو ٹھہری۔ گردن پھیر کر اس مقفل اسٹور روم کو دیکھا۔ پھر سر جھٹکا۔ "مجھے دیکھو، میں بے جا ضدی اور ہٹ دھرم ہوں، جب اپنی فطرت نہیں بدل سکی تو یہ احساس ہوا کہ اگر میں ایسی نہ ہوتی تو پراسیکیوشن کی سیاسی کرسی پہ دو دن بھی نہ بیٹھ سکتی، سعدی کے مجرموں کے آگے گھٹنے ٹیک کر ان کو معاف کر چکی ہوتی، مگر اب ... میری وہی بری چیزیں میرے کام آ رہی ہیں۔ تم بھی یہ کر سکتی ہو، مگر اس کے لیے تمہیں اس کیڑے کو باہر نکالنا ہو گا جو تمہیں اندر سے کھا رہا ہے۔"

تہہ خانے میں چند لمحے کی خاموشی چھا گئی۔ پھر حنہ نے نگاہیں جھکا لیں۔ وہ دونوں آمنے سامنے فرش پہ بیٹھی تھیں۔

"آپ مجھ سے نفرت کریں گی!"

"زمرّ! ی!" ذرا توقف کیا۔ جیسے کوئی راہ نکالی۔

"آج ہم ایک دوسرے سے باری باری سچ بولتے ہیں۔ پہلے میں بولوں گی!"

حنہ نے اثبات میں سر ہلایا، پھر خود ہی بولی۔ "مجھے پتا ہے، آپ بھائی کی فیس دیتی تھیں، مجھے ماموں نے بتایا تھا، اس رات جب امی سے لڑائی کے بعد آپ جنگل میں چلی گئی تھیں۔" نگاہیں جھکا لیں۔

"آئی ایم سوری۔" زمر نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم یہاں سوری اور تھینک یوز کے لیے نہیں بیٹھے۔ سچ بولنے بیٹھے ہیں۔" (ماموں کی طبیعت تو میں بعد میں صاف کروں گی!) اس کے سامنے، فرش پہ بیٹھی، وہ لٹ انگلی پہ لپیٹے کہہ رہی تھی۔

"میرا سچ یہ ہے کہ میں نے فارس کے رشتے سے انکار نہیں کیا تھا، امی نے کیا تھا۔ مجھے اس رشتے کی خبر اس دن تمہارے منہ سے ہوئی، اور مجھے لگا فارس نے مجھ پہ "گولی انتقاما" چلائی تھی۔" زمر نے آنکھیں بند کیں۔ تکلیف پھر سے عود آئی تھی۔ "اسی لیے میں نے اس سے شادی کی، اس سے انتقام کے لیے مگر میں اس کو کوئی مادی نقصان نہیں پہنچا سکی کیونکہ میں نے سعدی سے وعدہ کیا تھا کہ اسے ہرٹ نہیں کروں گی۔" آنکھیں کھولیں۔ اداسی سے مسکرائی۔ حنہ بالکل شل اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے شک تھا، مگر اس نے اتنا سب کچھ نہیں سوچا تھا۔

"اب تمہاری باری!"

حنین نے نگاہیں جھکا لیں۔ "میں ہاشم سے بات کرتی ہوں، ٹیکسٹ پہ، کال پہ۔ میں ان کی محبت میں مبتلا ہو چکی ہوں اور یہ دن بدن جان لیوا ہوتی جا رہی ہے۔" بہت دیر بعد نظریں اٹھائیں تو زمر اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ نہ کوئی ملامت، نہ حیرت۔

"تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو یا تم یہ تعلق ختم کرنا چاہتی ہو؟"

"میں اسے ختم کر دوں گی، مجھے پتا ہے ہم کبھی شادی نہیں کر سکتے۔ انہوں نے مجھ سے اس فلیش کے بارے میں جھوٹ بولا، تب سے میں نے ان سے بات نہیں کی۔ میں بہت ڈسٹرب ہوں۔" آنسو ابل ابل کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ زمر نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"تمہیں اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ مگر تم جو بھی فیصلہ کرو گی، میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔" اس نے نرمی سے حنہ کا ہاتھ دبایا۔ کوئی غصہ، کوئی ڈانٹ، کچھ بھی نہیں۔

حنہ آنسوؤں کے درمیان مسکرائی۔ "آپ کی باری!"

"ویل ..." زمر نے گہری سانس لی اور سر جھکایا۔ فرش پہ انگلی سے لکیر کھینچی۔ "مجھے سعدی کے لیپ ٹاپ سے جو پکچرز ملیں، وہ میں نے فارس کو نہیں دکھائیں، وہ پکچرز فارس نہیں لے سکتا۔ ایسی پکچرز Trophy Collector لیتے ہیں۔

وہ قاتل جو اپنے شکار سے وابستہ کوئی شے اپنے پاس رکھتے ہیں۔) اس لیے میں ان کی تحقیق کروا رہی ہوں مگر حنین! میں بہت ڈسٹرب ہوں۔ اتنے سالوں بعد اگر وہ بے گناہ نکل آیا۔۔۔ تو مجھے یہ چیز مار ڈالے گی۔" اس کی آنکھوں میں کرب اترا۔ "پتا ہے کیا! میرا ایک حصہ چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ نہ نکلے۔ مگر دوسرا حصہ سچ جاننا چاہتا ہے۔"

چند گہرے سانس لے کر اس نے خود کو نارمل کیا' پھر حنہ کی طرف دیکھا۔ "تمہاری باری!"

حنین فارس کے حق میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر رک گئی۔ وہ جج کرنے کا وقت نہیں تھا۔ پھر اس نے ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی۔

"میں نے کسی کی جان لی ہے۔"

پھر زمر کے تاثرات دیکھے۔ وہ متوجہ تھی۔ "میں سن رہی ہوں۔"

"میرے بورڈ کے او سی پی میری فرینڈ کے ابو تھے۔۔" وہ کہتی گئی' ساری تفصیل' ساری باتیں سناتی گئی۔

"اور جب میں ان کو بلیک میل کر رہی تھی تو پھپھو میں اپنی لٹ انگلی پہ لپیٹ رہی تھی' شاید میں زمر بننے کی کوشش کر رہی تھی مگر میں غلط تھی۔ آپ بہت سے لوگوں کو بلیک میل کر سکتی ہیں مگر چیٹنگ جیسے کام کے لیے۔" پہلے دن سے لے کر ان کی موت تک اس نے سارا واقعہ سر جھکائے کہہ سنایا۔ وہ ٹوٹی بکھری نظر آ رہی تھی۔ بار بار آنسو پونچھتی۔ پھر نگاہیں دھیرے دھیرے اٹھائیں۔ اب زمر اسے کیا کہے گی؟

"تم ایسی شرمناک حرکت کیسے کر سکتی ہو حنہ؟" وہ یوں چلائے گی؟

یا وہ نرمی سے کہے گی۔ "تم نے معافی مانگ لی' توبہ کرلی' جو ہوا ہے اسے بھول جاؤ۔"

مگر زمر کچھ نہیں بولی۔ حنین کی آنکھوں میں بے قراری ابھری۔

"پلیز کچھ تو کہیں۔ کیا سوچ رہی ہیں آپ؟" آنسو پھر سے چپکنے لگے۔

"تمہیں سن کر افسوس ہو گا۔"

"نہیں' میں سن لوں گی' آپ کہیں' جو بھی آپ کے دل میں ہے۔" گیلے چہرے کے ساتھ وہ بولی۔ وہ واقعی تیار تھی۔

"حنہ! میں یہ سوچ رہی ہوں کہ تمہاری کہانی بہت کمزور ہے۔"

"جی؟" حنہ کا ہکا بکا منہ کھل گیا۔ آنسو رک گئے۔

"یا تو تم مجھے پوری بات نہیں بتا رہی ہو' یا پھر تمہاری کہانی میں بہت سے جھول ہیں۔"

"میں۔۔۔ میں سب سچ بتا رہی ہوں' آئی سویئر!" وہ حیران تھی۔

"مجھے پتا ہے تم سچ کہہ رہی ہو مگر مجھے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی ہے کہ ایک او سی پی' جو اتنے سال سے اس پوسٹ پہ تھے' انہوں نے تمہارے چند فقرے سن کر گھٹنے کیسے ٹیک دیے؟"

"کیونکہ میں نے بتایا نا' میری ویڈیو والی دھمکی سے ان کی فیملی۔۔۔"

"حنین! ساری دھمکیاں فیملی سے ہی شروع ہوتی ہیں۔ او سی پی صاحب کو اتنے برسوں میں کیا کبھی کسی نے دھمکایا نہیں ہو گا؟ یا پیسوں کا لالچ نہیں دیا ہو گا؟ ایسی پوسٹ پہ موجود لوگ بہت ٹرینڈ اور تجربہ کار ہوتے ہیں' ان کو بلیک میلر کو ٹیکل کرنا اچھے سے آتا ہے اور تمہارے بقول وہ بہت ایمان دار بھی تھے' تو انہوں نے اتنی آسانی سے تمہیں پیپرز کیسے دے دیے؟ ایک ادھیڑ عمر کا سرکاری آفیسر' ایک اٹھارہ سالہ بچی کے آگے چند منٹ میں ڈھیر کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بھائی نے بھی یہی کہا تھا مگر بھائی کا کہنا تھا کہ وہ بزدل تھے' ان کو اللہ پہ بھروسا کرنا چاہیے تھا اور۔۔۔" وہ الجھن سے کہہ رہی تھی۔ زمر نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"سعدی کو تو رہنے دو۔ وہ تو آئیڈیلسٹ ہے' مگر میں پریکٹیکل ہوں اور میرا نہیں خیال کہ تمہیں خود بھی پورا قصہ معلوم ہے۔" وہ نرمی اور افسوس سے کہہ رہی تھی۔ اور حنین حیران پریشان بیٹھی تھی۔ اس کو

ملامت کی امید تھی یا ڈھارس بندھانے کی مگر... زمر اتنی پریکٹیکل کیوں تھی؟ وہ پہلے سے زیادہ ڈسٹرب ہو گئی تھی۔

"حنین! شاید تمہیں پورا قصہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس بات پہ سوچنا۔ اب سو جاؤ' ہم صبح بات کریں گے۔"

وہ مسکرا کر کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ حنہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ وہ سیڑھیوں تک گئی تھی جب حنین نے پکارا۔

"آپ کو مجھ پہ ذرا بھی غصہ نہیں آیا' ہاشم والی بات سن کر؟" زمر مڑی تو دیکھا' حنین پشیمان نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ زمر نرمی سے مسکرائی۔

"اس میں غصے والی کیا بات ہے؟ اب سو جاؤ۔" اور زینے چڑھتی گئی۔ اوپر آ کر لاؤنج کا دروازہ بند کیا تو چہرے کے تاثرات بدلے۔ جبراً" پرسکون' نارمل رکھا چہرہ غم و غصے میں ڈھلتا گیا۔

"اس گھٹیا آدمی کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ حنین کو یوں ایکسپلائٹ کرے؟ اس نے اپنی عمر نہیں دیکھی؟" وہ غصے سے کھولتی لاؤنج میں ٹہل رہی تھی۔

"اگر فارس کو پتا چلا تو ہاشم کی جان لے لے گا۔ حنین تو کم عمر ہے' نا سمجھ ہے مگر ہاشم' وہ اس کی فیلنگز کے ساتھ کیوں کھیل رہا ہے؟ تمہیں تو میں اچھا سبق سکھاؤں گی ہاشم!"

وہ جو سوچ رہی تھی' اس کے چہرے پہ حرف بہ حرف اترتا جا رہا تھا۔ فارس اوپر سے سیڑھیاں اترتا آیا تو ایک نظر اسے دیکھا جو غصے سے کھولتی ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ پھر کچن میں گیا۔ پانی کی بوتل فریج سے نکالی اور واپس آیا' اس کے قریب رکا۔

"کیا ہوا ہے؟"

اس نے خفگی سے فارس کو دیکھا۔ "مجھ سے بات مت کرو۔ مجھے غصہ آ رہا ہے۔"

"آپ کو چوبیس میں سے پچیس گھنٹے غصہ آیا رہتا ہے' پانی پئیں اور چند منٹ کے لیے کنٹرولڈ' ٹھنڈے اور شائستہ مزاج کی ہو جائیں۔"

بوتل سامنے رکھی اور اوپر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ زمر نے تلملا کر اسے جاتے دیکھا۔ (یہ مجھے میرے الفاظ لوٹا رہا تھا؟ ہاں' بہت بولنا نہیں آ گیا اس کو میرے آگے؟)

اور ساتھ والے قصر میں' نوشیرواں' بیڈ پہ بیٹھا' سفید سا پاؤڈر (آنکھیں بند کیے) ناک سے سانس کی صورت اندر اتار رہا تھا۔ سیاہ رات ایک دفعہ پھر سب کے گناہ اور سب کے راز چھپائے' تاریک ہوتی جا رہی تھی۔



متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

ملیالے رنگ کی دیواروں والا کمرہ خاموش تھا۔ سعدی بیڈ پہ ٹیک لگا کر لیٹا تھا۔ دفعتاً" دروازے کا لاک کھلنے کی آواز آئی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور دروازے کی اوٹ میں آ کھڑا ہوا۔ چال میں لڑکھڑاہٹ اب بہت کم تھی۔

دروازہ کھلا اور ڈاکٹر مایا اندر داخل ہوئی۔ خالی کمرہ دیکھ کر وہ رکی' گارڈ سے کچھ کہا تو گارڈ تیزی سے اندر آیا۔ اسی پل سعدی اوٹ سے نکلا' اور گارڈ پہ جھپٹا۔ گارڈ تیار نہیں تھا' قدرے لڑکھڑایا۔ باہر سے دو مزید گارڈ اس طرف لپکے اور کھینچ کر سعدی کو اس گارڈ سے علیحدہ کیا اور بیڈ پہ پٹخا۔

"آہ!" اس کے کسی زخم پہ کسی کا ہاتھ پڑا تھا۔ دہرا ہو کر بیڈ پہ گرا' وہ کراہا تھا۔ گارڈ غصے میں بول رہے تھے مگر ڈاکٹر مایا تیزی سے آگے آئی۔ "اس کو باندھنے کی ضرورت نہیں ہے' ٹھیک ہے' میں سنبھال لوں گی' تم لوگ جاؤ۔" ان کو اشارہ کیا تو وہ قدرے پس و پیش کے بعد باہر چلے گئے۔ سعدی اب سیدھا ہو کر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ درد سے آنکھیں بار بار میچتا۔ وہ اسٹول کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھی۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" وہ جواب دیے بنا سیدھا ہوا اور ٹیک لگا کر بیٹھا۔ پاؤں اوپر کیے۔

"اس جگہ یہ واحد گارڈز نہیں ہیں، یہاں قدم قدم پہ پہرے ہیں، تم اس طرح یہاں سے نہیں بھاگ سکتے۔" آواز آہستہ کی۔

سعدی نے اس کو دیکھا۔ پھر عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

"میرے زخم ٹھیک ہو گئے ہیں، اب تو کوئی نرس بھی کافی ہے، تو تم کیوں ہر روز آجاتی ہو؟"

"کیوں کہ میں..." اس نے بے بسی سے بند دروازے کو دیکھا، آواز مزید دھیمی کی۔ "مجھے تمہاری فکر ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔"

اچھا واقعی؟ "کیسی مدد؟"

"یہاں سے نکلنے میں۔" وہ بے بس نظر آرہی تھی۔

"ڈاکٹر مایا!" اس نے چبھتی ہوئی نظریں مایا پہ گاڑیں۔ "کیا میری شکل سے یہ لگتا ہے کہ میں کل پیدا ہوا تھا؟"

"کیا مطلب؟" وہ الجھی، سعدی اس کو گھورتا چبا چبا کر بولا۔

"اپنی اداکاری مجھ پہ ضائع مت کرو۔ میں بچہ نہیں ہوں۔ سب سمجھتا ہوں۔ تم میرے ساتھ گڈ کاپ کھیل رہی ہو۔ ہاشم میری ذہنی کیفیت اور ارادوں سے باخبر رہنا چاہتا ہے، اس لیے اس نے تم سے کہا کہ ہمدردی کی آڑ میں تم میرا اعتماد جیتو اور میرے فرار کے ہر طریقے کی مخبری کر کے اسے ناکام بناؤ، اس حد تک کہ میں اس قید کی زندگی سے کمپرومائز کرلوں اور نکلنے کا ارادہ ترک کردوں۔" اور چہرہ پھیر لیا۔

مایا کے حیرت زدہ چہرے پہ دکھ کے تاثرات ابھرے۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"تمہیں اپنے ہمدردوں اور دشمنوں میں فرق کرنا ہی نہیں آتا تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ مجھ پہ الزام لگانے سے پہلے تمہیں خدا کا خوف کرنا چاہیے تھا۔ میں ایک غریب آدمی کی مجبور بیٹی ہوں، مگر تم اپنی غلطیوں سے نکلو گے تو تمہاری آنکھیں کھلیں گی۔"

پھر ملامت بھری نگاہ اس پہ ڈالتی اٹھی۔ اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

باہر آکر مایا نے کچن کی طرف جاتے ہوئے ٹشو باکس سے دو ٹشو نکالے، آنکھیں رگڑیں اور ساتھ ہی کچن میں دیوار پہ لگے فون کا ریسیور اٹھایا۔

"ہاشم کاردار کو ملا دو۔" آپریٹر کو ہدایت دی۔ چند لمحے بعد ہاشم کی آواز ابھری تو وہ تیزی سے بولی۔

"سر! اسے شک ہو گیا ہے کہ آپ نے مجھے کس کام کے لیے رکھا ہے۔"

دوسری طرف بمشکل ہاشم نے ضبط کیا۔ "ایک کام کہا تھا میں نے تم سے کہ اس کو اٹریکٹ کرنے کی کوشش کرو، اتنا کہ وہ تمہیں اپنا بہترین ساتھی سمجھنے لگے مگر نہیں۔ تم سے یہ ایک کام بھی نہ ہو سکا۔"

"سر! میں کوشش کر رہی ہوں۔ مگر وہ مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ میری بھی ہر وقت روک ٹوک کرتی ہے۔ آپ میری انچیو کو میری جاب بتا کر اسے سمجھا دیں کہ ایسا نہ کیا کرے۔" وہ اکتا کر کہہ رہی تھی۔

راہداری میں کھڑی میری نے رک کر ساری بات سنی اور پھر تیزی سے سعدی کے کمرے میں آئی۔ گارڈ نے دروازہ کھولا تو اس نے دیکھا، وہ بستر پہ نیم دراز ہے۔ میری نے دروازہ بند کرتے ہوئے اسے غصے سے گھورا۔

"کیا کہا ہے تم نے مایا سے؟" سعدی نے نظریں اٹھائیں۔

"وہی جو تم نے مجھے بتایا تھا میری!"

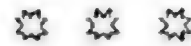
"میں نے؟" وہ حیران ہوئی۔

"ہاں۔" وہ پرسکون سا کہہ رہا تھا۔ "تم ہمیشہ کہتی تھیں، مایا اچھی ہے، مایا اچھی ہے، مگر تم نے یہ نہیں کہا کہ وہ اچھی لڑکی ہے یا اچھی ڈاکٹر ہے، یونو، تمہارے تھپڑ کے بعد میں یہ جان گیا تھا کہ تمہارا مطلب ہے، مایا اچھی Cop ہے۔ یونو گڈ کاپ۔ بیڈ کاپ، اس تھپڑ سے تم نے میری توجہ حاصل کی، تھینک یو اس ٹپ کے لیے۔" مسکرا کر سر کو خم دیا۔

میری کا رنگ ذرا بدلا، بے اختیار بند دروازے کو دیکھا، پھر جی کڑا کر بولی۔ "پتا نہیں کیا بولے جا رہے ہو،"

میں نے تمہیں کوئی ٹپ نہیں دی' خود سے باتیں مت فرض کیا کرو۔" غصے سے اسے ڈانٹ کر وہ واپس جانے کو مڑی۔ "اور گارڈ یہ آئندہ حملہ مت کرنا' اس طرح تم بھاگ نہیں سکتے!"

اس کے جانے کے بعد سعدی نے سر جھٹکا۔ "کس نے کہا کہ میں بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا؟" اور اپنے نیچے سے وہ سگریٹ لائٹر نکالا جو اس نے گارڈ کی جیب سے نکالا تھا۔ "گڈ جاب سعدی!" اسے دیکھتے ہوئے وہ مسکرایا۔



اسے کھو کر اسے پھر پانے کا شوق دل میں یوں ہے محسن
کہ جیسے پانی پہ دائرہ سا کوئی بنائے تو کچھ نہ پائے

جب ہاشم نے فون رکھا تو وہ ایک ہوٹل میں چند افراد کے ساتھ بوفے ٹیبل کے پاس کھڑا تھا۔ بات ختم کر کے وہ ان کے قریب واپس آیا اور سلاد کھاتے ہوئے گفتگو کو وہیں سے جوڑنے لگا جہاں سے مایا کی کال نے توڑا تھا۔

قریباً" تین گھنٹے بعد جب وہ اپنے گھر میں داخل ہو رہا تھا' تو اس کے سینے میں عجیب سی جلکڑن ہو رہی تھی۔ یہ یقیناً" سلاد تھا جس کی کوئی باسی یا خراب شے اسے لگ گئی تھی۔ ایک لمحے کو اسے لگا' وہ گرنے لگا ہے' پھر دیوار کا سہارا لیا۔ سامنے فینو نا کا حیران اور پریشان چہرہ نظر آیا' سب سلو موشن میں ہو رہا تھا۔ آوازیں بند تھیں۔ نوکر بھاگ کر اس کی طرف آ رہے تھے۔ وہ سہارے کے لیے بڑھے ہاتھ جھٹکتا' لڑکھڑاتا ہوا کمرے تک آیا۔ کوٹ اس نے کہاں گرایا' جوتا کدھر اتارا' کچھ خبر نہیں۔ باتھ روم تک بمشکل پہنچا' واش بیسن پہ ہاتھ رکھے جھکا۔ بے حد تکلیف دہ سی قے آئی۔ پھر پانی منہ پہ پھینکا۔ چہرہ اٹھا کر آئینے میں دیکھا تو رنگ بکھرا ہوا' اور آنکھیں نڈھال لگتی تھیں۔ آگے اسے ٹھیک سے یاد نہیں۔ کب بیڈ پہ لیٹا۔ کب اس نے جواہرات اور ڈاکٹر کو اپنے سر پہ کھڑے بات کرتے سنا (ذرا سی فوڈ پوائزننگ ہے میم' صبح تک بالکل ٹھیک ہوں گے کاردار صاحب!) کب کمرے میں اندھیرا چھایا۔ کب روشنی ہوئی۔ وہ سوتی جاگتی کیفیت میں بستر پہ نڈھال لیٹا رہا۔

متلی کی سی کیفیت سے اس کی آنکھ کھلی۔۔۔ چھت گھومتی دکھائی دے رہی تھی۔ کہنی کے بل ذرا سیدھا ہوا۔ کرسی پہ ایک فلپائنی ملازمہ بیٹھی تھی۔ اسے جاگتے دیکھ کر سیدھی ہوئی۔ ہاشم نے ذرا ناگواری سے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ نہیں گئی تو بدقت مگر سختی سے بولا۔ "میں ٹھیک ہوں۔ جاؤ!" وہ متذبذب سی باہر نکل گئی۔

مگر وہ ٹھیک نہیں تھا۔ بمشکل اٹھ پایا اور بے جان قدموں سے چلتا باتھ روم تک آیا۔ واش بیسن پہ جھکا۔ اسے بہت زور کی قے آئی تھی مگر ایسا لگتا تھا جیسے اندر تک سب کچھ صاف ہو گیا ہو۔ بدقت منہ پہ پانی ڈالا۔ شرٹ اور کف بھیگ گئے۔ دیوار کو پکڑ پکڑ کر چلتا باہر نکلا۔ بیڈ کے بجائے کاؤچ تک آیا اور نڈھال سا اس پہ لیٹ گیا۔ کروٹ کے بل' نیم مردہ سا۔ اسے شدید سردی لگ رہی تھی۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ اے سی یا پنکھا بند کرپاتا۔ کروٹ کے بل لیٹے لیٹے اس کی آنکھیں کھڑکی پہ جمی تھیں۔ پلک جھپکتا' تو منظر صاف ہوتا' دوبارہ جھپکتا تو ہر طرف بادل ہوتے' کبھی کھڑکی بڑی ہو کر دکھائی دینے لگتی' کبھی پردوں کے ہلنے کی آواز سمندروں کی لہروں کے شور جتنی بلند ہو جاتی۔

ہر شے' ہر آواز کئی گنا بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ شکلیں' ہیولے' بادل' سب آنکھوں کے آگے ناچ رہے تھے۔ ایسے میں ایک دفعہ اس نے پلک جھپکی تو کھڑکی کے آگے بہت سی روشنی نظر آئی۔ اتنی دودھیا روشنی کہ آنکھیں چندھیا جائیں' پھر اس روشنی میں سے ایک ہیولا سا ابھرنے لگا۔

سفید لمبی میکسی میں ملبوس کوئی لڑکی۔۔۔ اس سوتی جاگتی hallucinating ہیلوسی نیٹنگ (بیماری کے باعث غیر حقیقی چیزوں کا نظر آنا) سی کیفیت' میں بھی اسے لگا کہ اس کی موت آپہنچی ہے' وہ مرنے والا ہے اور وہ ملک الموت کا عکس ہے جو اس کی روح لینے آیا

ہے۔۔۔اس نے دھندلی بصارت سے اس وجود کو قریب آتے دیکھا۔ اس کی میکسی پاؤں تک آتی تھی اور سینے پہ بندھے ہاتھوں میں گلدستہ تھا۔ سرخ گلابوں کا۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر اوپر دیکھنا چاہا۔ دھندلا سا نظر آیا۔ اس کے چہرے کے گرد سرخ ریشمی اسٹول لپٹا تھا' جو کندھوں پہ اکٹھا ہو کر سامنے انگریزی حرف U کی طرح گر تا تھا۔ ہاشم نے نیم غنودگی سے انداز میں پلکیں جھپکیں۔ وہ قریب آئی۔ دودھ ملائی سا چہرہ' کرسٹل جیسی گرے آنکھیں اور سرخ ہونٹوں پہ ہمدردی بھری مسکراہٹ۔ جھک کر وہ اس کے پاس پھول رکھ رہی تھی۔

"Get well Soon Grim Reaper!"

گیٹ ویل سون گرم ریپر

(جلد صحت یاب ہو' موت کے فرشتے! مسکرا کر سرگوشی کی۔ وہ بول نہیں سکا۔ انہی نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ ملک الموت نہیں تھی' ملک الموت تو وہ خود تھا۔ اب وہ اس کے اوپر کوئی چادر سی ڈال رہی تھی۔ یکدم سردی لگنا بند ہو گئی تھی۔ ہاشم کی پلکیں بھاری ہو کر گر گئیں۔ بمشکل کھولیں تو کمرے میں روشنی ویسی ہی تھی مگر وہ غائب تھی۔۔۔ اس کا دماغ نیند میں ڈوبتا گیا۔

جانے کتنی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی۔ وہ آہستہ سے اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں شام کی نیلاہٹیں تھیں۔ بتیاں بجھی تھیں۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ ماتھا ٹھنڈا تھا اور حواس بستر تھے۔ اٹھتے ساتھ ہی اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

نہ اس کے اوپر چادر تھی' نہ ساتھ پھول رکھے تھے۔ ہاشم نے بے حد کرب سے آنکھیں میچیں۔ (ایک باسی سلاد نے اسے اتنا بیمار کر دیا کہ وہ اس بری طرح سے واہموں میں مبتلا ہونے لگا؟ ایسا تخیل؟ ایسا خواب؟) سر جھٹک کر وہ اٹھا اور باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ چند منٹ بعد نکلا تو ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھا۔ تکان ابھی تک چہرے پہ واضح تھی۔ سست قدمی سے چلتا باہر آیا۔

لاؤنج روشن تھا۔ جواہرات صوفے پہ بیٹھی' چائے پی رہی تھی۔ اسے آتے دیکھ کر فکرمندی سے کپ رکھا۔

"تمہیں ابھی آرام کرنا چاہیے۔ اب کیسے ہو؟"

"بہتر!" وہ اس کے ساتھ صوفے پہ آ بیٹھا اور پاؤں میز پر رکھ لیے۔ آنکھیں موند لیں۔

"کیا کھا لیا تھا؟ اتنے بیمار لگ رہے ہو۔ شیرو اور میں بہت پریشان تھے۔" اس کو بہتر دیکھ کر بھی جواہرات کو تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

ہاشم نے آنکھیں کھولیں اور چھت کو تکنے لگا۔

"میں نے ایک خوب صورت خواب دیکھا۔"

"اچھا۔" وہ نرمی سے مسکرائی۔ "کس کو دیکھا؟" اب وہ صوفے پہ آدھی مڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"تھی کوئی!"

جواہرات نے گہری سانس لی۔ "اسے کال کر لو۔ ڈنر پہ بلا لو۔ کتنے عرصے سے تم نے اس سے بات نہیں کی۔"

ہاشم نے آنکھیں بند کر لیں۔ "میں مصروف تھا۔ اب بھی ہوں۔" پھر سیدھا ہوا تو دیکھا' جواہرات اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں ممی' ہم اس بارے میں بات نہیں کرنے لگے۔ وہ مجھ سے بہت چھوٹی ہے' انوسینٹ ہے' میں نہیں چاہتا اسے کبھی میرے بارے میں وہ سب معلوم ہو۔ وہ گناہ جو میں نے کیے ہیں۔۔۔ وارث' زرتاشہ' وہ سب۔" اس نے سر جھٹکا۔

"کسی کو کبھی علم نہیں ہو گا' موو آن ہاشم!" اس نے خفگی سے ٹوکا اور کپ اٹھا لیا۔

ہاشم اٹھ گیا۔ "میں تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر لیٹتا ہوں۔" جواہرات خاموش رہی۔ جانتی تھی وہ موضوع سے بچنا چاہ رہا ہے۔

وہ کمرے میں آیا تو فیونا ساتھ ہی آئی۔

"فیونا! مجھے کافی لا دو۔" لائٹ جلاتے ہوئے اس نے کہا پھر رکا۔ "میرا لیپ ٹاپ کہاں ہے؟"

"سر' سوری! آپ کو کافی نہیں مل سکتی۔ آپ کا

لیپ ٹاپ اور بریف کیس بھی مسز کاردار کے کمرے میں رکھ دیا ہے' میں نے' اگلے دو دن آپ کو ڈاکٹر کے تجویز کردہ ڈائٹ پلان پہ عمل کرنا ہوگا۔ کوئی کام نہیں۔ صرف ریسٹ۔"

"تم ابھی اور اسی وقت اپنی نوکری سے فارغ ہو۔"

فینوناً نے مسکراہٹ دبائی۔ "تھینک یو سر! مگر آپ کو اپنی چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں مل سکتا' سوائے آپ کے سیل فون کے۔" سائیڈ ٹیبل پہ دھرے فون کی طرف اشارہ کیا "ابھی جوس لاتی ہوں اور پرہیزی کھانا۔" مستعدی سے کہتی وہ ایڑیوں پہ گھومی۔ ہاشم مسکرا کر قدم قدم چلتا بیڈ تک آیا۔

"اور ہاں سر!" وہ جیسے کچھ یاد کر کے واپس گھومی۔

"میں نے پھول ادھر رکھ دیے تھے۔" آتش دان کی طرف اشارہ کیا تو ہاشم نے چونک کر دیکھا۔ وہاں شیلف پہ گلدان میں سرخ گلاب رکھے تھے۔ ہاشم کی نظریں فوراً "صوفے تک گئیں۔ صوفے کے قدموں میں گول مول سی ہوئی چادر پڑی تھی۔

(جو شاید اس نے نیند میں اتار دی تھی۔ تو وہ اس کا خواب نہیں تھا)

"یہ کون لایا؟" وہ متحیر سا آتش دان کے قریب آیا۔

"سر! کسی لڑکی نے صبح آپ کے لیے کال کی تھی' میں نے بتایا آپ بیمار ہیں' تو وہ دوپہر میں آئی۔ نام نہیں بتایا' مگر تو شیرواں صاحب اس کو جانتے تھے۔ مسز کاردار اس وقت گھر پہ نہیں تھیں۔ میں نے اسے آنے دیا۔ آپ کو دیکھ کر اور یہ پھول رکھ کر وہ چلی گئی!"

"تم دوسری دفعہ اپنی نوکری سے فارغ ہو فینوناً۔" خفگی سے کہتا وہ پھولوں تک آیا اور اندر لگا کارڈ نکالا۔ سفید سے کارڈ پہ سرخ روشنائی سے تحریر تھا۔

"Get Well Soon Grim Reaper!"

اور نیچے چھوٹا سا لکھا تھا۔ "آبدار ہارون عبید!"

ہاشم ذرا سا مسکرایا۔ موبائل اٹھایا اور کانٹیکٹ لسٹ اوپر کی۔ ایک نام پہ رکا۔ Red Riding Hood۔ پہلے کال کا بٹن دبایا۔ پھر (اونہوں) کال کاٹی۔ اور میسج لکھا۔ "تھینکس' آبی!"

باہر سیڑھیاں اترتی فینوناً' ساتھ گزرتے شیرو کو دیکھ کر رکی۔ "سر' دوپہر میں جو لڑکی آئی تھی ہاشم صاحب کے لیے' اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔ کیا آپ اس کو جانتے تھے؟"

شیرو جو فون میں الجھا تھا' رکا اور تیز نظروں سے فینوناً کو گھورا۔

"آف کورس۔ وہ ہارون عبید کی بیٹی ہے۔ اور زہر لگتی ہے مجھے وہ۔ اب ہٹو سامنے سے۔" اور برے موڈ کے ساتھ اوپر آیا۔

(ایک تو ہاشم بھائی کو وہی لوگ کیوں پسند آتے ہیں جو مجھے ناپسند ہوتے ہیں؟ ایک سعدی اور ایک یہ فسادی! میں ابھی تک بھولا نہیں ہوں کہ کس طرح یونیورسٹی میں اس نے مجھے اپنے منگیتر سے پٹوایا تھا۔ ہونہہ!) منہ میں بڑبڑاتا وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔



صحرا میں جی رہا تھا جو دریا دلی کے ساتھ
دیکھا جو غور سے تو وہ پیاسا بہت لگا

ہاشم نے جب ٹیکسٹ بھیجا تو اس کے موبائل سے نادیدہ لہر نکلی اور اڑتی ہوئی ہوا میں بہتی چلی گئی۔ سڑکیں عبور کیں' گھر پھلانگے اور بالآخر سرسبز میدانوں سے گھرے ایک اونچے محل میں تیرتی ہوئی آئی' ایک کھڑکی سے اندر کودی' اور اسٹڈی ٹیبل پہ رکھے موبائل میں جا اتری۔ موبائل اسکرین میسج ٹون سے چمکی اور بجھ گئی۔

وہ ایک وسیع و عریض سی اسٹڈی سی لگتی تھی۔ اس کے دروازے پہ نیم پلیٹ لگی تھی۔ "آبدار عبید۔ Hypnotheropist۔" اندر دیکھو (اسی کھڑکی سے) تو اسٹڈی ٹیبل کی کنٹرول چیئر کی پشت نظر آتی تھی۔ سفید آستین میں ملبوس کہنی کرسی کے بازو پہ جمی تھی اور سرخ اسٹول میں ڈھکا سر پیچھے سے دکھائی دیتا تھا۔ یہاں سے اس کا چہرہ تو نظر نہ آتا' البتہ سامنے کاؤچ پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' قیمتی سوٹ میں ملبوس درمیانی عمر کا آدمی بیٹھا واضح دکھائی دے رہا تھا اور وہ

قدرے الجھن سے کہہ رہا تھا۔
"تو آپ میرا علاج کیوں نہیں کر سکتیں؟"
سرخ اسکارف والا سر جیسے گہری سانس لے کر جھٹکا۔ "مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا یہ کہتے ہوئے مگر آپ کو سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے اور میں سائیکاٹرسٹ نہیں ہوں' نہ ہی سائیکالوجسٹ۔ یہ وہ ہوتے ہیں جو ذہنی امراض کا علاج کرتے ہیں' نہ ہی میں میڈیکل ڈاکٹر ہوں جو کسی جسمانی بیماری کا علاج کر سکوں۔ میں hypnotheropist ہوں۔" اس کی آواز نرم اور سادہ تھی۔
"مگر..." وہ الجھا۔ "نہ جسمانی نہ ذہنی' اگر دونوں کا علاج آپ کے پاس نہیں ہے' تو... آپ کیا کرتی ہیں؟"
"میں Hupnosis کے ذریعے آپ کو ایک بہتر ذہنی حالت میں لے جا سکتی ہوں' جہاں آپ خود کو ایک بہتر انسان کے طور پہ دیکھ سکتے ہیں' یہ سیلف امپرومنٹ کے لیے ہوتا ہے' بری عادتیں اور بری یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے۔ اور اس کی آپ کو قطعاً" ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔ میں ایک ریفر کر رہی ہوں۔" قلم سے کاغذ پہ چند الفاظ گھسیٹے اور شوپ سے پیڈ سے صفحہ اتار کر اس کی طرف بڑھایا۔
"آپ ان سے مل لیں۔ یہ آپ کا بہترین علاج کریں گے۔"
ان صاحب نے تذبذب سے پرچہ تھام لیا۔
"مگر... آپ کے والد نے مجھے کہا تھا کہ آپ بہت اچھی تھراپسٹ ہیں۔"
"میں بہت اچھی تھراپسٹ ہوں' اسی لیے آپ کو ایمانداری سے بتا رہی ہوں کہ آپ کو میری ضرورت نہیں ہے۔" وہ صاحب اٹھے' چند الوداعی کلمات کہہ کر باہر نکل گئے۔ دروازہ بند ہوا تو اس نے کرسی موڑی' اب کھڑکی میں کھڑے ہو کر دیکھو تو اس کا داہنا رخ نظر آتا تھا۔ وہی ملائی سا چہرہ اور بلی جیسی سرمئی آنکھیں جن کے ابرو ناراضی سے بھنچے تھے۔

سرخ ہونٹ دانت سے کاٹتے ہوئے اس نے موبائل سے ہاشم کا نیا میسج سرسری سا پڑھ کر ایک کال ملائی۔
"امین... بابا کہاں ہیں...؟ نہیں' ان کو فون مت دو۔ بس اتنا بتا دو کہ ان کا بھیجا پانچ سو چھبیسواں مریض بھی میں نے واپس کر دیا ہے۔ اسی لیے اپنے سیاسی دوستوں کو میرے پاس مت بھیجا کریں' اس امید پہ کہ ان کے سارے راز میں آپ کو بتا دوں گی۔ اور ہاں امین' یہ زور دے کر کہنا کہ میں بہت بہت خفا ہوں۔" نرم سی خفگی سے کہہ کر موبائل رکھ دیا۔ پھر اٹھی اور دروازے کی طرف چلی گئی۔

چند لمحے بعد وہ اس اسٹڈی کے بیرونی دروازے سے نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں سبزہ زار دور دور تک پھیلا تھا۔ وہ ایک نظر سبزے پہ ڈالتی گھاس کے کنارے چلنے لگی۔ سادہ لمبا سفید فراک پہنے جس کی چوڑی دار آستینیں تھیں اور چہرے کے گرد سختی سے سرخ اسٹول لپیٹے۔ وہ چلتے ہوئے ہاتھ پودوں کے پتوں سے گزارتی جا رہی تھی۔ ایک سفید ایرانی بلی دور سے بھاگتی آئی اور اس کے قدموں کے برابر چلنے لگی۔
"سنو... بیلا۔" اس نے خفگی سے بلی کو مخاطب کیا۔ "میرا موڈ بہت خراب ہے اور آج میں مزید کوئی کلائنٹ نہیں دیکھنے لگی۔" ذرا آگے آکر رکی۔ برآمدہ خالی تھا۔ کرسیاں بھی خالی تھیں۔ آبدار نے "OOPS" والے انداز میں بلی کو دیکھا۔ پھر جلدی سے کندھے اچکائے۔
"چلو اچھا ہوا۔ اور کوئی کلائنٹ ہے بھی نہیں' میں انکار کرتی تو برا لگتا نا ان کو۔" بلی نے اس کے قدموں سے خود کو رگڑتے اس کے گرد چکر کاٹا۔ وہ پھر سے چلنے لگی۔
"ویسے تمہیں کیا لگتا ہے؟ بابا نے میری بات کا برا مانا ہوگا؟ مگر... اوہ نہیں بیلا۔" وہ اداس ہوئی۔ "امین (ڈرائیور) نے پوری بات بتائی ہی نہیں ہوگی ان کو۔ بابا سمیت کوئی بھی مجھے سیریس نہیں لیتا۔ سوائے میرے کلائنٹس کے۔ حالانکہ ان کو بھی مجھے سنجیدہ نہیں لینا

چاہیے۔ اب میں دیکھنے میں کوئی ہینو تھراپسٹ تھوڑی لگتی ہوں؟ ایک تو میں نرم دل اتنی ہوں' اوپر سے کیوٹ بھی ہوں۔" رک کر پوچھا۔ "ہوں نا؟" بلی جواب میں میاؤں میاؤں کرتی مسلسل اس کی ٹانگوں سے خود کو رگڑ رہی تھی۔

دور سے دو ملازموں نے دیکھا کہ وہ چلتی آرہی ہے۔ جو ذرا ادھیڑ عمر تھا' وہ نوجوان ملازم کی طرف مڑا۔

"تم آبدار بی بی کو بتاؤ اپنے سارے مسئلے مسائل' جن کی وجہ سے تم کک (باورچی) نذیر کا قرضہ واپس نہیں کرسکتے۔ بی بی بہت ہمدرد اور مہربان ہے' تم ابھی ان کو نہیں جانتے' نئے ہونا۔ وہ تمہیں کک سے مہلت دلادیں گی۔" ہمدردی سے مشورہ دیا۔ نوجوان ملازم کی ہمت بندھی۔ فوراً" آگے گیا' جہاں وہ روش پہ چلتی آرہی تھی۔

"آبدار میم!" اس نے ہاتھ باندھے مؤدب ہو کر پکارا۔ وہ رکی۔ نظر بھر کر اسے دیکھا۔

"آپ نے اس دن کہا تھا کہ کک سے لیے گئے پیسے جلد واپس کردوں۔"

"ہاں غضنفر! وہ بے چارہ پہلے ہی اتنا غریب ہے' نرم دلی میں دے تو بیٹھا ہے' لیکن ابھی اس کو سخت ضرورت ہے ان کی۔"

"وہ دراصل۔۔۔" سر جھکا کر بے چارگی سے بتانے لگا۔ "میری بہن کی شادی قریب ہے' وہ سارے پیسے اس میں لگ گئے' پھر بھی کم پڑ رہے ہیں۔ والد میرے سرطان کے مریض ہیں' ڈاکٹر نے کہا کہ علاج کی منزل سے نکل چکے ہیں۔ دوا کا خرچا بہت ہے۔ آپ پلیز کک سے کہہ دیں' وہ ذرا مجھے مہلت دے دے۔ آج کل دو وقت کے کھانے کا خرچا بھی پورا نہیں ہوپاتا ہمارے گھر کا۔" وہ دکھ اور بے بسی سے کہہ رہا تھا۔

آبدار کی آنکھوں میں فکر مندی ابھری۔ دو قدم قریب آئی۔ "اوہ ہو۔ آئی ایم سو سوری غضنفر۔ تمہارے تو بہت برے حالات ہیں' میں ابھی کک سے بات کرتی ہوں' نہ صرف وہ مہلت دے گا' بلکہ تم کہو تو میں تمہاری بہن کی شادی کے لیے پانچ دس لاکھ ارینج کردوں؟" اپنائیت اور ہمدردی سے پوچھ رہی تھی۔ ملازم غضنفر نے آنکھیں اٹھائیں۔ ان میں امید کی خوشی تھی۔

"بی بی! یہ تو آپ کا احسان ہوگا۔"

"شیور۔ میں ایسا کرتی ہوں' کک کے پیسے بھی خود ہی ادا کردیتی ہوں اور تمہیں مزید رقم بھی دے دیتی ہوں۔ اوکے؟" وہ آگے بڑھی پھر رکی۔ غضنفر فرط جذبات سے شکریہ بھی نہ کہہ پایا تھا جب وہ واپس گھومی۔

"مگر ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے غضنفر۔" بہت ہی فکر مندی سے بتانے لگی۔ "میں نے تمہارا بیک گراؤنڈ چیک کروایا تھا' ایسا ہے کہ تمہاری کوئی بہن نہیں ہے اور والد تمہارے دس بارہ سال پہلے فوت ہوگئے تھے۔ تمہارا۔ بینک اکاؤنٹ جس میں ہر ماہ تمہاری تنخواہ جاتی ہے' اس میں بھی کافی رقم ہے اور کک کے پیسوں سمیت وہ تمام رقم تم نے اپنے ہمسائے کو دینی ہے' اس کی بیٹی سے شادی کے بدلے میں' سو یو نو واٹ! میرے محنتی اور ایمان دار کک سے جو پیسے تم نے باپ کی بیماری کا کہہ کر ہتھیائے تھے نا' وہ ان کو کل صبح سے پہلے واپس ملنے چاہئیں' ورنہ۔۔۔ اگر میں نے بابا کو بتایا تو۔۔۔"

بہت ہی نرمی سے کہتے فقرہ ادھورا چھوڑا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مسکرائی اور مڑ گئی۔ ادھر غضنفر کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا' ایک جا رہا تھا۔ ہکابکا سا وہ ادھیڑ عمر ملازم کی طرف گھوما جس نے مسکرا کر مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"بولا تھا نا' ابھی تم بی بی کو نہیں جانتا۔" غضنفر نے تلملا کر اسے دیکھا تھا۔ (کک کا وفادار)

وہ اپنے قصر کی چار دیواری کے ساتھ قدم قدم چلتی آگے بڑھ رہی تھی۔ بلی بھی ساتھ ہی تھی۔ دفعتا" ایک دروازے کے قریب وہ رکی۔ آنکھیں چمکیں۔ شرارت سے بلی کو "ششش" چپ رہنے کا اشارہ کیا اور دبے قدموں آگے آئی۔ کھلے دروازے سے گردن نکال کر جھانکا۔

وہ کمپئین آفس کے طور پہ استعمال ہونے والا کمرہ تھا۔ دیواروں پہ کاغذ۔ چارٹس۔ ملٹی میڈیا۔ نوجوان ورکرز آگے پیچھے ٹہل رہے تھے' کوئی بول رہا تھا' کوئی کمپیوٹر پہ بیٹھا تھا۔ ان میں ذرا اونچے چبوترے پہ کھڑا' ٹی شرٹ اور پی کیپ والا نوجوان' جس کو وہ احمر شفیع کے نام سے جانتی تھی' کہہ رہا تھا۔

"فاطمہ! مجھے رات ایک دوست کے میموریل ڈنر پہ جانا ہے' پیچھے جب ہارون صاحب پرائم ٹائم میں انٹرویو دیں گے' تو تم میری جگہ ہوگی۔" فاطمہ کے پیچھے کسی ورکر کو دیکھ کر اونچا بولا۔ "یہ کیا ہے' رضا؟" آبدار کی نظریں اس طرف گھومیں جہاں ایک لڑکا ہینگنگ ڈریس بیگ اٹھائے چلا آرہا تھا۔

"سر' یہ عبید صاحب کا شلوار سوٹ ہے' یہ شو کے لیے بھیجا ہے ڈیزائنر نے۔" وہ ہینگنگ بیگ میں لباس دکھا رہا تھا۔ احمر کے ماتھے پہ بل پڑے۔

"ہرگز نہیں۔ وہ شلوار سوٹ میں مزید دراز قد لگیں گے' شو کے فارمیٹ میں تینوں سیاست دانوں کے سامنے میز نہیں ہوگی اور وہ کھڑے ہوں گے۔ مخالف والے چیمہ صاحب کو دیکھا ہے تم نے' کتنے کمزور اور منحنی سے ہیں۔ ہارون صاحب ان کو bully کرتے نظر آئیں گے۔ اس کو بدل کر تو پیس تیار کرواؤ۔ ٹائی گہرے رنگ کی ہو۔ ان کو فائیٹر لگنا چاہیے' ڈکٹیٹر نہیں۔" پھر اسی سنجیدگی سے فاطمہ کی طرف متوجہ ہوا' تب ہی دروازے میں گردن نکال کر دیکھتی لڑکی پہ نگاہ پڑی جو فوراً "سے اوٹ میں ہو گئی۔ فاطمہ کو رکنے کا کہہ کر تیزی سے باہر آیا۔ وہ دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔

"ہیلو احمر!" اسے دیکھ کر سنبھل کر مسکرائی۔ "میں فارغ تھی' سوچا کمپئین کے لیے خود کو ایز اے والنٹیئر کروں۔ کوئی کام ہے میرے لیے؟" معصومیت سے آنکھیں جھپکائیں۔

احمر نے بہت ضبط سے گہری سانس لی۔ "نہیں مس عبید' آپ کے لیے کوئی کام نہیں۔ بلکہ آپ کے اس کمرے میں داخل ہونے پہ بھی میں پابندی لگانے جا رہا ہوں۔"

آبدار کی آنکھوں میں خفگی ابھری۔ "سوروڈ۔ میں بابا سے شکایت کروں گی۔"

"پھر مجھے بھی بتانا پڑے گا کہ جب بھی آپ کمپئین آفس میں آتی ہیں' کچھ نہ کچھ غلط ضرور ہوتا ہے۔" دانت پہ دانت جمائے اسے گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "کبھی میرے بیگ سے مرا ہوا چوہا نکلتا ہے' کبھی موبائل چارجرز ڈسٹ بن میں خودبخود جا پہنچتے ہیں' کبھی ہماری فائلز میں چھپکلی کی دم خود سے آگرتی ہے۔"

وہ نظریں جھکا کر انگلیاں مروڑنے لگی' تو احمر نے چند ایک گہرے سانس لیے۔ "مجھے پتا ہے' آپ نہیں چاہتیں کہ آپ کے بابا کامیاب ہوں کیوں کہ اس صورت میں وہ آپ کو وقت نہیں دے پائیں گے مگر اچھا ہوگا اگر آپ اپنے ریلیشن شپ کو بہتر بنانے پہ توجہ دیں' بجائے میرے کام میں ٹانگ اڑانے کے۔ سو۔" انگلی سے چوکھٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ باؤنڈری اب آپ کراس نہیں کریں گی۔"

آبدار کی تلملائی ہوئی نظریں اوپر اٹھیں۔ نروٹھے پن سے کچھ کہنے لگی تھی کہ احمر کی شرٹ دیکھ کر رکی۔ آنکھیں سکیڑیں۔

سفید شرٹ پہ بلیک اینڈ وائٹ ایک مسکراتے نوجوان کی تصویر بنی تھی' جس کے چھوٹے گھنگھریالے بال تھے اور اوپر ریاضی کا نشان hash tag ڈال کر لکھا تھا SaveSaadi

"یہ کون ہے؟" وہ اچنبھے سے بولی۔ احمر اپنی ساری تقریر اکارت جاتے دیکھ کر مزید جل گیا۔

"میرا دوست ہے' مسنگ ہے' اس کے میموریل ڈنر میں جانا ہے رات کو' اسی کے لیے پہنی ہے۔" خفگی سے کہتا پلٹ گیا۔

آبدار الجھی سی کھڑی سوچتی رہی۔ (یہ کون تھا؟ کہاں دیکھا ہے میں نے اسے پہلے؟)

اس کی بلی اب بیٹھی اس کے پیر چاٹ رہی تھی۔



بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

میموریل ڈنر ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کے بینکوئٹ ہال میں منعقد تھا۔ اندر روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ اسٹیج کے پیچھے دیوار گیر بینر لگا تھا جس میں سعدی مسکراتا ہوا نظر آرہا تھا اور ساتھ Save Saadi # لکھا تھا۔ یہی تصویر پرنٹ ہو کر ہال میں بیٹھے بہت سے لڑکے لڑکیوں کی شرٹس پر چھپی تھی۔

احمر شفیع اسی شرٹ میں ملبوس کھڑا' سعدی کے دو منتظم دوستوں سے بات کر رہا تھا' جب اس نے زمر کو اس طرف آتے دیکھا۔ وہ گھنگھریالے بالوں کو جوڑے میں لپیٹے' قدرے عجلت میں لگ رہی تھی۔

"السلام علیکم احمر!" پھر دوسرے لڑکے کو مخاطب کیا۔ "تیسرے نمبر پہ تقریر میری بھتیجی کرے گی۔۔۔ اوکے؟ اور اس کو آدھے پون گھنٹے کا ٹائم چاہیے ہو گا۔ وہ سعدی کی بہن ہے آخر!"

"آ۔۔۔ اوکے مسز زمر!" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ احمر کچھ کہنے لگا مگر وہ مڑ گئی۔ اب وہ داخلی دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ چہرے پہ مسکراہٹ سجائے۔ سامنے سے ڈاکٹر ایمن اور ڈاکٹر توقیر چلے آرہے تھے۔

"مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ لوگ آئے۔" ان کو ریسیو کر کے وہ انہیں ان کی میز کی طرف لے آئی۔ "بچے نہیں آئے آپ کے؟"

"وہ بہت چھوٹے ہیں مسز زمر میموریل کی باتیں ان کے ذہنوں پہ ناخوش گوار اثر نہ ڈالیں' اس لیے ان کو نانی کی طرف چھوڑا ہے۔" ڈاکٹر ایمن بتا رہی تھیں۔ زمر کی گردن میں گلٹی سی ڈوب کر ابھری' مگر جبراً" مسکراتی رہی۔

"بالکل۔ ہر شخص کو اپنے بچے کو پروٹیکٹ کرنے کا حق ہے۔" اور پھر جب مڑی تو مسکراہٹ غائب تھی اور آنکھوں میں شدید تکلیف تھی۔ اسی طرح چلتی وہ حنین کی میز تک آئی جہاں ندرت' سیم اور فارس بیٹھے تھے۔ فارس بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ زمر نے اس کے ساتھ خاموش نظروں کا تبادلہ کیا' پھر حنین کے قریب جھکی۔

"تیسرے نمبر پہ وہ تمہیں اسٹیج پہ بلائیں گے۔ تمہیں تقریر کرنی ہے' وہ بھی چالیس منٹ کی۔"

"واٹ؟" حنہ نے دہل کر اسے دیکھا۔ "مگر میں اپنے بھائی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی کسی سے۔ آپ نے مجھے کہا تھا کہ مجھے کوئی تقریر وغیرہ نہیں کرنی ہو گی۔"

"مجھے نہیں پتا میں نے کیا کہا تھا۔" وہ دبی سرگوشی میں بولی۔ "مگر تمہیں اگلے چالیس منٹ اسٹیج پہ جا کر بولنا ہے اور اتنا اچھا بولنا ہے کہ کسی کو میری اور فارس کی کمی محسوس نہ ہو۔ اب میں جا رہی ہوں۔ کوئی سوال نہیں۔" فارس اتنا سن کر اٹھ کر اسٹیج کے عقب میں جانے لگا۔ وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ حنین سے کچھ بولا نہیں گیا۔ "مگر۔۔۔ میں کیا کہوں گی؟"

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ خود سوچو۔" رسان سے کہہ کر وہ اٹھ آئی۔

وہ کار میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے اندر بیٹھتے ہی بے چینی سے بولا۔ "میں اکیلا کر لیتا سب' آپ کو آنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"میں تمہاری مدد کے لیے نہیں آرہی۔" اور زور سے دروازہ بند کیا۔

اندر چند منٹ تو حنین یونہی بیٹھی رہی۔ پھر جب اس کا نام پکارا گیا تو اس نے بہت سی نظریں خود پہ اٹھتی محسوس کیں۔ پھر چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ڈائس تک آئی۔ پسینے سے نم ہوتے ہاتھوں سے مائیک سیدھا کیا۔ ایک نظر اس بھرے ہال پہ ڈالی جس میں ہر عمر کے افراد' سول سوسائٹی کے اراکین' طلبا' کچھ رشتے دار' سب بیٹھے تھے۔ دل کانپا۔ نگاہ جھکا لی۔ چند رسمی کلمات کہے' پھر رکی۔

"میں کوئی تقریر لکھ کر نہیں لائی' کیوں کہ میں تقریر کرنا بھی نہیں چاہتی۔ عجیب سا لگتا ہے اپنے بھائی کے لیے تقریر کرنا' رسمی جملے کہہ کر' چند آنسو بہا کر' تالیاں سمیٹنا۔" جھکی آنکھوں سے سر جھٹکا۔

"پاکستان میں ہر سال ہزاروں لوگ قتل کیے جاتے

ہیں' بم دھماکوں میں' ٹارگٹ کلنگ میں۔ اور ہزاروں اغوا کیے جاتے ہیں۔ کچھ مار دیے جاتے ہیں' کچھ تاوان لے کر چھوڑ دیے جاتے ہیں' مگر چند لوگ... چند لوگوں کو زندہ رکھا جاتا ہے۔ وہ شہباز تاثیر ہو' فرزند یوسف رضا گیلانی ہو' یا سعدی یوسف ہو۔ ان کے اغوا کار برسوں ان کو زندہ رکھتے ہیں اور ان کے گھر والوں کو روز مارتے ہیں..."

جھکی نظروں سے ڈائس کی سطح پہ دیکھا۔ وہاں میموریل کا پمفلٹ رکھا تھا۔ سعدی کی تصویر۔ اس کو دیکھ کر بہت کچھ یاد آنے لگا۔

"ہم عام بہن بھائیوں جیسے تھے۔ امی کو تنگ کرتے تھے بہت۔ وہ فون پہ کبھی کسی خالہ' ممانی سے کسی کی غیبتیں کررہی ہوتیں تو بھائی پکارتا امی یہ غیبت ہے' اور امی غصے سے جوتا اٹھا کر پھینکتے ہوئے کہتیں "میں حقیقت بیان کررہی ہوں۔" چہرہ جھکائے وہ ذرا سا ہنسی۔ ہال میں بھی نم سی ہنسی گونجی۔ "امی سارا دن ہم بہن بھائیوں کو برا بھلا کہتی تھیں اگر کبھی کسی رشتے دار کے سامنے ہماری تعریف کرتیں تو بھائی کہتا' حنہ! تمہیں نہیں لگتا کہ امی جھوٹ بول رہی ہیں؟" نظریں اٹھائیں تو دیکھا۔ سامنے بیٹھی ندرت اور سیم مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے۔ آنکھیں پرنم تھیں۔

وہ پھر سے پلکیں جھکا کر کہنے لگی۔

"بھائی اور میں اکٹھے اسکول جاتے تھے۔ پانچ سال کا فرق تھا ہم میں۔ دو بجے چھٹی ہوتی' دو بیس پہ ہم گھر پہنچتے۔ آتے ساتھ یہی بے چینی ہوتی کہ آج کھانے میں کیا پکا ہوگا؟ بھاگ کر دیگچی کا ڈھکن اٹھاتی۔ جس دن کبھی پائے کریلے ٹنڈے ہوتے' بس اس دن مجھے لگتا میں امی کی لے پالک اولاد ہوں۔"

مسکرا کر سر جھکائے' وہ کہہ رہی تھی۔ ایک دفعہ پھر سب ہنسے تھے۔

"خیر' پونے تین تک نہا دھو کر کھانا کھا کر میں جلدی سے سونے لیٹ جاتی' معلوم تھا کہ بمشکل آنکھ لگے گی کہ... تین بجے... وہ چنگھاڑتی ہوئی آواز اٹھا دے گی۔ جی ہاں۔ قاری صاحب کی گھنٹی کی آواز۔ اف۔"

ہال میں زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ (اور وہ سمجھتی تھی صرف اسی کے گھر قاری صاحب تین بجے آتے تھے۔)

"میں روز تین بجنے سے پانچ منٹ پہلے دعائیں' منتیں شروع کرتی' اللہ کرے قاری صاحب آج نہ آئیں۔ بارش ہوجائے۔ بیمار ہوجائیں۔ کبھی تین سے پانچ منٹ اوپر ہوجاتے اور گھنٹی نہ بجی ہوتی تو میں اتنی خوش ہوتی' مگر عین اسی وقت گھنٹی بج جاتی۔ اف... بہت تپ چڑھتی تھی' لیکن کبھی... سال میں ایک آدھ بار... وہ سرپرائز چھٹی کر بھی لیتے۔ اس خوشی کا کوئی ثانی نہیں ہوتا تھا۔ اب بھی کبھی لگتا ہے کہ اسی طرح ایک دن بھائی گھر آجائے گا۔ سرپرائز۔ اس خوشی کا بھی کوئی ثانی نہیں ہوگا۔"

جھکے چہرے پہ آنسو ٹوٹ کر گرنے لگے مگر اس کی آواز ہموار تھی۔ ہال چپ تھا۔ ڈاکٹر ایمن جذبات عاری چہرہ لیے اس کو دیکھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر توقیر بار بار پہلو بدل رہے تھے۔

"مگر پتا ہے کیا..." وہ کہہ رہی تھی۔ "بھائی قاری صاحب کے آنے پہ میری طرح نہیں چڑتا تھا۔ میں غصے سے قاری صاحب کی برائیاں کرتی۔ کہتی' بھائی یہ غلط فتوے دے دیتے ہیں' کبھی کہتے ہیں یہ حرام' کبھی وہ حرام۔ یہ مولوی اتنے تنگ نظر کیوں ہوتے ہیں؟ ایک دن بھائی نے مجھے صوفے پہ بٹھایا اور بولا۔ "حنہ پتا ہے' مولوی کون ہوتا ہے؟ وہ جس کی معمولی تعلیم ہوتی ہے' مسجد کے ایک حجرے میں رہتا ہے' چار پانچ بچے ہوتے ہیں اور اتنی کم تنخواہ جس میں ہم ایک ڈنر کرلیں۔ وہ اس میں پورا مہینہ گزارتا ہے۔ بچوں کو پڑھاتا ہے۔ دو وقت کی روٹی کی فکر بھی کرتا ہے' اس کو کہاں ملے ذہن کھلا کرنے کے مواقع؟ مدینہ یونیورسٹی یا گلاسکو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی نہیں کی ہوتی اس نے۔ یہ جو سوٹڈ بوٹڈ بہترین اسلامک اسکالرز بڑے بڑے سیمینار اور فورمز پہ لیکچر دیتے ہیں' ریسرچ پیپرز نکالتے ہیں' نہ ان جیسا ذہن ہوتا ہے اس کا نہ اتنے

مواقع ملے ہوتے ہیں۔ وہ تو منہ اندھیرے اذان دیتا ہے' لوگوں کو نماز کے لیے اٹھاتا ہے' رمضان میں تراویح پڑھاتا ہے' بچوں کو قرآن پڑھنا سکھاتا ہے۔ اس کی انکم دیکھو' اس کے حالات اور اس کا پس منظر تو دیکھو' پھر اگر وہ تنگ نظر ہے' سخت فتویٰ دے دیتا ہے' تو کیا تم لوگ اس کی ان باتوں کو' اس کے ان سارے احسانات کے پیش نظر جو وہ تم لوگوں پہ کرتا ہے' اگنور نہیں کر سکتے؟ کیا اس کے حلوے کی پسندیدگی پہ لطیفے بنانا ضروری ہے؟ مگر میں نے پھر بھی کہا۔ جو بھی ہے بھائی' تین بجے آنا کوئی انسانیت نہیں ہے۔" ہلکا سا ہنسی تھی وہ۔۔۔ سب سن رہے تھے اسے۔ غور سے خاموشی سے اور وہ بولتی جا رہی تھی۔۔۔ اس کے اندر کا کھانا کیڑا دم توڑنے لگا تھا۔



ضبط غم نے اب تو پتھر کر دیا ورنہ فراز!
دیکھتا کوئی کہ دل کے زخم جب آنکھوں میں تھے

ان سے دور' نیم تاریک کالونی میں ایک بنگلے کے سامنے' چار دیواری کی اوٹ میں وہ کھڑا تھا۔

"ان کا گارڈ نہیں ہے کیا؟" ساتھ کھڑی زمر نے پوچھا تھا۔

"اونہوں' آج کل ان کا گارڈ اسپتال کی عمارت میں ہوتا ہے۔" وہ کہتے ہوئے گیٹ کے تالے میں تار ڈال کر گھما رہا تھا۔ زمر نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ "کسی دن ہم عدالت میں کھڑے اس لمحے کی بات کر رہے ہوں گے اور میں چاہتی ہوں کہ خود کو perjure (کٹہرے میں جھوٹ بولے بغیر) کیے بغیر کہہ سکوں کہ تمہیں کبھی کچھ ال لیگل کرتے نہیں دیکھا۔"

گیٹ کھل گیا' وہ ان سنی کرتا اندر بڑھ گیا۔ زمر پیچھے آئی۔ باہر لگی نیم پلیٹ جگمگا رہی تھی۔

ڈاکٹر توقیر بخاری۔ ڈاکٹر ایمن بخاری۔

"کالونی میں ایک ہی سی سی ٹی وی کیمرہ ہے' جس کو میں نے دوپہر میں ڈس ایبل کر دیا تھا۔" وہ گھر کے اندرونی دروازے کے سامنے بیٹھا' اور ایک ننھی سی پک Pick (لوہے کا تار) لاک میں گھماتے بولا۔

زمر سینے پہ بازو لپیٹے ساتھ کھڑی' اسے دیکھے گئی۔

"کسی کے گھر کا لاک توڑنا' کسی کی پراپرٹی پہ ٹریس پاس کرنا' مجھے یقین نہیں آ رہا میں ایسے کام میں ملوث ہو رہی ہوں۔ تمہیں پتا ہے ٹریس پاسنگ کی سزا کتنے سال ہوتی ہے؟" وہ جھری جھری لے کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"ایکس ٹورشن (بلیک میلنگ) کی سزا کتنے سال ہوتی ہے؟" وہ اسی سنجیدگی سے پک کو کی ہول میں گھسائے باری باری لاک کی پنیں دھکیلنے لگا۔ زمر کلس کر چپ ہو گئی۔

وہ ایک ایک پن دھکیل رہا تھا۔ یوں جیسے پیانو کی کیز پہ انگلیاں چلا رہا ہو اور جو تال اٹھی تھی' اس نے اندھیرے میں ایک منظر اس کے سامنے لہرا دیا۔۔۔

"ندرت بہن بھی چابی کدھر رکھو بیٹھیں' اور آپ نہ ہوتے تو ہم آج گھر کے باہر رات گزارتے ماموں۔"

وہ چھوٹے باغیچے والے گھر کے دروازے پہ کھڑے تھے' فارس پنجوں کے بل بیٹھا' لاک میں Pick گھسا رہا تھا اور کم عمر سعدی ستائشی انداز میں کہہ رہا تھا۔ "ویسے بغیر چابی کے کیا کوئی لاک اتنی آسانی سے کھل سکتا ہے؟"

"ابھی دنیا میں وہ لاک نہیں بنا جو توڑا نہ جا سکے۔ ادھر غور سے دیکھو' میں یہ کیسے کر رہا ہوں۔"

"میں سیکھ کر کیا کروں گا؟" کم عمر لڑکے نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔ فارس نے سر اٹھا کر تندی سے اسے دیکھا۔

"کبھی کہیں لاکڈ ہو جاؤ تو باہر تو نکل سکو گے۔ اب دیکھو۔" وہ بتانے لگا۔ "یہ سمپل لاک ہے۔ چھ پنیں ہیں اندر۔ اس کی چابی کے ایسے دانت ہوتے ہیں جو اندرونی سانچے میں فٹ ہو جاتے ہیں' تم چابی گھماؤ تو Pins آگے سرک جاتی ہیں اور لاک کھل جاتا ہے۔"

سعدی ساتھ بیٹھ گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ "یہی کام تم چابی کی جگہ اس سادہ Pick (ننھی سی لوہے

کی اسٹک) سے بھی کرسکتے ہو۔ باری باری ہر بٹن کو سرکاتے جاؤ' ون' ٹو' تھری۔۔۔" اس کی انگلیاں مہارت سے چل رہی تھیں۔ "فور' فائیو' سکس' کلک!"

کلک کی آواز آئی' لاک کھلا تو وہ چونکا۔ پیانو کی دھن غائب ہوئی۔ اردگرد منظر بدلا۔ وہ اندھیرے پورچ میں کھڑا تھا۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ (امید کرتا ہوں سعدی کہ جو کچھ میں نے تمہیں سکھایا تھا وہ تمہیں یاد ہو۔)

دونوں ساتھ ساتھ اندر آئے۔

"میں اپنا کام کرتا ہوں' آپ تب تک بیڈ روم میں جا کر ان کے دراز وغیرہ چیک کریں۔" وہ بیگ کندھے سے اتارتا ڈرائنگ روم کی طرف جاتے کہہ رہا تھا۔

زمر نے رک کر اسے دیکھا۔

"مجھے آرڈر مت دو۔ مجھے پتا ہے' مجھے کیا کرنا ہے۔"

فارس نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ "بہت بہتر!" اور آگے بڑھ گیا۔

وہ بیڈ روم میں آئی۔ چند منٹ لگے اسے تمام دراز' الماریوں کے کاغذات دیکھنے میں۔ فارس کی دی گئی چابیوں میں سے کوئی نہ کوئی چابی ہر دراز اور لاکر میں لگ رہی تھی۔ چند ایک کی کیمرے سے پکچرز لیں۔ پھر واپس ڈرائنگ روم کی چوکھٹ تک آئی تو وہ پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھا' اپنا کام کر رہا تھا۔

اسے مصروف دیکھ کر زمر اس کھلے سے اسٹڈی روم میں آئی جو ڈاکٹر ایمن کے ہوم کلینک کے طور پہ استعمال ہوتا تھا۔ اندر آتے ہی وہ تیزی سے الماریوں کی طرف لپکی۔ جس شے کی اسے تلاش تھی' وہ ڈھونڈنے میں چند منٹ لگے۔ ایک الماری' جس میں درازوں کی طرح خانے تھے' اس میں پیشنٹ نوٹس رکھے تھے۔ فائلز اور آڈیو سی ڈیز۔

"جی۔۔۔ بی۔۔۔ جی۔" وہ حروف تہجی کے اعتبار سے آرگنائزڈ فائلز پہ انگلی پھیرنے لگی۔ پھر رکی۔ ای ایف جی۔۔۔ جی سے غازی۔ فارس غازی۔ اس نے فائل نکالی۔ اندر چند سی ڈیز بھی تھیں۔

(اور ڈاکٹر ایمن نے کورٹ میں کہا تھا کہ اس نے کبھی غازی کے سیشن ریکارڈ نہیں کیے' مگر یہ جھوٹ تھا۔) اس نے باکس میں سے سی ڈیز نکال کر اپنے پرس میں منتقل کیں۔ پھر ایک دوسرے مریض کی سی ڈیز اس باکس میں ڈال دیں اور اسے واپس فارس کے فولڈر میں رکھ کر دراز بند کرتی مڑی ہی تھی کہ۔۔۔

"چلیں!" وہ چوکھٹ میں کھڑا تھا۔ زمر کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی پھر بھی وہ اس کا قدرے بوکھلایا چہرہ دیکھ چکا تھا۔

"کیا ہوا؟" غور سے اس کو دیکھا۔ اس نے اس کو سی ڈیز نکالتے نہیں دیکھا تھا۔

"تم نے اپنا کام کرلیا؟" وہ خود کو نارمل کرتی آگے آئی۔ "میرا مطلب ہے' ایک اور الیگل کام؟"

فارس کے لب بھینچ گئے۔ "آپ آرہی ہیں یا آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں؟"

وہ اب تک نارمل ہو چکی تھی' اس بات پہ سلگ کر سامنے آکھڑی ہوئی۔ اور نیم تاریکی میں چبھتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم یہ ظاہر کرنا چاہ رہے ہو کہ مجھے ادھر چھوڑ کر جاسکتے ہو؟"

فارس کے لبوں پہ مدھم مسکراہٹ رینگی۔

"اور آپ کے خیال میں' میں آپ کو ادھر چھوڑ کر کیوں نہیں جاسکتا؟"

وہ چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

"کیوں کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔ تم اپنی بیوی کو جان سے تو مار سکتے ہو' مگر اس کو یوں چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتی دو قدم آگے آئی۔ "کیوں کہ تم اپنے ابو کی طرح نہیں بننا چاہتے۔"

فارس کی مسکراہٹ غائب ہوئی' چہرے پہ سنجیدگی اتری۔ "چلیں!" اور بیگ کندھے پہ ڈالتا آگے بڑھ گیا۔ وہ گہری سانس لے کر (شکر کا) اپنے پرس کو مضبوطی سے تھامے اس کے پیچھے آئی۔

اور حسب معمول کچھ دیر بعد وہ کار میں بیٹھے' سرسری اور خشک انداز میں بات کر رہے تھے۔ زمر اس کو بنائی گئی تصاویر دکھا رہی تھی۔

"تم نے جو ان کے بینک اکاؤنٹس کی ڈیٹیلز نکالی تھیں' ان اکاؤنٹس کے علاوہ کوئی اور چیک بک نہیں نظر آئی مجھے۔ میرا خیال ہے' یہ ان کے واحد اکاؤنٹس ہیں۔"

"لیکن ان میں کوئی پیسے ٹرانسفر نہیں ہوئے۔ سعدی والے واقعے سے اب تک۔ مطلب کوئی لمبی چوڑی رقم نہیں۔ بلکہ صرف نکلوائے گئے ہیں۔" وہ سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ زمر نے ایک اور تصویر سامنے کی۔

"وہ جو ڈائمنڈ ٹاپس ڈاکٹر ایمن نے پہن رکھے ہیں' ان کا ان وائس بھی لاکر میں موجود تھا' جو بڑی رقم نکلوائی گئی تھی' وہ ان ہی کے لیے تھی۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا کہ سعدی کے بدلے انہوں نے ڈاکٹر بخاری کو کچھ نہ دیا ہو۔ کچھ تو دیا ہے کہ وہ مالی طور پہ اتنے بے فکر ہو گئے ہیں کہ مہنگے تحفے خرید رہے ہیں۔"

ہال آ گیا تھا' وہ کار کھڑی کرنے لگا۔ یہ ہال پانچ منٹ کی ڈرائیو پہ تھا اور زمر کے کہنے پہ لڑکوں نے ڈاکٹر بخاری کی ہی ہاؤسنگ سوسائٹی میں بک کروایا تھا۔

"فارس! ہم یہ کیوں فرض کر رہے ہیں کہ ان کو صرف پیسے ہی دیے جا سکتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کچھ اور دیا ہو۔ کوئی فیور' کوئی سفارش۔"

"میں کل چیک کرتا ہوں۔" وہ سر ہلا کر نکلنے لگی' جب وہ آہستہ سے بولا۔

"میری بیوی نے آخری ملاقات میں آپ سے کیا کہا تھا؟"

زمر نے مڑ کر اسے دیکھا' اس کی نظریں ونڈ اسکرین پر جمی تھیں۔ (آخری ملاقات؟) اس کے اندر ابال سا اٹھنے لگا جسے بمشکل دبایا۔

"یہی کہ وہ تم سے نفرت کرتی ہے اور تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔" وہ بے بسی بھرے غصے اور عجلت میں کہتی نکل گئی۔ اسے دیر ہو رہی تھی' حنہ نے پتا نہیں کیسے سنبھالا ہو سب۔ اور یہ کہتے ہوئے اس نے فارس کا چہرہ نہیں دیکھا جو ایک دم دھواں ہو گیا تھا۔

جب وہ ہال میں واپس پہنچا تو حنین' جو ابھی تک تقریر کر رہی تھی' ان کو باری باری آتے دیکھ کر جلدی سے "دیٹس آل" کہہ کر نیچے اتر آئی۔ ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔ وہ اتنا اچھا بولی تھی کہ کچھ لوگ کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ احمر شفیع بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔

(ماننا پڑے گا' غازی کے خاندان میں کوئی نارمل نہیں ہے۔)

وہ واپس آ کر بیٹھی تو زمر جو اپنی کرسی پہ بیٹھی تالیاں بجا رہی تھی' آہستہ سے بولی۔ "آئم ایم سوری' میں نے تمہیں اس پوزیشن میں ڈالا کہ..."

"ایکچولی تھینک یو زمر!" حنہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتے مسکرائی۔ "مجھے لگا آج بہت دن بعد بھائی سے باتیں کی ہیں۔" ایک دم گڑبڑا کر رکی۔ "مطلب' زمر پھپھو!" لاحقہ لگا کر خفت سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

زمر صرف مسکرا دی۔ فارس خاموشی سے دور بیٹھی ڈاکٹر ایمن کو دیکھتا رہا۔



تمام رسمیں ہی توڑ دی ہیں' میں نے آنکھیں ہی پھوڑ دی ہیں
زمانہ اب مجھ کو' مرا آئینہ بھی دکھائے تو کچھ نہ پائے

چند دن مصروف سے گزرے' وہی لگی بندھی زندگی۔ اور پھر ایک چمکیلی صبح ہاشم کاردار کے آفس کے باہر حلیمہ فون پہ کسی کو ہدایات دیتی نظر آ رہی تھی۔ بند دروازے کے پیچھے ہاشم پاور سیٹ پہ ٹیک لگائے براجمان تھا اور سامنے کرسی پہ بیٹھا نوشیرواں برا منہ بنائے کہہ رہا تھا۔

"طبیعت آپ کی خراب ہوئی' شامت میری آ گئی۔ مطلب اب مجھے روز آفس آنا پڑے گا؟"

وہ ہولے سے ہنس دیا۔ "نہیں' میں بوڑھا نہیں ہو رہا لیکن تم بھی اب بچے نہیں رہے۔ تمہاری کمپنی اب تمہارے حوالے ہے۔ تم اس کو کہاں لے جاتے

ہو' یہ تم پہ منحصر ہے۔" ذرا رکا۔ "اب سعدی تھرکول میں نہیں ہے۔ یہی وقت ہے جب ہم پراجیکٹ لے سکتے ہیں۔" نوشیرواں کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ "بھائی یار' ایک اس کے نہ ہونے سے تھرکول کا کیا بگڑے گا۔"

ہاشم میز سے ایک کرسٹل بال اٹھا کر انگلیوں میں گھماتے مسکرایا۔ "تم میری بات نہیں سمجھے۔ وہ ان کی سائیڈ پہ نہیں ہے' وہ ہماری سائیڈ پہ ہے۔"

نوشیرواں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "وہ ہمارے لیے کبھی کام نہیں کرے گا۔"

"کرے گا۔ اس کی بہن اس کی کمزوری ہے۔ میں نے اسے اس حوالے سے اچھا خاصا خوف زدہ کر دیا ہے۔"

"آپ کیا کریں گے اس کی بہن کا؟"

ہاشم نے ناک سے مکھی اڑائی۔ "وہ چھوٹی بچی ہے' مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں' مگر اسے ہاتھ میں رکھنا ضروری ہے۔ وہ سعدی کی واحد وارث ہے۔ سعدی کی ماں کو تو رہنے دو' اس کو ان ہیین (پاگل) قرار دینا آسان ہے۔"

"بھائی۔" شیرو الجھ کر سوچنے لگا۔ "اگر۔۔۔ بالفرض۔۔۔ اس چھوٹی لڑکی کو کچھ ہو جائے' مطلب کہ یہ مر ور جائے تو حق قصاص کا کیا ہو گا؟"

"حق قصاص منتقل ہو جائے گا۔ اس لڑکی کے شوہر کو۔"

وہ چونکا۔ "اور شوہر چاہے تو معاف کر دے؟"

ہاشم نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بالکل۔"

نوشیرواں نے ستائش سے ابرو اکٹھے کیے۔ "واؤ۔ انٹرسٹنگ۔ اس کو واقعی ہاتھ میں رکھیں پھر' مگر آپ کہہ رہے تھے کہ کئی دن سے اس نے آپ کو ٹیکسٹ نہیں کیا۔"

"کیوں کہ میں نے اسے ٹیکسٹ نہیں کیا۔ جس دن میں کروں گا۔ وہ فوراً" جواب دے گی۔ کیا تم لڑکیوں کو جانتے نہیں ہو؟"

لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوتے اس نے تبصرہ کیا۔ شیرو گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ (واقعی۔ بھائی کمال کا تھا۔ ایک اس سے تو نہ قتل ٹھیک سے ہوا' نہ ایک لڑکی پٹ سکی۔) سینے میں ٹیس سی اٹھی۔

☆ ☆ ☆

سینکڑوں طوفان لفظوں کے دبے تھے زیر لب
ایک پتھر تھا خموشی کا کہ جو ہلتا نہ تھا

انیکسی میں وہ صبح خاموشی سے پھیلی تھی۔

لاؤنج میں ابا بیٹھے نظر آرہے تھے۔ ساتھ صوفے پہ زمر پیر اوپر رکھے بیٹھی' لیپ ٹاپ گود میں رکھے' کانوں میں ایئر فونز لگائے ہوئے تھی۔ اسکرین پہ جو ونڈو کھلی تھی' اس سے ظاہر تھا کہ وہ فارس کے آڈیو سیشنز سن رہی تھی۔ بہت سے سن لیے تھے اور بہت سے رہتے تھے۔ پچھلے کچھ دنوں سے اس کا یہی معمول تھا۔ جب وقت ملتا' اسی طرح بیٹھ کر اس کی باتیں سنتی رہتی۔ پتا نہیں کیوں عادت سی ہوتی جا رہی تھی اس کی آواز کی۔

ابا مسلسل خاموشی سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔ وہ ان آوازوں سے بے خبر تھے' جو زمر کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

"تمہیں اپنی بیوی سے محبت تھی؟" ڈاکٹر ایمن پوچھ رہی تھی۔ زمر کے ابرو سکڑے' ابا نے محسوس کیا وہ دھیان سے سننے لگی ہے۔

"وہ میری بہت اچھی دوست تھی' انڈرسٹینڈنگ تھی ہمارے درمیان' ہمدردی' خیال کا رشتہ تھا' اور کیا ہوتی ہے محبت؟"

"مطلب کہ محبت نہیں تھی۔"

"وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی اور میں اس کو بہت مس کرتا ہوں' جیل میں تو بہت زیادہ۔ آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں' کیوں کہ میں صرف سچ بولنا چاہتا ہوں اور میرا سچ آپ کے علاوہ کوئی سننا نہیں چاہتا۔"

"تمہیں کسی اور سے محبت تھی' ہے نا؟"

"مجھے جج کیوں کر رہی ہیں آپ؟" وہ دھیرے سے بولا تھا۔

"یہ میری جاب ہے۔ تمہارے اندر کے خیالات

باہر لاتا' مگر یہ محفوظ رہے گا۔ تم جانتے ہو' confidentiality کے پانچ C ۔"

"واٹ ایور!"

"تو اس سے شادی کیوں نہیں کی جس سے تھی؟"

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ زمر کو بے چینی ہوئی' کہیں آگے ٹیپ خالی تو نہیں؟ مگر پھر فارس کی آواز ابھری۔

"ہو نہیں سکی۔"

"اس نے انکار کر دیا؟"

"پتا نہیں۔"

(اف' اس کو کیا مسئلہ ہے' ٹھیک سے بتاتا کیوں نہیں ہے؟ بات گھمانی ضرور ہے؟) وہ چڑی۔

"کبھی بتایا اس کو؟"

ذرا وقفہ ہوا۔ "میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔ یہ کس چیز کا انجکشن تھا۔" ایک دم زمر چونکی۔

"تمہاری اجازت سے لگایا ہے' یہ truth serum تھا۔ میں چاہتی تھی' تم سچ بولو۔"

زمر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ اس کی آواز میں تکلیف محسوس کر سکتی تھی۔ (کیا ڈاکٹر نے اس کو سائیکو ایکٹو ڈرگز دے کر اعتراف کروایا تھا؟) فارس سے سارے اختلاف اپنی جگہ' اس کا اعتراف قتل سننے کا اشتیاق اپنی جگہ' مگر اس کے اندر کی انصاف پسند لڑکی کو کچھ بہت برا لگ رہا تھا۔

"آئندہ مجھے یہ انجیکٹ مت کیجئے گا۔" وہ نیم غنودگی میں بول رہا تھا۔ "جو پوچھنا ہے ایسے ہی پوچھ لیا کریں۔"

"اوکے' اس لڑکی کا بتاؤ' اسے کبھی بتایا یا نہیں؟"

"نہیں۔" اس کی آواز آہستہ آہستہ ڈوبتی جا رہی تھی۔

"کبھی کوشش کی؟"

"کی تھی۔"

"کیسے؟"

"میں نے اسے... ایک ہیرا دیا تھا۔"

وہ جو چہرے پہ اذیت لیے سن رہی تھی' ایک دم ٹھہر سی گئی۔ بالکل مبہوت۔

"کون تھی وہ؟"

"میرے نروز بہت مضبوط ہیں' ڈاکٹر! جو نہیں بتانا چاہتا۔ نہیں بتاؤں گا۔" آواز ہلکی اور غنودہ تھی۔ چند لمحے کی خاموشی۔

"فارس! تم نے اپنے بھائی کو کیوں قتل کیا؟" نرمی سے پوچھا۔

"میں نے نہیں کیا۔" گہری سانس لینے کی آواز۔

"اوکے۔ تم سو جاؤ۔" چند منٹ کی خاموشی کے بعد سیشن ختم ہو گیا۔ وہ متحیر' الجھی' حیران سی بیٹھی رہی۔ پتا نہیں اس کا دل کس بات پہ دکھا تھا۔ اور حیرت کس بات پہ تھی۔

"چھوڑو زمر۔ اس کو لڑکیوں میں ہیرے بانٹنے کی عادت ہے؟ ایک اپنی ٹیچر کو دیا' ایک اس لڑکی کو اور زرتاشہ کا ولیمہ کا سیٹ بھی ڈائمنڈ کا تھا۔ ہونہہ!" ایئر فونز اتارتے ہوئے وہ تکلیف میں ڈوبی آواز کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ "اچھا بالفرض وہ میری بات کر بھی رہا تھا تو وہ تب کی بات تھی۔ اب تو میں اس کی دشمن ہوں۔"

"کیوں پریشان ہو؟" ابا کی آواز پہ وہ چونکی۔ وہ اسی کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے سر جھٹکا۔

"بس... ایک پرانا کیس اسٹڈی کر رہی تھی۔" اٹھ کر چیزیں سمیٹنے لگی۔ انہوں نے یاسیت سے اسے دیکھا۔

"کتنے عرصے سے ہم نے بات نہیں کی۔ تمہارے پاس اب وقت نہیں ہوتا زمر!"

وہ ٹھہر گئی۔ دل کو دھکا سا لگا۔ "ایسا نہیں ہے۔ میں سعدی والے معاملے میں الجھی رہتی ہوں۔ ورنہ... آپ کو پتا ہے آپ پہ طنز کرنے کا موقع میں چھوڑا نہیں کرتی۔" رسان سے کہتی' ان کے قریب آ بیٹھی۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔

"سعدی مل جائے گا۔ میں بہت دعا کرتا ہوں۔ دنیا میں ایسا کچھ نہیں ہے جو دعا سے نہ مل سکتا ہو۔"

وہ اداسی سے مسکرائی تب ہی فون بجا۔ نمبر دیکھا تو

اس دن وہ واقعی اسے اسٹپنی لگا۔ "سوری ابا! مجھے یہ کال لینی پڑے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔" انہوں نے گہری سانس بھری۔ اب وہ بات کرتی سیڑھیوں پہ چڑھتی جا رہی تھی۔

"مسز زمر! میں اسی ہوٹل سے آرہا ہوں۔" وہ بتا رہا تھا۔ "تصاویر میں نیچے ایک ہورڈنگ بورڈ نظر آرہا ہے۔ پورے ہوٹل میں اوپر نیچے صرف نو ایسے کمرے ہیں جن سے یہ اینگل بن سکتا ہے۔"

"آپ نے نو کے نو کمرے دیکھے؟"

"جی۔ مگر پکچرز اسی کمرے سے لی گئی ہیں جس سے آپ پہ فائرنگ کی گئی۔"

"وہ کیسے؟" زمر نے بات کاٹی۔ (اف 'اس کے معالج کو سو درے تو لگنے چاہئیں۔) مگر بظاہر تحمل سے بولا۔

"دیکھیں، تصویر میں کھڑکی کے پٹ پہ ایک نشان سا ہے' کیل وغیرہ ٹھونک کر نکالنے کا۔ یہ نشان مجھے ان نو کمروں کی کسی کھڑکی پہ نہیں ملا۔ سوائے اسی کمرے کے۔ اب پینٹ کی وجہ سے ڈھک گیا ہے' لیکن موجود ہے۔"

"یعنی ہمارا اڑانی کلیکٹر بھی اسی کمرے میں موجود تھا۔ تو وہ فارس کے جانے کے بعد آیا ہو گا؟"

"نہیں' وہ کافی دیر سے یہاں تھا۔"

"احمر! میں بہت احسان مند ہوں گی اگر آپ ایک ہی سانس میں پوری بات بتا دیں۔" وہ اکتائی۔

(یہ ہوئے پورے ایک سو پچاس درے!)

"تصاویر میں کھڑکی کے شیشے میں جو عکس پڑ رہا ہے' اس میں میز کے اوپر کرے ایش ٹرے نظر آرہی ہے۔ زوم کر کے دیکھا ہے میں نے' مگر ہوٹل کی کراکری میں تمام ایش ٹریز اب بھی اور تب بھی 'شفاف شیشے کی ہیں۔ سو غور کیا تو معلوم ہوا کہ ایش ٹرے سگریٹ کی راکھ سے بھری ہونے کے باعث گرے لگ رہی ہے۔ یعنی ہمارا اڑانی کلیکٹر کافی دیر سے بیٹھا انتظار کرتے ہوئے سگریٹ پھونک رہا تھا۔ چین اسموکر ہے وہ۔ اور غازی سگریٹ نہیں پیتا۔"

زمر چند لمحے خاموش رہی۔

"یعنی وہ فارس کے ساتھ تھا؟"

"یا شاید غازی اس کے ساتھ تھا ہی نہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے واقعی فریم کیا گیا ہو۔"

"اس کو بے گناہ مت سمجھیں' اس نے یہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے۔" مگر لہجہ اتنا سخت اور مضبوط نہیں تھا۔

"مجھے اس اڑانی کلیکٹر کے بارے میں مزید کچھ ٹھوس معلوم کر کے دیں۔ آپ یہ بھی کر سکیں' تب بھی آپ کی فونیج آپ کو دے دوں گی۔" احمر کے اندر تک ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ (چلو پچاس درے واپس لیے!)

وہ فون رکھ کر آئی تو ابا کو سیم لان میں لے جا رہا تھا۔ اور فارس باہر سے آرہا تھا۔ زمر نے جلدی سے آکر اپنا لیپ ٹاپ آف کیا۔ وہ سیدھا اس تک آیا۔

"آپ کا اندازہ درست تھا۔ ڈاکٹر بخاری کو سعدی کو غائب کرنے کے لیے کوئی رقم نہیں دی گئی۔" وہ چند کاغذات اس کی طرف بڑھاتے بولا۔ "مگر ایک ماہ قبل کچھ فارن ڈونرز نے اسپتال کے لیے مشینری عطیہ کی ہے۔"

"سارا پیپر ورک کلین ہے۔ قانونی طور پہ اب ان کو کوئی نہیں پکڑ سکتا۔" وہ کاغذات الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا' ایسی مسکراہٹ جس میں شدید تپش تھی۔

"قانون کی بات ہی کون کر رہا ہے؟ اس وقت جج' جیوری اور جلاد 'فارس طہیر غازی ہے!"

سینے پہ انگلی سے دستک دی اور اوپر چڑھتا گیا۔ زمر نے بے اختیار مڑ کر اسے دیکھا تھا۔



میں بڑھتا ہوں زندگی کی جانب لیکن
زنجیر سی پاؤں میں چھنک جاتی ہے

ان سے دور' اس مٹیالے رنگ کی دیواروں والے کمرے میں وہ بیڈ پہ پیر اوپر کر کے بیٹھا تھا۔ اپنے قرآن کو ہاتھ میں لیے' وہ سرورق پہ ہاتھ پھیرتا کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر چہرہ اٹھایا۔ قرآن کھولا۔ پانی کے جگ کو دیکھا جو

سائیڈ ٹیبل پہ دھرا تھا۔ اس میں اپنا عکس نظر آیا۔ گردن کے نشان واضح تھے' باقی سب کچھ مندمل ہوچکا تھا۔ اس نے گننے کی کوشش کی۔ یہ اگست کے آخری دن تھے۔ اسے تین ماہ ہوچکے تھے اس قید میں۔ خیر۔ میرا وقت بھی آئے گا۔

نظر میری پہ پڑی جو سامنے کاؤچ پہ بیٹھی تھی۔

"تم نے کیا کیا تھا جو مسز کاردار نے نوکری سے نکالا؟"

"روز روز یہ سوال مت دہرایا کرو۔" اکتا کر میگزین لیے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ اسے اس کو باہر ہی نکالنا تھا سو اب آرام سے توجہ قرآن کی طرف مبذول کی۔

"میں پناہ چاہتا ہوں اللہ کی دھتکارے ہوئے شیطان سے۔ شروع اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔"

اس روز وہ چیونٹی والا قصہ پورا بھی نہیں پڑھ پایا تھا' جب مایا نے اسے انجکشن دیا تھا۔ پھر بعد میں صرف ناظرہ تلاوت کرتا رہا کچھ دن۔ کہاں تھا وہ تفسیر میں؟ مطلوبہ آیت ڈھونڈ کر زیر لب پڑھنے لگا۔

"تو (سلیمان) مسکرا دیے ہنستے ہنستے' اس (چیونٹی) کی بات پر..." سعدی وہیں رکا۔

مسکرا دیے' ہنستے ہنستے؟ پتا ہے کیا اللہ میں نے بہت دفعہ سوچا کہ ان الفاظ کی کیا ضرورت تھی قرآن میں؟ دیکھیں نا' یہ تو افسانہ نگار کرتے ہیں' کرداروں کے چہرے کے تاثرات' ہنسی' وغیرہ بتانا۔ قرآن میں مگر کچھ بھی ایکسٹرا نہیں ہوتا۔ تو اس کی وجہ... خیر وجوہات تو بہت سی ہوں گی' مگر مجھے یہ سمجھ میں آیا کہ دیکھیں' یہی قصہ تورات میں یوں لکھا ہے کہ چیونٹی کی بات سے سلیمان علیہ السلام کو غصہ آیا' انہوں نے اسے ڈانٹ دیا' وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس آیت نے دوسری آسمانی کتابوں میں درج اس مسخ شدہ قصے کو گویا کینسل کردیا' اور بتایا کہ آپ کے انبیا کتنے پیارے اور نرم دل لوگ تھے۔" نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھا۔ "اور دوسری بات' آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کہ "وہ ہنستے ہنستے مسکرا دیے"۔ میں نے ان دو الفاظ پہ غور کیا تو یہ لگا کہ خالی "وہ مسکرا دیا" بھی کہا جاسکتا تھا۔ پھر "ہنستے ہنستے مسکرا دیا" کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر احساس ہوا کہ غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کو چیونٹی کی بات نے اتنا لطف دیا تھا کہ وہ ہنسنے کو تھے' مگر ضبط کرکے صرف مسکرا دیے۔ انبیا بہت مسکرانے والے لوگ تھے' مگر ان کے مسکرانے میں بھی مینوز ہوتے تھے' گریس تھی' وقار تھا۔ وہ اونچا قہقہہ نہیں لگاتے تھے' ایسے نہیں کہ حلق کا کوا نظر آئے' اسی لیے ان کے دل زندہ تھے۔ کیا کوئی ہے جو میرے انبیا کا مقابلہ کرسکے؟"

ان قدیم قصے کہانیوں کو پڑھتے ہوئے وقت کا احساس ختم ہوجاتا تھا۔ وہ اپنا کمرہ' گھٹن' ان تین ماہ کی اذیت' ہاشم کی باتیں' سب بھولتا جارہا تھا اور پڑھتا جارہا تھا۔

"پھر (سلیمان) اس کی بات سے ہنستے ہنستے مسکرا دیے اور کہنے لگے' اے میرے رب' مجھے توفیق دے کہ میں آپ کے احسان کا شکر کروں جو آپ نے مجھ پہ کیا اور میرے ماں باپ پہ کیا اور یہ کہ میں وہ نیک کام کروں جو آپ پسند کریں اور مجھے اپنی رحمت سے نیک بندوں میں شامل کرلیں۔"

"ہوں!" اس نے تھکی ہوئی سانس لی۔ "سو... سلیمان علیہ السلام نے احسان کا شکر کرنے کا کہا تو... اپنے ماں باپ کا ذکر کیوں کیا؟ ایک منٹ" گھنگھریالے بالوں والا لڑکا ہونٹ دبا کر سوچنے لگا۔

"وہ چیونٹی کی ذہانت پہ مسکرائے تھے' بات تو چیونٹی کی ہورہی تھی' تو سلیمان علیہ السلام کو اپنے ماں باپ کا خیال کیوں آیا؟ شاید اس لیے کہ..." وہ سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "یہ ماں باپ ہی ہوتے ہیں جو اولاد کو یہودی' عیسائی یا مسلمان بناتے ہیں' نمازی یا بے نمازی بناتے ہیں' ورنہ پیدا تو ہر کوئی اللہ کی فطرت پہ ہوتا ہے۔ یعنی کہ... شکر ادا کرنا بھی "توفیق" سے ملتا ہے۔ "توفیق" بھی "دعا" سے ملتی ہے۔ مطلب کہ دنیا میں ہر چیز دعا سے ملتی ہے۔ اگر دعاؤں سے یقین اٹھ جائے تو اس "یقین" کے لیے بھی دعا مانگی جاتی ہے۔ اور دیکھیں اللہ! سلیمان علیہ السلام تو پیغمبر تھے۔ وہ آل

ریڈی اتنے نیک تھے۔ پھر بھی دعا کر رہے ہیں کہ اللہ آپ مجھے نیک بندوں میں شامل کرلیں اور پھر وہ نیک کام جو اللہ آپ پسند بھی کریں۔"

کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ دل میں بول رہا ہے یا زبان سے کہہ رہا ہے۔

"اللہ تعالیٰ! میں اکثر دیکھتا ہوں 'لوگ میوزک شوز منعقد کرکے چیریٹی جمع کرتے ہیں 'اب کوئی مانے یا نہ مانے 'موسیقی کی اجازت اللہ تعالیٰ آپ نے ہمیں نہیں دے رکھی 'اور کسی کے نہ ماننے سے حرام 'حلال نہیں ہو جائے گا 'سو انسان کو نیک کام کرتے وقت سوچنا چاہیے کہ یہ اللہ کے اصولوں کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ ورنہ جیسے اللہ آپ نے کہہ رکھا ہے کہ بعض اوقات اللہ گناہ گاروں سے بھی دین کا کام کروا لیتا ہے۔ یعنی کہ اگر نیت یا طریقہ درست نہ ہو تو ہم بہت عمل کرنے والے مگر صرف تھکنے والے ہوں گے؟ عاملة ناصبة۔ اف! میں صرف ڈرانے والی باتیں کیوں سوچتا اور کرتا ہوں؟" جھرجھری لی۔ "شاید اس لیے کہ مجھے لگتا ہے ہر وقت لوگوں کو اور خود کو "سب معاف ہو جائے گا" اور "جنت کی حوروں" کا کہہ کہہ کر سلائے رکھنا نقصان دہ ہوتا ہے۔ بار بار انسان کو Reality Check (حقیقتوں کا ادراک) ملتے رہنا چاہیے۔"

"خیر" وہ اگلی آیت کی طرف بڑھا۔

اور (سلیمان نے) پرندوں کی حاضری لی تو کہا 'کیا بات ہے۔ جو میں ہدہد کو نہیں دیکھتا؟ کیا وہ غیر حاضر ہے؟ میں اسے سخت سزا دوں گا 'یا اسے ذبح کردوں گا یا وہ میرے پاس کوئی واضح دلیل لے کر آئے۔"

"تو ثابت ہوا اللہ کہ حسن اخلاق اور چیز ہے 'اور ڈسپلن کے لیے سخت اصول بنانا اور چیز ہے۔ خیر۔" نگاہیں اگلی آیت پہ جمائیں۔

"پھر تھوڑی دیر بعد ہدہد حاضر ہوا اور کہا کہ میں حضور کے پاس وہ خبر لایا ہوں جو حضور کو معلوم نہیں 'اور لایا ہوں ملک سبا سے یقینی خبر۔ میں نے ایک عورت کو پایا ہے 'جو ان پہ حکمرانی کرتی ہے (ملکہ سبا) اور اسے ہر چیز دی گئی ہے 'اور اس کا بڑا سا تخت ہے۔ میں نے پایا ہے کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے سوا سورج کو سجدہ کرتے ہیں 'اور شیطان نے ان کو ان کے اعمال خوب صورت کرکے دکھائے ہیں 'اور انہیں راستے سے روک دیا ہے 'سو وہ درست راہ پہ نہیں چلتے۔"

اس دلچسپ قصے کو پڑھتے پڑھتے وہ ان الفاظ پہ ٹھہرا۔

"شیطان نے ان کے اعمال ان کو خوب صورت کرکے دکھائے ہیں؟ مطلب کہ یہ مسئلہ کیا ہے شیطان کے ساتھ؟" ایک دم سے اسے بہت زیادہ غصہ آیا۔ "کیا یہ انسان کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا؟ ہمیں بری چیزیں اچھی بنا کر دکھانا ترک نہیں کرسکتا؟ ہم سکون سے اللہ کی عبادت کیا کریں 'شکر کیا کریں۔ حلال کھائیں 'لوگوں سے بھلائی کریں 'آپ نا شیطان کو لاک اپ کردیں کبھی اور۔" بولتے بولتے وہ رکا۔ "اور۔ رمضان میں یہی تو ہوتا ہے مگر۔ پھر بھی۔" نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھا۔

"اچھا سوری 'یہ شیطان کو لاک اپ والی بات واپس لیتا ہوں میں۔ خواہ مخواہ ایموشنل ہو گیا میں۔" سر جھٹک کر آیات کی طرف دھیان دیا۔ وہاں ہدہد کہہ رہا تھا۔

"اللہ ہی کو کیوں نہ سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزوں کو ظاہر کرتا ہے؟ اور جو تم چھپاتے ہو 'اور جو تم ظاہر کرتے ہو 'سب کو وہ جانتا ہے۔ اللہ ہی ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔"

"ویسے اللہ تعالیٰ۔" وہ ستائش سے کہنے لگا۔ "ایک بات ہے۔ ہدہد بہت ہی سیانا تھا۔ مطلب کہ۔ ہدہد۔ ایک پرندہ۔ ملکہ سبا کے عظیم الشان تخت کو دیکھ کر بھی اے اللہ وہ آپ کا وہ عرش عظیم نہیں بھولا جو اس نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ ایک ننھا سا پرندہ بھی دل کا ایسا بادشاہ ہے کہ اس کو ملکہ کی شان و شوکت نے یوں مرعوب نہیں کیا کہ وہ اللہ کو بھول جائے۔ مگر ہم کیا

کرتے ہیں؟ کسی اشں ہش چمکتے مال میں جائیں' کسی سیون اسٹار ہوٹل کے فنکشن میں چلے جائیں' تو دولت کی ریل پیل نگاہوں کو یوں خیرہ کردیتی ہے کہ ہم سب بھول جاتے ہیں۔ اکثر اچھی اچھی عبایا یا اسکارف کرنے والی لڑکیاں یورپ یا امریکہ چلی جائیں تو ایک ہفتے میں حجاب اتر جاتا ہے۔ وہ مغربی لباس کو اپنا لیتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں' ملک بدلنے سے اللہ تو نہیں بدلتا۔ دین تو نہیں بدلتا۔ ایک پرندے کو بھی جو بات پتا ہے' وہ ہمیں کیوں بھول جاتی ہے؟"

وہ کچھ دیر یونہی بیٹھا بڑبڑاتا رہا۔ کڑھتا رہا۔ پھر قرآن رکھا' دعا مانگی۔

"مجھے کم از کم اتنا مضبوط تو کردیں جتنا وہ ہدہد تھا۔ دل کا بادشاہ۔" اور یہ تو سعدی یوسف کی 25 سالہ زندگی کے تجربوں کا نچوڑ کہتا تھا کہ قرآن پڑھنے کے بعد مانگی جانے والی دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے۔ سو دعا مانگ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دیوار پہ لگے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ وہ نیلی جینز اور سیاہ شرٹ میں ملبوس تھا۔ چہرہ قدرے کمزور مگر آنکھیں سنجیدہ لگتی تھیں۔ خود کو دیکھتے وہ سوچتا رہا۔ پھر دروازہ بجایا۔ میری اور گارڈ اسے کھولتے ہی سامنے نظر آئے۔

"میں کھانا لا رہی ہوں' تم۔"

"مجھے ہاشم سے بات کرنی ہے۔ ابھی اسی وقت۔ اور تم۔" گارڈ کو دیکھا۔ "مجھے گھورو مت۔ اپنی گن کی نمائش بھی مت کرو میرے سامنے۔ مجھے کبھی شوٹ کیا نا تو تمہارا مالک تمہیں شوٹ کردے گا۔ اس کمپاؤنڈ میں اگر کوئی نہیں مرنے والا تو وہ میں ہوں۔ اب فون لاکر دو مجھے۔"

میری اس کی تبدیلی پہ حیران ہوئی مگر بلا چوں چرا فون لاکر اس کو تھمایا۔ "وہ لائن پہ ہیں۔ یہ صرف ون وے فون ہے' اس لیے کال بند کر کے کسی اور کو کرنے کی زحمت مت کرنا۔" ساتھ ہی اسے گھورا۔ سعدی نے وہیں کھڑے کھڑے فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔

"مسٹر ہاشم کاردار۔ سنا ہے اس روز آپ مجھ سے ملنے آئے تھے۔"

"وعلیکم السلام سعدی۔"

"طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ السلام وعلیکم ایک دعا ہے' اور دعا وہ آخری چیز ہے جو میں تمہیں دوں گا۔ فی الحال تو ہاشم' میرے پاس تمہیں دینے کے لیے ایک فہرست ہے۔" چبا چبا کر کہہ رہا تھا اور ادھ کھلے دروازے میں میری اور گارڈز ہکا بکا کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اسے اس لہجے میں بات کرتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"میں سن رہا ہوں۔"

"میرا خیال تھا' تمہارا ٹیسٹ اچھا ہے۔ مگر جو کھانا مجھے دیا جاتا ہے' وہ تمہارے کتے بھی نہیں کھاتے ہوں گے' اس لیے آئندہ جو میں بتاؤں گا' وہی مینو مجھے دیا جائے' مجھے میری مرضی کی کتابیں' پین اور لکھنے کے لیے صاف جرنلز چاہئیں۔ مجھے ایک ٹی وی چاہیے۔ جس پہ میرے ملک کے لوکل چینلز آتے ہوں۔ مجھے کپڑوں کے دس نئے جوڑے چاہئیں' اور مجھے واک کرنے کے لیے کوئی جگہ چاہیے۔ اسی کمپاؤنڈ کا کوئی بڑا کمرہ ہو بے شک۔"

"اور کچھ؟" سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

"اور بس اتنا کہ اس روز جو تم نے کیا' وہ بزدلانہ حرکت تھی۔ مجھے مفلوج کردیا کیونکہ تم میرے ری ایکشن سے ڈرتے تھے۔ اتنا بھی کیا ڈرنا ہاشم؟ میں تم پہ تب جھپٹتا جب مجھے تمہارے کسی لفظ کا اعتبار ہوتا۔ مگر تم جھوٹ بول رہے تھے۔ وہ تصویریں اور وہ باتیں تم نے میرا ذہن خراب کرنے کے لیے کہی تھیں۔ اس لیے میں نے ان کو پھاڑ دیا ہے کیونکہ میری بہن نے تم سے کوئی غلط بات نہیں کہی۔ وہ تم سے یو ایس بی کا ہی پوچھ رہی تھی۔ اس لیے میں تمہیں دعوت دیتا ہوں۔ میرے پاس آؤ' میرے سامنے بیٹھو اور میری آنکھوں میں دیکھ کر وہ سب دہراؤ جو تم نے اس دن کہا مگر مجھے مفلوج نہ کرو۔ پھر دیکھو' میں کیا جواب دیتا ہوں۔ تمہیں اپنی آفر کا جواب چاہیے نا؟"

"سعدی! مجھے تمہاری بہن میں کوئی انٹرسٹ

نہیں۔ میرے نزدیک وہ میری بیٹی کی عمر کی ہے' لیکن جو میں نے کہا' وہ خالی دھمکی نہیں تھی۔ میں کرنے پہ آؤں' تو کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"فون پہ نہیں ہاشم۔ میرے سامنے' میری آنکھوں میں دیکھ کر یہ بات کہنا۔" اور فون میری کی طرف بڑھا دیا۔ ہاشم نے فون رکھتے ہی انٹرکام اٹھایا۔

"کیپٹن اشعر سے کہو' ہفتے کے روز جیٹ تیار رکھے' مجھے ملک سے باہر جانا ہے' کسی کا دماغ درست کرنا ہے۔" اپنے پرائیویٹ جیٹ کے پائلٹ کے لیے پیغام دے کر اس نے ریسیور واپس ڈال دیا۔

اور ادھر سعدی کے کمرے میں کھڑی میری نے فون گارڈ کو دے کر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلا گیا تو وہ دروازہ بند کر کے چند لمحے اس کو دیکھتی رہی۔

"نیکلس!"

"کیا؟" سعدی نے ابرو اٹھائی۔

"میں نے مسز کاردار کا نیکلس چرایا تھا۔ اسی لیے انہوں نے مجھے نوکری سے نکالا۔"

اور پھر اس کو دیکھے بنا باہر چلی گئی۔ سعدی وہیں کھڑا گہرے سانس لیتا' خود کو نارمل کرنے لگا۔ دل کا بادشاہ بننا اتنا مشکل نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

کرو کج جبیں پہ سر کفن' میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرور عشق کا بانکپن' پس مرگ ہم نے بھلا دیا

وہ رات گرم تھی' اور بے رحم۔ ٹھنڈی تھی اور منتقم۔

اس علاقے میں ویران پلاٹ تھے یا فاصلے پہ عمارتیں۔ رات کے اس پہر سڑک سنسان تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اسٹریٹ لائٹس بھی اچانک آف ہو گئی تھیں۔ ایسے میں ڈاکٹر ایمن کے نو تعمیر شدہ اسپتال کی عمارت اس وقت اندھیری پڑی تھی۔ دروازے پہ تالا لگا تھا۔ اور باہر دو گارڈز بیٹھے تھے۔ وہ آپس میں اسٹریٹ لائٹس کی بات کر رہے تھے۔ پیڈسٹل فین ساتھ ہی چل رہا تھا۔ ایک گارڈ جمائی لیتے ہوئے منہ پہ ہاتھ رکھ ہی رہا تھا کہ دفعتاً" اس کے کندھے میں کوئی شے آ کر چبھی۔

چبھن شدید تھی' پھر ہلکی ہوتی گئی۔ جسم کسی خالی بادل کی مانند ہو رہا تھا۔ گردن اور کندھے کے درمیان کوئی سرنج سی چبھی تھی۔ کن اکھیوں سے اسے نظر آیا کہ ساتھ والا گارڈ کرسی سے نیچے گرتا جا رہا تھا۔ اس کا اپنا جسم بھی ڈھلک رہا تھا۔ اور اسی ڈھلکی گردن سے اس نے دیکھا۔ وہ جو گرز والے پیر اس کے سامنے آ رکے تھے۔ جو گرز سے اوپر جینز نظر آئی' اس سے اوپر نہ دیکھ سکا اور غنودگی میں ڈوبتا گیا۔

جینز کے اوپر اس نے سیاہ شرٹ پہن رکھی تھی جس کی آستینیں کلائی سے بالشت بھر پیچھے ختم ہو جاتی تھیں۔ نگاہ اوپر اٹھاؤ تو اس کا چہرہ نظر آتا تھا جو اس وقت پتھریلا سا تھا۔ چھوٹے کٹے بال اور ہلکی بڑھی شیو۔ آنکھوں میں سرد تپش تھی۔ اور پہلو میں گرے ہاتھ میں پستول تھی۔ اندھیرے میں بھی فارس غازی کی ٹھنڈی آنکھوں میں چبھن نظر آتی تھی۔

"ڈاکٹر ایمن میرے ساتھ دوہرائیے۔ میں اللہ کو حاضر۔ ناظر جان کر حلف اٹھاتی ہوں کہ جو کہوں گی سچ کہوں گی' سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔" تین سال پہلے وہ سفید کرتے میں ملبوس ڈیفنس کی کرسی پہ بیٹھا' سلگتی ہوئی نظروں سے کٹہرے کو دیکھ رہا تھا جہاں کھڑی ڈاکٹر ایمن سے حلف لیا جا رہا تھا۔

"میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ جو کہوں گی سچ کہوں گی' اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔"

"اور عدالت سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔"

"اور عدالت سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔"

فارس نے پستول پچھلی جیب میں اڑسا۔ جھکا۔ دونوں گارڈز کی گردنوں سے ٹرنکولائزر ڈارٹس darts نکال کر کندھے پہ لٹکے بیگ میں ڈالے۔ پھر ایک کو کندھوں سے گھسیٹتا ہوا سڑک کے اس پار لے جانے لگا جہاں جھاڑیاں تھیں۔

"کیا آپ اس شخص کو پہچانتی ہیں ڈاکٹر ایمن؟"

"جی۔ یہ وارث غازی کی تصویر ہے۔ وہ میرا پیشنٹ تھا۔ تین ماہ تک وہ میرے پاس آتا رہا تھا۔"

"آپ جانتی ہیں جج نے آپ کو ڈاکٹر پیشنٹ Previlige مریض اور ڈاکٹر توڑنے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے آپ وارث غازی کے سیشنز کی نیچر سے عدالت کو مطلع کریں۔"

اب دونوں بے سدھ ہوئے گارڈز دور جھاڑیوں میں اوندھے پڑے تھے۔ اور وہ کندھے پہ بیگ لٹکائے' واپس اسپتال کی عمارت تک چلتا جارہا تھا۔ اب ایک ہاتھ میں چھوٹا کلہاڑا بھی نظر آرہا تھا۔ دروازے کے سامنے وہ رکا' اور زور سے کلہاڑا تالے پہ مارا۔ تالہ ٹوٹا۔ اس نے جوگر سے دروازے کو ٹھوکر ماری۔ دروازہ اڑتا ہوا دوسری طرف جالگا۔ وہ اندر داخل ہوا۔

"وارث پریشان تھا۔ اور گلٹی بھی۔ اس نے بتایا' اور یہ سب میرے نوٹس میں بھی لکھا ہے۔ جو میں نے عدالت کے حوالے کیے ہیں کہ وہ اپنے بھائی فارس کی بیوی کو پسند کرتا تھا اور اس کے اس کے ساتھ تعلقات تھے۔"

کٹہرے میں کھڑی عورت سکون سے کہہ رہی تھی اور سامنے بیٹھا سفید کرتے والا غازی' اس کو ان ہی چبھتی نظروں سے دیکھے جارہا تھا۔ آنکھوں میں سرخی آرہی تھی اور مٹھی بھنچی ہوئی تھی۔ "اس نے کہا کہ شروع میں لڑکی راضی نہیں تھی' سب زبردستی ہوا' مگر اب وہ بھی مکمل طور پہ انوالو ہو چکی تھی۔ وہ بہت گلٹی تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کے بھائی کو علم نہ ہو جائے۔"

اس نے سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مارا۔ بتیاں روشن ہونے لگیں۔ اندر سے اسپتال ٹائلز کے فرش اور سفید دیواروں سے جگمگا رہا تھا۔ قیمتی فرنیچر' بہترین مشینری۔ بس دو مہینے بعد وہ افتتاح کے لیے تیار تھا۔ وہ بتیاں جلاتا' آگے بڑھتا گیا۔ آنکھوں میں سرد سی ٹھنڈ لیے۔ وہ ایک ایک کمرے کو دیکھتا جارہا تھا۔

"اپنی موت سے دو دن قبل وہ میرے پاس آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے بھائی کو اس کے افیئر کا علم ہو گیا ہے اور وہ اس سے چھپتا پھر رہا ہے۔ اسی لیے وہ گھر نہیں جارہا۔ بلکہ ہاسٹل میں رہ رہا ہے۔ وہ تنہائی میں فارس سے ملنے سے گھبرانے لگا ہے۔"

فارس قدم قدم چلتا آگے بڑھ رہا تھا۔ تین سال پہلے کے عدالتی کمرے کی ساری کارروائی اس کے چہرے پہ اترے سردپن کے اندر کرب میں پنہاں تھی۔

"جی ہاں' فارس غازی کے لیے بھی کورٹ نے مجھے اپائنٹ کیا تھا۔ میں پچھلے آٹھ ماہ سے فارس کا علاج کر رہی ہوں۔ اپنے کلائنٹ کا پری ویلج توڑتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ کانفیڈینشلٹی کے پانچ C's میں سے ایک اگر Consent ہے تو وہ میرا مریض مجھے نہیں دے گا۔" نظروں کا رخ فارس کی طرف موڑا۔ وہ ان ہی سرخ گلابی آنکھوں سے اسے دیکھے جارہا تھا۔ "دوسرا سی کورٹ آرڈر ہے مگر میرے نزدیک اس سے زیادہ اہم Treatment Continued ہے۔ اور فارس کے لیے یہ بہتر ہے کہ میں یہ سب کورٹ کو بتاؤں۔ آئی ایم سوری فارس!"

وہ وسط کمرے میں آکھڑا ہوا۔ بیگ کھولا' اور اندر سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالا۔ پہلے صفحے پہ چند الفاظ نظر آئے۔ سرکار بنام فارس غازی۔ پی ڈبلیو (پراسیکوشن Witness) ڈاکٹر ایمن کی گواہی۔ وہ ان ہی سرد آنکھوں میں آنچ لیے اس پلندے کو دیکھ رہا تھا۔

"ٹریٹمنٹ کے دوران فارس نے مجھے بتایا کہ اسے پہلے دن سے اپنی بیوی کی حرکتیں پسند نہیں تھیں۔ وہ امیچور اور بچکانہ سی تھی۔ مگر وہ اس کو چانس پہ چانس دینے لگا۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے اپنی بیوی کو اپنے بھائی کے ساتھ دیکھ لیا۔ اس کی غیرت کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ وہ دو دن سو نہیں سکا۔ کسی کو بتا نہیں سکا۔ وہ اندر سے ٹوٹ چکا تھا۔"

"کیا آپ نے اس سے یہ اعتراف کروانے کے لیے کبھی کوئی ڈرگ استعمال کی؟"

اس نے بیگ سے ایک چھوٹی استری نکالی۔

کاغذوں کا پلندہ میز پہ رکھا اور استری کا لوہا کاغذوں کے اوپر لٹا دیا۔ پلگ لگا کر سوئچ آن کیا۔ پھر کلہاڑا اٹھایا۔

"اس شخص کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ان دونوں کو قتل کر دے مگر وہ گرفتار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے پوری کوشش کی کہ یہ آنر کلنگ نہ لگے۔ فارس غازی نے 2 نومبر اور اٹھائیس جنوری والے سیشن میں اعتراف کیا تھا کہ اس نے یہ دونوں قتل کیے ہیں' اور اسے ان پہ بہت افسوس ہے۔ آپ میرے نوٹس چیک کر سکتے ہیں۔ آڈیو ٹیپ کی اجازت اس نے مجھے نہیں دی تھی۔ اب میں یہ سب اس لیے کورٹ کو بتا رہی ہوں کیونکہ اگر آپ نے فارس کو ضمانت پہ رہا کیا تو وہ خود کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ مجھے اپنے پیشنٹ کی فکر ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ کسی اور جرم میں ملوث ہو کر چند دن بعد پھر جیل میں بند ہو۔ اس لیے ابھی کچھ ماہ تک اسے کسٹڈی میں رکھنا ضروری ہے۔"

وہ دیوار تک آیا' چند لمحے اپنی سرد آنکھوں سے دیوار پہ لگے پائپ کو دیکھتا رہا' پھر پوری قوت سے کلہاڑا اس پہ مارا۔ پائپ پھٹ گیا۔ سس کی آواز سے گیس لیک ہونے لگی۔

فارس طہیر غازی نے اپنا بیگ کندھے پہ ڈالا اور راہداری کی طرف چلتا گیا۔ استری تلے رکھے کاغذ درمیان سے ہلکے ہلکے بھورے ہونے لگے تھے۔ وہ دروازے سے باہر نکل آیا' اور اسے بند کر دیا۔ ایک نظر اٹھا کر اس دو منزلہ خوب صورت عمارت کو دیکھا۔

"مجھے معلوم ہے تم مجھ سے خفا ہو گے۔" سماعت ختم ہونے کے بعد وہ اس کی کرسی کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سرخ آنکھوں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ مٹھی زور سے بھینچ رکھی تھی۔ "مگر مجھے تمہاری فکر ہے' تم ٹھیک نہیں ہو۔ اگر باہر جاؤ گے تو خود کو نقصان دو گے۔" فارس نے سرخ آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہ مت سمجھنا کہ میں نے جھوٹ بولا ہے۔ تم نے یہ سب اس دن مجھے بتایا تھا' جب میں نے تمہیں ٹروتھ سیرم دیا تھا۔ تمہیں یاد نہیں ہو گا مگر میں کورٹ میں یہ کہنے پہ مجبور تھی۔ مجھے نوٹس پہ نوٹس آ رہے تھے۔ پھر میں نے جو بھی کیا' تمہیں پروٹیکٹ کرنے کے لیے کیا۔"

اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر تھپکا۔ انگوٹھی کے اندر کچھ نوکیلا سا چبھا۔ "تم ایک دن دوبارہ نارمل زندگی کی طرف لوٹ آؤ گے۔ چند سال کی ہی تو بات ہے!" اب وہ جا رہی تھی۔ سفید کرتے والے شخص نے سرخ آنکھوں کا رخ موڑ کر اسے جاتے دیکھا۔

"مجھے اس دن کا انتظار ہے ڈاکٹر!" وہ بڑبڑایا تھا۔

اسپتال کی عمارت اسی طرح اندھیرے میں کھڑی تھی اور فارس غازی اب اس سے دور چلتا جا رہا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے' کندھے پہ بیگ اٹھائے' وہ مطمئن سے قدم اٹھا رہا تھا۔ پس منظر میں کھڑی تاریک عمارت دور ہوتی جا رہی تھی۔ پھر ایک دم۔ رات میں روشنی ہوئی۔ عمارت کے اندر دھماکہ سا ہوا۔ سنہری آگ کے شعلے کھڑکیوں سے باہر لپکنے لگے۔ دروازے جل رہے تھے۔ آگ کے ہاتھ انگلیاں پھیلائے آسمان کی طرف بڑھ رہے تھے' چلا رہے تھے۔ اور وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتا جا رہا تھا۔



اب وہ پھرتے ہیں اسی شہر میں تنہا لیے دل کو
اک زمانے میں مزاج ان کا سر عرش بریں تھا

آسمان پہ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اسپتال کی عمارت کوئلے کی طرح سیاہ پڑی تھی' دھوئیں کے بادل ابھی تک اوپر اٹھ رہے تھے۔ ارد گرد رش تھا۔ فائر بریگیڈ' رپورٹرز کے کیمرے۔ پولیس۔ ایک جگہ وہ دونوں گارڈز کھڑے ایک پولیس افسر سے بات کر رہے تھے۔ فاصلے پہ ایک پولیس موبائل کے ساتھ اے ایس پی سرمد شاہ کھڑا تحمل سے توقیر بخاری کو سن رہا تھا۔ جو

پاگلوں کی طرح غرا رہے تھے۔

"تم لوگوں نے میری برسوں کی محنت برباد کر دی۔ اپنے بچوں کی طرح خیال کیا تھا اس عمارت کا میں نے۔"

"ڈاکٹر صاحب آرام سے' میں نے کہا نا ہم تفتیش کر رہے ہیں۔"

"خاک تفتیش کرو گے تم؟ کل تم نے مجھے فون پہ کہا تھا کہ اوپر والے کہہ رہے ہیں' اگر پھر کوئی مطالبہ کیا تو جو ہے وہ بھی نہیں رہے گا' اور آج میرا اسپتال جلا ڈالا گیا۔ اندھا ہوں میں؟ بچہ ہوں میں؟" آستین سے کف رگڑتے' پسینے سے تر چہرے اور سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتے دبا دبا سا چلائے تھے۔ "تم سب بھگتو گے۔ وہ۔ نیاز بیگ کا بھائی اور تم۔ تم سب ملے ہوئے ہو۔"

"میں بڑا لحاظ کر رہا ہوں آپ کا۔ محنت سی محنت۔ یہ جگہ ہم نے آپ کو دی تھی۔ آدھی سے زیادہ مشینیں ہم نے آپ کو دی تھیں۔" ناگواری سے ٹوکا۔

"میں نے اپنی ساری جمع پونجی کنسٹرکشن پہ لگائی' میرے اوپر قرضہ ہے' مجھے کنگال کر دیا تم لوگوں نے۔" وہ بال نوچ رہے تھے۔ وہ واقعی بال نوچ رہے تھے۔

قدرے فاصلے پہ کار رکی اور تیزی سے دروازہ کھول کر ڈاکٹر ایمن باہر نکلی۔ ادھر ادھر دیکھتے' قدم بڑھائے تو سامنے عمارت نظر آئی۔ وہ زنجیر پا ہوئی۔ برف ہوئی۔ نمک کا مجسمہ ہوئی! اس کی آنکھیں اس کوئلے کی سی ہوئی عمارت پہ جا ٹھہریں' لب ہلکے سے کھل گئے۔ اور دل۔ دل خالی ہو گیا۔ بے اختیار اس نے کار کے دروازے کا سہارا لیا۔

سب جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

بنا پلک جھپکے' وہ اس عمارت کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کا رنگ پیلا! زرد ہو رہا تھا' اور کانوں کے ہیرے ویسے ہی جگمگا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے مد مقابل تو بتاؤ
وہ کہاں ہیں کہ جنہیں ناز بہت اپنے تئیں تھا

اس شام ڈاکٹر ایمن بہت تھکی تھکی' نڈھال سی اپنے لاؤنج میں اندھیرا کیے بیٹھی تھی۔ گھر خالی تھا۔ بچوں کو نانی کی طرف بھیج دیا تھا اور ڈاکٹر توقیر تھانے گئے ہوئے تھے۔ وہ پیر اوپر کیے' یک ٹک بیٹھی خلا میں دیکھ رہی تھی۔ پھر یکایک کھٹکا سا ہوا۔ وہ چونکی۔ ٹھک ٹھک ٹھک۔ مدھم سی بیٹ۔ وہ سست روی سے اٹھی اور راہداری کی طرف آئی۔ اندھیرے گھر میں ادھر ادھر چلتی اپنی اسٹڈی کے دہانے پہ آرکی۔ دروازہ دھکیلا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ صرف کھڑکی سے نیلگوں روشنی آ رہی تھی۔ وہ جانے لگی' تب ہی ایک دم رکی۔

میز کے پیچھے' مرکزی کرسی پہ کوئی بیٹھا تھا۔ اس کا سارا وجود اندھیرے میں تھا۔ صرف ایک ہاتھ نظر آ رہا تھا جس سے وہ میز پہ ایک پین کو "ٹھک ٹھک" بجا رہا تھا۔

"پنجاب بر زن کے چار سی ہوتے ہیں۔ کنٹرول' کسٹڈی' کیئر اور کریکشن۔" تاریکی میں بھی وہ اس کی آواز سن سکتی تھی۔ وہ بت بن گئی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔

"کانفیڈنشلٹی کے پانچ سی ہوتے ہیں' جن کے تحت پریویلج توڑا جا سکتا ہے۔ آپ کو یہ نو کے نو C یاد رہے۔ مگر مجھے صرف ایک C کا علم ہے۔"

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے آئی۔ پلکیں جھپک کر اندھیرے میں آنکھوں کو عادی کیا' تو منظر واضح ہوا۔

"اور وہ C ہے۔ کاربن۔" وہ آگے ہوا۔ نیلی روشنی میں فارس کا چہرہ واضح ہوا۔ اس پہ سرد سی مسکراہٹ تھی۔ اور آنکھوں میں تپش تھی۔ وہ آگ اور برف ایک ساتھ دیکھ رہی تھی۔

"وہ کاربن نہیں جو آپ کے کانوں میں ہیں۔" انگلی سے ڈاکٹر ایمن کے کانوں کی طرف اشارہ کیا جن میں جگمگاتے ہوئے دنیا کے سخت ترین کاربن تھے۔ "بلکہ ایک ہائیڈرو کاربن۔ وہ سی جو آپ کو بھول گیا تھا۔ CH4

ڈاکٹر ایمن کا سانس حلق میں اٹک گیا۔

"میتھین؟ نیچرل گیس۔" وہ شل رہ گئی۔ "تم نے۔ تم نے آگ لگائی ہے میرے اسپتال میں۔ ہے نا؟ تم نے کیا نا یہ سب؟" اس کا سارا خون سمٹ کر چہرے میں آیا۔ وہ ایک دم آگے آئی۔

"کیوں کیا تم نے ایسا؟ وہ میرے برسوں کی محنت تھی۔ وہ میری پوری زندگی تھی۔" وہ دبا دبا سا چلائی تھی۔ "ہمارے اوپر قرضہ ہے۔ اسے کیسے اتاروں گی میں؟ میں تباہ ہو گئی ہوں فارس غازی!"

"گڈ!" اس نے سر کو خم دیا۔ ایمن کی آنکھوں سے شرارے پھوٹنے لگے۔

"تم۔ تم نے مجھ سے بدلہ لیا نا۔ پریولیج توڑنے کا۔ پرجری کا۔ ہاں بولا تھا میں نے جھوٹ۔ اور اب تم دیکھو میں تمہارے ساتھ کیا کرتی ہوں۔" میز پہ دونوں ہاتھ رکھے، جھکی کھڑی وہ زخمی ناگن کی طرح پھنکار رہی تھی۔ "میں ابھی کے ابھی پولیس بلا رہی ہوں۔ توقیر، اے ایس پی، میں سب کو بتاؤں گی کہ تم نے کیا ہے یہ سب۔ کاؤنٹ آف مونٹی کرسٹو واپس آگیا ہے اور وہ ایک ایک سے بدلہ لے رہا ہے۔ اور میں۔" اس کا سانس بکھر رہا تھا۔ "میں میڈیا پہ بھی سب بتاؤں گی۔ تمہاری بیوی اور تمہارے بھائی کے افیئر کی ایک ایک تفصیل بتاؤں گی۔"

"نہیں، آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی۔" آواز پہ وہ چونکی۔ کھڑکی کے پردے کے ساتھ کھڑی لڑکی آگے چلتی آئی اور فارس کی کرسی کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ وہ ایک انگلی سے مسلسل اپنی گھنگھریالی لٹ لپیٹ رہی تھی اور اس کا چہرہ نیلی چاندنی میں دمک رہا تھا۔

ڈاکٹر ایمن ہاتھ ہٹا کر سیدھی ہوئی۔ شرربار نظروں سے باری باری دونوں کو دیکھا۔ فارس اب پیچھے کو ٹیک لگائے بیٹھا، مسلسل پین سے میز کی سطح پہ ٹھک ٹھک کر رہا تھا۔

"یہ تم دونوں کی بھول ہے کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

فارس نے قلم رکھا اور میز پہ پڑا فوٹو فریم اٹھا کر سامنے کیا جس میں ایمن، توقیر اور ان کے تین بچے مسکرا رہے تھے۔ "آپ کا بڑا بیٹا بہت پیارا ہے، ڈاکٹر!"

ڈاکٹر ایمن نے استہزائیہ "اوہ" کر کے سینے پہ بازو لپیٹے۔ "اچھا تو تم میرے بیٹے کو مارنے کی دھمکی دے رہے ہو؟ ہونہہ۔ تم یہ نہیں کر سکتے۔ You Dont' Have It In You۔ تم قاتل ہو، نہ ہو سکتے ہو۔" اس بات پہ زمر نے چند لمحے کے لیے فارس کو دیکھا، پھر چہرہ ڈاکٹر کی طرف موڑا۔

"کوئی کسی کو قتل کرنے نہیں جا رہا ڈاکٹر ایمن۔" وہ سکون سے بولی۔ "مگر مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے ڈرائنگ روم میں دو سرویلنس کیمرے لگے ہیں۔"

ڈاکٹر ایمن نے بے یقینی بھرے غصے سے انہیں دیکھا۔ "تم لوگوں نے میرے گھر میں کیمرے لگائے ہیں؟ اچھا، تو کیا ریکارڈ کیا تم نے؟ اے ایس پی اور ہماری باتیں؟ ہونہہ۔ ہم ایسی ملاقاتیں گھر پہ نہیں کرتے۔"

"ہم یہی ریکارڈ کرنا چاہتے تھے لیکن ہم نے کچھ زیادہ دلچسپ ریکارڈ کیا ہے۔" کہتے ہوئے زمر نے اپنے اسمارٹ فون کی اسکرین روشن کی۔ نیم تاریک کمرے میں روشنی چمکی۔ اسکرین اس کے سامنے لائی۔ ایمن کی آنکھیں اس پہ جھکیں۔

"یہ آپ کی اور آپ کے بہنوئی کی ایک گفتگو ہے۔" اس نے پلے نہیں کیا، صرف اسٹل امیج نظر آ رہا تھا مگر ڈاکٹر ایمن کا چہرہ ایک دم سفید پڑنے لگا۔ اس نے بے یقینی سے زمر کو دیکھا۔ کرسی کی پشت پہ ہاتھ رکھا۔

"جیسا کہ میرے ہزبینڈ نے کہا، آپ کا بڑا بیٹا بہت پیارا ہے مگر وہ صرف آپ کا بیٹا ہے۔ ڈاکٹر توقیر کا نہیں۔" اسکرین سامنے لہرائی۔ "اس کا باپ آپ کی بہن کا شوہر ہے۔ اوہ۔ ڈاکٹر توقیر کو تو علم نہیں ہے نا اس بات کا؟"

ڈاکٹر ایمن کرسی کی پشت پکڑے پکڑے جھکی۔ چند گہرے سانس لیے۔ پھر سامنے بیٹھی۔ اس کا چہرہ وہ

نہیں تھا جس کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

فارس نے دونوں ہاتھ باہم ملائے، میز پہ آگے کو ہوا۔ اس کی نیم مردہ آنکھوں میں دیکھا۔ "اللہ کا ایک اصول ہے کہ جب کوئی کسی پہ ایسا الزام لگاتا ہے جو اس نے نہ کیا ہو یا ترک کر چکا ہو تو مرنے سے پہلے وہ خود اس میں ضرور ملوث ہو جاتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں جھانکتے فارس کی نظروں میں تپش ابھری۔ "تم نے میری بیوی پہ بھری کچہری میں الزام لگایا، تم نے میرے بھائی پہ الزام لگایا۔"

چند لمحے تک ایمن کچھ بول نہ پائی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "کیا تم یہ سب بھول نہیں سکتے تھے؟ رہا ہو گئے، شادی کر لی، سیٹل ہو گئے۔ کیا تم۔ تم معاف نہیں کر سکتے تھے؟"

"تم لوگوں نے معافی مانگی کب تھی؟ تم لوگوں نے میرے بھانجے کے ساتھ بھی وہی کیا جو میرے ساتھ کیا۔ لیکن اب کم از کم تم ایک لمبے عرصے تک کسی کے ساتھ دوبارہ یہ نہیں کر سکو۔ گی۔" دوبارہ ٹیک لگائی۔ آنکھیں سکیڑ کر اسے تپش سے دیکھا۔

"اور اب۔ محترمہ! آپ وہی کریں گی جو ہم آپ کو بتائیں گے۔"

"جی ڈاکٹر ایمن، اور ہم میں اور آپ میں یہی فرق ہے۔" وہ بھی خشک سا کہہ رہی تھی۔ "ہم چاہیں تو آپ کے شوہر کو بتادیں۔ آپ کا میکہ بھی چھوٹے گا، سسرال بھی۔ شوہر اور دو بچے تو جائیں گے ہی۔ مگر ہم ایسا نہیں کریں گے۔ آپ کی ذاتی زندگی خراب نہیں کریں گے۔ تب تک جب تک آپ ہمارے کہے پہ عمل کرتی رہیں گی۔"

اس کے آنسو بہہ رہے تھے، اور وہ بے بسی سے انگلیاں مروڑتی زمر کو سن رہی تھی۔

"آپ ہر ایک کو یقین دلائیں گی کہ اس واقعے میں علیم بیگ کا ہاتھ ہے، یہ بھی بتائیں گی کہ وہ آپ کو فون پہ دھمکیاں دیتا رہا ہے۔ آگے آپ کو پتا ہے آپ کو کیا کرنا ہے۔" ڈاکٹر ایمن نے بھیگے چہرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور اب!" وہ اسی سنجیدگی سے بولا۔ "اب آپ بتائیے، سعدی یوسف کے بارے میں۔ ہر وہ چیز جو اس رات ہوئی۔ زیادہ پس و پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ دیکھ چکی ہیں میں کیا کر سکتا ہوں۔" چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ پھر اس نے چہرا اٹھایا۔ وہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"وعدہ کرو تم کبھی توقیر کو نہیں بتاؤ گے، میرے اور کامران کے درمیان اب کچھ نہیں ہے، وہ ایک پرانی بات تھی۔ توقیر کو سنی سے بہت محبت ہے، پلیز تم۔"

"ڈاکٹر ایمن! اگر آپ کے منہ سے نکلنے والے اگلے الفاظ میرے جواب کے علاوہ ہوئے تو میں اسی وقت یہ ویڈیو ڈاکٹر توقیر کو فارورڈ کر دوں گا۔"

"اوکے اوکے!" اس نے ہتھیلی سے آنسو رگڑتے ہاتھ اٹھائے۔ "اس رات توقیر کو اے ایس پی کا فون آیا، اس نے کہا کہ ایک لڑکا غائب کرنا ہے۔ جب اس کی حالت خطرے سے باہر ہو....."

"یہ سب مجھے پتا ہے۔ یہ بتائیں، اے ایس پی کے علاوہ کون شامل تھا اس میں؟"

وہ لمحے بھر کو خاموش رہی۔ "ہمارا رابطہ صرف اے ایس پی سے تھا مگر اے ایس پی اسی شخص سے ہدایات لیتا تھا جس سے تمہارے کیس میں لیتا آیا تھا۔" رک کر اس کو دیکھا۔ "تمہارا جج، جسٹس سکندر۔"

"مجھے پتا ہے جج بکا ہوا تھا اور....."

"تمہیں غلط پتا ہے۔ جج بکا ہوا نہیں تھا۔ جج خریدار تھا۔"

زمر اور فارس نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

"وہ جج ہمارے یا نیاز بیگ کی طرح ایک مہرہ نہیں تھا۔ وہ اسی جرم میں برابر کا حصے دار تھا جس کو چھپانے کے لیے یہ سب ہوا تھا۔ اس سے آگے میں کچھ نہیں جانتی۔ پلیز اب یہاں سے جاؤ۔" کرب سے کہتے اس نے منہ پھیر لیا۔

وہ اٹھا اور گھوم کر دروازے کی طرف جانے لگا۔ زمر بھی پیچھے گئی، تب ایمن بولی۔

"آئی ایم سوری' جو میں نے کیا تمہارے ساتھ۔"
فارس نے مڑ کر ایک نظر اس پہ ڈالی۔
"نہیں' آپ کو قطعاً" کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ دس منٹ پہلے آپ وہ سب دہرانا چاہتی تھیں۔"
اس نے گردن موڑ کر بھیگے چہرے سے فارس کو دیکھا "تب میں غصے میں تھی۔"
"اور اب آپ صرف خوف زدہ ہیں۔" مدھم مگر مضبوط آواز میں بولا۔ "کم از کم چار سال لگیں گے آپ کو اپنا قرضہ اتارنے اور دوبارہ اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کے لیے اور آپ جانیں گی کہ ہر پل اپنی زندگی تباہ ہو جانے کا خوف کیا ہوتا ہے' خوف کی قید کیسی ہوتی ہے' وہ فیلنگ کیسی ہوتی ہے جب آپ اپنی صفائی بھی نہ دے سکیں' جب آپ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگیں۔ مگر ڈونٹ وری ڈاکٹر' آپ ایک دن نارمل ہو جائیں گی۔ چند سال کی ہی تو بات ہے۔" ہلکا سا ڈاکٹر ایمن کا کندھا تھپکا اور اور تیز قدموں سے باہر نکل آیا۔



اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

وہ ریسٹورنٹ کے سامنے کار میں بیٹھے تھے اور دونوں کے درمیان خاموشی چھائی تھی۔ زمر تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے دو دن لگاتار تمام فیلڈز دیکھی تھیں اور قسمت سے اس کو مطلوبہ شے مل گئی تھی۔ مگر اب تھک چکی تھی۔ کچھ ذہن بھی الجھا تھا۔ فارس کے فقرے ذہن میں گونج رہے تھے۔ (گناہ گار لوگ اپنی بے گناہی پہ ایسے پُراعتماد تو نہیں ہوتے۔۔۔ اف زمر! بس کر دو' اس کے حق میں کوئی صفائی نہیں۔) گردن موڑ کر اسے دیکھا تو وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ہلکا سا مسکرایا۔
"گڈ ایوننگ مسز زمر! میرا نام فارس طہیر غازی ہے۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"
اور وہ تھکی تھکی سی ہلکا سا مسکرائی۔ "مجھے بھی۔" پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

"میں نے جھوٹ بولا تھا۔ آئی ایم سوری۔" باہر دیکھتے ہوئے وہ بولی تو وہ چونکا۔
"تمہارے لیے نہیں بتا رہی' اس لیے بتا رہی ہوں کیونکہ میں نے غلط کیا۔ تمہاری بیوی نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ آخری وقت تک تمہارے لیے پوزیسو تھی۔" کچھ دیر باہر دیکھتی رہی' جواب نہیں آیا تو آنکھوں کا رخ اس کی طرف پھیرا۔
اس نے جیسے گہرا سانس لیا تھا۔ پھر سر جھٹکا۔ کم از کم زمر سے اب وہ اس موضوع پہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ "کچھ کھائیں گی؟"
"ہوں!" گردن ہلا دی اور سر سیٹ سے ٹکا دیا۔ آنکھیں بند کر دیں۔ وہ اندر چلا گیا۔
باہر پھولوں کے اسٹال پہ ڈوبتی شام کے اندھیرے میں بیٹھا گل خان چھڑی سے فٹ پاتھ پہ لکیریں کھینچ رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے فارس کو باہر جاتے دیکھا' اس کی آنکھیں چمکیں۔ دوڑ کر زمر کی کھڑکی تک آیا۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اس نے شیشہ بجایا۔ زمر چونک کر سیدھی ہوئی۔ پھر شیشہ نیچے کیا۔
"زمر باجی۔" وہ چہکا "ہم کو تمہیں کچھ دینا تھا۔" بے چینی سے دیکھا' اندر فارس کاؤنٹر پہ کھڑا نظر آ رہا تھا۔ پھر جیب سے سیاہ ہیرے والا کی چین نکال کر دونوں ہاتھوں سے اس کی طرف بڑھائی۔ زمر کی آنکھوں میں تحیر ابھرا۔
"یہ تمہیں کہاں سے۔۔۔"
"بعد میں بتائے گا' جب یہ تمہارا بندہ نہیں ہو گا سامنے۔ کل رات سعدی بھائی کو خواب میں دیکھا۔ بھائی بہت خفا تھا ام سے۔" وہ واپس آتا نظر آ رہا تھا' گل خان کا منہ کڑوا ہوا اور وہ پلٹ گیا۔ زمر نے بے اختیار شکریہ پکارا۔ پھر کی چین کو دیکھا۔ اس سے ایک سلور پین بھی نتھی تھی۔ اس نے پین کھولا۔ اندر یو ایس بی پلگ تھا۔ فارس قریب آ رہا تھا' اس نے جلدی سے اسے پرس میں رکھ لیا۔
جب وہ گھر آئی اور کھانے کے شاپرز صداقت کو پکڑائے تو حنین اور سیم لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ سیم

فوراً" اٹھا۔ "پھپھو' حنہ کہہ رہی ہے میری برتھ ڈے سیلیبریٹ کریں گے ہم۔" وہ مسکرا دی۔ اس کا گال تھپتھپایا۔

"حنہ نے مجھے بتایا تھا۔" پھر حنین کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر پیچھے آئی۔ زمر نے اوپر کمرے میں آکر پرس سے کی چین نکالا اور اپنے دراز میں رکھ دیا۔ پھر دروازے میں کھڑی حنہ تک گئی۔

"کیا ہاشم کا کوئی ٹیکسٹ آیا؟"

حنین نے اداسی سے نفی میں سر ہلایا۔

"اوکے' اب سیم کی برتھ ڈے کے لیے انوائٹ کرنے ہم دونوں اس کے پاس جائیں گے اور جیسا ہم نے ڈیسائڈ کیا تھا' وہی کریں گے۔"

"آپ تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ چلو۔" بال جوڑے میں لپیٹتے ہوئے وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ فارس نے دیکھا تو پوچھا۔ "کدھر؟ صداقت کھانا لگا رہا ہے۔"

"بس پانچ منٹ میں آتے ہیں۔ مسز کاردار سے کام تھا۔ حنہ میرے ساتھ آؤ۔" اور حنین سر جھکائے' نظر ملائے بغیر اس کے ساتھ باہر آگئی۔

کچھ دیر بعد وہ ہاشم کے سامنے اس کے لان میں بیٹھی تھیں۔ ہاشم نے اپنی بیماری کا بتایا البتہ اب وہ فریش لگ رہا تھا۔

"سوری ہاشم! ہمیں نہیں معلوم ہو سکا کہ آپ بیمار تھے۔" زمر نے کہہ کر حنہ کو دیکھا۔ تو وہ بظاہر مسکرا کر بولی۔ "تبھی آپ نے اتنے دن سے مجھے ٹیکسٹ نہیں کیا' ہاشم بھائی۔"

اور وہ جو مسکرا کر کچھ کہنے جا رہا تھا' چونکا۔ زمر کو دیکھا اور پھر حنہ کو۔

"ہاں' میں بس آرام کرتا رہا۔" البتہ وہ قدرے بے چین ہوا تھا۔ اسے ہمیشہ لگا تھا کہ یہ ایک چھپی ہوئی چیٹ ہے' مگر زمر واقف تھی؟ منظر نامہ بدلنے لگا تھا۔

"اسی لیے میں نے حنہ سے کہا کہ ان کی خیریت پوچھتے ہیں' ورنہ تمہیں یا سعدی کو وہ جواب نہ دیں' یہ ناممکن ہے۔" وہ مسکرائی۔ ہاشم "جبراً" مسکرایا۔

"اچھا ہاشم بھائی! پھر آپ کل آ رہے ہیں نا سیم کی سالگرہ پہ؟" حنین کے دل میں اذیت ہی اذیت تھی مگر وہ زمر کی ہدایت پہ عمل کرنے پہ مجبور تھی۔ (ہمیں اس کو یقین دلانا ہے کہ یہ کوئی چھپا ہوا افیئر نہیں ہے' بلکہ سب اس سے واقف ہیں' تاکہ وہ کبھی زندگی میں تمہیں یا فارس کو بلیک میل نہ کر سکے' حنہ!)

"کل میرا ایک ڈنر ہے' مجھے وہ کینسل کرنا پڑے گا۔"

"تو بس آپ ڈنر کینسل کریں۔" زمر رسان سے بولی۔ وہ دونوں بہت اپنائیت سے اصرار کر رہی تھیں۔ منظر نامہ واقعی بدل رہا تھا۔ (حنین نے زمر کو بتا رکھا ہے؟ تو فارس؟ اوہ پلیز نہیں!)

"اوکے!" اسے پورا منظر نامہ جاننا تھا۔ سو مسکرایا۔ "میں کرتا ہوں۔" کال ملا کر موبائل کان سے لگایا۔

"کل کے ڈنر کی ریزرویشن کروادی ہے؟ چلو یہ اچھا ہو گیا۔ ہاں اسے پرسوں پہ رکھ دو۔ کل میری فیملی میں ایک ڈنر ہے۔ اوکے تھینک یو' حلیمہ!" موبائل رکھ کر مسکرا کر انہیں دیکھا۔

"چلیں شکر ہے' حلیمہ نے ابھی انویٹیشن کال نہیں کی تھی۔" وہ بالکل بے خبر کہے جا رہا تھا۔

اور سامنے بیٹھی حنین کی ٹانگوں سے جان نکلنے لگی۔ زمر کی رنگت زرد پڑنے لگی۔ وہ دونوں یک ٹک ہاشم کو دیکھ رہی تھیں۔ پھر زمر ذرا سنبھل کر مسکرائی۔

"یہ کون تھی؟ آپ کی کسی ڈیٹ کو تو ہم نے خراب نہیں کر دیا؟"

"ارے نہیں' یہ حلیمہ تھی' میری سیکرٹری۔" ہنس کر سر جھٹکا۔

اور اگر پیچھے مڑ کر دیکھو اور سوچو کہ وہ کون سا لمحہ تھا' وہ ایک لمحہ' جس نے انصاف اور انتقام کی وہ جنگ شروع کی تھی' جس نے ان سب کی زندگیاں بدل دی تھیں' تو وہ یہی لمحہ تھا جب ہاشم نے کہا تھا۔

"یہ حلیمہ تھی' میری سیکرٹری!"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سمیرا حمید

جوگ آس

اور شاید اس سے ایک غلطی ہوئی کہ وہ اسے مٹھی میں دبا کر ساتھ لے آیا۔۔۔ نہ سر سے اچھالا نہ پاؤں سے مسلا اور ہریالی کے سارے ٹھکانے جو اس کے اندر پیوست تھے' وہ چتا کی لکڑیوں کی طرح سلگنے لگے۔ اس



کے گھر کی روشنیاں کم سے کم ہوتی گئیں اور آخری وقت اسے دیواریں ٹٹول کر چلنا پڑا۔ یہ سب تین دن بعد ہوا اور تین دن پہلے دیواریں ٹٹولتے ہی وہ اس دہلی دروازے سے پار ہوا تھا۔ جن گلیوں میں وہ گھس آیا تھا۔ ان میں بہت اندھیرا تھا یا اسے ہی زیادہ روشنیوں میں رہنے کی عادت ہو چکی تھی کہ وہ ایک دیوار کا سہارا لے کر بھی لڑکھڑا گیا۔

اور یہ تیس سال بعد ہوا۔۔۔

یہ راز بہت بعد میں کھلا کہ یہ بھی کوئی راز ہی تھا۔

وہ آیا۔ وہ آئی۔۔۔ اور بس۔۔۔ اگرچہ بعد کے دنوں میں اس قصے کو نت نئے اندازوں سے سنایا گیا جیسے کہ کوئی لوک کتھا۔۔۔ جو ہر زبان پر پہنچ کر اس زبان والے کی من مرضی کی ہو جاتی ہے۔

پہلی بار اس نے ماں کو محرابی چوکھٹے میں کھڑے دیکھا اور اسے لگا راجپوتوں کی کوئی راج کماری دم بھر کے لیے سورج کو اپنا نظارہ کروا رہی ہے۔ وہ اس کی ایسی فیاضانہ ادا پر دم بخود رہ گیا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے ساتھ چلتے پھوپھی زاد طیب سے پوچھا۔

"یہ؟ ماں دیدی ہیں۔"

"ماں بھی اور دیدی بھی؟ ہیں کون۔ کس چچی، پھوپھی، خالہ، ممانی کی اولادیوں دلیرانہ پروان چڑھی ہے کہ ایسے تصویر کی طرح محراب میں جڑی ہے۔ ایسی جرأت سے کسی بانکے کو کھڑے نہیں دیکھا کجا بانکی۔ میں یہ تشنا سہن نہیں کرپارہا۔"

"کوئی گناہ کر رہی ہیں کیا؟" طیب نے دانت نکالے۔

"گناہ کروا رہی ہیں۔۔۔"

"آپ کو تو عادت ہے، ہر لڑکی کے لیے گناہ سر پر لینے کی۔۔۔"

"اور تمہیں عادت ہے، میرے سارے گناہ یاد رکھنے کی۔"

"مشکل سے پانچ دن نہیں ہوئے آپ کو یہاں آئے ہوئے اور دو عدد خطوط میں آپ کے تکیے کے غلاف سے برآمد کر چکا ہوں اور ایک چھت کی ممٹی سے۔ معاف کیجیے گا، ریشمی رومال کی آخری سطر میں نے بندہ نفس سے مجبور ہو کر پڑھ لی تھی۔ لگتا ہے محترمہ کے ابا حضور مشاعروں میں کثرت سے شرکت کرتے ہیں اور پھر گھر آ کر محفل جمانے کے شوقین ہیں اور میری ذہانت پر داد و تحسین عنایت فرمایئے، میں نے ان کے چوبارے سے جھانکتی ساری نسوانی بیلوں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ یہی ہے وہ گھر جہاں سے مشاعرانہ رومال کا نزول ہوا ہے۔ بجا فرمایا نا میں نے؟"

"تم ذرا خاموش رہو۔۔۔" طیب کی آواز بار بار اسے الجھا رہی تھی۔

وہ چوکھٹے سے ہٹی۔ ستون کے ساتھ بل کھانے لگی اور اس بار نظر کرم اس نے آسمان ۔ پر کی اور اسے ایسے دیکھنے لگی جیسے وہاں سے کسی خاص مہمان کی آمد متوقع ہو۔ یعنی اسے زمین والوں سے کچھ لینا دینا ہی نہیں۔

عالی نے آہ بھری کہ یہ کیسی ناانصافی ہے۔

اور پھر جب وہ وہاں سے ہٹی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی روشنی اپنے اندر سموئے وہاں کھڑی تھی۔ یہ اندازہ بہت بعد میں بھی ہوا کہ وہ کیا کچھ لیے ہوئے تھی۔ کھڑی تھی، بیٹھی تھی، چلتی تھی، رکتی تھی، روک لیتی تھی اور ان سب کے ساتھ قائم بھی رہتی تھی، لیکن بہت کچھ تو ہلا ڈالتی تھی نا۔

شادی کا گھر تھا۔ لاکھ پردے کا اہتمام ہوا کرتا، لیکن آمنا سامنا ایسے تو ہو ہی جاتا کہ معلوم پڑتا بانکے بھی آئے ہیں اور بانکیاں بھی۔ سجیلے بھی ہیں اور سجیلیاں بھی۔ بانکی سجیلی وہ ڈھیر سارے کپڑے لپیٹے کبھی کسی بالکنی میں کھڑی دکھتی، کبھی کسی ستون سے لپٹی ملتی اور کبھی دالانوں سے فرشی سلام لیتی پائی جاتی اور وہ اتنا فارغ تھا کہ سارے ماموؤں، چچاؤں، چھوٹے بڑے ہر طرح کے اباؤں کی گھوریوں کو نظر انداز کرتا ان مندروں کی گھنٹیاں بجایا کرتا جن میں درشن کو وہ

میسر ہوتی۔
لیکن ایسے نہیں کہ نظریں چار ہو جائیں۔ بس کسی نہ کسی کی اوٹ سے۔ چھجوں اور کھڑکیوں میں کھڑے ہو کر وہ اسے ان ستونوں' احاطوں' دالانوں میں صنف نازک کے جلوس میں علم بردار بنے دیکھتا۔ جہاں غراروں کی جانچ پڑتال ہو رہی ہوتی' کناریاں ٹنک رہی ہیں اور ہرے بھرے پتے سل بٹے پر رگڑ رگڑ کر منہ پر لیپے جا رہے ہوتے۔ وہ کبھی آنکھ اٹھا کر اوپر دیکھ لیتی اور پھر اس کے قہقہوں پر وہ جی جان سے چڑ جاتا اور من ہی من میں کہہ اٹھتا۔
"اچھا جناب! تو ایسے باز نہیں آئیں گی آپ بھی۔"
"یہ کون ہے؟" طیب پھر سے پیچھے کھڑا دانت نکال رہا تھا اور وہ اس بار سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔
"کسی اور سے کیوں نہیں پوچھ لیتے۔ بلکہ ان ہی سے۔" طیب کی ہنسی معنی خیز تھی۔
"تمہیں کس دن کے لیے تیل پلایا ہے۔"
"لیکن یہ چراغ آپ کے ہاں کے تیل سے نہیں جلے گا۔"
"کیوں؟" اسے انکار کی ساری ہی توجیہات بہت بری لگتی تھیں۔
"یہ تھالی اور سندور کی پر جاتی سے ہیں۔ پھوپھی اماں ان کی ماتا کی سہیلی ہیں۔ خاص دہلی سے لے کر آئی ہیں آپا رقیہ کی شادی کے لیے۔ دیکھ بھتیجے بھائی صاحب! یہ ہندوستان نہیں جس کے ٹکڑے کر کے آپ کے ہاتھ آپ کا حصہ تھما دیا جائے گا۔"
"کم بخت! منہ سے خرافات ہی نکالنا۔" بڑے چچا کا گزر ہوا قریب سے تو طیب کی بات سے بھڑک اٹھے۔ "کیوں ہوں گے ٹکڑے۔ چل آ تیرے کروں ٹکڑے۔"
بڑے چچا کانگریس کے حمایتی تھے۔ مزاج اتنا بگڑا کہ طیب کو حلوائی کے ساتھ سامان اٹھوانے میں لگا دیا جو بے چارا پھوپھی اور پھوپھیریوں کے دوپٹے رنگوانے جاتے سو سو بہانے بناتا تھا کہ ہم سے نہیں ہوتا اتنا کام۔
سفید اونچی دیواروں سے رنگین آنچل ٹکرایا کرتے تو دم بھر کو اسے لگتا کہ اڑتا ہوا یہ آنچل اس کے ہاتھ آیا کہ آیا۔
بالائی منزل میں موجود بلکہ قید مردانے میں دم سادھ لیا جاتا جب نت نئے راگ ڈھولک پر گائے جاتے۔ آگرے کے پھوپھا حقہ گڑگڑاتے گاؤ تکیے کو سہارا بنائے ذرا کی ذرا چونکے۔
"یہ کون گا رہا ہے؟" سرگوشی کی طیب کے کان میں: مبادا کوئی یہ جان نہ لے کر وہ ایسے کان لگا کر سن رہے ہیں۔
"وہی جن کے لیے آپ کہتے ہیں' گھٹی میں ناچ گانا چاٹتے ہیں۔"
"اچھا تب ہی۔"
حقے گڑگڑاتے' پان چباتے' حیدر آبادی چٹکلے چھوڑتے مردانے کے سب مرد سو جاتے تو وہ چپکے سے ابا سے نظر بچا کر جو آنکھیں تو موند لیتے پھر بھی اوں آں کرتے رہتے۔ اوپر چھت پر آجاتا اور نیچے چلمن پوش دالانوں کو جو انگیٹھیوں سے دہک رہی ہوتیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا۔ جو دکھائی دیتا وہ سنائی نہ دیتا۔ وہ نیچے آتا سنتا اور پھر دیکھنے کے لیے اوپر پہنچ جاتا۔
"یہ ٹھمری ہے۔ گیت۔ کہ بھجن۔"
وہ سنتا جاتا' سوچتا جاتا۔ پھر دبے پاؤں نیچے آتا اور سوچتا کہ سب تو ڈھولک کے گرد بیٹھی ہیں۔ کہیں سے کسی کونے میں گھس جائے اور دیکھے کہ قریب سے دیکھنا کیسا ہے۔
"تم سوئے نہیں ابھی تک؟" کوئی نہ کوئی بوا' چچی' ماسی سر نکال پوچھتی۔
"یہ ماسیاں' چچیاں' بوائیں اتنی زیادہ کیوں ہوتی ہیں۔ ہوتی بھی ہیں تو جلد سوتی کیوں نہیں۔ بلیوں کی طرح کہیں سے بھی میاؤں کر دیتی ہیں۔"
"کان میں درد ہے۔ تیل لینے آیا ہوں۔ اماں جی کہاں ہیں؟"

"اماں تو سو گئی تمہاری۔ کان میں درد ہے تو بچے ہو کیا جو تیل ڈالو گے۔۔۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔"

"درد میں نیند کسے آتی ہے۔۔۔ درد دینے والوں کو ہی آتی ہوگی۔۔۔ سہنے والوں کو تو نہیں ہے۔۔۔" اس نے ذرا سر کو اٹھا کر کہا کہ کوئی تو سن لے۔

اور سن لیا گیا کہ چلمن کے پار ڈھولک پر تھاپ رک گئی۔ گانے والی کی آواز بھی۔

"کون دکھیارا راگ الاپ رہا ہے موسی؟" ڈھیروں کپڑوں میں لپٹی نے ڈھیروں کانچ سے سجے ہاتھ کو جسے آج ہی مہندی سے رنگا تھا۔ ادھر موسی کی طرف اٹھا کر پوچھا۔

"گیت گانے والیاں کیا گیت ہی بولتی ہیں؟" چلمن سے اس نے اس کی مسکراتی آنکھوں کو دیکھ کر سوچا۔

باقی لڑکیاں ہنسی سے دہری ہونے لگیں اور اس کو اس کی جرأت پر داد دینے لگیں۔

"اب کیا تیل کے لیے بھی دائیں اٹے کے پاس جاویں اور کہویں۔" وہ بوا سے چڑ گیا۔

"بھجوا لاتی ہوں پر کہے دے رہی ہوں۔ دوبارہ کان میں درد لے کر نہ آنا۔ تین دن سے یہ درد لیے تمہیں آتے اور جاتے دیکھ رہے ہیں بابو۔! تمہاری اماں کے کان میں بات ڈال دی ہے۔ اب ذرا صبری سے رہو۔ کل پوچھا تو کہہ رہی تھیں۔ ابھی نہیں کروں گی اس کی کام ہوام تو کوئی کرتا نہیں۔"

بوا نے ایسا کوئی چٹکلا تو نہیں چھوڑا تھا' لیکن ڈھولکی کی ساری پلٹن ہنس ہنس کر ادھ موئی ہو گئی۔

اگلے دن ناشتا ملا' نہانے کا سامان اور اعلان بھی کہ "تیل ماچس رکھوا دی گئی ہے کمرے میں۔ راتوں کو نیچے آنے کی زحمت نہ کیجیے۔ ٹھنڈ لگ گئی تو ہم سے تیمارداری نہ ہوگی۔"

ہونہہ اسے کیا ضرورت تھی نیچے آنے کی۔ اتنا تو اب اس نے کر ہی لیا تھا کہ تین اطراف کی چھت کو گھوم پھر کر اس نے وہ سارے کونے تلاش کر لیے تھے جہاں سے گیت بولنے والی دکھائی دیتی تھی۔ سنہری دھوپ میں جھولا جھولنے والی' پان کی گلوری دکھا بنا کھانے والی' سر نہیوڑائے پیروں کے ناخنوں پر مہندی لگانے والی' کسی ریشمی جھلمل کو سر پر اوڑھتی ہوئی۔ اور سر اٹھا کر چھت کے کسی کونے کی درز کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر اور پھر "اچھا بچو! تو یہ آپ ہیں۔" آنکھوں میں سمو کر بھر بھر اچھالنے والی۔



اوپر کہیں سے کچھ آ کر گرا۔ تنتنا کر اس نے سر اٹھایا اور گندی سندی دیواروں' کھڑکیوں' چھجوں کو گھور کر رہ گیا' لیکن کچھ بھی قابل ثبوت نہ ملا کہ کس نے سر نکال کر یہ حرکت کی۔ کراہیت سے وہ جل بھن گیا۔ یہ تھوک تھا جو اس کی پیشانی پر پڑا تھا۔ رومال سے پیشانی رگڑتے اس کے اندر ابال آیا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ اب تک تو اس نے کبھی رتی برابر بھی یہ کوشش نہیں کی تھی کہ ٹوٹے بکھرے قافلوں کی صورت ہجرت پر نکلے خاندان کو پالے۔ وہ رنگین برتنوں کا دلدادہ تھا۔ باسی پن سے اسے اکتاہٹ ہوتی تھی۔ اماں' ابا ہجرت سے دعا کرتے بہت جلد اپنی روحیں لیے اس پار جا پہنچے اور ہجرت سے باغی ہوئے۔ پھر یہاں آئے ہی کیوں تھے۔ چند بار اسے خطوط ملے کہ میں تمہارا فلاں ابن فلاں ہوں اور تم میرے فلاں ابن فلاں لگتے ہو۔

"تو میں کیا کروں؟" وہ خط کو کہیں بھی اچھال دیتا۔

جو حویلی اس نے ان دنوں اپنے نام الاٹ کروالی تھی' وہ اسے ہوٹل بنانے میں مصروف تھا۔ اب وہ اس کی دیکھ ریکھ کرتا یا ان فلاں ابن فلانوں کی۔ ویسے بھی پرانا دستور جو بھی ہوا کرے' وہ تو نیا دستور رقم کر رہا تھا۔

کیسا خوب صورت دستور رہا تھا شادی کے گھر آنگن میں مہینوں پہلے قافلوں کے اترنے کا۔ علی گڑھ سے کچھ اور مہمان آرہے تھے۔ مردانے کو ذرا خالی کروایا گیا اور لڑکیاں آئیں بستر اور جانے کیا کیا اٹھا کر اوپر رکھنے۔ وہ عین وقت پر پردے کے پیچھے کمال مہارت سے چھپ گیا۔ اوپر سے نیچے جھانکتے پہلے ہی تاڑ گیا تھا کہ بانکپوں کی آمد اوپر متوقع ہے۔

اور پھر جب صاف شیشوں کی لالٹینیں رکھ دی

گئیں۔ انگیٹھیوں کی پرانی راکھ کو کوئلوں سے بدل دیا گیا اور طاقوں کو چراغوں سے سجا دیا گیا تو وہ یہاں وہاں اپنے ڈھیروں کپڑوں کو اپنے ساتھ گھسیٹتی گلاب پاش سے فضا کو معطر کرتی نیچے جاتے جاتے رہ گئی۔ باقی سب جا چکی تھیں' ایک اسی کا کام رہ گیا تھا۔

وہ اوٹ سے نکل آیا اور وہ گلاب پاشی کرتی ایڑی کے بل گھومتی اس کے سینے سے آ لگی۔

"اوئی ماں!" اس کے منہ میں ہی رہ گیا۔ دہن وا ہوا اور آنکھوں نے پہچان سے کچھ یوں کہا۔ "اچھا بچو! تو یہ آپ ہیں۔"

"کیوں نا ہوتا!" اس نے لفظ لفظ کہا۔ آواز سے کہا کہ یاد تھا وہ کس تفاخر کو لیے پہلی بار کیا پائی گئی تھی۔

تفاخرانہ ہی اس کے ہونٹ کچھ کہنے پر مائل ہوئے' لیکن پھر آخر کار وہ ان پر تبسم لے آئی۔

"مجھے عالی جاہ کہتے ہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر پیشانی تک لے جا کر کہا۔ کتنی ہی بار سوتے جاگتے یہ دہرا چکا تھا۔

نام سن کر گلاب پاش کو اس نے اس کے شانوں کے کنارے سے پرے لہرایا اور پھر گلاب پاش کو دونوں ہتھیلیوں میں سمو کر ہاتھ جوڑ لیے ذرا سا پیچھے ہوئی' ذرا سا جھکی اور کہا۔

"پرنام۔ مجھے مانیکا کہتے ہیں۔۔۔ مان بھی کہا جاتا ہے۔ پرنام کہتی ہوں۔۔۔ چرن چھوانے کی اوشکتا (ضرورت) تو نہیں ہوگی۔"

آنکھوں کی کمانوں کو اس نے ایسے اٹھایا' مانو جیسے اس کی حالت کا نظارہ کرنے کو اس کا دل مچلا جاتا رہا ہو اور وہ بھی اس کی مشق کرتی رہی ہو کہ جو ورزیں ڈھونڈ ڈھانڈ' تانکا جھانکی کرتا ہے' وہ جب جواب میں پرنام پائے گا تو کیسے مچل کر تڑپ جائے گا۔ اور ایسا ہوا بھی' لیکن پھر وہ اس کے چونک کر ادھ موا ہو جانے پر آن کے آن دل شکستہ سی ہو گئی۔

"مانیکا!" عالی جاہ نے ایسے صدمے سے کراہ کر کہا جیسے اس کی روح کے باغات کو لوبان کی دھونی دی جانے لگی ہو اور اس اطلاع نے اسے رقص بسمل کی سزا سنائی ہو۔

مانیکا نے زمین سے چھوتی اپنی چولی' چنر کو اٹھانے کی زحمت کیے بنا ان سے الجھتے ہی بھاگ جانا چاہا اور وہ یہ کر گئی' لیکن صدمے کا اثر کچھ ساتھ لے گئی۔ کچھ چھوڑ گئی۔

سلام اور پرنام میں ربط گلاب پاش کی موجودگی میں بھی پنپ نہ سکا۔

رات نئے مہمانوں نے جم کر ڈھولک بجائی پھر بھی رات سونی رہی۔ نہ من کے گیت جاگے نہ ارمان آہ بنے۔

رات میں بن باس پنپنے لگا۔

وہ پھر نیچے آیا۔

"تیل تیلی رکھوا دی ہے تمہارے کمرے میں۔" بوا شاید ہنسی تھیں کہ کانوں کے بالے جھومنے لگے۔

"سر میں درد ہے' کچھ کیجیے۔۔۔"

"اب سر کو کیا ہوا؟ اور کیا کروں میں۔ جاؤ' اپنی اماں سے کہو۔ وہ وہاں محفل جمی ہے ان کی۔ اور سنو بابو! پہلے سلام کر لینا سب بڑوں کو۔ یہاں سب کو تم سے شکایت ہے کہ تم ٹھیک سے آپ جناب نہیں کرتے۔"

"کہیں تو پیر بھی چھو آؤں؟"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اماں پتا نہیں کس کس کے ساتھ لمبی باتوں کے سفر پر نکلی تھیں۔ وہ ایک نظر ادھر دیکھ کر اوپر آ گیا۔

"چرن چھوانے کی اوشکتا تو نہیں ہوگی۔" رات بھر یہی منتر اسے بہلاتا رہا اور دالانوں' بالکنیوں کے کونے بدلتے دن میں وہ اس منتر کو آنکھوں سے پھونکتا رہا۔ نیچے وہ خود کو چھپاتی رہی' نہ مسکرائی اٹھلائی' نہ چنر میں نہ چولی میں جھلملا کر نہ اترا کر۔

دن میں آس پنپنے لگی۔

شام کو لالٹین اٹھانے اور نئی رکھنے آئی۔ مرد سب احاطے میں تھے۔ قوالی شروع ہونے والی تھی۔ طیب کو اس نے چوکیداری پر لگایا تھا۔ اور وہ مرا جا رہا تھا سیٹی مارنے کے لیے اس سے پہلے کہ انہیں ہی گردن سے

پکڑ کر مار دیا جائے۔ وہ چھت پر آ گیا جہاں سے بالائی منزل یہ سامنے ہی دکھائی پڑتی تھی۔

ململ کے کپڑے سے اس نے کھڑے کھڑے چند لالٹینوں کے شیشے اندر سے صاف کیے اور ان میں تیل ڈالتی انہیں روشن کرتی رہی۔

شام گہری ہونے کو تھی اور روشنیوں کا سامان کر دیا گیا تھا۔

آٹھ دس لڑکیاں اتنے سے کام کے لیے جانے کیوں دیری کر رہی تھیں۔ ہنسی ٹھٹھول کے لیے کیا یہی جگہ اور وقت ملا تھا۔ اب بوا کہاں ہیں۔ خبر کیوں نہیں لیتیں کہ لڑکیاں رنگین جھلمل اوڑھنیاں اوڑھے نینوں میں کاجل بیٹھائے مردانے میں صرف تیل بدلتے وقت کا اتنا ضیاع کر رہی ہیں۔

بہت دیر گزر رہی۔ بوا جاگ ہی گئیں اور ان کی للکار پر کچھ جھٹ پٹ نیچے بھاگ گئیں۔ کچھ نے کانوں میں تیل ڈال لیا اور للکار کو نظرانداز کر دیا۔ اتنا ہی کافی تھا۔

وہ مردانہ چال کی آواز پیدا کرتا نیچے اترا تو جو بچی تھیں وہ بھی کھسک گئیں۔ وہ لالٹین کی لاٹ کو بلاوجہ ٹھیک کرنے لگی۔ تو اب وہ آہٹ پہچان گئی تھی۔ اس کا انداز دل ربانہ تھا اور محبوبانہ بھی۔ لیکن ایسا نہیں کہ کچھ طے پا جائے یا وہ کچھ طے کر بھی لے گی۔ اسے یاد تھا کہ سندور ریکھا کے عین نیچے بندیا چمک رہی ہے۔

"روشنی ہو گی یا نہیں۔ کیسا دل کو آ لینے والا اندھیرا چھایا ہے۔ میں ایسے اندھیرے میں کیسے جیوں بھلا اب۔"

عالی جاہ نے بات کی اور ساری بات کہہ دی۔

سوال کے جواب کے لیے وہ ذرا ٹھہری اور رخ موڑے بنا دیا سلائی روشن کی اور پھر پھونک مار کر بجھا دی۔ اور اس نے تو داستان ہی کہہ دی۔

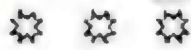
جس جاہ اور طمطراق سے وہ نیچے آیا تھا اور کئی گھنٹوں سے اوپر ٹہل رہا تھا وہ سب پہلی رات کی سہاگن کی بیوگی کے جوگ میں لپٹ گئے۔ طبیب نے سیٹی ماری۔ نہ بھی مارتا تو اسے جانا ہی تھا۔ لیکن وہ رک گیا تھا اس سے سہن نہیں ہو رہا تھا۔

"پھر اندھیرا ہی ہے۔ ماں؟" اس کی پشت کو دیکھتے جس پر اس کے بال جوگی کی من سادھنا جاپ کرنے کو تھے دیکھتے ہوئے کچھ کہا کچھ بتایا۔

اور ایسے ہوا کہ رخ کو اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور جو بندیا دو نینوں کے بیچ چوکیداری کر رہی تھی، وہ کسی کام کی نہ رہی۔ سارا مان سمان، جاہ و جلال کی نذر ہو گیا۔ کچھ وقت نہ لگا۔ دوسری دیا سلائی روشن ہوئی اور تازہ تازہ صاف کی گئی لالٹین روشن ہو گئی۔

طبیب سیٹیاں مار مار کر ہلکان ہو گیا اور ایک نہ دو کتنے ہی مہمان مردانے کی طرف آئے۔ وہ اس کا ہاتھ کھینچ کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر لے گیا اور دور سے آتی قوالی کی آواز نے نہ معلوم کیسا سماں باندھا کہ اس کے ہاتھ کی روشن لالٹین کی گواہی میں دو دلوں نے یکساں حال کھیلا۔

اور "دو" کا ہندسہ، تہمت زدہ ہے۔



وہ دو گڈیاں رکھ کر لایا تھا جیب میں۔ وہ یہ طبیب کو دے دے گا۔ مہینہ پہلے دور کے کوئی رشتے دار اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اپنا کوئی کام نکلوانے اس کے پاس آئے تو باتوں باتوں میں طبیب کا ذکر نکل آیا۔

"ایک ٹانگ سے اپاہج ہو گیا تھا ہجرت میں۔ پہلے تو کئی کئی دن کا فاقہ رہتا تھا اب بیوی اور بچیوں نے کچھ سلائی بنائی کا کام شروع کیا ہے تو روٹی میسر ہے۔ دیوانی بہن اور تین بچیوں کے ساتھ غربت جھیل رہا ہے۔"

"صغریٰ دیوانی ہو گئی۔" اسے ننھی صغریٰ یاد آئی اور پھر وہ سارے کام چھوڑ کر طبیب کی طرف آنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ ایک طبیب ہی تھا جسے اس نے تھوڑا بہت تلاشنے کی کوشش کی تھی۔

گلیاں جتنی تنگ ہوتی جا رہی تھیں۔ اتنی ہی مدفن اور تعفن زدہ ثابت ہوتی جا رہی تھیں۔ دور سے بینڈ باجے کی آواز آ رہی تھی جو قریب آتی گئی۔ گلی تنگ ہو گئی اور جب تک بارات آگے نہیں نکل گئی، وہ پھنس کر کھڑا رہا۔ شادی والے گھر کے آگے سے گزرا

تو ایک نظر گھر کے اندر بھی ڈال لی۔

شادی کے گھر میں دن ایسے پھسلے جیسے آسمان سے مینہ پھسلتا ہے' دھن دھنا دھن۔ شرارتوں میں لپٹی لڑکیاں گیت مالا بن گئیں۔ منکے پر منکہ گرا اور زندگی کی سیج پر ایک مالا پرو گیا۔ ماں اور عالی کی یک جوڑ مالا۔

وہ دہلی سے تھی اور وہ بھی سارے راستے ماپ آیا تھا۔ کتنے ہی ملنے والے دور کے 'نزدیک کے' 'سگے' سوتیلے وہاں رہتے تھے۔ ہاں بس اسے ذرا ڈھیٹ ہونا پڑا کہ جب یہ نوبت آجاتی کہ بس ہاتھ پکڑ کر نکالنے کی کسر رہ جاتی تو وہ واپس حیدر آباد آجاتا۔ ابا سے دو جوتے کھاتا اور سو جھوٹ سچ بولتا کہ کہاں تھا اور کیا کرتا رہا۔

دو سگائیاں اس نے تڑوا دی تھیں۔ ایک موذی بیماری کا ڈھونگ رچا کر اور ایک بے شرم بن کر لڑکے سے خود کہہ کر۔ گھر والوں کو بھنک نہیں تھی کہ وجہ کیا ہے۔ وہ روز مندر جاتی تھی اگر وہ ذرا رکھوالی کرتے تو جان جاتے کہ مندر کے نام پر کون سی "پوجا" ہو رہی ہے۔ مندر کے "بہانے" زیادہ ہو جاتے تو وہ عالی کی دور کی خالہ زاد جو اس کی سہیلی بھی تھی کی طرف آجاتی اور اس کا برقع لے کر نکل جاتی۔ عذرا کو اس نے خبر نہیں ہونے دی تھی۔ ویسے وہ اس کی سانس کے سنگ سنگ تھی لیکن عالی جاہ کے مقام سے وہ پردہ نہیں اٹھا سکی۔ اسے پہلی بار یہ دھڑکا لگا کہ یہاں عذرا کی محبت مات کھا جائے گی۔ وہم حقیقت میں نہ بدل جائے' اس نے آزمائش سے دور ہی رکھا۔ اور پھر عالی جاہ بھی یہی چاہتا تھا۔

دونوں پرانے قلعوں میں بیگم اور صاحب بن کر گھومتے رہتے۔ بازاروں سے گھر دار بن کر خریداری کرتے۔ باغوں سے اپنے باغیچوں کے لیے پھول توڑتے۔ وہ چولیوں اور ساڑھیوں میں اس کی پسند کے رنگ لیتی اور مانگ نکال کر اس کے نام کا ان دیکھا سندور بھرتی اور اس کے نام پر برت رکھنے لگی۔ سب یوں ہی ہونے دیا گیا۔

سب گھر ایک جیسے تھے۔ وہ تین بار غلط جگہ دستک دے چکا تھا۔ اسے اشتعال آیا کہ وہ آخر یہاں آیا ہی کیوں ہے۔ کیا کرلے گا اب وہ طیب سے مل کر۔ کیا ضرورت تھی اتنا جذباتی ہونے کی۔ اس نے چاہا کہ وہ واپس پلٹ جائے لیکن پھر بھی وہ آگے بڑھتا رہا کہ اس مجمع سے بمشکل جگہ بنا کر گزرا جو آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے اور اچھا خاصا فساد برپا کر رکھا تھا۔

فسادات کی خبریں جو دور دور تھیں' وہ نزدیک تر آتی گئیں۔ جو کل تک اس شہر اور اس گلی تک کی بات تھی' اب وہ ساتھ والی گلی اور ساتھ والے گھروں تک آگئی۔ مرنے والوں کی خبریں دال سبزی کے بھاؤ کی طرح عام ہو گئیں۔

جو خط ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھے جاتے' وہ اس تک پہنچ ہی نہ پائے۔ لیکن چند ایک خط جو اس نے طیب کے ذریعے عالی تک پہنچائے جو عذرا کے یہاں اپنا خاندان لے کر آچکے تھے' وہ تو اسے ضرور ملے ہوں گے۔ وہ آس اور امید سے زیادہ پر اعتبار یقین کر بیٹھی تھی۔ گھر والوں کو اس نے الوداعی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ماتا جی کو وہ بار بار چومتی تھی اور گلے لگا کے ہاتھ جوڑ جوڑ کر شما (معافی) مانگا کرتی۔

عالی اپنا خاندان سرحد پار کروا آیا تھا لیکن دوسری بار پھر اس پار آگیا تھا۔ وہ بنا کسی کو بتائے آیا تھا ورنہ اماں کبھی نہ آنے دیتیں۔ پاکستان کیمپ میں چند دنوں کے قیام سے وہ تاڑ گیا تھا کہ نئے نئے بنے اس ملک میں اب پیسے والے ہی انسان کہلائیں گے۔ خود کو انسانوں میں شمار کروانے وہ اس پوٹلی کو لینے واپس آیا تھا جو وہ آبائی گھر کی زمین میں دبا آئے تھے۔

واپسی میں کیمپ میں بوسیدہ کپڑوں میں وہ نظر آئی تو وہ ہولے ہولے اس کی شکل کو اکٹھا کر سکا۔

"عالی!" وہ اس کا نام یاد کرنے کی کوشش میں نہیں بھی تھا تو بھی وہ اس سے لپٹ گئی اور اسے سب یاد کروا دیا۔

"مان۔ تم یہاں۔" اسے اتنا سا جملہ بولنے میں کافی دقت ہوئی۔ اس کے حواس یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھے کہ اس کے سامنے وہی ہے۔

"ہاں۔ میں تمہارے گھر بھی گئی تھی' وہاں اور

لوگ آ گئے ہیں۔ مجھے پتا تھا تم ضرور آؤ گے۔"

"تم گھر سے بھاگ آئی ہو؟"

"نہیں، بھاگی تو نہیں۔ سدھار آئی ہوں۔ کتنی منت کی تمہاری کہ مت جانا۔ جانا تو مجھے لے کر جانا۔ عذرا کا پیغام ملا کہ تم پاکستان پہنچ چکے ہو۔ میں جانتی تھی تم مجھے لینے ضرور آؤ گے۔"

"مجھے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔"

"کیسے ملتا۔ لیکن تم آئے بھی نہیں لینے۔ میں یہاں آ گئی۔ تم نہ آتے تو پاکستان آ جاتی۔"

"ماں! تم پاکستان جا رہی ہو؟ ماں! تمہاری جاتی نے چچا قدوس کو زندہ جلا..."

"ہے رام۔ میں دیکھ رہی ہوں سب۔"

"اب سب الگ ہو گیا ہے ماں!"

"اسی لیے تو آئی ہوں کہ ہم الگ نہ ہوں۔"

"ہمارا دین، دھرم تو الگ ہے۔"

"دھرم۔دھرم کی بات پہلے تو نہیں کی۔"

"میں سب یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔ کچھ نہیں لے کر جانا مجھے یہاں سے۔"

"تم بھی تو یہاں کے ہی ہو۔ پھر خود کو کیوں لے جا رہے ہو۔"

"تمہاری وہاں کوئی جگہ نہیں ہو گی ماں! میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔"

"میں کسی زمین پر رہنے نہیں جا رہی۔ تمہارے ہوتے ایسا کیسے کروں گی۔"

"تم یہاں آئیں ہی کیوں؟ کچھ نہیں سوچا کیا؟"

"سوچا! تمہیں سوچا۔ تم مجھے چھوڑنا چاہتے ہو؟"

"میں تمہیں تکلیف سے بچانا چاہتا ہوں۔"

"تمہارے ساتھ میں کس تکلیف میں ہو سکتی ہوں؟ یاد کرو، رقیہ کی شادی میں تم نے کہا تھا "موت کی حقیقت تم پر میری جدائی سے کھلے گی۔" میں تم پر یہ حقیقت نہیں کھول سکتی عالی۔" وہ خاموش رہا۔

"کہو تو میں لوٹ جاؤں۔" یہ کہتے اس کی آواز سن مرتے ہوئے

مردہ پرندہ کی لاش تھی تب ہی وہ ساری کی ساری اس سے لپٹ گئی کہ وہ کہے لوٹ جاؤ تو وہ دم توڑ دے اور اسی میں

لوٹ جائے۔

اور ایسے پر آشوب وقت میں ' کیمپ کے خون آشام اندھیرے میں ہجرتی قافلے کے مسافر نے اپنے اندر غیرت کو اٹھتے محسوس کیا اور وہ یہ گوارا نہ کر سکا کہ جو گھر سے خود ہی سدھار آئی ہے ' اسے یہ بتادے کہ وہ اس کے لیے نجمہ تھی' حلیمہ تھی' اختر تھی' مہر النساء تھی۔ محبت اس کی خصلت تھی بس۔ وہ تو پہلے دن سے ہی جانتا تھا کہ وہ مانیکا ہے۔ پوجا کی تھالی اور سندور کی پرجائی ہے۔ اور خصلتوں کو پرجاتیوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔

زخمیوں کے کراہنے کی آواز آرہی تھی۔ مائیں مر گئی تھیں' ان کے شیرخوار دودھ کے لیے تڑپ رہے تھے۔ تیرہ چودہ سال کی دو لڑکیاں سر پر ہاتھ رکھے ہچکیاں لے رہی تھیں۔ ایک کپکپاتا جھکی کمر کا بوڑھا کیمپ میں رینگ رینگ کر چلتے' غفور' غفور کی صدائیں لگا رہا تھا۔

پھر بھی وہ خود کو نیچا دکھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایک عورت کو کیونکر کہہ دیتا کہ ''اس نے سب سچ بولا تھا جو اب جھوٹ ہو گیا ہے۔ جاؤ لوٹ جاؤ۔ ہمارا تمہارا بس یہیں تک کا یارانہ تھا۔''

اپنی حقیقی ذات کے اہرام کو کیونکر ایک عورت کے سامنے ملیامیٹ کر دیتا۔

''یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟'' خاموشی نے عجیب کام کیا' مان کی جھنکار لوٹ آئی۔ اس سب پر بھی کہ ذرا فاصلے پر ایک جوان دیہاتن بیوہ اپنے بال نوچ نوچ کر بین کر رہی تھی۔ ''دیکھو' میرے کپڑے کیسے تار تار ہو گئے ہیں۔ شرم آتی ہے اب تو۔ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟''

''اماں کے زیور۔''

''اماں جی کے زیور۔ ایسا ویسا اتنا کچھ دیکھ لیا ہے۔ لاؤ' کچھ اچھا بھی دیکھ لیں۔''

وہ تھیلے میں سے پوٹلی کھول کر دیکھنے لگی۔ شاہدہ' رخسانہ کے لیے زیور الگ کر دیے۔ چھوٹے آزاد اور بڑے اقبال کی دلہنوں کے لیے بھی۔

''اور یہ میرے ہوئے۔ عالی جاہ کی دلہن کے لیے بھی۔'' پھر یوں مسکرانے لگی جیسے اس کی ساس نے اسے شگن چڑھایا ہو۔

''دیکھو عالی! برا نہ مانو تو ان میں کوئی ایک زیور مجھے پہنا دو۔ میرا دل لرزتا ہے' یوں یہ اچھا شگون ہو جائے گا۔ ماتا جی کہتی ہیں۔ شگن لیکھ کو چڑھاوا ہے مانو پھر تو لیکھ بھی نہیں بدلتے۔ لجا کرتے ہیں۔''

اس نے ناک کی بالی کو کان کے سوراخ میں پرو دیا اور وہ ایسے خوش ہو گئی جیسے اس کی مانگ میں سندور بھر دیا گیا۔

''میری آتما کو اب قرار ہے عالی۔ میں کیسے کیسے نہیں ڈرتی تھی لیکن اب قرار ہے۔''

اس قرار کو لیے وہ گہری نیند سو گئی تو وہ پوٹلی کو اس کے پہلو سے نکال کر چلا آیا۔ کہ جاؤ بس لوٹ جاؤ۔

بوسیدہ دروازے پر جھولتی زنگ آلود زنجیر کو اس نے اخلاقاً" بجایا ورنہ دروازہ وا تھا اور کتنا پھٹا پردہ چور کو بھی کان لپیٹ کر پلٹ جانے کا سندیسہ دے رہا تھا۔

''آجایئے!'' مردانہ آواز جو اس نے پہچان لی' طیب کی تھی' وہ اندر چلا گیا۔ اس کی آنکھیں قبل از وقت نم ہو گئیں اور سینہ طیب کو بھینچ لینے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

اندر جاتے ہی روشنی اور کم ہو گئی اور یک دم اسے دیوار کا سہارا لینا پڑا۔

طیب اتنا سرد ملا جیسے خون اس کی رگوں میں ہمالیہ سے بہہ کر آتا ہو۔ اسے حیرت ہوئی۔ پھر خیال آیا کہ نوٹوں کی جو گڈیاں اس کی جیب میں موجود ہیں' وہ شاید اسے تھوڑا گرم کر دیں۔ جو بھی تھا۔ اسے دھچکا لگا۔ اس کی بیوی اور تینوں بچیاں اسے بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہیں جیسے وہ کسی جنگل کا وحشی ہو اسے کوفت ہوئی' لیکن چھپا گیا۔

''تم نے کبھی مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی طیب؟'' یہ سوال وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا اور پوچھ بھی لیا۔

''کیوں نہیں' اور تم ملے بھی۔ ایک خط بھی لکھا'

کبھی کوئی جواب نہیں آیا۔ سوچا پتا ٹھیک نہیں ہوگا۔" اس نے پتا ٹھیک نہیں ہوگا ایسے کہا جیسے گھر کے پتے کی بات نہ کر رہا ہو۔

"خط!" وہ چونک گیا۔ وہ فلاں ابن فلاں کے خطوط سے اتنا عاجز تھا کہ اپنے سیکریٹری کو کہہ رکھا تھا "ایسے ہر خط کو پھاڑ کر پھینک دیا کریں۔ میرا وقت برباد نہ کیا کریں۔"

"مجھے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ اگر ملتا تو میں بہت پہلے تم سے ملنے چلا آتا۔"

طیب خاموش رہا اور اس کی بیوی بھی خاموش رہی' اس کی تینوں بیٹیاں بھی۔ پر اتنی خاموشی میں بھی کوئی تو بولتا رہا۔

اسے طیب کے ایسے غیر جذباتی پن نے صدمہ دیا اور جیب سے نوٹوں کی گڈیاں نکالنے کا ارادہ اس نے ترک کر دیا۔ اسے معمولی ہی سہی لیکن دکھ ہوا کہ کیسے طیب' جو اسے آپ کہا کرتا تھا' اب تم پر آگیا ہے۔

"صغریٰ کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ دیوانی ہو گئی ہے۔ تم نے اس کا علاج نہیں کروایا؟" اس نے طنزاً کہا۔ وہ اس کی غربت کا مذاق اڑانے پر آگیا تھا۔

"صغریٰ!" طیب چونکا جیسے اس کا دل مٹھی میں آگیا۔ "میری صغریٰ! اس نے تو میرے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔"

"تو پھر بانو ہے؟" اب کی بار وہ پھونکار کے رہ گیا۔

"بانو تو کیمپ میں ہی اماں ابا کے دکھ میں چل بسی تھی۔"

کچھ وقت ایسے ہی سرک گیا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا جانے کے لیے اور ابھی وہ دروازے تک پہنچا تھا کہ طیب کی سلگتی آواز اس تک آئی۔

"تم جا رہے ہو؟"

وہ اچنبھے سے اسے پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"تو پھر تم یہاں کرنے کیا آئے تھے؟"

"تم سے ملنے۔" وہ پھنکار کر بولا۔

"مجھ سے ملنے۔" طیب اس سے زیادہ پھنکارا۔

"اور اس سے نہیں؟" جس ڈیوڑھی میں وہ کھڑا تھا' لنگڑاتے ہوئے طیب نے آگے بڑھ کر اس میں سے نکلتے ایک چھوٹے اندر کو دھنسے ہوئے دروازے کو ہاتھ بڑھا کر کھول دیا۔

اندر اندھیرا تھا۔ بہت اندھیرا۔ کیونکہ کوئی جلی ہوئی تیلیوں کو ماچس میں سے نکال نکال کر بجھی ہوئی لالٹین کو روشن کر رہا تھا۔ جس میں تیل تھا نہ لاٹ۔

"یہ مجھے پاکستان کے کیمپ میں ملی تھیں۔ ریڈیو سے ان کے شوہر عالی جاہ کے نام کے اعلانات ہر پندرہ منٹ بعد ہوتے تھے۔ ہندوستان خط لکھے کہ آکر لے جائیں انہیں لیکن وہ صرف ان کی جلی ہوئی ہڈیاں لینے پر بضد رہے کہ گنگا میں بہا دیں۔ اب آئے ہو تو اسے آزاد کر دو یا اس کی ہڈیاں اس کے پرکھوں کو بھجوا دو۔ آگ لگانے کی تو اب ویسے ہی ضرورت نہیں رہی۔"

طیب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی چابی نکالی جو اس زنجیر کی تھی' جو اس کے پیر میں پڑے تالے کی تھی۔

اندھیرا اتنا بڑھ گیا کہ اس نے طیب کو تھام لیا اور چابی کہیں نیچے گر گئی۔

"محبت جو خصلت ہوا کرتی ہے وہ قسمت نہیں ہوتی۔ نا اِس کی نا اُس کی۔"

وہ آگے بڑھا اور ان ہڈیوں کو دیکھنے لگا جنہیں اب آگ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ ویسے ہی جل رہی تھیں۔

جلتی چتا میں ہاتھ بڑھا کر اس نے شگن کو اس کے کان سے نوچ ڈالا۔ "لیکھ اب بدل جائیں گے۔ چڑھاوا لوٹ لیا۔"

وہ بنا پلٹے اتنی تیزی سے اندر کو دھنستے اس گھر سے نکلا جس میں پانچ لوگ اسے نفرت ــــ سے دیکھ رہے تھے کہ رک جاتا تو دھنس جاتا۔

تین دن بعد طیب کا پہلا اور آخری تار ملا۔

"مجھے معلوم ہوتا کہ اس بالی کو اتارنے سے وہ آزاد ہو جائیں گی تو یہ کام بہت پہلے کر چکا ہوتا۔"

اور تین دن بعد وہ راکھ میں وہ ہڈیاں چننے لگا جو ہر روز اس کے اندر ڈھیروں ڈھیر پنپ جاتی تھیں۔ ✿

مکمل ناول

شہرِ آشوب

امتل عزیز شہزاد

ڈھلتی شام کا سے تھا۔ شہر کے ایک مشہور اور مہنگے شاپنگ سینٹر میں خلق خدا کی تعداد دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ اس غریب ملک میں کوئی ٹینشن بھی ہے۔ مگر یخ بستہ شاپنگ سینٹر کی چمچماتی دکانوں اور لشکتے در و دیوار سے باہر روڈ پر سے گزرتے عوام کے چہرے بہت سی ان کہی داستانیں سنا رہے تھے۔ بائیک والے، سائیکل والے، چھوٹی گاڑی، بڑی گاڑی، ڈگمگیں ہیں۔
لگتا تھا کہ سارا شہر اسی ایک روڈ پر جمع ہو گیا ہے۔
ایک ڈھلتی عمر کی پریشان مگر صبیح چہرے والی عورت بادامی چادر کی بکل مارے شاپنگ سینٹر کے مقابل روڈ پر کافی دیر سے غالباً "سڑک پار کرنے کی منتظر تھی۔ مگر ٹریفک کا ریلا لمحہ بھر کو بھی نہ تھما تھا۔ پیڈیسٹرن برج کافی دور تھا اور وہ عورت جانتی تھی کہ اسے اپنی لنگڑاتی ٹانگ کو گھسیٹ کر وہاں تک لے جانا، جان جوکھوں کا کام ہو گا اسی لیے وہ چار و ناچار یہیں کھڑی محو انتظار تھی کہ کب موقع ملے اور وہ سڑک پار کر لے۔ اس نے اک بے زار سی نگاہ شاپنگ سینٹر کے سیدھے ہاتھ پر کھڑی خوب صورت عمارت پر ڈالی جہاں اسے کوئی کام تھا اور تب ہی اس کی نگاہ ۔ شاپنگ سینٹر کے آٹومیٹک گلاس ڈور سے باہر آتی اک نوعمر سی لڑکی پر پڑی۔ ایک لحظہ اس کی بڑی مگر جھریوں زدہ سی آنکھوں سے الجھن مترشح ہوئی۔ اس لڑکی نے اپنے دونوں





ہاتھوں میں تھامے بہت سے شاپنگ بیگز سڑک پر کھڑی گاڑی میں ڈھیر کردیے اور مڑ کر شاپنگ سینٹر کے دروازے کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ غالباً" کسی کی منتظر تھی۔ تب ہی ایک ماڈرن سی پختہ عمر کی عورت اس کی جانب آتی دکھائی دی۔ عورت نے نزدیک آکر لڑکی سے کچھ کہا تھا۔ اس کے بعد دونوں مسکراتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئیں اور ڈرائیور تو جیسے تیار ہی تھا۔ فوراً" گاڑی پیچھے کرنے لگا۔ سڑک کے دوسری جانب کھڑی عورت جو اب تک گویا بے جان سی کھڑی تھی' ایک جھٹکے سے ہوش میں آئی۔

"سنو... رکو..." وہ حلق کے بل چیخی۔ مگر اس مصروف ترین سڑک کے شور مچاتے ٹریفک کے سامنے اس کی آواز اپنی موت آپ مرگئی۔

"بات سنو میری... رکو۔" اب کی بار وہ کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں فٹ پاتھ سے سڑک پر اتر آئی تھی۔

"ٹھہرو... رکو۔" وہ ایک مرتبہ پھر ہذیانی انداز میں چیخی تھی۔

بیک وقت کئی گاڑیوں کے ٹائر چرچرائے تھے۔

☼ ☼ ☼

جس وقت اجیہ اور مہ پارہ کی گاڑی "فاروقی ہاؤس" کے ماربل سے بنے پورٹیکو میں رکی۔ آسمان پر اجالا آخری سانسیں لے رہا تھا۔

"توبہ خالہ جانی! یہ شاپنگ کرنا بھی کتنا بورنگ کام ہے۔" وہ اپنے کل وقتی ملازم شریف کو آواز دے کر سامان اندر پہنچانے کا کہہ کر گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھتی ہوئی گویا ہوئی۔

"شاپنگ واقعی بورنگ کام ہے' اگر کسی دوسرے کے لیے کی جائے تو۔" مہ پارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں خوب صورت ہری گھاس سے مزین لان عبور کرکے جس وقت براؤن لکڑی کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئیں' سامنے ہی فان کلر کے صوفے پر وقار جمیل فاروقی بیٹھے کوئی نیوز چینل دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے ٹیبل پر چائے دھری تھی۔

"وعلیکم السلام بابا!" اجیہ ان کے برابر میں تھکے تھکے سے انداز میں ڈھیر ہو کر بولی اور اپنے گورے گورے ملائم خرگوش سے پیر کالی سینڈل سے آزاد کرکے صوفے ہی پر رکھ لیے۔

"وعلیکم السلام۔ خیر سے کر آئے آپ لوگ شاپنگ؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھا۔

"بس بھائی صاحب۔" مہ پارہ بھی ان کے سامنے رکھے صوفے پر آرام دہ انداز سے براجمان ہوتے ہوئے بولیں۔

"جن کے لیے اتنی محنت کی ہے' انہیں شاپنگ پسند آجائے تو سمجھیے محنت وصول ہوگئی۔"

"آجائے گی اسے بھی پسند آجائے گی' ویسے بھی اسے کیا معلوم زنانہ شاپنگ کا۔" وہ تسلی دینے والے انداز میں دھیمے سے مسکرا کر بولے۔

"رہنے دیں بابا' انہیں تو جیسے اپنی شادی سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ کسی بھی چیز کے متعلق رائے لو عجیب سنجیدہ سا منہ بنا کر کہتے ہیں۔ "جیسے تمہاری مرضی" صاف جتارہے ہیں کہ تم لوگوں ہی کو میری شادی کا شوق چڑھا ہے' تو خود ہی سارے معاملات بھگتو' مجھے کیا؟" اجیہ تھوڑی خفگی سے بولی اور پاس دھرے شاپنگ بیگز جو شریف ابھی ابھی یہاں رکھ کر گیا تھا' اپنے قریب کرکے اس میں سے مہنگے بوتیکز سے خریدے گئے فیشن کے عین مطابق خوش رنگ کپڑے باہر ڈھیر کرنے لگی۔ اس کی بات پر مہ پارہ اور فاروقی صاحب کچھ نہ بولے' البتہ دونوں ہی کچھ بے چین سے ہوگئے۔ تب ہی ان کی کل وقتی ملازمہ لالی نے ان سے چائے کا پوچھنے کے لیے وہاں جھانکا۔

"واہ... واہ ماشاء اللہ چھوٹی بیگم کی شاپنگ کی ہے؟" وہ اشتیاق سے پھیلے زرق برق لباس دیکھنے لگی۔

"ہاں... چلو یہ پھیلاوا سمیٹو یہاں سے اور ذرا اسٹرونگ سی چائے بنا کر لاؤ۔" مہ پارہ نے نپے تلے لہجہ میں کہا۔

"اچھا جی۔" اس نے اپنے اشتیاق پر قابو پایا اور کپڑے و دیگر اشیا سمیٹ کر سامنے سے اوپر جاتی سیڑھیوں پر چلتی چلی گئی۔ اس کا رخ سائر فاروقی کے کمرے کی جانب تھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں بابا' اجیہ نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا "اگلی بار اگر بھائی جان نے اپنی شادی کے کسی بھی معاملے میں بے دلی دکھائی تو میں ان کی شادی کا بائیکاٹ کروں گی۔" وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔

"ریلیکس اجیہ بیٹا۔ سنجیدہ مزاج لڑکا ہے' اس لیے اس طرح کرتا ہے' ورنہ تو شادی ہرگز ایسا معاملہ نہیں ہے جس کو اتنا لائٹ لیا جائے۔" مہ پارہ بولیں۔ ان کا لہجہ ہلکا پھلکا تھا۔

"پتا نہیں سنجیدہ ہے یا کیا پرابلم ہے۔ پچھلے سنڈے میں نے اپنی فرینڈز کو ہلہ گلہ کرنے کی غرض سے گھر پر انوائیٹ کیا۔ ابھی ہم نے ڈھولک رکھی ہی تھی کہ وہ آدھمکے اور لگے مجھے ڈانٹنے۔ ذرا بھی خوشی نہیں ہے انہیں اور نہ ہی وہ کسی اور کو خوشی منانے دینا چاہتے ہیں۔ یہ تو آپ آئی ہیں تو ذرا گھر میں شادی والا ماحول لگ رہا ہے' ورنہ تو لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ کوئی شادی کا گھر ہے۔"

"اچھا بیٹا! تم شاور لے کر فریش ہو جاؤ' پھر ڈنر کا ٹائم ہو جائے گا۔" فاروقی صاحب نے جیسے اسے ٹالا تھا۔ وہ سر ہلا کر اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ "بھائی صاحب۔ کیا آپ سائر کی شادی زور زبردستی سے کر رہے ہیں اپنے دوست کی بیٹی کے ساتھ؟ آپ نے پوچھ تو لیا تھا نا' کہیں وہ کسی اور کو پسند تو نہیں کرتا؟" اجیہ کے جانے کے بعد وہ ان سے تشویش ناک لہجے میں استفسار کرنے لگیں۔

"مہ پارہ تم آخری بار کب پاکستان آئی تھیں؟ غالباً" نو سال قبل اس وقت سائر انٹر کا طالب علم تھا۔ تب سے اب تک اس کی شخصیت میں کئی واضح تبدیلیاں آچکی ہیں اور میں خود حیران ہوں کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔" وہ اضطرابی انداز میں ٹی وی کی آواز بند کر کے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے۔

"آپ سے فرینک ہے وہ؟"

"ہاں بالکل ہے' ہر بات آسانی سے وہ مجھ سے شیئر کر لیتا ہے۔" وہ تیقن بھرے لہجے میں بولے۔

"تب تو پھر اس نے شادی سے بدکنے کی وجہ بتائی ہو گی آپ کو؟" وہ بھی پر یقین' مگر سوالیہ لہجے میں بولیں۔

"وجہ اس نے بتائی تو نہیں' مگر میں جانتا ہوں۔" یک لخت ان کے لہجے میں پھنکار سی سنائی دینے لگی۔
مہ پارہ انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔



یہ ایک اندرون کراچی کا پرانا علاقہ تھا۔ یہاں بنے

زیادہ تر مکانات پرانے اور مکین جو کبھی مڈل کلاس رہے ہوں گے۔ اب کئی سالوں سے اپنی کلاس کی کھوج میں تھے۔ یہاں بنے فلیٹس کی عمارتیں اتنی خستہ حال تھیں کہ اندیشہ تھا کہ کسی بھی وقت زمین بوس ہو جائیں گی، مگر ستم رسیدہ اور مجبور لوگ یہاں پر بسے رہنے پر مجبور تھے۔ انہیں پرانے بوسیدہ اور میلے کچیلے سے فلیٹس میں سے ایک فلیٹ کا رنگ اڑا، دروازہ وہ کھول رہی تھی۔ جس دم وہ دروازہ کھول کر اس نیم تاریک سیلن زدہ ایک مختصر سے صحن اور ایک کمرے پر مشتمل اس فلیٹ میں داخل ہوئی اس کی طبیعت عجیب طرح سے بوجھل ہوئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کمرے کی واحد کھڑکی جو پیچھے گندی گلی میں کھلتی تھی کھول دی۔ بدبو کے ایک ثقیل جھونکے نے اس کا دماغ بھنا دیا۔ وہ پلٹ کر ایک سلیب پر مشتمل کچن میں آئی۔ کالی بدرنگی پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر جھانکا، آلو کی ترکاری پیندے سے لگی تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے لال رنگ کے ٹوٹے ہوئے ہاٹ پاٹ سے اس نے صبح کی بچی روٹی نکالی اور زہر مار کرنے لگی۔ وہ موجود تو بے شک یہاں تھی، مگر کل شام سے اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ روٹی کھا کر اور پرانے ہرے رنگ کے فریج سے، جس کی ٹھنڈک کب کی عنقا ہو چکی تھی، پانی کی بوتل نکالی اور یوں ہی ہونٹوں سے لگالی۔ مگر جو آگ اس کے سینے میں دہک رہی تھی وہ اس پانی سے کبھی نہیں بجھ سکتی تھی۔ اسی لیے بھنا کر اس نے بوتل سامنے دیوار پر دے ماری، اور اپنا گھومتا سر پکڑ کر بیٹھتی چلی گئی۔

"کہاں سے ڈھونڈوں تمہارا پتا کہاں سے۔" وہ ہذیانی انداز سے چیخی۔ پھر یک بیک ہی اس کے بے بس وجود میں جیسے بجلی سی دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور لوہے کی الماری کھول کر اس نے جیسے ساری ہی اشیا باہر ڈھیر کر دیں۔ وہ دیوانوں کی طرح ڈھیر میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ پھر اس نے جھنجلا کر وہ سب وہیں پٹخا اور الماری کے لاکر جس میں پتا نہیں کون کون سے کاغذ موجود تھے، انہیں باہر نکالنے لگی۔ ڈائریاں، کاپیاں جن میں نہ جانے کون کون سا حساب کتاب درج تھا وہ اٹھا اٹھا کر دیوانوں کی طرح پھینکنے لگی۔ تب ہی اس کا پیر ایک سیاہ جلد والی پرانی ڈائری سے ٹکرایا۔ اس نے بے دلی سے اسے کھولا۔ تو ایک کاغذ اس کے ہاتھ آیا وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا نہ تھا۔ اسے گویا زندگی کا پروانہ مل گیا تھا۔ کچھ دیر قبل مضمحل سی بے بسی سے سسکتی "گل ناز بانو" اب ہذیانی انداز سے قہقہے لگا رہی تھی۔ بلند آہنگ۔ خوف ناک قہقہے۔

☼ ☼ ☼

ابراہیم خان آج سے بائیس تیئیس برس قبل اپنی وفا شعار و دمساز بیوی کے انتقال کے بعد بالکل نڈھال ہو کر رہ گئے تھے۔ ان دنوں وہ بریڈ فورڈ میں رہائش پذیر تھے۔ اپنی دو سالہ معصوم سی بیٹی میرب اور چار سالہ بیٹے حاشر ابراہیم کی پرورش اب وہ یہاں نہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا ان کے مستقبل کی خاطر وطن لوٹ آئے کہ کچھ بھی ہو ان بچوں کے ننھیال ددھیال یہیں تھے۔ یہ الگ بات کہ دونوں بچے نانی، دادی سے بھی محروم ہی تھے۔ پھر ایسے میں کون تھا جو نہ صرف ان کی تربیت کرتا بلکہ پیار و محبت بھی نچھاور کرتا۔ کچھ عرصہ اپنوں کے بیچ رہنے کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ ان میں اور غیروں میں زیادہ فرق نہ تھا۔ ان ہی دنوں جب وہ یہاں اپنا کوئی بزنس شروع کرنا چاہ رہے تھے، اسی سلسلے میں ان کی ملاقات وقار فاروقی سے ہوئی اور یہ ملاقات کب گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی پتا بھی نہ چلا۔ یہ وقار فاروقی ہی تھے جنہوں نے ابراہیم صاحب کو الگ گھر لے کر رہنے کا مشورہ دیا اور اس سلسلے میں ان کی معاونت بھی کی اور انہیں اپنے ایک اچھے دوست کے پڑوس میں خالی ہونے والا بنگلہ دلوا دیا۔ بعد ازاں وقت نے یہ فیصلہ درست ثابت کر دیا کہ احمد سعید جو ابراہیم صاحب کے پڑوسی اور وقار صاحب کے دوست تھے، ان کی بیگم سعدیہ خاتون نے اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ ان کے دونوں بچوں خصوصاً میرب کا اس طرح خیال رکھا کہ ابراہیم صاحب ان کے زیر بار ہی ہو گئے۔

دوسری جانب ماریہ اور میرب کی اتنی دوستی ہوگئی کہ گویا وہ سگی بہنیں ہوں۔ ماریہ اور میرب نے اپنی تعلیم بھی اکٹھا مکمل کی۔ جوں ہی ان کی تعلیم مکمل ہوئی ماریہ کی نسبت اس کے خالہ زاد احمد عباس جو کہ پیٹرولیم انجینئر تھا کے ساتھ طے کردی گئی۔ وقار بھی جیسے میرب کی تعلیم مکمل ہونے کے منتظر تھے۔ وہ بھی اپنے ہونہار خوبرو، سنجیدہ و متین اعلیٰ تعلیم یافتہ برخوردار سائر فاروقی کا رشتہ میرب کے لیے دے آئے۔ بظاہر تو اس رشتے سے انکار کا کوئی جواز نہیں تھا، اس لیے ابراہیم نے سعدیہ بیگم کے توسط سے میرب کا عندیہ لیا۔ سعدیہ میرب کو کہیں نہ جانے دیتیں اگر جو سعد مان جاتا۔ سعد اپنی کسی کلاس فیلو میں انٹرسٹڈ تھا۔ میرب نے سائر کو دیکھا تھا، وہ ایک سنجیدہ کم گو اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا انسان لگا تھا اسے۔ ابراہیم اور وقار کی دوستی کے باوجود ان کے بچوں کے درمیان دوستی تو درکنار بے تکلفی بھی نہیں تھی۔

بہرکیف... میرب کا کوئی خاص آئیڈیل نہ تھا۔ سو اس نے اچھی مشرقی لڑکیوں کی طرح بڑوں کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔



"لالی سے کہہ کر گیسٹ رومز کی صفائی ستھرائی خود اپنی نگرانی میں اچھی طرح کروادی ہے۔ وقار بھائی بتا رہے تھے کل دوپہر کو پہنچیں گی تمہاری پھوپھیاں یہاں۔ میں چاہ رہی ہوں کہ مہمانوں کی آمد سے قبل ہی تمام ضروری کام نپٹ جائیں۔ ذرا دلہن کے سامان کی لسٹ لاؤ۔ دیکھوں تو، مبادا کچھ رہ گیا ہو۔" مہ پارہ بڑی مصروفیت آمیز لہجے میں کہتی اجیہ کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ اجیہ جو اپنے بیڈ پر نیم دراز ٹی وی دیکھنے میں منہمک تھی ان کی بات سن کر اور رائٹنگ ٹیبل کی دراز میں سے طے شدہ پرچا نکال کر انہیں تھما دیا۔

"ہوں..." مہ پارہ نے آرام دہ انداز سے کاؤچ پر بیٹھ کر پرچا تھام کر اسے کھولتے ہوئے پرسوچ ہنکارا بھرا۔

اکیس بھاری جوڑے، برائیڈلز، اس کے لوازمات، دلہن کے زیورات اور سونے کے کنگن، انہوں نے نگاہ اٹھا کر سنہری خوب صورت ڈبوں میں پیکٹ شدہ سامان جو احتیاط کے پیش نظر اجیہ کے کمرے میں رکھا ہوا تھا، کو دیکھا۔

"کنگن کہاں ہیں؟" وہ پریشانی سے پوچھنے لگیں۔

"ان کی شاید پالش باقی رہ گئی تھی۔ سنار نے آج شام تک دینے کا کہا ہے۔ بھائی جان لیتے آئیں گے۔" اجیہ نے بتایا۔

"بیٹا ایسا کرو تم ذرا فون کر کے اسے یاد دہانی کروا دو، عجیب بھلکڑ لڑکا ہے، کہیں بھول ہی نہ جائے کل تو بری پہنچانی ہے ان لوگوں کو۔" وہ فکر مندی سے بولیں تو اجیہ کو بے ساختہ ان پر پیار سا آگیا۔

"خالہ جانی..." اس نے بڑے پیار سے انہیں مخاطب کیا اور ان کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولی۔

"بلیو می... آپ نے جس احسن طریقے سے اس شادی کا انتظام سنبھالا ہے میں تو مر کر بھی اتنی بہترین مینجمنٹ نہیں کرسکتی تھی۔"

"بے وقوف کہیں کی۔" انہوں نے اس کے انداز پر نہال ہو کر اسے پیار سے چپت لگاتے ہوئے کہا۔

"میں تو بس اپنی سی کوشش کر رہی ہوں کہ تم لوگوں کو کہیں کوئی کمی محسوس نہ ہو۔"

"مگر خالہ...!" یک لخت اجیہ کا مسکراتا چہرہ ماند پڑ گیا۔

"سب کچھ ہوتے ہوئے بھی زندگی میں کہیں کوئی کمی سی لگتی ہے۔" اس کے دل سے ہوک نکلی، مہ پارہ بھی افسردگی سے بولیں۔

"سچ تو یہ ہے کہ ماں کی کمی کو کوئی پورا نہیں کرسکتا۔" انہوں نے بے دلی سے سامان پرے کیا۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں تو مجھے ان لوگوں کی خوش قسمتی پر رشک آنے لگتا ہے، جن لوگوں نے امی کو دیکھ رکھا تھا۔ مجھے تو ان کے دھندلے سے نقوش بھی یاد نہیں۔ سالوں پہلے ان کی تصویر دیکھی تھی کہیں۔ اب تو وہ بھی پتا نہیں کہاں گئی۔" وہ نم آواز

میں بولی۔

"ہاں میری جان۔۔۔" مہ پارہ گہری یاسیت سے بولیں۔ "تم دو ماہ کی تھیں جب۔"

"وہ تم لوگوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئی اور جن کو جانا ہو انہیں کون روک سکا ہے۔"

"وہ کیسی دکھتی تھیں۔ بالکل میری طرح؟" اس نے پرشوق لہجے میں چمکتی آنکھوں سے پوچھا۔

"اوں ہوں۔۔۔" مہ پارہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولیں۔ "تم اس سے مشابہہ ضرور ہو مگر وہ تم سے کئی گنا زیادہ حسین تھی۔ بالکل کانچ سے بنی مورت۔"

"مائے گاڈ۔۔!" اجیہ رشک سے بولی۔ "پھر تو کیا لگتی ہوں گی وہ مس ورلڈ یا مس یونیورس؟" مہ پارہ ہنس پڑیں۔

"یہ مس ورلڈ اور یونیورس تو بس ایویں سی ہوتی ہیں' وہ خالص نکھری روشن نگاہوں کو خیرہ کردینے والے ماورائی حسن کی مالک تھی۔"

"تب ہی نانی نے اتنی چھوٹی عمر میں ان کی شادی کردی ہوگی۔ پھپھو بتا رہی تھیں کہ امی بابا سے کافی چھوٹی تھیں۔"

"ہاں۔۔" مہ پارہ غیر مرئی نقطے پر نگاہ جمائے بولیں۔ "اس کے تو اتنے رشتے آتے تھے کہ بی جان تو سمجھو بولائی بولائی سی رہتیں کہ کسے ہاں کریں اور کسے نا۔"

"واؤ۔۔۔" اس نے آنکھیں حیرانی و خوشی کی ملی جلی کیفیت میں پھیلائیں۔۔۔ پھر یک دم گہرے ملال میں ڈوب گئی۔

"کاش میں انہیں دیکھ پاتی۔ میں نے قدم قدم پر ان کی ضرورت محسوس کی ہے۔ میں انہیں بہت مس کرتی ہوں خالہ۔۔ میں ان کے متعلق ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں مگر پتا نہیں مجھے کیوں لگتا ہے کہ بابا' امی کا ذکر آنے پر کچھ چپ سے ہو جاتے ہیں اور سائر بھائی تو ہیں ہی اتنے ریزرو سے ان سے بے تکلفی سے بات کی ہی نہیں جاسکتی ورنہ میں ان سے ان کے بچپن کی۔۔۔ امی کے ساتھ گزارے لمحات کی بابت ضرور پوچھتی۔ مگر خالہ جانی۔۔۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ میں نے کبھی انہیں امی کو یاد کرتے نہیں دیکھا' بلکہ نہ انہیں' نہ بابا کو۔"

"ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی' بظاہر خاموش مگر دل کے تہ خانے میں محبت کا جہاں بسائے ہوئے۔ شاید وقار بھائی اور سائر کا شمار ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔" مہ پارہ نے کہا۔

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" اجیہ نے کہا۔

یاد ان کو کیا جاتا ہے بیٹا جن کو انسان بھولا ہو مگر یہ تم نہیں سمجھو گی بیٹے۔ مہ پارہ سوچ رہی تھیں۔



میرب کی رسم مایوں ادا کردی گئی تھی۔ بات بات پر اس کا دل بھر آرہا تھا۔ کبھی اپنی والدہ کی یاد' اس کی آنکھیں نم کردیتی' کبھی اپنے پیاروں سے جدائی کا دکھ۔۔۔

"اچھا اب بس بھی کردو میرو اور کتنا روؤگی۔" ماریہ کی اپنی حالت اس سے مختلف نہیں تھی مگر وہ خود پر قابو پاکر اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھنے لگی۔

"ماریہ۔۔ تم نے زندگی کے ہر موڑ پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی ہے۔ کبھی کسی موقع پر تنہا نہیں چھوڑا۔ بہت پیاری اور اچھی دوست ہو تم' مجھے فخر ہے تم پر۔۔۔" وہ بھیگے ہوئے تشکر آمیز لہجے میں بولی۔

"چلو شکر ہے' تم نے میری قدر تو جانی۔۔۔ ورنہ یہاں تو جسے دیکھو میری برائی پر کمربستہ ہے۔" وہ کورنش بجالانے کے بعد۔۔ بھنائے ہوئے لہجے میں بولی۔ میرب کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

رب رحیم' یہ بے ریا شفاف موتیوں سی ہنسی یوں ہی سدا سلامت رہے۔ ماریہ نے اسے دیکھتے ہوئے دل سے دعا دی۔ مگر کچھ دعائیں اتنی آسانی سے مقبول نہیں ہوتیں۔



یہ ایک پوش علاقے میں واقع شان دار گھر تھا۔ اس

ایڈریس پر پہنچنے میں گل کو خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بس اسٹاپ خاصا دور ہونے کی وجہ سے اسے اس بھری دوپہر میں ٹھیک ٹھاک پیدل چلنا پڑا تھا۔ اس گھر کے گیٹ تک پہنچتے پہنچتے وہ سر سے پیر تک پسینے میں شرابور ہو چکی تھی۔ لنگڑاتی ہوئی ٹانگ گویا درد سے چور ہو چکی تھی مگر نہ جانے کون سا جذبہ تھا جو وہ یوں بنا کچھ سوچے سمجھے یہاں تک چلی آئی تھی۔ اس نے کندھے پر لٹکائے گئے کالے رنگ کے عام سے ہینڈ بیگ سے وہ چٹ جس پر یہاں کا پتا درج تھا' نکالی پھر سر ہلا کر آگے بیل بجانے کو بڑھی' تب ہی کہیں سے باوردی گارڈ نے منہ نکالا۔

"اے... کیا بات ہے' کس سے ملنا ہے۔" اس نے خاصی ناگواری سے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے..." اک لمحے کے لیے اس نے کچھ سوچا۔ "مجھے اس گھر کی مالکن سے ملنا ہے۔" وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ مانگنے والوں کے لہجے ایسے نہیں ہوا کرتے۔ اسی لیے گارڈ اپنے ساتھی کو الرٹ کرتا کیبن سے نکل کر اس کی جانب آیا۔

"مالکن سے مگر کیوں؟" وہ درشت لہجے میں پوچھنے لگا۔

"کیوں کا کیا مطلب ہے؟" اس کے چتون بھی تیکھے ہوئے۔ "میں رشتے دار ہوں ان کی۔" اس کا عام سا گھسا ہوا حلیہ اور قطعی لہجہ گارڈ کو مخمصے میں ڈال گیا۔

"نام بتاؤ اپنا۔" پھر وہ جیسے کچھ سوچ کر انٹر کام سنبھال کھڑا ہوا۔

"ن... نام۔" وہ ہکلائی۔ (کہیں وہ نام سن کر ملنے ہی سے منکر نہ ہو جائے۔)

"کیوں؟ اپنا نام بھی یاد نہیں آ رہا۔" گارڈ طنزیہ بولا۔

"گل... کہو گل آئی ہے۔" اسے بولنا ہی پڑا۔ (اب جو ہو' دیکھی جائے گی) وہ سوچنے لگی۔

"السلام علیکم بیگم صاحبہ! کوئی گل آئی ہے۔ اپنے آپ کو آپ کا رشتے دار بتاتی ہے' کیا کرنا ہے۔ جی... جی بہتر۔" پھر وہ گل کی جانب مڑا۔

"بی بی کہہ رہی ہیں' وہ کسی گل کو نہیں جانتیں' اب کہو؟" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

"خدا کے لیے مہ پارہ! صرف ایک بار مجھ سے مل لو' صرف ایک بار۔" اس نے جھپٹ کر گارڈ سے ریسیور چھینا اور گڑگڑائی۔

"مگر میں مہ پارہ نہیں ہوں۔ اوہ... اچھا ٹھہرو' گارڈ کو ریسیور دو" دوسری جانب سے کہا گیا۔

"جی... جی بہتر۔" گارڈ مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر ریسیور رکھ کر اس سے مخاطب ہوا۔

"جاؤ' اندر بی بی لان میں موجود ہوں گی۔" دوسرے گارڈ نے مین گیٹ کا الیکٹرک لاک کھول دیا۔ وہ پر اعتماد قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ بڑا ہی شان دار اور پرشکوہ گھر تھا۔ گل کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ سیدھے ہاتھ پر ہرا بھرا لان تھا۔ وہاں کین چیئر پر کوئی بیگم صاحبہ ٹائپ خاتون' براجمان تھیں۔ خاتون نے حیرت سے نو وارد خستہ حال خاتون کو دیکھا۔

"جی فرمایئے..." اس نے اپنے مقابل کرسی کی جانب اشارہ کر کے گویا بیٹھنے کا کہا۔ گل کا مصنوعی اعتماد اب متزلزل تھا۔

"جی مجھے مہ پارہ سے ملنا ہے' یہ اس کا گھر ہے نا؟" وہ جلدی سے بولی۔ زندگی میں ویسے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔

"گھر ہے نہیں تھا' پہلے یہاں انہوں نے کرائے دار رکھے ہوئے تھے۔ خود تو وہ کافی برس پہلے ہی آسٹریلیا چلی گئی تھیں۔ بعد میں ان سے یہ گھر ہم نے خرید لیا' اب تو ہمیں بھی یہاں رہتے دس سال ہونے کو ہیں۔ مگر آپ کی تعریف..." ان کی آنکھوں میں الجھن دکھائی دی۔

"جی میں ان کی دور کی رشتے دار ہوں۔ کئی برس پہلے میری شادی اندرون سندھ میں ہو گئی تھی۔ پھر کئی سال میں کراچی آ نہ سکی' اس لیے بہت سے رشتے دار چھوٹ گئے۔ بہت سوں کا تو میں پتا بھی گنوا بیٹھی

ہوں' جیسے مہ پارہ کا۔" وہ حقیقتاً" تاسف سے بولی۔ دو دن سے بدن میں در آئی توانائی زائل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

"جی میں سمجھ سکتی ہوں مگر ایسا ہے کہ اگر آپ مہ پارہ سے ملنا چاہتی ہیں تو میرے پاس ان کی بہن کے گھر کا ایڈریس موجود ہے۔ ان کی بہن کا تو کافی سال پہلے انتقال ہو گیا تھا' البتہ ان کے بہنوئی اور بچے اسی ایڈریس پر موجود ہیں اور آپ کے لیے اچھی خبر تو یہ ہے کہ آج کل مہ پارہ بھی پاکستان آئی ہوئی ہیں۔ دراصل مہ پارہ کے شوہر مکرم بھائی میرے رشتے کے کزن لگتے تھے۔ اسی لیے ان سے علیک سلیک تو بہرحال رہتی ہی ہے۔ شانو! اندر سے میری ایڈریس والی ڈائری اور پین لے کر آؤ۔" انہوں نے بولتے بولتے اور جوس پیش کرتی نوکرانی کو مخاطب کیا۔

"جوس لیجیے آپ۔" انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔

"جی... جی۔" وہ جیسے ہڑبڑا کر ہوش میں آئی اور سرعت سے جوس کا نازک سا گلاس تھام کر لبوں سے لگا کر ایک ہی سانس میں خالی کر کے واپس رکھ بھی دیا۔ بیگم شاہانہ امتیاز نے بے حد تعجب سے اس کی حرکت دیکھی۔ پھر دل میں سوچا۔ بے چاری ہے تا کسی گوٹھ کی گنوار' پتا نہیں ایسے رشتے داروں سے میل جول رکھنا مہ پارہ بھابھی کو کیوں پسند ہے۔ شاید اس لیے کیونکہ ان کا میکہ بھی بہرحال ایک مڈل کلاس فیملی سے متعلق تھا۔

"کہاں رہ گئی آپ کی ملازمہ؟" اس کی بے چین نگاہیں وہاں گڑ کر رہ گئی تھیں۔ جس دروازے سے ملازمہ گھر کے اندرونی حصے کی جانب گئی تھی۔

"آپ اطمینان رکھیے' ابھی آجاتی ہے۔" وہ اوپری لہجے میں بولیں۔ تب ہی ملازمہ ڈائری اور پین تھامے چلی آئی۔ گل کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ ڈائری اچک کر اس میں سے گوہر مقصود برآمد کر لے۔

"جی..." بیگم شاہانہ نے ڈائری کا مطلوبہ صفحہ کھول کر اس میں سے ایڈریس اور فون نمبر ایک چٹ پر منتقل کیا اور گل کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وقار فاروقی نام ہے ان کے بہنوئی کا۔ مکمل ایڈریس اور گھر کا فون نمبر میں نے آپ کی سہولت کے لیے لکھ دیا ہے۔"

"جی بہت شکریہ۔" اس نے جھپٹ کر کاغذ کا ٹکڑا تھاما اور مزید کچھ کہے بنا' پلٹ کر داخلی گیٹ کی جانب چل دی۔

گل جب ایک موہوم سی امید کے سہارے یہاں تک آئی تب اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ منزل مقصود تک یوں ڈائریکٹ رسائی ہو جائے گی۔ یقیناً" اس کے ستارے آج کل بلندی پر تھے۔ وہ گیٹ سے باہر آئی اور اپنی لنگڑاتی ہوئی ٹانگ کے ساتھ بڑی شاداں و فرحاں سی مین روڈ کی جانب بڑھنے لگی۔

گارڈ اپنے کیبن کی کھڑکی سے اس کی پشت تکنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں اس مشتبہ عورت کے لیے ناگواری سی تھی۔ پتا نہیں یہاں کیا لینے آئی تھی۔ وہ بڑبڑایا۔ وہ جو کچھ یہاں سے لینے آئی تھی لے کر جا چکی تھی۔



"بس بھائی جان! آپ سے ہمیشہ یہ ہی شکایت رہی زندگی کے کسی موڑ پر بھی آپ نے ہم سے نہ اپنے درد بانٹنے چاہے' نہ خوشی۔ ناز بھابھی آپ کے دیرینہ دوست کی پسند تھیں' حالانکہ ہمیں کتنا شوق تھا خود سے بھابھی پسند کر کے لانے کا' مگر خیر' وہ تو ناز بھابھی تھیں ہی اتنی من موہنی صورت کی حامل کہ بھلا کون بدنصیب انہیں رد کرتا۔ پھر ان کی زندگی میں آپ نے شاید ایک آخری مرتبہ ہی ہمیں اپنے بچوں کی خوشی میں شریک کیا ہو گا' پھر جب آپ یہاں کراچی آگئے تو ہم اس سے بھی گئے۔ میرے دل سے تو آج تک اس بات کا غم نہیں جاتا کہ آپ نے ناز بھابھی کے گزرنے کے بلکہ ان کی تدفین ہو جانے کے بعد ہمیں بتایا بھلا ایسی غیریت کوئی اپنوں سے بھی برتتا ہے؟"

نروٹھے لہجے میں کہتیں یہ وقار صاحب کی چھوٹی بہن سائرہ تھیں جو اپنی چھوٹی بہن نعیمہ کے ساتھ کل

ہی لاہور سے یہاں تشریف لائی تھیں۔ سائرہ کے بڑے بیٹے فاران ڈاکٹر تھے اور آج کل امریکا میں ہوتے تھے۔ انہوں نے دونوں چھوٹی بیٹیاں اپنے سسرالی عزیزوں ہی میں بیاہی تھیں۔ جبکہ نعیمہ کا ایک بیٹا حدید پنجاب یونی ورسٹی میں زیر تعلیم تھا اور چھوٹی بیٹی رمشا جوانئر کا امتحان دے کر فارغ تھی' ان کے ساتھ ہی آئی تھی۔ سائرہ تین سال پہلے بیوہ ہوئی تھیں' سو اس لحاظ سے آج کل وہ بالکل فارغ تھیں۔ البتہ نعیمہ کے شوہر امتیاز حسین کی طبیعت ٹھیک نہ رہتی تھی' سو وہ ساتھ نہیں آئے تھے۔

یہ سب اس وقت لونگ روم میں بیٹھے لانی کے ہاتھ کی مزے دار سی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے' تب ہی وہ یہ قصہ چھیڑ بیٹھیں۔ سائر' جو پہلے ہی جبراً یہاں بٹھایا گیا تھا' نے بے چینی سے ان کی بات پر پہلو بدلا۔ مہ پارہ خاموشی سے چائے کے گھونٹ لیتی رہیں۔ اجیہ جو بے تابی سے اپنی فرینڈز کا انتظار کر رہی تھی' اس تذکرے پر کچھ بجھ سی گئی اس کے ساتھ ہی رمشا بیٹھی تھی۔ ان دونوں کے درمیان کزنز والی روایتی دوستی تو خیر مفقود تھی مگر بہرحال وہ دونوں نو عمر لڑکیاں تھیں اور شادی والے گھر میں اکٹھی تھیں' سو ان کے مابین اچھی خاصی بے تکلفی قائم ہو چکی تھی۔

"سائرہ! تمہاری یہ شکایت بے جا ہے' میں نے ہر ہر موقع پر تم دونوں بلکہ انگلینڈ بیٹھے حسن (چھوٹے بھائی) کو بھی ہمیشہ یاد رکھا ہے۔" وقار صاحب نے کچھ ناگوار سے لہجے میں کہا۔

"ہاں... اتنی مہربانی تو بہرحال آپ نے کی ہے' فیصلہ کرنے کے بعد بتا ضرور یاد کرتے تھے اور ابھی بھی آپ نے یہ ہی کیا۔ میں نے تو وہاں اتنی اچھی لڑکی سائر کے لیے نظروں میں رکھی ہوئی تھی' مگر آپ نے تو اچانک ہی دھماکا کر دیا۔" نعیمہ بھی لب کشا ہوئیں۔ سارا دکھ اس بات کا تھا کہ رمشا کو وہ سائر کی دلہن بنانے کا سوچے ہوئے تھیں۔

"سائر میرا بیٹا ہے' میں اس کے مزاج کے سب رنگوں سے واقف ہوں اور اس کے مطابق ہی میں نے اس کی دلہن تلاش کی ہے تو کیا غلط کیا ہے؟" وہ اس مرتبہ درشت لہجے میں بولے تو دونوں جز بز سی ہو گئیں۔ پھر سائرہ تروٹھے پن سے بولیں۔

"آپ کا بیٹا ہمارا بھی تو کچھ لگتا ہے نا' یا کہہ دیں کہ نہیں لگتا؟" سائر کی عمر کے چھبیس دیں برس انہیں اس بات کا خیال آرہا تھا۔ اب تک کی عمر ان دونوں نے بن ماں کے کیسے گزاری اس چیز کا انہیں شاید احساس نہیں تھا۔ انسان یقیناً" اتنی ہی خود غرض فطرت کا حامل ہے۔ فرض سے ناآشنا اپنا حق وصولنے کے لیے ہمہ وقت تیار۔

سائر کے خوب صورت نین و نقش تن سے گئے۔ مگر وہ خاموش رہا' کہنا بہت کچھ چاہتا تھا' مگر وقار کی تربیت اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ وہ دنیا کا ہر غم سہہ سکتا تھا مگر وقار کا جھکا سر دیکھ کر جو اس پر بیتی تھی' وہ جانکنی سے زیادہ تکلیف دہ اذیت تھی۔ وہ اس اذیت کا ذائقہ ایک دفعہ چکھ چکا تھا اور اس دن اس نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے' وہ یہ سر پھر دوبارہ کبھی نہیں جھکنے دے گا۔

"کیوں نہیں' تم پھپھو ہو اس کی' تمہارا حق ہے اس پر۔" وقار صاحب نے متانت سے کہتے ہوئے ان کا مان بڑھایا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ یک دم بہت خوش ہو کر بولیں۔ ناز بھابھی کی جگہ ماں کے سارے شگن میں پورے کروں گی۔ ان کی بات کی تائید میں نعیمہ بولیں۔

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔ تیاری وغیرہ تو ساری مہ پارہ نے کرلی تھی۔ ہم تو چاہ کر بھی اتنے دن پہلے یہاں آہی نہ سکے۔ بھرے پرے سسرالوں کے سو بکھیڑے۔" مہ پارہ ہلکے سے مسکرا دیں۔ چاہتی تو یہ کہہ سکتی تھیں کہ بھلے وہ اپنے شوہر اور اکلوتے بیٹے کے ساتھ آسٹریلیا میں تنہا رہتی ہیں مگر فارغ نہیں رہتیں۔ اکیلے آدی کی ذمے داری ویسے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

"ہمیں نیگ میں دینے کے لیے کیا خریدا ہے سائر بھائی!" شوخ و شنگ رمشا نے اسے چھیڑا۔ "آخر ہم بہنیں ہیں آپ کی۔"

"کیوں فکر کرتی ہو' آخر بھائی جان کی زندگی کا اتنا خوب صورت موقع ہے۔ کچھ نہ کچھ تو وہ ضرور دیں گے ہی' کیوں بھائی۔" اجیہ نے شرارت سے اپنے بھائی کی جانب دیکھا۔ جو اچانک ہی اٹھ کر بنا کچھ کہے ہی اس محفل سے نکلتا چلا گیا۔ سائرہ اور نعیمہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو معنی خیز اشارے کیے۔ اس ردعمل پر اجیہ کا منہ اتر گیا۔ رمشا نے محض کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔

"بھائی جان نے..." کچھ دیر بعد نعیمہ بولیں۔ "سائر کے مزاج کے مطابق لڑکی تو شاید ڈھونڈ ہی لی ہے آپ نے... مگر ضروری تو نہیں کہ وہ لڑکی سائر کو پسند بھی آئی ہو۔" وہ سوئی چبھونے والے لہجے میں بولیں' جس کی چبھن وقار صاحب نے بخوبی محسوس کی۔

"نعیمہ... کیا ہو گیا ہے' کیسی باتیں کر رہی ہو' کل بارات ہے۔ کیا تمہیں اس موقع پر ایسی ناگوار باتیں کرنا زیب دیتا ہے۔" انہوں نے سرد مہری سے کہا تو وہ بادل نخواستہ چپ کر گئیں۔ مگر وقار گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ کیوں نہ ہوتے' ہر طرف سے سائر کے رویے کو تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ اسی وقت لالی نے آکر اجیہ کی دوستوں کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ تو یوں بھی ماحول کی کشیدگی سے اکتائی بیٹھی تھی۔ فوراً" سے پیشتر ڈرائنگ روم کی جانب چل دی۔ کچھ دیر بعد جب وہاں سے شادی بیاہ کے گیتوں کی آواز آنے لگی تو یکے بعد دیگرے سب ہی وہیں اکٹھا ہو کر شگن کے گیت گانے لگیں۔

مگر وقار کے اعصاب پر وہ گیت' ہتھوڑے کی طرح ضربیں لگا رہے تھے۔

سائر کے سنجیدہ اور لیے دیے رویے کو وہ خود بھی کافی محسوس کر رہے تھے۔ اس پر اس کے متعلق سائرہ اور نعیمہ کی کڑوی' مگر کسی حد تک درست باتیں گویا ان کے اعصاب پر سوار ہو گئیں۔

کیا واقعی میں نے سائر کی پسند کو اہمیت نہیں دی؟ کیا اس کی مرضی کچھ اور تھی اور میں اپنا انتخاب اس پر مسلط کر بیٹھا ہوں۔ رات کے ڈیڑھ دو بجے کا عمل تھا۔

شام سے برپا شور و ہنگامہ اب سرد پڑ گیا تھا۔ مگر وقار صاحب کی نیند کو یہ دہلاتے سوالات چرا کر لے گئے تھے۔ جب وہ اپنے کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے گویا تھک سے گئے۔ تب ہی کسی خیال کے تحت انہوں نے سائر کے کمرے کی راہ لی۔

دروازہ دوسری دستک پر کھل گیا تھا۔

ڈھیلے ڈھالے چیک دار نیلے ٹراؤزر اور براؤن ٹی شرٹ میں آنکھوں میں نیند کا ہلکا سا خمار لیے وہ وقار صاحب کو دیکھ کر یک دم چونکتا سا ہو گیا۔

"بابا! آپ اس وقت یہاں... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے' آیئے اندر آیئے۔" اس نے فکرمندی سے کہا۔ وہ اندر چلے آئے۔ اس نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔

"سو گئے تھے۔" انہوں نے شفقت سے اس کا تھکا تھکا سا چہرہ دیکھا۔

"جی بس ذرا کام تھا لیپ ٹاپ پر بزی تھا۔ بس ابھی ہی فارغ ہوا ہوں مگر آپ اس وقت یہاں..." وہ سامنے رکھے فان اور میرون بیش قیمت صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔

"نہیں الحمدللہ بالکل ٹھیک ہوں۔ جس کا تم جیسا قابل فخر بیٹا ہو اسے اتنی آسانی سے بھلا کچھ ہو سکتا ہے؟ بس یوں ہی تم سے کچھ باتیں کرنے کا جی چاہا سو چلا آیا اگر تم ڈسٹرب ہوئے ہو تو معذرت چاہتا ہوں۔" وہ اس کی تشویش زائل کرنے کو دانستہ دھیمے لہجے میں بولے۔

"ارے نہیں بابا' وہ بے ساختہ بولا' میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا۔" کچھ دیر توقف کے بعد وہ بولے۔

"سائر... میں لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھوں گا۔ میں صرف تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کہیں انجانے میں' میں نے تمہارا کوئی خواب تو چکنا چور نہیں کر دیا۔ میرا مطلب ہے کہ خدانا خواستہ تم کہیں اور انٹرسٹڈ تو نہیں تھے؟" وہ ٹٹولتی نظروں سے اسے بغور تکتے ہوئے بولے۔

"یہ کیسا سوال ہے بابا' وہ حیران ہوا' آپ کو ایسا کیوں

لگا؟ آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ میری زندگی کا ہر فیصلہ کرنے کا اختیار میں نے صرف آپ کو سونپ رکھا ہے پھر اس سوال کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔"

"نکلتی ہے بیٹا، مجھے یہ کہتے میں کوئی عار نہیں کہ تم انتہائی سعادت مند اور فرماں بردار ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے مجھے انکار نہ کرنے کے خیال سے اپنے دل کو روند ڈالا ہو۔" وہ سنجیدہ لہجے میں پوچھنے لگے۔

"یہ دل بھلا کیا شے ہوتی ہے بابا" وہ سر جھٹک کر استہزائیہ انداز میں بولا "اس دل سے بھی زیادہ مسلم حقیقتیں ہیں میری زندگی میں اور آپ اطمینان رکھیے۔ جیسا آپ سوچ رہے ہیں ویسا کچھ بھی نہیں اور یوں بھی آپ نے تو مجھ سے میری رائے، میری پسند پوچھی تھی، کوئی ہوتی تو بتاتا نا۔" وہ انہیں مطمئن کرنے کے لیے بولا۔

"مگر تمہارا خاموش انداز اور اکھڑ رویہ مجھے الجھا رہا ہے۔ میں ہی کیا تقریباً سارے ہی لوگ اس بات کو محسوس کر چکے ہیں، ایسے میں میری تشویش کچھ ایسی بے جا بھی نہیں۔ شادی اپنی مرضی سے ہو یا کسی اور کی مرضی سے۔ لڑکے تو لفظ شادی سنتے ہی کھل سے جاتے ہیں۔ ان کے لب ہمہ وقت مسکراہٹیں بکھیرتے رہتے ہیں۔ آنکھوں سے خوشی کی کرنیں پھوٹ رہی ہوتی ہیں اور تم۔۔۔" انہوں نے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔

"تمہارا بجھا ہوا چہرہ، ماند مسکراہٹ اور کسی بھی جذبے سے عاری آنکھیں مجھ سے بہت کچھ کہہ رہی ہیں بیٹے۔" وہ جتاتے لہجے میں بولے تو بالآخر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"بابا۔۔۔ ابھی میں نے اس بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا تھا اور آپ نے اچانک ہی مجھ پر اتنی بھاری ذمے داری ڈالنے کا پلان بنا لیا، بس میں اسی لیے شاکڈ ہوں اور کچھ نہیں۔ سوچتا ہوں آگے زندگی کیسے مینیج ہوگی۔ بس یہ ہی بات مجھے پریشان کیے ہوئے ہے۔" (اب وہ انہیں کیسے بتائے کہ اک خواب ہے تو سہی، بھیانک خواب۔ جو اسے راتوں کو سوتے سے جگا دیتا ہے۔ اس کے دل برباد کو آباد ہونے نہیں دیتا۔)

"واقعی۔۔۔؟" انہیں جیسے یقین نہ آیا۔ "محض اتنی سی بات تمہیں پریشان و بے چین کیے ہوئے ہے۔ بیٹا میں نے تمہارے لیے میرب کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ وہ پڑھی لکھی، سمجھ دار اور باشعور گھریلو قسم کی لڑکی ہے۔ اس کا بچپن بھی میری آنکھوں کے سامنے گزرا ہے۔ اس نے اپنے باپ کے گھر کو جنت بنا رکھا ہے۔ وہ یقیناً" تمہارے لیے ایک بہترین بیوی ثابت ہوگی اور جہاں تک اچانک اس فیصلے کی بات ہے تو یہ اتنا بھی آنا" فاناً" نہیں۔ اب نہیں تو دو یا تین سال بعد تو بہرحال تمہاری شادی کرنی ہی تھی، پھر اجیہ کا مسئلہ بھی تمہارے سامنے ہے۔ وہ اپنی عمر کے نازک دور میں ہے۔ اسے کسی باشعور عورت کی سرپرستی کی ضرورت ہے۔ وہ تم سے یا مجھ سے تو اپنے دل کی باتیں شیئر کرنے سے قاصر ہے، اپنی پھوپھوں کا حال تم دیکھ چکے ہو۔ مہ پارہ کا دم غنیمت ہے۔ اس نے ہمیشہ تم دونوں سے خصوصی محبت کا سلوک روا رکھا ہے مگر بہرحال یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کا بھی اپنا گھر بار ہے اور پھر وہ رہتی بھی دیار غیر میں ہے۔ سامنے رہنا بعض اوقات بہت ضروری ہوتا ہے۔ آئے دن اجیہ کی دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا چلا جارہا ہے۔ بچیوں کو سو طرح کی باتیں سکھانی ہوتی ہیں جو تم اور میں ڈائریکٹ کبھی نہیں سمجھا سکتے۔ اسی لیے مجھے یہ ہی حل بہتر لگا کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔ تمہاری بھی تنہائی دور ہوگی اور اجیہ کو بھی جب گھر ہی میں دوست میسر آجائے گی تو بھلا وہ باہر کیا لینے جائے گی۔" انہوں نے اب کی مرتبہ اطمینان سے اپنے فیصلے کے پس منظر سے آگاہ کیا۔

"آپ نے کچھ زیادہ ہی توقعات تو نہیں وابستہ کر لیں؟" وہ بے یقین لہجے میں پوچھنے لگا۔ جواباً" وہ مسکرا دیے۔

"مجھے زندگی میں بھلے کسی اور چیز کی پہچان ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو البتہ عورت کی پہچان مجھے اچھی طرح ہوگئی ہے اور تم اپنی خوش قسمتی پر جتنا نازاں ہو کم ہے۔

میرے بیٹے! تمہارے باپ نے تمہارے لیے ہیرا چنا ہے۔ خالص ہیرا۔ مجھے یقین ہے بیٹی میرب میرے مان کو توڑے گی نہیں۔" ان کے لہجے میں اتنا یقین تھا کہ سائر ششدر رہ گیا۔ (بابا نے زندگی میں جو کچھ بھگتا ہے' کیا اس کے بعد بھی وہ کسی پر اس حد تک اعتبار کر سکتے ہیں؟) اس نے سوچا۔

"چلو بیٹے' میرے دل میں جو پھانس چبھ رہی تھی تم نے نکال دی۔ اب میں مطمئن ہوں' رات کافی بیت چکی ہے۔ اب تم بھی پر سکون ہو کر سو جاؤ۔ کل تمہاری بارات ہے اور میں چاہتا ہوں میرا بیٹا کل بالکل شہزادہ لگے۔" انہوں نے پیار سے اس کا ماتھا چوم کر کہا۔ تو اس کی آنکھیں ان کی والہانہ محبت پر بھیگ سی گئیں۔

"بابا! اس بے غرض محبت کے صدقے اگر آپ مجھے کنویں میں بھی چھلانگ لگانے کا کہہ دیتے تو میں لگا دیتا اور یہ رشتہ جوڑنا میرے لیے خودکشی کرنے جیسا ہی ہے' مگر میں تیار ہوں بالکل تیار ہوں' آپ کی بے ریا محبت کے صدقے۔" ان کے جانے کے بعد اس نے خود سے کہا اور چپکے سے آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

رات تقریباً" روزانہ ہی اس مختصر سے گھٹن زدہ تاریک فلیٹ میں کسی قہر کی صورت اترتی تھی۔ اپنے سود و زیاں کا گل روز ہی حساب لگاتی اور سارے کا سارا خسارہ اسی کے کھاتے میں درج ملتا۔ ایسے میں اس پر چھائی جھنجلاہٹ' کڑواہٹ میں بدلنے لگتی اور پھر یہ کڑواہٹ زہر کی مانند رگ و پے میں سرائیت کر جاتی۔ گل اپنا نیل و نیل وجود لیے تکلیف سے کراتی' ہسٹریائی چیخیں مارتی' مگر یہاں کون تھا جو اس کی فریاد سنتا۔ ایک عہد' گل نے بہت پہلے ہی اپنے آپ سے کر لیا تھا۔ زندگی میں جب بھی موقع ملا وہ اپنی بربادی کے ذمے دار کو ضرور ان حالوں تک پہنچائے گی کہ وہ بھی اسی کی طرح تڑپے گا' روئے گا' چیخے گا اور شاید یہ مقصد اور عہد اب پورا ہونے جا رہا تھا۔ گل معمول کے مطابق اپنے روزمرہ کے کام نپٹا کر اطمینان سے سنگل بیڈ' جس پر نیلے رنگ کی سفید پھولوں والی پرانی چادر بچھی ہوئی تھی' پر بیٹھی اور مکمل سکون سے جٹ پر جو کہ اس روز گل نے بیگم شاہانہ سے حاصل کی تھی' موجودہ نمبر ڈائل کرنے لگی۔ بیل جا رہی تھی۔ گل کوئی کچی کھلاڑی نہیں تھی۔ اس کا ماضی گواہ تھا کہ وہ کتنی زبردست پلانر تھی۔ اب بھی وہ اس طرح جال بچھا رہی تھی کہ کامیابی یقیناً" اس کا مقدر ٹھہرتی۔ یہ کال یوں ہی گئی۔ دوبارہ' سہ بار' اس نے ہمت نہ ہاری۔

"ہیلو۔" اس بار کسی نے فون ریسیو کر لیا' آواز مرد کی تھی۔ یک لخط گل کا اعتماد متزلزل ہوا' مگر پھر اس کا ازلی رعونت آمیز انداز عود کر آیا۔

"السلام علیکم۔ کون بات کر رہا ہے؟" گل نے سنبھل کر احتیاطاً" پوچھا۔

"بی بی۔ فون آپ نے کھڑکایا ہے۔ پہلے آپ بتاؤ' آپ کون ہو؟" وہاں سے بے زار کن مگر مضبوطی تادیبی لہجے میں پوچھا گیا۔

"میں۔ میں۔" اتنا تو گل سمجھ گئی تھی کہ فون کسی ملازم نے اٹھایا ہے' مگر پھر بھی اس کی ذات کا حوالہ ایسا تھا کہ وہ دے نہ سکتی تھی۔

"میں۔ مجھے اجیہ فاروقی سے بات کرنی ہے' میں اس کی دوست کی والدہ بات کر رہی ہوں۔" بالآخر وہ گویا ہوئی۔

"بی بی' صاحب تو گھر پر موجود نہیں ہیں۔ وہ لوگ تو چھوٹے صاحب کی بارات لے کر نکل چکے ہیں' پر آپ کو کیا کام ہے؟" شریف نے بتایا۔ خوش قسمتی سے تو چھیالیس انچ کے ایل سی ڈی پر "پتر ہمایوں گجر دا" دیکھنے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔ اس پر اس غیر اہم کال کی آمد اس کا مزہ کرکرا کرنے کے درپے تھی۔

"ہاں۔ ہاں دراصل ہمیں ہوٹل کی لوکیشن سمجھ میں نہیں آ رہی' اسی لیے کال کی تھی کہ اس کا راستہ اچھی طرح سمجھ سکوں' اصل میں ہم اس شہر میں نئے ہیں' اسی لیے راستوں سے مکمل واقفیت نہیں رکھتے۔

اگر ہو سکے تو اجیہ کا موبائل نمبر دے دو' میں خود اس سے رابطہ کرکے پوچھ لوں گی۔" گل جلدی سے بہانہ گھڑ کے چالاکی سے بولی۔

اور جو شریف کی ساری توجہ ہمایوں کے پیتر کی جانب نہ مبذول ہوئی ہوتی تو ضرور ہی سوال کرڈالتا کہ "بی بی کی سہیلی کے پاس نہیں ہے ان کا نمبر" مگر اس کی بے توجہی گل کا کام بنا گئی۔

"ہاں ہاں... لکھو... زیرو تھری... اور اچھا خدا حافظ۔" اس نے جلدی سے اجیہ کا نمبر اسے لکھوا کر سرعت سے فون رکھ دیا اور ایک مرتبہ پھر آکر صحت مند حسیناؤں کے نادیدہ حسن میں کھو گیا۔ دوسری جانب گل کو یقین ہو چلا تھا کہ اس کی قسمت کی گردش اب تمام ہو چکی ہے اور اس کے ستارے ایک مرتبہ پھر جگمگا اٹھے ہیں۔

"وقار! آج سے سالوں پہلے تم نے مجھے جو اذیت دی تھی اس کے بدلے کا وقت آن پہنچا ہے اور میرا یقین کرو میں وہ اذیت تمہیں سود سمیت واپس لوٹاؤں گی۔ میرے خوابوں کو چکنا چور کرنے والے! تم نے جو نقصان مجھے پہنچایا تھا اس کے آگے تو یہ تکلیف کچھ بھی نہیں۔ آج سے تم الٹی گنتی گننا شروع کردو' کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ گل جو کہہ دے' کرتی ضرور ہے۔" وہ خود کلامی کررہی تھی۔ مگر اس کا لہجہ... کوئی درندہ بھی سنتا تو دہل جاتا اور اس کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک کمرے میں ڈولتی تنہائی نے جھرجھری سی لی تھی۔



ہوٹل میں بارات کا شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ استقبال کرنے والوں میں لائٹ پنک لمبی فراک چوڑی دار پاجامہ اور تیز گلابی دوپٹے میں ملبوس ماریہ پیش پیش تھی اور اس کی والدہ سائر کے گھروالوں کو بڑی اچھی طرح اٹینڈ کررہی تھیں۔ میرب کی "قریبی کزنز یعنی رشتے دار" دور کے عزیزوں کی طرح اجنبی سے بنے بیٹھے تھے۔ کچھ غیروں کو سب انتظام سونپ دینے پر خفا بھی تھے۔ جس دم سرخی مائل براؤن کلر کی شیروانی جس پر گولڈن اور سرخ خوب صورت کام بنا ہوا تھا زیب تن کیے اور گولڈن اور فان کلاہ سر پر تاج کی طرح سجائے شہزادوں کی سی آن بان والے سائر کے برابر میں سرخ جس پر سنہری اور فیروزی بھاری کام بنا ہوا تھا۔ سونے کی فیروزے جڑی جیولری سے آراستہ و پیراستہ میرب کو ماریہ نے لاکر بٹھایا' اک پل کو اس خوب صورت سے شادی ہال میں موجود تمام نفوس نے بے ساختہ اس پرفیکٹ جوڑی کو سراہا تھا۔ وقار صاحب اور ابراہیم صاحب کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ان کی دیرینہ دوستی آج بالآخر رشتے داری میں تبدیل ہونے جارہی تھی اور اجیہ... اس کی تو آج چھب ہی نرالی تھی۔ سیاہی مائل گرین اور ڈارک میرون چنری کے خوب صورت کام سے مزین لانگ شرٹ اور شرارے میں وہ شعلہ جوالا بنی ہوئی تھی۔ پشت پر لہراتے کالے سیاہ ریشمی بال' پیشانی پر سونے کا بڑا سا گول ٹیکا جس کے سرے پر زمرد لٹکا ہوا تھا' اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھا۔ آج کئی دل اسے دیکھ کر ڈول گئے تھے۔ وہ بے چینی سے اپنی نئی نویلی دوست شہنا کی منتظر تھی۔ نئی نویلی اس لیے کہ شہنا سے اس کی دوستی تقریباً" چھ ماہ قبل کمپیوٹر کورس کے سلسلے میں جوائن کیے گئے ادارے میں ہوئی تھی۔ حسب عادت اجیہ نے اپنی افتاد طبع سے مجبور ہوکر انسٹی ٹیوٹ تو کب کا چھوڑ دیا تھا مگر شہنا یوں چپکی کہ چھٹ نہ سکی۔ وہ بھی اس کی طرح امیر خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر اجیہ کے برعکس کافی شوخ' بولڈ اور آزاد خیال سی لڑکی تھی۔ اجیہ کی ہر دور کی ایک دوست ہوا کرتی تھی۔ جو چند قدم ساتھ چلنے کے بعد کسی نہ کسی وجوہ کی بنا پر اس سے علیحدہ ہوجاتی یا اجیہ ہی اس سے ملنا ترک کردیتی۔ آج کل شہنا سے اس کی دوستی زوروں پر تھی۔ تب ہی دور سے شہنا آتی دکھائی دی۔ اجیہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

"اتنی دیر لگادی' رسمیں بس شروع ہی ہونے والی ہیں۔" وہ قریب آکر کسی قدر فہمائش سے بولی۔

"سانس تو لیا کرو لڑکی۔ نہ حال پوچھا' نہ چال' لگیں

رعب جھاڑنے۔" وہ اس سے لپٹ کر گال سے گال ملا کر بولی۔ "خدا کی قسم پہچانی نہیں جا رہیں۔" اس نے اجیہ سے الگ ہو کر اوپر سے نیچے تک بغور اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تب ہی شہنا کے عقب میں آ کر بلیک ڈینم اور بلیک ہی سفید لائنوں والی خوب صورت سی شرٹ میں ملبوس وہ وجیہہ و شکیل سا مرد آ کر کھڑا ہوا۔

"میٹ مائی برادر آغا شایان اور آغا۔ یہ ہے میری پیاری سی دوست اجیہ فاروقی۔" شہنا نے رسم تعارف نبھائی۔

"ہیلو۔" اجیہ نے خیر مقدمی سی مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی اور جواب لیے بنا ہی شہنا کو لے کر اسٹیج کی جانب پلٹ گئی۔

اور آغا شایان... وہ تو شاید یہاں رہا ہی نہیں آنکھیں ایسی چکا چوند ہوئیں تھیں کہ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ پھر جب اس کی بینائی بحال ہوئی تو خطبہ نکاح کے وقت سر پہ دوپٹے کا پلو ڈالے ہوئے، دودھ پلائی کے موقع پر دلہن کی رشتے کی کزنز سے بحث و تکرار کرتے ہوئے، دولہا دلہن کے ساتھ تصویریں اترواتے ہوئے، بعد ازاں چھری کانٹوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اسے صرف وہ... وہ... اور وہ ہی نظر آئی۔

"آغا اب چلے بھی چلو کیا دلہن کو رخصت کروانے اس کے گھر تک جانا ہے؟" ہوش میں تو وہ تب آیا جب شہنا نے اس کا کندھا بری طرح جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

"آں... چلو... اپنی فرینڈ سے اجازت لے لی؟" وہ متلاشی نگاہوں سے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

"ہاں بھئی... چلو اب..." وہ بے پروائی سے اسے جواب دے کر ہال کے مین دروازے کی جانب بڑھنے لگی تو چاروناچار اسے بھی قدم بڑھانے پڑے۔ دوسری جانب مہ پارہ اپنی طرف کے مہمانوں کا شکریہ ادا کر رہی تھیں۔

"بڑا اچھا لگا آپ سب آئے اب ان شاء اللہ ولیمہ پر ملاقات ہو گی۔" وہ اپنی ایک رشتے دار سے ہاتھ ملا کر بولیں۔

"شکریہ کی کیا بات ہے پارو۔ اب بس یہ شادی بیاہ ہی کے مواقع ہی تو ہوتے ہیں جس پر سب اکٹھا ہو کر سب سے مل جل لیتے ہیں ورنہ آج کل تو ہر شخص اتنا مصروف رہتا ہے کہ قریبی عزیزوں ہی کے ہاں بمشکل جانا ہوتا ہے۔" وہ خاتون مسکرا کر متانت سے بولیں۔

مہ پارہ سر ہلا کر آگے بڑھیں۔

"میں بس تمہاری ہی جانب آ رہی تھی۔" بیگم شاہانہ مہ پارہ کے گال کا بوسہ لے کر بولیں۔ "بھانجے کی شادی بہت بہت مبارک ہو۔"

"خیر مبارک... اور تمہارا آنے کا بہت بہت شکریہ۔" وہ بولیں۔

"اخلاق بھائی اور حمزہ نہیں آئے؟" بیگم شاہانہ نے ان کے بیٹے اور شوہر کا نام لیا۔

"بس اخلاق کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی، پھر آج کل کام کا بھی کافی لوڈ تھا اور حمزہ کا لاسٹ سمسٹر تھا۔ اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہو جاتا، بس اسی لیے وہ چاہنے کے باوجود بھی نہ آ سکا۔" بیٹے اور شوہر کے تذکرے پر وہ کچھ اداس سی ہو گئیں۔

"اچھا بھئی میں اب چلتی ہوں۔ ولیمہ پر شاید نہ آ سکوں، میری بہن کی بیٹی کی منگنی طے ہے اس دن اور یاد آیا۔" وہ بولتے بولتے اچانک چونکیں "تمہاری کوئی رشتے دار آئی تھیں میرے گھر، میرا مطلب ہے انہیں شاید معلوم نہیں تھا کہ وہ گھر تم بہت پہلے ہمیں بیچ چکی ہو۔ تم سے ملنا چاہ رہی تھیں، کہہ رہی تھیں، اندرون سندھ سے آئی ہیں، کئی برس سے تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"اچھا..." مہ پارہ حیرت سے بولیں... "میں نہیں جانتی، خیر نام کیا بتایا تھا؟" وہ جیسے یاد کرنے کو پوچھنے لگیں۔

"نام..." وہ سوچنے لگیں۔ "شاید راشدہ یا ساجدہ ایسا ہی کچھ نام لیا تھا، بہرحال میں نے انہیں وقار بھائی کا ایڈریس دے دیا تھا کہ تم وہاں موجود ہو گی کیا ابھی تک انہوں نے تم سے رابطہ نہیں کیا۔ حالانکہ خاصی

بے چین لگ رہی تھیں۔" مہپارہ سوچ میں پڑ گئیں۔
"خالہ جانی۔ پلیز چلیں۔ رخصتی کروانے کو کہہ رہی ہیں پھوپھو لوگ۔" اجیہ نے آکر چڑے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ جلدی سے انہیں خدا حافظ کہتی رخصتی کروانے کی غرض سے اجیہ کے ساتھ آگے بڑھ گئیں۔



تھکی تھکی سی میرب نے بالآخر جب اپنی تختہ ہوتی کمر بیڈ کراؤن سے ٹکائی تو اسے یک گونہ سکون سا محسوس ہوا۔ اس نے بھاری آنچل سے بوجھل سر اٹھا کر کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وسیع و عریض کمرے میں اس کے جہیز کا بیش قیمت فان کلر کا بھاری فرنیچر سجا تھا۔ فان اور میرون صوفہ سیٹ' بیڈ کے سیدھے ہاتھ پر رکھا گیا تھا۔ سامنے دیوار پر LED سجی تھی' الٹے ہاتھ پر بنا ڈریسنگ روم اور واش روم تھا۔ کمرے سے ملحقہ ٹیرس گلاس ڈور ہونے کی وجہ سے دکھائی دیتا تھا۔ ریشمی سرسراتے میرون پردے اور زمین پر بچھا اخروٹی رنگ کا ایرانی قالین' وہ جائزہ لینے میں مشغول ہی تھی کہ ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا۔ ساری رسمیں اور نیگ وغیرہ وہ پہلے ہی نپٹا چکا تھا۔ اسی لیے بنا کسی رکاوٹ کے وہ اندر چلا آیا۔ تازہ گلابوں سے سجی' سیج پر بیٹھی ہوئی میرب کا دل اب کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ سائر نے اطمینان سے اپنا کلاہ اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اور پھر شیروانی کی قید سے خود کو آزاد کروا کر اسے ہینگ کرنے کے بعد کرتے کی جیب سے مخملیں ڈبیہ برآمد کرتا اب وہ اس تک آیا تھا۔
"السلام علیکم!"
جواباً اس نے بھی اپنی نرم آواز کا جادو بکھیرا تھا۔
"یہ تمہاری منہ دکھائی' یہ لو۔" اس نے ڈبیہ بنا کھولے اس کی جانب بڑھائی۔ جو اس نے "جی شکریہ" کہہ کر تھام بھی لی۔ تاہم دل میں یہ خیال ضرور جاگزیں ہوا کہ کیا رونمائی ایسے دی جاتی ہے؟ کچھ لمحے یوں ہی سرک گئے۔ میرب نے ڈرتے ڈرتے نظر اٹھا کر دیکھا' وہ ایک بازو کے نیچے تکیہ دبائے کہیں خلاؤں میں گھور رہا تھا۔
"آج ہماری نئی زندگی کی پہلی رات ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ میرب نے سرعت سے نگاہیں ایک مرتبہ پھر جھکا لیں۔
"نئی زندگی تمہارے ساتھ شروع کرنے سے قبل میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں' کیا تم سن رہی ہو؟" اس نے اپنی نگاہیں اس کی جانب کیں۔
"جی جی بالکل! میں ہمہ تن گوش ہوں۔" وہ منمنائی۔
"عورت کبھی بھی میرے لیے کسی بھی صورت میں دلچسپی کا باعث نہیں رہی' میں شاید اس ٹائپ کا بندہ ہی نہیں ہوں۔ عورت کا حسن میرے لیے ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے نزدیک اس کا کردار ہی اس کا سب کچھ ہے' تم سمجھ رہی ہو میری بات؟" وہ پھر رکا۔
"آپ کہتے رہیے' میں سن رہی ہوں۔" وہ دھیمے مگر نسبتاً پراعتماد لہجے میں بولی۔
"مجھے منوانے والی نہیں بات ماننے والی بیوی درکار ہے۔ میں ایک مشکل آدمی ہوں' شاید تمہیں میرے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں مسائل کا سامنا کرنا پڑے' مگر اس سب کے باوجود میں ایک وفادار شخص ہوں۔ جو اپنی بیوی سے بھی یہ ہی چاہے گا کہ وہ اس کی وفادار رہے۔ میرے گھر میں چھوٹی بہن ہے' میں چاہتا ہوں کہ تم اس کا بڑی بہنوں کی طرح خیال رکھو۔ میرے جان سے پیارے بابا ہیں اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم ان کا بالکل اپنے والد کی طرح دھیان رکھو۔ بس میں صرف یہ چاہتا ہوں' اس کے علاوہ میری تم سے کوئی ڈیمانڈ نہیں۔ تمہیں کچھ کہنا ہے؟" وہ اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔
"میں آپ کی ہر خواہش کا احترام کروں گی۔ بس اس کے علاوہ کیا کہوں؟" وہ اپنی بڑی بڑی ساحر آنکھیں اٹھا کر بولی کہ سائر اس سارے عرصے میں پہلی بار کھل کر مسکرا دیا۔ سائر کی مسکراہٹ سے اسے حوصلہ ہوا اور وہ بولی۔
"اچھا' اب میں چینج کرلوں؟"

"ابھی نہیں۔ ابھی میں نے تمہارے بارے میں تو کچھ کہا ہی نہیں۔" وہ نرم آواز میں بولا اور وہ جو کپڑے تبدیل کرنے اٹھ رہی تھی' اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھالیا۔ پھر اس کا نازک سا مہندی سے سجا دودھیا ہاتھ تھام کر بولا۔

"تمہارے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں۔"

"پوچھ رہے ہیں یا بتا رہے ہیں۔" وہ شوخی سے بولی۔

"بتا رہا ہوں۔" وہ اس کا شوخ انداز نہ سمجھ کر سادگی سے کہہ گیا۔ جواباً" وہ مسکرا دی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر سائر کی مسکراہٹ دوچند ہو گئی۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا

اور میرب اس رات اس عجیب و غریب بندے پر مرمٹی تھی۔



اگلی صبح کا نقشہ بالکل ویسا ہی تھا۔ جیسا کہ عموماً" شادی والے گھر میں شادی کی اگلی صبح ہوا کرتا ہے۔ جب گھڑی بارہ کا ہندسہ عبور کر گئی تب مہ پارہ نے لالی کے سپرد انہیں بیدار کرنے کا کام سونپا۔ لالی ابھی اوپر جا ہی رہی تھی کہ اہل گرین خوب صورت سے فراک پاجامے میں سر پہ دوپٹا لیے میرب اپنے کمرے سے باہر آتی دکھائی دی۔

"سلام بیگم صاحب!" لالی نے خوشدلی سے سلام کیا۔ اس نے جواب دے کر استفسار کیا۔

"لاؤنج میں کون کون ہے؟"

"سب ہی ہیں جی۔" وہ بولی تو میرب جھجک گئی۔

"ایسا کرو تم اجیہ کو بلا لاؤ۔" اس نے اکیلے نیچے اترنے کے خیال سے گھبرا کر کہا۔ نہ جانے یہ لوگ کیا خیال کریں۔

"جی جی بی بی۔" وہ پلٹ گئی۔ میرب وہیں متذبذب سی کھڑی تھی' تب ہی اجیہ آتی دکھائی دی۔

"ہیلو سوئٹ بھابھی۔۔۔ نئی صبح مبارک ہو آپ کو۔" وہ چٹاچٹ اس کے گال چوم کر رک رک کر بولی۔

"چلیں جلدی نیچے چلیں' آپ کے گھر والے ڈرائنگ روم میں آئے بیٹھے ہیں۔" اس نے اطلاع دی۔ میرب' اجیہ کی معیت میں نیچے آئی۔ مہ پارہ نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔

"السلام علیکم!" میرب نے ادب سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! جیتی رہو' خوش رہو' اللہ شاد و آباد رکھے' سدا سہاگن رہو۔" مہ پارہ نے اسے اپنے ساتھ لگا کر دعا دی۔

"جاؤ اجیہ۔۔۔ بھابھی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھو۔ لالی چیزیں گرم کر کے ناشتہ لگاتی ہے تو میں آواز دے دوں گی۔" مہ پارہ نے کہا۔ اجیہ اسے ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"شادی کی اگلی صبح پہننے کے لیے تو کم از کم تیز رنگ کا انتخاب کرنا چاہیے نا' مگر یہ آج کل کی فیشن زدہ لڑکیاں انہیں کون سمجھائے۔" اس کے جانے کے بعد نعیمہ کڑوے لہجے میں بولیں۔

"اچھا خاصا بھاری سوٹ ہے نعیمہ آپا۔" مہ پارہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بتانا چاہا' انہوں نے نخوت سے ہونہہ کر دیا۔

ماریہ اسے دیکھ کر والہانہ آگے بڑھی' میرب بھی بے ساختہ اس کے گلے لگ گئی تھی۔ ماریہ کے ساتھ میرب کی دو تین کزنز بھی تھیں۔ ماریہ کا بھائی سعد انہیں ڈراپ کر کے جا چکا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ انہیں پک کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

"کیسے لگے سائر بھائی؟" ماریہ نے شرارت سے پوچھا' وہ آسودگی سے مسکرا کر بولی۔

"بہت اچھے۔"

"اف اللہ! کہاں تو رخصتی سے پہلے اندیشے پال پال کر ہمارا خون خشک کر رکھا تھا اور اب یہ شرمیں انداز' بہت اچھے۔" ماریہ نے چڑ کر اس کی نقل اتاری تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ناشتے کی ٹیبل پر نکھرا ستھرا نیلے کرتا شلوار میں سائر بھی موجود تھا۔ ناشتا ہلکے پھلکے ماحول میں کیا گیا۔ سائر' ماریہ کی چھیڑ چھاڑ کو انجوائے

کر رہا تھا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر وقار صاحب کے دل میں ڈھیروں اطمینان اتر آیا۔ ناشتے کے بعد ان لوگوں نے مہ پارہ سے میرب کو لے جانے کی اجازت مانگی۔ ان کے جانے کے بعد گھر میں سناٹا پھیل گیا۔ شام کو رواج کے مطابق سائر کے گھر والوں نے میرب کو لینے جانا تھا۔ سائر اخبار دیکھنے لگا۔ یہ الگ بات کہ اسے اپنا دل بہت خالی خالی سا لگ رہا تھا۔

"کب ہوگی یہ شام۔" اس نے اکتا کر اخبار واپس میز پر رکھا اور گھڑی کو دیکھا جو دن کے تین بجا رہی تھی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس کے لب آپ ہی آپ مسکرا اٹھے۔



گل نے دو تین مرتبہ اجیہ کا نمبر ملایا تھا' مگر اس نے ریسیو ہی نہ کیا۔ اس وقت اس کی جھنجلاہٹ مزید بڑھ گئی' جب اس پارلر' جہاں وہ کام کرتی تھی کی ہیڈ میڈم نشی نے اسے کسی شوٹ کے سلسلے میں مری ساتھ چلنے کا کہا۔ وہ ان سے کانٹریکٹ کی وجہ سے انکار کرنے کی مجاز نہ تھی۔ سو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ان کے ساتھ جانا ہی تھا اور وہ چلی بھی گئی۔

عام طور پر تو گل اس تبدیلی کو بے پناہ پسند کرتی تھی مگر آج کل وہ جس ذہنی کیفیت سے گزر رہی تھی وہاں یہ تبدیلی کوفت آمیز بے زاری کے علاوہ اس کے لیے اور کچھ نہیں تھی۔ وہ شدت سے کراچی لوٹنے کی منتظر تھی۔



ولیمہ کے بعد نعیمہ اور سائرہ واپس لوٹ گئیں۔ مہ پارہ البتہ چوتھی کی دعوت کے بعد واپسی کا ارادہ رکھتی تھیں۔ شادی کی رونق ماند پڑتے ہی روزمرہ کی مصروفیات شروع ہو گئیں۔ سائر نے آفس سے ایک ہفتے کی چھٹی لے رکھی تھی۔ مہ پارہ نے انہیں ہنی مون پر جانے کا مشورہ دیا۔ سائر اتنی جلدی ہنی مون پر جانے کے حق میں نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ تھوڑی بہت انڈر اسٹینڈنگ کے بعد ہی وہ ہنی مون پر جا کر خود کو ریلیکس محسوس کر سکتا ہے۔ سو اس نے سہولت اور طریقے سے مہ پارہ کو انکار کر دیا۔ میرب کو البتہ اس نے اصل بات سے آگاہ کر دیا تھا اور وہ اس کے خیال سے متفق بھی تھی۔ وہ روز صبح اٹھ کر فریش ہو کر نیچے آتی۔ پھر سب ساتھ میں ناشتا کرتے' اس کے بعد وہ کبھی وقار صاحب کے ساتھ کسی کتاب پر تبصرہ کرتی' کبھی مہ پارہ کے ساتھ زنانہ باتیں کرتی۔ کبھی اجیہ کے ساتھ اس کے کالج اور دوستوں کے قصے سننے میں دلچسپی ظاہر کرتی۔ سائر اسے بغور دیکھتا۔ کبھی تو مسکرا دیتا' کبھی یوں ہی سنجیدگی طاری کیے بیٹھا رہتا۔ شادی کے پہلے ہفتے میرب اتنا تو اندازہ لگا ہی چکی تھی کہ اس گھر میں اگر کوئی مشکل پسند بندہ ہے تو وہ خود اس کا مجازی خدا ہی ہے اور میرب خود کو بھی جانتی تھی۔ وہ مشکلات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اسے خود پر پورا بھروسا تھا۔ مگر کبھی کبھی انسان خود کو کتنا اوور اسٹیمیٹ کر جاتا ہے۔



"اف کتنی بوریت بھری ہے زندگی میں۔" اجیہ نے اکتا کر لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کیا۔ وہ پچھلے ڈھائی گھنٹے سے فیس بک پر بیٹھی اپنی فرینڈز سے چیٹ کر رہی تھی۔ اس نے لیپ ٹاپ رائٹنگ ٹیبل پر رکھا اور بھرپور انگڑائی لی۔ ڈھیلے ڈھالے پنک ٹراؤزر اور ملگجی سی وائٹ ٹی شرٹ میں ملبوس بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹے وہ واقعی بے زار بے زار سی دکھائی دے رہی تھی۔ رواج کے مطابق چوتھی کی دعوت سے قبل میرب اپنے گھر رہنے جا چکی تھی۔ پھر اس کا جی اس منظر سے بھی اچاٹ سا ہو گیا۔

"شاور لے لوں' شاید سستی دور ہو جائے۔" وہ اپنی وارڈروب کی جانب بڑھی اور وائٹ نیوی اور ملٹی کلر کی لانگ شرٹ برآمد کر کے واش روم کی جانب بڑھی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ ناگواری سے بولی۔

"ہاں کہو۔" انداز لالی کا تھا' وہ پہچان گئی تھی۔

"وہ چھوٹی بی بی! آپ کی دوست آئی بیٹھی ہیں

شہنا بی بی!" لالی نے مطلع کیا۔

"اچھا۔" پل بھر میں اس پر چھائی ساری بے زاری ہوا ہو گئی۔ "تم ایسا کرو' اسے یہیں روم میں بھیج دو۔" وہ کہہ کر پلٹنے لگی۔

"مگر لی بی وہ صاب جی۔" لالی ہچکچا کر بولی وہ آپ جانتی ہیں ناکہ صاحب آپ کی سہیلیوں کا آپ کے کمرے میں آکر بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔" اس کی بات پر اجیہ کے چتون تیکھے ہو گئے۔

"زیادہ بک بک مت کرو' جو کہا ہے۔ اس پر عمل کیا کرو' جاؤ جا کر بلا لاؤ اسے یہاں۔" وہ اسے جھڑک کر چھپاک سے واش روم میں گھس گئی۔ لالی مجھے کیا' والے تاثرات چہرے پر سجائے شہنا کو اس کے کمرے میں پہنچا گئی۔ جس وقت سر پر تولیہ لپیٹے نکھری نکھری فریش سی اجیہ باہر نکلی کاؤچ پر بیٹھی کسی فیشن میگزین کی ورق گردانی کرتی شہنا نے میگزین سائیڈ پر رکھ کر اسے خفگی سے گھورا۔

"کتنی دیر لگا دی' میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

"بس۔۔۔ بس۔۔۔" وہ مسکرا کر بولی "کتنا انتظار کر لیا' فوراً" ہی تو نکل آئی ہوں میں۔" وہ اس کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

"خیر۔ اتنے دن سے کہاں غائب ہو' نہ فون کیا' نہ خیر خبر لی؟" اجیہ نے بھی جواباً" خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ "شادی اٹینڈ کر کے یوں غائب ہوئیں' جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔۔۔"

"نہ پوچھو۔ وہ ہاتھ اٹھا کر نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی' یہ آغا جب سے اسٹیٹس سے لوٹا ہے' مجھے لیے لیے نہ جانے کہاں کہاں کی سیریں کرتا پھر رہا ہے۔ یو نو میرے ڈیڈ تو خیر اپنے بزنس میں بزی رہتے ہیں اور مام اپنی سوشل ایکٹوٹیز میں اب لے دے کے کون رہ جاتا ہے اسے کمپنی دینے کو۔۔۔ آف کورس میں' سو اسی لیے نہ کسی فرینڈ سے مل سکی' نہ ہی تمہیں فون وغیرہ کر سکی اور تم نے بھی کون سا کر لیا۔" وہ اس کے سوال کا تفصیلی جواب دیتے دیتے" آخر میں جتاتے لہجے میں بولی۔

"ہاں بس یوں ہی یار بھائی جان کی شادی میں بزی تھی ذرا۔" وہ یوں بولی گویا شادی کا سارا بار اس نے اپنے نازک کندھوں پر اٹھا رکھا ہو۔ حالانکہ ایسی بات بالکل نہیں تھی' وجہ صرف یہ تھی کہ وہ ان دنوں عجیب سی ذہنی کیفیت کا شکار ہو رہی تھی۔ مہ پارہ کو اپنے گھر میں چلتے پھرتے دیکھ کر لاشعوری طور پر وہ اپنی ماں کو یاد کر رہی تھی۔ اگر وہ ہوتیں تو کیا گھر یوں ہی بے جان سا لگتا۔ مہ پارہ جس طرح گھر میں دلچسپی لے رہی تھیں' یہ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ کبھی مالی کے سر پر کھڑی ہو کر لان میں لگے پودوں کی کانٹ چھانٹ کروا رہی ہوتیں۔ کبھی شریف سے اپنی نگرانی میں گھر کی صفائی کروا رہی ہوتیں۔ تو کبھی کچن میں کھڑی لالی کی مدد سے ایک سے ایک ذائقے دار پکوان تیار کر رہی ہوتیں۔ ان کا گھر پہلے بھی بہت صاف ستھرا چمکتا دمکتا سجا' سنورا رہتا تھا۔ کھانے بھی لالی مزے دار اور ورائٹی والے بناتی تھی مگر اس سب کے باوجود بھی کچھ کمی تھی جس کا احساس اب اجیہ کو شدت کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس کے پاس سب کچھ تھا' مگر یہ کمی اس سب کچھ پر حاوی ہوتی چلی جا رہی تھی۔

"چلو اب تو ہو گئی نا شادی اب چھوڑو۔ ویسے بھی مجھے تم سے ایک انتہائی اہم بات شیئر کرنی ہے۔" وہ آنکھیں گھما کر تجسس پھیلا کر بولی۔

"او کے۔۔۔ او کے' کیا پیو گی یا کچھ کھانے کا موڈ ہے۔" اجیہ نے انٹر کام پکڑ کر شہنا سے پوچھا۔

"فی الحال کچھ نہیں۔ البتہ کوئی ڈرنک منگوا لو۔" وہ ہاتھ بڑھا کر ریموٹ پکڑتی ہوئی بولی اور ٹی وی آن کر دیا۔ جس وقت اجیہ لالی کو اورنج جوس لانے کی ہدایت دے کر پلٹی وہ کوئی انڈین فضول سا گانا لگا کر اس پر مزے سے پیر جھلا رہی تھی۔

"فرمایئے۔۔۔ اب۔" وہ اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولی اور گیلے بال تولیے سے آزاد کر کے اس میں تیز تیز انگلیاں چلانے لگی۔

"یار! یہ کرینہ نے کچھ وزن نہیں بڑھا لیا۔" اس

نے بغور اسکرین پر برہنہ تھرکتی ہیروئن کو دیکھ کر تبصرہ کیا۔

"پلیز۔" اجیہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بے ساختہ کہا۔ "اب تم کرینہ نامہ نہ اسٹارٹ کر دینا۔" تب ہی لالی نے دستک دی اور اندر آکر فریش جوس اور نمکین کاجو رکھ کر پلٹ گئی۔

"خیر جانے دو۔" شہنا کاجو کی پلیٹ اپنے نزدیک کھسکا کر بولی۔ "تم تو ہو ہی بے وقوف' پتا نہیں آغا کو تم میں کیا دکھائی دے گیا ہے کہ جب سے تمہاری ایک جھلک دیکھی ہے' بالکل پاگل سا ہو گیا ہے۔"

"ایکسکیوزمی۔ کیا کہا تم نے؟" جوس کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتی اجیہ یک لخت تھم سی گئی' اسے لگا اس نے سننے میں کچھ غلطی کی ہے۔

"ہاں تو اور کیا' اس دن شادی پہ تمہیں دیکھ کر وہ جیسے دیوانہ ہی ہو گیا ہے تمہارا۔ ہر وقت مجھ سے تمہاری باتیں کرتا رہتا ہے۔ وہ تو اسی رات تمہارا نمبر مجھ سے مانگ رہا تھا مگر میں نے اسے بتایا کہ تم کتنی کنزرویٹو لڑکی ہو' کہیں برا ہی نہ مان جاؤ' ویسے میں اتنا ضرور بتا دوں۔ آغا ڈیشنگ ہے۔ ویل ایجوکیٹڈ ہے۔ امریکا میں اپنا بزنس کر رہا ہے' کوئی کمی نہیں ہے میرے بھائی میں۔ اسے شادی کرنے کے لیے عرصے سے کسی آئیڈیل کی تلاش ہے اور وہ کہتا ہے کہ تم اس کے آئیڈیل پر پوری اترتی ہو۔ خیر اب تم بتاؤ' پھر میں دے دوں اسے تمہارا نمبر۔" اس کی کتر کتر زبان بلا تکان چل رہی تھی۔

ایک سنسنی سی اس کی رگ و پے میں دوڑ گئی۔ جو بھی تھا اجیہ کو اس کی یہ پیش کش اچھی لگی تھی۔

"کیا چپ کا روزہ رکھ بیٹھی ہو۔ بتاؤ بھی' آغا مجھے لینے آتا ہی ہو گا' بڑا بے تاب ہے وہ تم سے بات کرنے کے لیے۔" وہ شوخی سے بولی۔ اجیہ کے کان کی لوئیں دہکنے لگیں۔

"اوکے تم دے دینا میرا نمبر۔" وہ بنا سوچ بچار کیے ہاں کہہ گئی۔

"او نو!" شہنا فلک شگاف قہقہہ لگا کر ہنسی۔ "قار گاڈ سیک' تم بالکل سیونٹیز کی دہائی کی کوئی اسٹوپڈ سی لمبے لمبے سانس لینے والی ہیروئن لگ رہی ہو۔ آغا بہت انسپائرڈ ہو گا تم سے۔ وہ شرماتی ہوئی لڑکیوں کی شرم بہت انجوائے کرتا ہے۔" وہ بات کرتے کرتے اپنے موبائل کے بجنے پر چونک کر رک گئی۔

"لو بھئی۔ آغا آگیا ہے میں تو چلی۔" وہ فون سننے کے بعد بولی اور گلاس میں بچا ہوا جوس یوں ہی چھوڑ کر اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوکے' بائے۔ اچھا وہ جلد ہی تمہیں کال کرے گا ٹھیک؟" اس نے ایک مرتبہ پھر پوچھا تو اجیہ نے میکانکی انداز میں سر ہلا کر اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ ابھی تک اس کے کہے لفظوں کے سحر میں جکڑی ہوئی تھی۔

وہ اسے یوں ہی سحر زدہ سا چھوڑ کر کمرے کا دروازہ عبور کر گئی۔ لاؤنج میں بیٹھے تینوں نفوس نے اس جینز میں پھنسی لڑکی کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جو ابھی ابھی اجیہ کے کمرے سے برآمد ہوئی تھی۔

"دیکھا تم نے مہ پارہ۔" وقار صاحب نے ناراضی بھرے لہجے میں کہا۔ "میں سخت عاجز ہوں اجیہ کی نت نئی دوستیوں سے۔ اگر میں اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ مجھ سے ناراض ہونے لگتی ہے' تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔" وہ واقعی اس کی دوستیوں سے سخت نالاں تھے۔

"کوئی بات نہیں بھائی صاحب۔ ابھی بچی ہی تو ہے' آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی۔ یوں بھی بن ماں کی بچی ہے۔ کوئی گائیڈ کرنے والا بھی نہیں تھا۔ اب ماشاء اللہ میرب بھی آگئی ہے' بہت سلجھی ہوئی' سمجھ دار لگی ہے وہ مجھے۔ دیکھیے گا ان شاء اللہ اجیہ کے لیے اس کا ساتھ بہت مفید ثابت ہو گا۔" مہ پارہ تسلی دینے والے انداز میں بولیں۔

"ہاں مہ پارہ۔" وقار اثبات میں سر ہلا کر بولے۔ "واقعی بہت گنوں والی بچی ہے۔ میں نے اس کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے' مجھے بھی اس سے یہ ہی امید ہے' وہ مان بھرے لہجے میں بولے۔

اتنی دیر سے ان دونوں کی گفتگو خاموشی سے مگر بغور

سنتا سائر میرب کے ذکر پر بے چین سا ہو گیا۔ دو دن ہو گئے تھے اسے گئے ہوئے۔ نہ جانے وہ کیا کر رہی ہو گی۔ اس نے سوچا اور پتا نہیں یہ سوچ اسے کیوں مزید مضطرب کر گئی گو کہ وہ ہر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد اسے فون کر رہا تھا مگر پھر بھی کوئی چبھن سی تھی جو اس کے دل کو مطمئن نہیں ہونے دے رہی تھی۔ وہ ان دونوں کے پاس سے اٹھا اور ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں آکر اسے کال ملانے لگا۔

☆ ☆ ☆

"اور سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟" یہ عشا کے بعد کا وقت تھا۔ ماریہ اور میرب کا میرب کی شادی سے پہلے کا معمول تھا کہ وہ دونوں چائے کا بڑا سا کپ لے کر اس وقت میرب کی چھت پر چہل قدمی کیا کرتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ خاندانی مسائل، دیگر دوستوں کے معاملات، کالج، اساتذہ وغیرہ کی باتیں بھی ڈسکس کی جاتیں۔ جب سے میرب یہاں رکنے آئی تھی یہ معمول پھر سے دہرایا جا رہا تھا۔

"ابھی تو شادی کو صرف ہفتہ، ڈیڑھ ہفتہ گزرا ہے۔ ابھی تک تو بظاہر سب ٹھیک ہی ہے؟" اس نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔

"تمہاری نند، وہ کیسی ہے تمہارے ساتھ" آئی مین اس کا رویہ مجھے تو خاصی نک چڑھی سی لگتی ہے۔" ماریہ ناک چڑھا کر بولی۔

"ارے نہیں۔۔۔" میرب نے مدافعانہ انداز میں کہا۔ "ایسی نہیں ہے وہ، البتہ لگتی کچھ اسی طرح کی ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا، لگتی ہے ایسی ہے نہیں؟" ماریہ نے کچھ چڑ کر پوچھا۔

"یار دیکھو۔۔۔ وہ محض دو ماہ کی تھی تو سائر کی مما کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ تم تصور تو کرو کہ انکل نے کیسے کتنی مشکلات جھیل کر اسے پالا ہو گا، پھر خالہ، پھوپھی بھی قریب نہ تھیں، ماں کی محرومی کے سائے تلے پلی بڑھی ہے وہ۔ بس اسی لیے اس کی شخصیت میں کچھ کمی بھی رہ گئی ہے۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے، وہ موڈی ضرور ہے، بے مروت نہیں۔ ہاں البتہ جذباتیت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔" اس کے انداز میں ہمدردی کی جھلک نمایاں تھی۔

"تو انکل کو اتنے پرابلمز فیس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ینگ تھے، پیسے والے تھے، اجیہ کی خاطر دوسری شادی کر لیتے۔" وہ بولی۔

"بات صرف اجیہ کی ہوتی تو شاید کر بھی لیتے، مگر چھ سالہ سائر بھی تو تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں سائر ان کے اس فیصلے سے ڈسٹرب نہ ہو جائیں۔ سائر نے تو بہرحال اپنی مما کو دیکھ رکھا تھا۔ ان کی محبت کا ذائقہ انہیں کسی دوسری عورت سے تو نہ مل سکتا تھا نا۔" وہ ہمدردانہ بولی۔

"بی بی میرب۔۔۔" ماریہ شوخ سے لہجے میں یک دم ٹہلتے ٹہلتے رک کر بولی۔ "یہ تمہیں ایک ہی ہفتے میں اس کی فیملی کی ہسٹری بھی پتا چل گئی اور تو اور تم تو ناک تک سسرال کی ہمدردی میں ڈوب چکی ہو۔" اس کی بات پر میرب دھیمے سے ہنس دی۔ پھر کچھ توقف کے بعد سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"بات ہمدردی کی ہے بھی۔ میری نظر میں ماں جیسی ہستی سے محرومی دنیا کی سب سے بڑی محرومی ہے ماریہ۔ میرا بچپن اجیہ اور سائر سے مماثل ہے۔ شاید اسی لیے میں ان کا درد کچھ زیادہ محسوس کر رہی ہوں۔ پھر مجھے تو تمہاری امی کا ساتھ بھی میسر تھا۔ مگر اجیہ اور سائر یہاں بھی محروم رہے۔"

"ہوں۔۔۔ یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" ماریہ نے متفق ہو کر سر اثبات میں ہلایا۔

"خیر۔۔۔ یہ بتاؤ تمہارا ہنی مون کا کیا پلان ہے۔" ماریہ نے اس کا افسردہ چہرہ دیکھ کر موضوع بدلنا چاہا۔

"سائر کا کہنا ہے کہ پہلے تھوڑی انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے ہمارے مابین، پھر سوچیں گے۔" میرب نے چائے کا خالی کپ منڈیر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو حیرت ہوتی ہے تمہیں دیکھ کر میرب شادی سے قبل تو نہ جانے کون کون سے اندیشے اور بدگمانیاں پال رکھی

تھیں تم نے اس بندے کے متعلق، اور اب اپنا حال دیکھو۔" ماریہ نے شرارت آمیز لہجے میں کہتے ہوئے مصنوعی تاسف سے سرہلایا۔ "تمہاری گفتگو کا محور و مرکز ہی سائر بن کر رہ گیا ہے۔ پتا نہیں یہ شادی کے بعد لڑکیوں کو کیا ہو جاتا ہے چچ چچ۔"

"کچھ دن بعد پوچھوں گی تم سے کہ کیا ہو جاتا ہے۔" میرب منہ پر بدلہ لینے والے انداز سے ہاتھ پھیر کر بولی۔

"ویسے میں سنجیدگی سے پوچھ رہی ہوں کہ آخر ایسا کیا ہو جاتا ہے کہ جب دیکھو تب لڑکیاں، وہ یہ کہتے ہیں، وہ یوں کرتے ہیں۔ کہتی نظر آتی ہیں بتاؤ۔" وہ استفسار کرنے لگی۔

"شاید محبت ہو جاتی ہے۔ نکاح کے بولوں میں واقعی اثر ہوتا ہے۔ میرا تجربہ تو یہ ہی کہہ رہا ہے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

"اور اسے... یعنی سائر کو ہوا یہ خوش گوار تجربہ؟" وہ جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں کیوں نہیں' اس کے شنگرفی لبوں پر شرگمیں مسکراہٹ پھیل گئی۔ جب سے یہاں آئی ہوں سینکڑوں مرتبہ مجھے کال کرچکے ہیں' یہ انداز محبت نہیں تو اور کیا ہے۔" وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگی۔

"اسے محبت نہیں' نئی نئی شادی کا خمار کہتے ہیں۔" ماریہ نے جیسے تپ کر کہا۔ وہ اس کے لہجے پر بے ساختہ ہنس دی۔ تب ہی اس کا بھائی عاشر' میرب کا موبائل ہاتھ میں لیے اسے ڈھونڈتا ہوا چھت پہ چلا آیا۔

"میرب تمہارا فون کب سے بج رہا ہے۔ سائر کی کال آرہی ہے۔ دیکھو اسے کوئی اہم بات نہ کرنی ہو۔" عاشر نے موبائل اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"اب تم میرڈ ہو میرب، ایسی باتوں سے لاپروائی اچھی نہیں ہوتی۔" وہ اسے سرزنش کرنے لگا' تب ہی فون پھر بجنے لگا تو وہ دونوں ہاتھ منڈیر پر رکھ کر نیچے جھانکتی ماریہ کے پاس چلا آیا۔

"ہیلو۔" میرب نے سرعت سے فون ریسیو کیا۔

"ہیلو۔ سب خیریت تو ہے' کہاں تھیں تم' فون کیوں نہیں ریسیو کررہی تھیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے گمبھیر لہجے میں استفسار کرنے لگا۔

"وہ سائر میں چھت پر ہوں' فون نیچے ہی رہ گیا تھا تو اس لیے ریسیو نہ کرسکی۔" اس نے وضاحت دی۔

"اچھا۔ اس نے کہا' پھر ٹھہر کر پوچھنے لگا' کون کون ہے چھت پر؟"

"میں اور ماریہ تھے اور ہائے... " وہ نسبتاً "چھت کے اندھیرے گوشے میں آکر بات کررہی تھی' اچانک کسی کے ہاؤ کرنے پر جواب دیتے دیتے بُری طرح اچھلی۔

"خدا کی پناہ سعد۔" وہ پیٹ پکڑ کر دہرے ہوتے سعد کو دیکھ کر بے پناہ خفگی سے بولی۔ "تم نے تو میری جان ہی نکال دی۔" ابھی تک اس کے بدن پر کپکپی طاری تھی۔

"بس دیکھ لیا تمہارا جگرا۔ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے لڑکی۔" وہ اس کے ڈر کر اچھلنے پر ہنستے ہنستے بے حال ہوا جارہا تھا۔ سو اپنا کارنامہ عاشر اور ماریہ کو سنانے ان کی طرف چل دیا۔

"اچھا تو یہاں مصروف تھیں تم' سوری تمہیں ڈسٹرب کیا۔ اوکے' پھر بات ہوگی' اپنا خیال رکھنا۔" سائر نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہہ کر رابطہ منقطع کردیا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ اس نے بڑی پریشان کن حیرانی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں موجود سیل کو دیکھا۔ پھر خود سے کال ملائی۔ اس کا فون بند ہوچکا تھا۔

"اسے کیا ہوا؟" وہ سخت متعجب تھی۔ اسے سمجھ ہی نہ آیا۔

"کیا وہ بدگمان ہوا ہے؟" یہ بہت جلد اسے سمجھ آجانا تھا۔ یک دم ہر شے سے جی اچاٹ سا ہوگیا تھا۔ تاہم وہ سر جھٹک کر ان کی طرف بڑھی' جہاں وہ تینوں کسی بات پر قہقہے لگانے میں مصروف تھے۔

☼ ☼ ☼

"کیا میں نے آغا سے بات کرلینے کی ہامی بھر کے کچھ غلط تو نہیں کیا؟" شینا کے جانے کے بعد بھی وہ کافی دیر

تک اسی ادھیڑبن میں رہی۔ ایک طرف دل اس سے بات کرنے پر مائل تھا تو دوسری جانب دماغ کی سرزنش۔

"اوں ہوں۔۔۔ یہ غلطی بھول کر بھی مت کرنا۔" وہ سوچتی رہی' الجھتی رہی' لالی کھانے کا کہنے آئی' اس نے انکار کردیا۔ مہ پارہ متفکر سی ہو کر اسے پوچھنے چلی آئیں۔

"کیا بات ہے بیٹا' طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" وہ نیم دراز اجیہ کی پیشانی چھو کر بولیں۔

"جی خالہ جانی' ٹھیک ہوں میں بالکل۔۔۔ آپ بیٹھیں۔" اس نے اپنے بکھرے بال سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے کہا۔

"کچھ پریشان سی لگ رہی ہو۔ سب خیریت تو ہے نا؟" انہوں نے ٹٹولتی نگاہوں سے اس کا ستا ہوا' مگر حسین چہرہ دیکھ کر سوال داغا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ موسم تبدیل ہو رہا ہے' شاید اسی کا اثر مجھ پر بھی ہو گیا ہے۔" اجیہ نے اپنے بکھرے بال سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں قید کیے۔

"اپنا خیال کیا کرو جان۔۔۔ دیکھو تو کتنا سامنہ نکل آیا ہے۔ یقیناً" تمہیں نظر بھی خوب لگی ہو گی۔ لگ بھی تو بالکل شہزادی رہی تھیں تم۔ میں تو ایک پل کے لیے حق دق ہی رہ گئی تھی' لگا جیسے گل مجسم سامنے چلی آئی ہو۔ خیر ابھی وضو کرکے معوذتین پڑھ کر دم کیے دیتی ہوں' نظر وظر سب اتر جائے گی۔ گرم دودھ بھجوا رہی ہوں' پی کر ٹیبلٹ لے کر لیٹ جانا' ٹھیک ہے بیٹا۔"

وہ اسے شفقت سے پچکار کر بیڈ سے اٹھیں۔ تب ہی پیچھے سے اجیہ نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"خالہ جانی۔۔۔ آپ بہت اچھی ہیں' اگر کبھی میں نے آپ کا دل دکھایا ہو تو اس کے لیے سوری۔" وہ اتنی بے ساختہ قسم کی معصومیت سے بولی کہ مہ پارہ نثار ہی ہو گئیں۔

"نہیں میری جان۔" وہ اس کا چاند چہرہ اپنے ہاتھوں کے ہالے میں لے کر بولیں۔ "تم تو اتنی کیوٹ ہو' تم بھلا کیسے میرا دل دکھا سکتی ہو۔ اب الٹی سیدھی سوچوں کو خیرباد کہہ کر ریلیکس کرو۔ میں ٹیبلٹ اور دودھ بھجواتی ہوں۔" وہ اس کا ماتھا چوم کر نم آنکھوں سے بولیں۔ سچ تو یہ تھا کہ نہ جانے کیوں مہ پارہ کا دل اجیہ اور سائر کو دیکھ کر کٹ سا جاتا تھا۔ اجیہ نے اثبات میں سر ہلایا اور بیڈ کراؤن سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ مہ پارہ جاتے ہوئے دروازہ بند کر گئیں۔

کبھی کبھی دل اتنا خالی خالی سا کیوں لگنے لگتا ہے۔ وہ پشت سے سر ٹکائے سوچ گئی۔ تب ہی کمرے کی پرسکون فضا میں اس کے موبائل نے ارتعاش پیدا کیا۔ آنکھوں سے ٹپکا آنسو انگلی کی پور سے جھٹک کر موبائل کی اسکرین دیکھی۔ وہاں کوئی انجان نمبر تھا۔ کئی روز سے اسے کوئی انجان نمبر سے کال کر رہا تھا۔ سوئے قسمت کہ وہ اٹھا ہی نہیں پاتی تھی۔

"ہیلو۔" اس نے فون ریسیو کر کے کہا۔

"زہے نصیب۔۔۔ کیا میں اجیہ سے بات کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔" زندگی سے بھرپور شوخ آواز! اجیہ چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔

"کک۔۔۔ کون بات کر رہا ہے؟" اس کی آواز اٹکنے لگی۔ اپنا دل اسے کانوں میں دھڑکتا سنائی دینے لگا۔

"خاکسار کو آغا شایان کہا کرتے ہیں زمانے والے۔ آپ کا جو جی چاہے نام دے لیجیے محبت کی زبان میں ہمارا نام مجنوں' فرہاد' رومیو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ شرط یہ کہ آپ لیلیٰ' شیریں یا جولیٹ بننے پر راضی ہوں۔" کیا خوب صورت و دلنشین انداز تکلم تھا' اجیہ عش عش کر اٹھی۔

"سن رہی ہیں نا آپ؟" اس نے جیسے اس کی مسلسل چپ سے مجبور ہو کر پوچھا۔

"جی میں سن رہی ہوں' آپ کہیے۔" وہ کچھ توقف کے بعد اپنی دھڑکنوں پر قابو پا کر بولی۔

"میں نے کہہ دیا۔۔۔ اب آپ کی سمجھ داری کا امتحان ہے کہ پلے کچھ پڑا ہے یا نہیں۔" وہ متبسم لہجے میں بولا۔

"بے وقوف نہیں ہوں' سمجھ گئی ہوں' اچھا۔!" وہ

برا مان کر بولی۔ دوسری جانب اس کا قہقہہ بڑا جان دار تھا۔

"خوب خوب وہ جیسے مزہ لے کر بولا۔ "بیوٹی وِد برین کا کامبینیشن شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ خیر آپ کے پاس برین نہ بھی ہوتا تو چلتا۔ میں تو آپ کے حسن جہاں سوز پر مرمٹا ہوں، مجھے اور کسی شے سے کیا لینا دینا۔"

"میں حیران ہوں، آپ اسٹیٹس میں رہ کر بھی اتنی ثقیل اردو کیسے بول لیتے ہیں۔" وہ تحیر سے آنکھیں پھیلا کر بولی۔

"کیا بدمذاقی ہے۔ یہاں حال دل بیان کر رہا ہوں، اور آپ میری زبان و بیان پر سوال اٹھا رہی ہیں۔ افسوس صد افسوس۔" وہ مایوسی سے سرہلا کر بولا۔ تو وہ کچھ کنفیوژ سی ہوگئی۔

"پھر خاموشی۔! میں نے آپ کی خاموشی سننے کے لیے تو فون نہیں کیا۔ وہ تو میں چشم تصور میں روز ہی سن لیتا ہوں۔" وہ کچھ جھنجلایا تھا۔

"اصل میں میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہے کہ میں آپ سے کیا بات کروں؟" وہ جیسے بے بسی سے بولی تھی۔

"اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔ کاش تم اس وقت میرے سامنے ہوتیں۔ میں تمہاری معصومیت پر تمہیں ضرور خراج پیش کرتا۔" اس کا لہجہ آنچ دیتا تھا، وہ قطرہ قطرہ پگھلنے لگی۔

"آپ اسٹیٹس میں کیا کرتے ہیں؟" وہ بوکھلا کر پوچھ بیٹھی۔

"جھک مارتا ہوں۔" وہ چڑ کر بولا۔ تب وہ یک دم ہنس دی۔ نرم پھوار سی ہنسی۔ آغا شایان کا تن من بھیگنے لگا۔

"سنو اجیہ فاروقی۔ تم مجھے بری طرح بھا گئی ہو۔ میں زیادہ لاگ لپیٹ کرنے کا قائل نہیں، صاف گو بندہ ہوں، تم سے ملاقات کرنے کا متمنی ہوں۔ کیا مجھ سے مل سکو گی؟" اب کی بار اس نے صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

"کیا بندے ہو تم؟ پہلی ہی مرتبہ میں اظہار محبت کر ڈالا اور اب ملنے کی فرمائش، ایسا بھی بھلا کہیں ہوتا ہے؟" وہ استعجابیہ لہجے میں کہہ گئی۔

"میری طرف تو ایسا ہی ہوتا ہے اور یہ ہی طریقہ مجھے پسند بھی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو کتنی ہی فون کال محض یہ اندازہ لگانے میں ضائع کردیتے ہیں کہ آیا محبوبہ کے دل میں ان کے لیے نرم گوشہ ہے یا نہیں۔ میں تیز رفتار دنیا کا باسی ہوں۔ اسی لیے ڈائریکٹ تم سے یوں بات چیت کر رہا ہوں، اب تم بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے؟" اس کے لہجے سے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ پہلی بار اجیہ سے گفتگو کر رہا ہے۔ اجیہ اس کے دوٹوک اور کھرے انداز گفتگو سے متاثر ہوئی تھی۔

"مگر شایان... مجھے کچھ دن لگیں گے۔ مجھے تو ٹھیک سے تمہارا چہرہ بھی یاد نہیں، میں اتنی جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔" وہ بھی صاف گوئی سے بولی۔ وہ اب اپنی کیفیت پر مکمل قابو پا چکی تھی۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں جب تک ملو گی نہیں، مجھے دیکھو گی کیسے۔ جب دیکھو گی ہی نہیں تو مجھے سمجھنے میں بھی دشواری ہوگی۔" وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔ تب ہی دروازے پر ہونے والی دستک سے اجیہ ہڑبڑا سی گئی۔

"اوکے... میں کل بتاؤں گی، ٹھیک؟" وہ جلدی سے بولی اور دوسری طرف وہ کھل کر مسکرا دیا۔

"ٹھیک ہے... اپنا بہت خیال رکھنا، بائے..." اس نے کہہ کر فون بند کردیا۔

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

"ہاں آجاؤ۔" وہ اسی کیفیت کے زیر اثر بولی۔ آنے والی لالی تھی۔ اس نے دودھ کا گلاس ٹیبل پر رکھا، ٹیبلٹ نکال کر اسے پانی کے ساتھ دی۔ جو اس نے بلاحیل و حجت نگل بھی لی۔ کب لالی باہر گئی اسے خبر نہیں۔

محبت تو اپنا آپ بھی بھلا دیتی ہے۔ اسے اگر اردگرد کا ہوش نہیں رہا تھا تو یہ کچھ ایسا عجیب بھی نہ تھا۔



تاحد نگاہ تک جلتا بلتا صحرا پھیلا ہوا تھا۔ سورج سوا نیزے پر پہنچا' بڑے طیش و حقارت سے نیچے دیکھ رہا تھا۔

ایسے میں وہ کوئی پانچ یا چھ سال کا بچہ تھا جو نیکر اور بنیان پہنے اس قہربار صحرا میں پاپیادہ تن تنہا بھاگ رہا تھا۔ سر پر آگ انڈیلتا سورج اور زمین پر تپتی لاوا اپنی چادر اس کے پیر جھلسا رہی تھی' مگر نہ جانے۔ کیسی دیوانگی اس پر طاری تھی کہ وہ بنا رکے بنا ٹھہرے بھاگے چلا جا رہا تھا۔ دور افق کی لکیر کے پاس کوئی آنچل سا پھڑپھڑاتا دکھائی دیا اور اس کے بھاگنے میں شدت پیدا ہوگئی۔

"رکو۔۔۔ رکو۔۔۔ دیکھو میں آرہا ہوں تمہارے پاس' مجھے چھوڑ کر مت جاؤ خدارا ٹھہر جاؤ۔۔۔ چاروں طرف پیاس ہی پیاس بکھری ہے۔ دھوپ کی تمازت مجھے جھلسائے دے رہی ہے' مجھ پر آنچل کا سایہ کرو' مجھے زندگی کی نوید سناؤ' میں تھک رہا ہوں' خدارا رک جاؤ۔" وہ چیختا رہا آگے بڑھتا رہا' یہاں تک کہ وہ جو کوئی بھی تھی۔ اس کے قریب پہنچنے پر اس کی طرف پلٹی۔ گلابی ساڑھی میں ملبوس اس وجود پر موجود آنکھوں میں اس کے لیے ایک نرم شفیق سا تاثر تھا۔ خوب صورت لبوں پر نمودار ہوئی مسکراہٹ۔

اسے حوصلہ ہوا تھا۔ یکلخت موسم بدلا۔ آگ اگلتے سورج کا گلا سرمئی اور نارنجی بادلوں نے دبا دیا۔ ہوائیں سرسرانے لگیں۔ جلتے خشک پیڑوں کی آگ سرد پڑنے لگی۔ اس نے لپک کر پھڑپھڑاتا ساڑھی کا پلو تھام لیا۔ وہ اب پرسکون سا ہو کر مسکرا رہا تھا' مگر یہ کیا۔۔۔ یک بیک ہی گلابی ساڑھی میں ملبوس وجود کی آنکھیں بدلی تھیں۔ ان آنکھوں کا نرم تاثر غائب ہو گیا' اس کی جگہ قہر نے لے لی۔ مسکراہٹ تو ہونٹوں پر اب بھی موجود تھی' مگر نامہربان' کریہہ مسکراہٹ۔۔۔ پھر یک بیک اس کا ہاتھ اٹھا اور ایک زناٹے دار تھپڑ کی صورت اس پھولے پھولے گالوں والے بچے کے گال پر پڑا۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا تھا۔ ساڑھی کا پلو اس کے ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔

دسنپولے۔۔۔ تو دیکھنا ایک دن تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔ آ' اب میرے نزدیک آ۔" وہ دونوں بانہیں پھیلا کر آگے بڑھی۔ اسی وقت ایک اور وجود نہ جانے کہاں سے نمودار ہوا اور وہ بھی گلابی ساڑھی والی کی تقلید میں اس کی جانب دونوں بانہیں پھیلائے بڑھا۔

"آؤ سائر! میرے پاس آؤ۔۔۔ آؤ نزدیک آؤ۔"

"آ' اب آ میرے قریب' چھری سے تیرا گلا کاٹ دوں گی' اگر اپنی زبان کھولی تو۔" وہ بے تحاشا قہقہے لگا رہی تھی۔ بے ربط سے مگر دل دہلانے والے الفاظ بول رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں مجھے چھوڑ دو۔۔۔ چھوڑ دو۔" وہ اپنی جان بچانے کے خیال سے دوڑ پڑا۔

"سائر ٹھہرو۔۔۔ میں بھی آتی ہوں' نیچے فون بھول گئی تھی نا چھت پر اکیلی تھی۔" وہ مکاری سے آنکھیں مٹکا کر بولی۔

"ہائے۔۔۔" کسی نے زور سے کہا تھا' وہ ہنسنے لگی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں خدا کے لیے تم دونوں مجھے چھوڑ دو۔" وہ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر دوڑ رہا تھا۔ آسمان اب بارش برسا رہا تھا۔ انگاروں کی بارش۔۔۔

"ہاہاہا۔۔۔ آ اب آ نزدیک آ۔"

"سائر میں ماریہ کے ساتھ اکیلی تھی ہاہاہا۔"

دونوں آوازیں مدغم ہو رہی تھیں۔ وہ دوڑتا رہا' یہاں تک کہ وہ دونوں بہت دور رہ گئیں۔ کسی چیز سے اس کا پاؤں الجھا تھا۔ وہ منہ کے بل زمین پر آرہا۔ ایک جھٹکے سے سائر کی آنکھ کھلی تھی۔ اس کی سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔ سر سے پیر تک باوجود اے سی کی ٹھنڈک کے وہ پسینے پسینے تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اردگرد نگاہ دوڑائی اور دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیا۔ کچھ دیر بعد حواس یکجا ہوئے تو اٹھ کر کمرے کے فریج تک آیا۔ اس میں موجود ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر بے تابی سے لبوں سے لگا کر ایک سانس میں خالی کر دی۔ پھر

اسے یوں ہی پھینک کر سائیڈ ٹیبل سے سگریٹ اٹھا کر ٹیرس پر نکل آیا۔

چار سو مہیب سناٹا بکھرا پڑا تھا۔ آسمان کی گود چاند سے خالی تھی۔

"کیوں آخر کیوں، یہ بھیانک خواب میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتا۔ میں کب تک اس خواب کا بوجھ ڈھوتا رہوں گا۔" اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر گاڑھا دھواں فضا میں بکھیرا۔

زندگی کتنی آگے بڑھ گئی، مگر یہ خواب آج بھی وہیں کھڑا ہے۔ میں اپنا دامن اس سے کیوں نہیں چھڑا پایا اور میرب.... ہاں میرب بھی تو تھی آج اس خواب میں۔ وہ بھی میرا پیچھا کر رہی تھی۔ خواب الہام ہوا کرتے ہیں، تو کیا آج کا یہ برسوں پرانا خواب میرے لیے کوئی اشارہ ہے؟ کیا میرب اس عورت کی جگہ لینے والی ہے؟ اف خدایا میں کیا کروں؟" اس نے بے چینی سے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ گویا کہ وہاں سے جواب کا طالب ہو۔

مگر میں تو وقار نہیں ہوں، کچھ دیر مضطرب رہنے کے بعد اس کی بادامی ساحر آنکھوں میں چمک سی لہرائی تھی۔ ہاں.... اگر وہ اس عورت کی جگہ بھی آگئی میں تب بھی سائر ہی رہوں گا، وقار ہرگز نہیں بنوں گا۔ وقار شاید مجبور تھا یا کم ہمت، مگر سائر فاروقی نہ ہی مجبور ہو سکتا ہے اور نہ ہی بے بس اور یہ بات وقت آنے پر میں بہت اچھی طرح ثابت کر دوں گا۔ اس نے جیسے تہیہ کیا، سگریٹ زمین پر پھینک کر چپل پہنے پاؤں سے یوں مسلی جیسے وہ چشم تصور میں کسی کا سر کچل رہا ہو۔

آسمان پر نمودار ہوتی سفید دھاری نے بڑی مشکل سے یہ تاریک منظر دیکھا تھا۔ چرند پرند ثناء خوانی میں مشغول ہو چکے تھے۔ فجر کی اذان بلند ہونے لگی۔ وہ واپس اندر پلٹ آیا۔

☆ ☆ ☆

"یہ لیجیے کھائیے، آپ نے یہ سیب پورا ختم کرنا ہے۔" میرب نے پیار بھری دھونس اپنے والد ابراہیم صاحب پر جماتے ہوئے کہا۔

کل رات اس پر بے حد گراں گزری تھی۔ سائر کا بند فون بند ہی رہا۔ وہ اس کی ناراضی کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ اور کچھ کچھ خود بھی اس سے ناراض ہی تھی۔ اگر کوئی شکایت تھی تو کہنا چاہیے تھا یہ کیا کہ فون بند کر دیا۔ اب مقابل پریشان ہو تا رہے۔ بڑی مشکل سے اس کی آنکھ لگی تھی۔ فجر کی نماز بھی قضا ہو گئی۔ وہ کف افسوس ملتی ساڑھے نو بجے اپنے کمرے سے باہر آئی تھی۔ ان کی ملازمہ رکھی صفائی ستھرائی سے فارغ ہو کر اب ناشتے کی تیاری کر رہی تھی۔ میرب نے اس کے ساتھ مل کر عاشر کے من پسند قیمے کے پراٹھے بنائے۔ میز لگوا کر اور رکھی کو تھوڑی دیر بعد چائے لانے کا کہہ کر وہ میز پر آبیٹھی۔ اب وہ ابراہیم صاحب کو بڑی نفاست سے سیب کاٹ کاٹ کر دے رہی تھی۔ ساتھ ساتھ یہاں وہاں کی باتیں بھی کر رہی تھی۔

"اوں ہوں بس بھئی۔" ابراہیم صاحب نے اسے مزید ایک قاش اپنی طرف بڑھاتے ہوئے دیکھ کر نفی میں ہاتھ ہلایا انہوں نے ایک ہاتھ سے اخبار پکڑ رکھا تھا۔

"ایک سیب تو پورا کھا لیجیے بابا۔" وہ اصرار کرنے لگی۔ "اپنی صحت کا آپ ذرا بھی دھیان نہیں رکھتے ہیں۔ جب کھائیں گے پئیں گے نہیں تو صحت بھلا خاک بنے گی۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو؟" اسی وقت نکھرا نکھرا سفید کاٹن کے شلوار کرتے میں گیلے گھنے بالوں میں انگلیاں چلاتا عاشر کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میری تو ایک نہیں سنتے تم ہی کچھ سمجھاؤ۔" وہ اپنے آگے رکھی پلیٹ میں گرما گرم پراٹھا ہاٹ پاٹ سے نکال کر رکھتے ہوئے بولا۔

"کیا سنوں برخوردار! تم مانتے ہو میری، جو میں تمہاری بات سنوں۔" اب کی مرتبہ وہ بھی خفگی سے بولے۔

"ارے کیا ہوا خیریت؟" میرب نے چونک کر رغبت سے پراٹھوں سے انصاف کرتے عاشر کو دیکھا۔

"بابا تم سے خفا ہیں کیا؟" وہ مسکرا کر پوچھنے لگی۔ ان دونوں کے مابین کسی نہ کسی وجہ سے کبھی کبھی اختلاف رائے ہو جاتا تھا' وہ یہی سمجھی۔

"میں تو نہیں جانتا تم خود ہی پوچھ لو۔" وہ تجاہل عارفانہ سے گویا ہوا۔

"آپ ہی بتادیں۔" وہ ان کے نزدیک نیم گرم دودھ کا گلاس رکھ کر بولی۔ جو وہ بنا کچھ کہے اٹھا کر غٹاغٹ پی گئے اور نیپکن سے منہ صاف کر کے اپنا اخبار سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ تم اسے اچھی طرح سمجھاؤ مجھ سے گھر میں چھائے سناٹے مزید برداشت نہیں ہوتے۔ بہتر ہوگا کہ یہ اپنے لیے کوئی فیصلہ کر لے۔" وہ جاتے جاتے اسے اصل بات سے آگاہ کر گئے۔ میرب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" اس نے اپنے سے دو تین سال بڑے مگر بے تکلف بھائی کی جانب شرارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"ہوں۔ بات تو یہی ہے۔" عاشر نے اقراری انداز میں سر ہلایا۔

"تو تم بابا کی بات مان کیوں نہیں لیتے؟ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے' یو کے میں اچھی جاب ہے تمہاری' کہو تو تمہارے لیے میں کوئی لڑکی دیکھوں؟" میرب نے خلوص دل سے پیشکش کی۔ رکھی چائے رکھ کر پلٹ رہی تھی اسے رکنے کا اشارہ کیا اور چائے بنا کر اسے کپ تھما کر بولی "یہ بابا کو دے آؤ۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" وہ قہقہہ لگا کر اپنے لیے چائے بنانے لگا۔

"یہ تو غلط بات ہے عاشر" وہ فہمائشی لہجے میں بولی۔ "تم شادی اب نہیں تو پھر کب کرو گے؟" وہ چائے کا گھونٹ بھر کر اسے دیکھنے لگی۔

"یار دیکھو۔ اس سال تو بالکل بھی ارادہ نہیں ہے۔ بابا کی خواہش اپنی جگہ' مگر میرا کیریئر اس وقت بڑے اہم موڑ پر ہے۔ ویسے ہی تمہاری شادی کے سلسلے میں اتنی چھٹیاں لے چکا ہوں۔" وہ چائے کا گھونٹ بھر کر ٹالنے والے انداز میں بولا۔

"میں شادی کا پوچھ رہی ہوں' تم چھٹیوں کا کہہ رہے ہو۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی؟" وہ ناراضی آمیز لہجے میں بولی۔

"بھئی شادی کے لیے بھی تو چھٹیاں درکار ہوں گی یا نہیں۔" عاشر نے جیسے بڑے پتے کی بات کی۔

"اب اتنی چھٹیاں لیتا رہا تو کہیں وہ لوگ میری مکمل چھٹی ہی نہ کر دیں۔ یوں بھی آج کل میری کمپنی میں ڈاؤن سائزنگ زوروں پر ہے۔" وہ نچلا لب بھینچ کر شرارتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے گویا تھا۔

"تم بھی عجیب بات کرتے ہو' شادی اتنی آسانی سے تھوڑی ہوتی ہے؟ ابھی تو لڑکی ہی نہیں دیکھی گئی۔ باقی معاملات تو بعد کی بات ہیں۔" وہ جیسے اس کی سادہ لوحی پر مسکرائی تھی۔

"لڑکی دیکھنے کی زحمت مت کرنا۔" اس نے ٹوکا۔

"لڑکی نہیں دیکھیں گے تو پسند کیسے کریں گے؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"وہ میں پسند کر چکا ہوں۔" وہ قطعی لہجے میں بولا۔

"رئیلی" میرب نے خوشگوار حیرت سے کہا۔ "گھنے ہو پورے' کہاں پسند کی؟ کیسی ہے؟ وہیں لندن میں یا یہاں پر تمہارے کسی دوست کی بہن ہے؟" خوشی سے کھنکتی آواز میں سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"میرا خیال ہے کہ دس بارہ اندازے اور لگا لو شاید جواب تک رسائی ہو ہی جائے۔" وہ جیسے چڑ کر بولا۔

"سو سوری۔" وہ جلدی سے بولی۔ "چلو تم ہی بتا دو کون ہے۔ وہ؟" اس نے مشتاق لہجے میں پوچھا۔

"سائر کی بہن۔ اجیہ۔" وہ نہایت سکون سے بولا۔ اور چائے کا آخری گھونٹ بھر کر پلیٹ پرے سرکا دی۔

"اجیہ؟" اس نے تحیر سے دہرایا۔ پتا نہیں کیوں مگر وہ یہ نام بلکہ غیر متوقع نام سن کر کچھ پریشان سی ہو گئی۔

"ہاں کیوں؟ کیا اچھی نہیں ہے وہ۔" اس مرتبہ عاشر نے سنجیدگی سے استفسار کیا۔

"بہت اچھی ہے۔" وہ سنبھل کر بولی۔

"مگر" اس کے آگے وہ گومگو کا شکار ہو گئی۔

"کیوں کیا کہیں انگیجڈ ہے؟" وہ ہنوز سنجیدگی سے پوچھتا گیا۔

"نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں مگر شاید سائر اس کا رشتہ یہاں کرنا پسند نہ کریں۔ دہرا رشتہ جوڑنے میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"خیر۔ خیر۔" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر ہلکے پھلکے لہجے میں گویا ہوا۔ "وہ مجھے واقعی پسند آئی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں سب کچھ داؤ پر لگا کر اسے پانے کا متمنی ہوں۔ رشتوں کی نزاکتیں اور باریکیاں شاید میں اتنی نہیں سمجھتا مگر پھر بھی یہ جانتا ہوں کہ ایسی شادیاں بعد میں مسائل بھی پیدا کر سکتی ہیں۔ تم بالکل فکر مت کرو میں نے تو یوں ہی ایک بات کی ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو معاملہ پروسیڈ کرنا ورنہ نہیں' میں تمہیں تفکرات میں دھکیل کر اپنی خواہش کو پورا کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔" وہ یقین دلاتے والے لہجے میں بولا۔ وہ یقین نہ بھی دلاتا تب بھی میرب اپنے بھائی کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اس پہ اور بابا پر اپنی جان بھی نچھاور کر سکتا تھا۔ یہ تو محض ایک چھوٹی سی خواہش تھی۔ اس کے محبت بھرے انداز پر میرب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"میں جانتی ہوں تم ایک بہت اچھے بھائی ہو۔" وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"ہوں تو سہی۔" وہ بھی مسکرا دیا۔ تب ہی تیز تیز بولتی ماریہ ڈائننگ ایریا میں داخل ہوئی۔

"واہ جناب واہ۔ یہاں اطمینان کا یہ عالم ہے کہ ابھی تک ناشتہ ہی تمام نہیں ہوا۔ اور وہاں ہماری والدہ ماجدہ نے رات ہونے والی دعوت کی فکر میں ہمیں ٹھیک سے ناشتہ بھی نہیں کرنے دیا۔ چلو لڑکی بتاؤ' ناشتے میں کیا ہے' بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے اور یہاں بڑی اشتہا انگیز خوشبو چکراتی پھر رہی ہے۔" ماریہ نے بے نقط بولتے کرسی کھینچی اور اس پر بیٹھ گئی۔

"ماریہ بولنے کے درمیان سانس لینے کا وقفہ تو لیا کرو۔" عاشر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے ٹوکا' میں ذرا ایک کام سے اپنے دوست کی طرف جا رہا ہوں ایک گھنٹے تک واپسی ہو جائے گی۔ انتظامات کے سلسلے میں کوئی بات ہو تو مجھے فون پر کانٹیکٹ کر لینا۔ باقی میں آکر دیکھتا ہوں اوکے۔" وہ کہہ کر میز سے اٹھ گیا۔ میرب نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلا دیا پھر انتہائی تیزی سے بڑے بڑے نوالے نگلتی ماریہ کی جانب متوجہ ہوئی۔

"ماریہ آرام سے کھاؤ' اور آنٹی سے کہو رات کی دعوت کی اتنی ٹینشن مت لیں' سب ہو ہی جائے گا۔" وہ رسان سے بولی۔

"ایسا ہے کہ یہ بات تم خود آکر امی سے کہہ دو۔" نوالہ چبانے کے دوران مشورہ دیا گیا۔ "میری تو سنیں گی نہیں۔ انہیں کون سمجھائے کہ بی بی میرب شادی کے دو ہی ہفتے بعد ان کی محبتوں کو احسان سمجھنے لگی ہیں۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے؟" میرب سرعت سے کھسیاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ "آنٹی کی محبتوں کو میں احسان ہرگز نہیں سمجھتی۔ ماریہ کیا تم مجھے اتنا کم ظرف گردانتی ہو؟" اس نے متاسف لہجے میں سوال کیا۔

"بس بس زیادہ ملکہ جذبات بننے کی ضرورت نہیں۔ امی نے تمہیں رات کا مینو ڈسکس کرنے کے لیے بلوایا تھا۔ لیکن روسٹ اور بریانی وہ خود بنائیں گی۔ میٹھا وغیرہ ہمارا شیف بنا لے گا۔ چائنیز وہ کسی اچھی سی جگہ سے منگوا لیں گی۔ سیخ کباب اور رولی میری نیٹ کر چکی ہیں وہ۔ ڈنر سے پہلے گوگی (شیف) انہیں باربی کیو کرے گا۔ اور کچھ ذہن میں آتا ہو تو بتاؤ اور ہاں چائے نکالو میرے لیے ذرا۔" اس نے ٹشو سے ہاتھ اور منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"بس بس یہ سب تو ٹھیک ہے۔"

"باقی باتیں تم امی سے ڈسکس کر لو۔ ابھی چلو' پھر شام میں تمہیں پارلر بھی جانا ہو گا۔" وہ اسٹرونگ چائے کا گھونٹ بھر کر بولی۔

"کس خوشی میں؟" اس کے چتون تیکھے ہوئے۔
"اپنی چوتھی کی دعوت کی خوشی میں۔" وہ ترنت بولی۔
"میں گھر میں ہی تیار ہوں گی۔" وہ چبا چبا کر بولی۔
"ہاں اور ماشاء اللہ ایسا ہوں گی کہ سائر بھائی چیخ مار کر بھاگیں گے۔ بڑی آئیں روحانہ اقبال کی جان نشین۔ آئی لائنو تک تو لگانا آتا نہیں تمہیں۔" اس نے گھر کا۔ مگر اس کا دھیان کہیں اور اٹک گیا تھا۔ سائر اور اس کے بند فون کی جانب، اس کی ناراضی کی جانب۔ اور ناراضی کی نا سمجھ میں آنے والی وجہ کی جانب۔ ماریہ نے چائے ختم کی اور اسے ساتھ لیے اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔



"کیا بات ہے بیٹا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔"
رات بھر نیند نامہربان رہی تھی۔ ذہن مختلف سوچوں میں گھرا تھک سا گیا تھا۔ تو ایسا کیوں کر ممکن تھا کہ ذہن کی تھکاوٹ چہرے اور بے خوابی آنکھوں سے عیاں نہ ہوتی۔ گو کہ وہ اپنی جانب سے اچھی طرح شاور لے کر اور فریش ہو کر ہی ناشتے کی میز پر آیا تھا مگر کچھ آنکھیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے چہرے نہیں من پڑھنا جانتی ہیں۔ ان ہی آنکھوں نے یہ سوال پوچھا تھا۔
"جی بابا' ٹھیک ہے طبیعت۔" وہ توس پر مکھن لگاتے ہوئے بولا۔
"پھر تمہارا چہرہ ستا ہوا کیوں ہے؟" انہوں نے تشویش سے پوچھا۔
"بس نیند پوری نہیں ہوئی رات میں اور کوئی بات نہیں۔" وہ اپنے ازلی سنجیدہ و محتاط انداز میں بولا۔
"تو بیٹا ابھی تھوڑا اور سو لیتے تم۔ اتنی جلدی کیوں جاگ گئے۔ یوں ہی تھکے تھکے سے جاؤ گے کیا رات میں اپنی دلہن لینے۔" مہ پارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"جلدی جاگنا میری عادت ہے۔ میں چاہوں نہ چاہوں' جلدی جاگ ہی جاتا ہوں۔" وہ بظاہر چائے کے گھونٹ لے رہا تھا مگر اس کا دھیان واضح طور پر کہیں اور تھا۔ یہ بات مہ پارہ بھی محسوس کیے بنا نہ رہ سکیں۔
"کیا بات ہے بیٹا! کوئی مسئلہ ہے تو ڈسکس کر لو' اپنے اعصاب پر طاری کیے کیوں بیٹھے ہو؟" وہ نرمی سے بولیں۔
"کہہ دینے سے بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔" وقار متانت سے بولے۔
کئی بار بڑھ بھی جاتا ہے بابا کئی گنا۔ اس نے من ہی من سوچا۔ تاہم بولا تو یہ کہ۔
"آپ لوگ ناحق پریشان ہو رہے ہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دوپہر کو تھوڑی نیند لے لوں گا تو مزید فریش ہو جاؤں گا۔"
"ہاں یہ ٹھیک ہے ویسے ڈنر کے لیے کب تک نکلنا چاہیے نو بجے تک ٹھیک رہے گا؟" مہ پارہ' وقار صاحب سے باتیں کرنے لگیں۔ وہ ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز چائے کے سپ لیتا ہوا نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس کا اندازہ اسے بھی نہ ہو سکا۔



یہ ایک متوسط علاقے کے متوسط درجے کے گھر میں اتری صبح کا منظر تھا۔ سامنے لائن سے بنے تین کشادہ کمرے۔ برآمدے اور بڑے سارے صحن کے سیدھے ہاتھ پر بنے باورچی خانے' غسل خانے پر مشتمل اس گھر کے مکینوں کے مزاج میں شرافت سادگی اور اخلاص بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ شیخ عبدالحمید جن کی محلے ہی میں چلتی ہوئی پرچون کی دکان تھی۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند سیدھے سادے آدمی تھے۔ باریش' سرخ و سفید چہرہ۔ محلے میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ان کی شریک حیات بی بی رقیہ بڑی نیک اطوار' نیک سیرت اور بارہ وہ خاتون تھیں۔ قاسم ان کا بڑا بیٹا بی اے کرنے کے بعد اپنے والد کی دکان سنبھال رہا تھا۔ ہاشم ابھی میٹرک میں تھا۔ قاسم کے بعد نازو' چندا اور مانو تھیں۔ نازو انٹر کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ چکی تھی۔ اب گھر کے کاموں میں ہمہ وقت مصروف دکھائی دیتی۔

اس کی نسبت اس کے ماموں زاد سے طے تھی۔ مانو اور چندا بالترتیب کالج کے پہلے اور دوسرے سال میں تھیں۔ مانو خاصی پڑھاکو لڑکی تھی۔ جبکہ چندا۔

اس کا دل زیادہ تر غیر نصابی سرگرمیوں میں لگتا۔ کالج کا کوئی بھی رنگا رنگ ایونٹ ہو اس کے بغیر ادھورا تھا۔

گھر کے تمام افراد خانہ صحن میں بچھی دری پر بیٹھے ناشتہ کررہے تھے۔

"ارے کوئی چندا کو تو آواز دو۔ اس نے نہیں کرنا کیا ناشتہ؟" شیخ صاحب نے رات کی روٹی چائے سے نگل کر پریشانی سے کہا۔

"وہ شہزادی تیار تو ہو جائے پہلے۔" بی بی نے کچھ بے زاری سے سر جھٹکا۔

"گھر کے تمام افراد خانہ کو ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا چاہیے اس سے برکت ہوتی ہے۔" وہ نرم روی سے ناصحانہ انداز میں بولے۔

"سب ہی ساتھ کھاتے ہیں سوائے اس شہزادی کے۔ ان نیک بختوں سے زیادہ آپ کی نصیحتوں کی ضرورت اس مہارانی کو ہے۔" وہ ناپسندیدہ لہجے میں بولیں۔

"اری نیک بخت۔۔۔؟ نہ اس کے لیے ایسا کڑوا لہجہ اختیار کیا کر۔ جب اللہ سائیں نے اس کا مزاج ہی دوسرے طرح کا بنایا ہے تو اسے سمجھانا اور سکھانا بھی دوسرے طریقے سے پڑے گا۔ بس کچھ نازک مزاج ہے میری چندا دل کی بری نہیں۔ یوں اسے جھڑک جھڑک کر اس کا دل نہ میلا کیا کر۔"

"اوئی اللہ۔" بی بی گویا کرنٹ کھا کر اچھلیں "تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میری وجہ سے وہ بگڑے مزاج کی بن گئی ہے۔ اس میں بھی میری ہی کوتاہی ہے۔ واہ شیخ صاحب واہ! خوب انصاف ہے آپ کا۔ ارے۔ میں ماں ہوں اس کی۔ میں اسے بگاڑوں گی۔" وہ روہانسے لہجے میں بولیں۔ شیخ صاحب گڑبڑا گئے۔

"اری میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ صفائی دینے والے لہجے میں بولے۔

"چھوڑیں اماں! ابا کا واقعی یہ مطلب نہیں تھا۔ چندا او چندا جلدی باہر آکر ناشتا کرو کالج سے دیر ہو رہی ہے۔" قاسم نے گونج دار آواز میں پکارا۔ تب ہی بڑی سی کالی چادر میں ملفوف چندا بیگ تھامے باہر آئی۔

"مجھ سے نہیں کھایا جاتا صبح ہی صبح پراٹھا۔ میرے لیے ڈبل روٹی منگوا لیا کریں۔" اس نے دسترخوان پر دیکھ کر نخوت سے کہا۔

"ناشکری۔۔۔ حلق میں اٹکتے ہیں کیا تیرے پراٹھے۔" اس کی بات پر بی بی بھنا گئیں۔

"ہاں اٹکتے ہیں میرے حلق میں آپ چلو مانو کھا چکی ہو تو۔" وہ بڑے اطمینان سے کہہ کر گھر کے بیرونی دروازے کی سمت بڑھی۔ مانو نے چپ چاپ ناشتا ختم کیا اور رسی پر پڑی اپنی سفید چادر اوڑھ کر بیگ تھامے اس کی تقلید کی۔

"خدا حافظ ابا۔" اس نے مڑ کر ابا کو کہا۔

"خدا حافظ بچیوں فی امان اللہ۔" انہوں نے ملائم آواز میں جواب دیا۔

"دیکھا شہزادی کو حلق میں رزق اٹکتا ہے اس کے۔" وہ تلملائیں۔

"چھوڑو نیک بخت۔ اب نہیں کھاتی اگر وہ کوئی چیز شوق سے تو مت زبردستی کرو۔ ہاں بھئی قاسم دکان سے روز لے آیا کرو ڈبل روٹی۔ پیسے میں ادا کر دیا کروں گا کھاتے میں مت لکھنا۔" انہوں نے گویا بات ہی ختم کر دی اور دسترخوان سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نازو چپ چاپ برتن سمیٹنے لگی۔ ہاشم کو اسکول سے دیر ہو رہی تھی وہ بھی سب کو خدا حافظ کہتا دروازہ عبور کر گیا۔

"ہو بہو تمہاری چھوٹی پھوپھو کی شکل ہے۔ اپنی چھوٹی بہن کو دیوانوں کی طرح چاہتے تھے شیخ صاحب۔ جب میری شادی ہوئی ساس تو بستر سے لگی ہوئی تھیں۔ بڑی بیٹیاں بیاہی ہوئی چاچیاں تمہاری اسے رکھنے پر تیار نہیں۔ پہلے دن ہی مجھے کہہ دیا تھا شیخ صاحب نے، رقیہ۔ میرے دل میں جگہ چاہتی ہو تو میری چندا کا خیال کرنا ورنہ تو تمہاری اس گھر میں کوئی جگہ نہ

ہوگی۔ اپنے بچوں کی طرح رکھا اسے مگر ہاں 'ماں ہوتی ہے اُدھر تمہاری دادی ختم ہوئیں بے چاری ایک سال میں ہی ان کے پیچھے چلی گئیں۔ برسوں غم زدہ رہے تمہارے ابا۔ تم لوگ کی پیدائش پر البتہ سنبھل گئے مگر اس نامراد کی دفعہ تو ایسے خوش ہوئے گویا ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آگئی ہو۔ بس اسی کا فائدہ اٹھاتی ہے۔" بی بی جو کہانی سنا رہی تھیں قاسم اور نازو کے لیے نئی نہیں تھی پھر بھی چپ چاپ سنے گئے' یہاں تک کہ وہ خود ہی خاموش ہو گئیں اور قاسم اپنی دُکان اور نازو برتن دھونے چل دیں۔

☆ ☆ ☆

"ماریہ! میں کیسی لگ رہی ہوں؟" میرب نے کچھ کنفیوز ہو کر ماریہ سے دریافت کیا۔ وہ ابھی ابھی ڈرائنگ روم سے نکل کر ڈنر کے انتظامات وغیرہ کا جائزہ لینے کی غرض سے باہر آئی تھی کہ اس کے پیچھے میرب چلی آئی۔

"ہزاروں روپے پارلر میں جھونک کر تمہیں اچھا ہی لگنا ہے۔ اچھی بلکہ بہت اچھی لگ رہی ہو۔" وہ رکھی کو برتن لگانے کی ہدایت کرکے اس کی جانب پلٹ کر بولی۔

"واقعی اچھی لگ رہی ہوں نا؟" اسے نجانے کیوں اطمینان نہیں ہوا تھا۔

"اُفوہ" وہ جھنجلا گئی۔ "کیا سائر بھائی کی آنکھوں نے نہیں بتایا کہ تم بہت اچھی لگ رہی ہو جو یوں پوچھتی پھر رہی ہو۔ اب جا کر بیٹھو اپنے سسرالیوں کے پاس۔ میں ذرا ٹیبل لگوا کر آتی ہوں سب کو بلانے۔" وہ مصروف سے انداز میں بولی۔

"میں مدد کرواؤں؟" وہ اندر نہ جانے کے لیے یوں ہی بولی۔

"یار۔۔۔ ضرورت ہی نہیں ہے ابھی میں کرلوں گی سب کچھ مگر بہت جلد ہی تمہیں بدلہ چکانے کا موقع ملنے والا ہے تب یوں خالی نہیں بیٹھنے دوں گی۔" وہ دھمکانے لگی تو میرب خوش دلی سے اس کا اشارہ سمجھ کر ہنس دی۔

"ضرور۔۔۔ ضرور۔"

وہ ناچار ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ وہاں اس وقت میرب اور سائر کی فیملی کے علاوہ ماریہ کی فیملی بھی براجمان تھی۔ ماریہ کی امی سعدیہ' مہ پارہ کے ساتھ بیٹھی میرب ہی کی باتیں کر رہی تھیں۔ مہ پارہ کو ان کا میرب سے لگاؤ اچھا لگا' جبکہ وقار اس کے اور ماریہ کے والد وغیرہ ایک طرف بیٹھے ہمیشہ کی طرح ملکی حالات وغیرہ پر تبصرہ کر رہے تھے۔ سائر' حاشر اور سعد نجانے کون سا مسئلہ ڈسکس کر رہے تھے۔ وہ بے زار بیٹھی اجیہ کے پاس ٹک گئی۔

"بھابھی یور لکنگ سو بیوٹی فل۔۔۔ میک اپ کہاں سے کروایا ہے آپ نے؟" وہ دلچسپی سے پوچھنے لگی۔ واقعی موو اور گولڈن کلر کے لانگ فراک اور پاجامے میں نوک پلک سے درست وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کی نگاہ بے ساختہ سنجیدہ بیٹھے سائر کی جانب اٹھی۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ مگر یہ نگاہیں ستائشی یا پرشوق نہیں تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر دھیمے سے مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں اپنائیت تھی جواباً "اس کے خوب صورت لبوں پر جو چیز نمودار ہوئی وہ مسکراہٹ کے علاوہ سب کچھ تھی۔

"اچھی تو تم بھی بہت لگ رہی ہو۔" اس نے پیار سے اس کا دودھیا گال تھپتھپایا۔ واقعی شاکنگ پنک اور لائٹ پنک لانگ شرٹ ٹراؤزر میں وہ کوئی اپسرا ہی لگ رہی تھی۔ تب ہی تو بار بار عاشر کی نگاہیں چوری کا ارتکاب کر رہی تھیں۔ تب ہی ماریہ نے کھانا لگنے کا اعلان کیا۔ وہ لوگ ڈائننگ ٹیبل تک آئے۔ خوش گوار ماحول میں کھانے کا آغاز ہوا۔

"یہ روسٹ لیں سائر" سعد نے قاب اس کے نزدیک رکھ کر اخلاق سے کہا۔

"آپ زحمت مت کریں' مجھے جو چیز درکار ہوگی' میں لے لوں گا۔" سائر نے کچھ ایسی رکھائی سے کہا کہ سعد کے لب یک دم بھینچ گئے۔ میرب بے دلی سے لقمے لینے لگی۔ بالآخر کھانا تمام ہوا۔ پھر قہوے کا دور چلا اور آخر

میں واپسی۔

میرب کا سامان سعد اور عاشر نے گاڑی میں رکھ دیا۔ وہ اپنے بابا کے گلے لگی اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرتی رہی۔ سب ایک دوسرے سے الوداعی کلمات کہنے لگے۔ مہ پارہ نے شاندار ڈنر پر سعدیہ بیگم کا بہ طور خاص شکریہ ادا کیا۔ اور انہیں بھی جلد ہی اپنے ہاں آنے کی دعوت دے ڈالی۔ میرب نے سعدیہ بیگم اور ماریہ دونوں ہی کا شکریہ ادا کیا۔ حسب معمول وہ خفگی دکھانے لگیں۔

"چلو بھئی میرب۔۔۔ بیٹھ بھی جاؤ گاڑی میں۔" عاشر نے ٹوکا تو وہ اس کے کندھے سے آلگی۔

"اللہ حافظ۔" نم آنکھوں سے عاشر نے اسے الوداع کہا اور گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ملے جلے احساسات میں گھری گاڑی میں آبیٹھی۔ گاڑی سائر ہی ڈرائیو کررہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کی سیٹ پر تھی اس نے کن اکھیوں سے سائر کو دیکھا۔ وہ ہنوز سنجیدگی و بے گانگی کا نمونہ محسوس ہوا۔ وہ گردن موڑ کر باہر دیکھنے لگی۔ وقار اور مہ پارہ آپس میں یہاں وہاں کی باتیں کررہے تھے جبکہ اجیہ اپنے سیل پر مسیجنگ میں مصروف تھی۔

راستہ یونہی تمام ہوا گھر پہنچ کر سب اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ اس کا سامان کار سے شریف نکال کر اس کے کمرے میں رکھ گیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے میں چلی آئی اور چپ چاپ آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔ سائر ڈریسنگ روم سے ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں برآمد ہوا۔ وہ اسے مکمل طور پر نظرانداز کیے ہوئے تھا۔ وہ اس سے ناراض تھا' وجہ بتائے بغیر اور یہ چیز اسے جھلاہٹ میں مبتلا کررہی تھی۔ وہ سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر ٹیرس پر جانے لگا۔

"سائر۔" تب ہی وہ بے ساختہ پکار بیٹھی۔ وہ رکا مگر پلٹا نہیں۔

"کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" وہ کچھ جھجک کر بولی۔ اب کی بار وہ پلٹا۔

"تمہیں ایسا کیوں لگا؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھنے لگا۔

"کیوں کہ آپ کا رویہ میرے ساتھ نارمل نہیں ہے۔" وہ جتانے والے انداز میں بولی۔

"کیا کہنا چاہتی ہو تم۔۔۔ ایب نارمل ہوں میں۔" وہ درشتی سے پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

"خدانخواستہ" وہ سرعت سے بولی۔ "میں نے یہ تو نہیں کہا۔" وہ سر اٹھائے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"تو پھر کیا کہنا چاہتی ہو تم؟" وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

"سیدھا سا سوال ہے میرا کہ آپ اگر مجھ سے خفا ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو اس کی نشاندہی کیجیے۔ اس طرح خاموش رہنے سے تو بات نہیں بنے گی۔" وہ پریشان کن لہجے میں بولی۔ یک لخطہ سائر نے اس کے چہرے کی جانب بغور دیکھا گویا اس کی بات کی گہرائی جانچی تھی۔

"میں ٹیرس پہ ہوں۔۔۔ چلو" وہ کہہ کر ٹیرس کی طرف چلا گیا۔ ٹھنڈی سانس بھر کر میرب نے تقلید کی۔ اس نے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور دھواں فضا میں بکھیر دیا پھر غیر مرئی نقطے پہ نظر جمائے بولا۔

"میں نے شادی کی رات ہی تم پر واضح کردیا تھا کہ میرے نزدیک عورت کی خوب صورتی کی کوئی ویلیو نہیں مجھے اس کا کردار اٹریکٹ کرتا ہے' مگر لگتا ہے بات تمہارے سمجھ میں نہیں آئی۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں' میں سمجھ نہیں پارہی۔" میرب نے واقعی الجھ کر اسے دیکھا۔

"میں صاف لفظوں میں بتارہا ہوں مجھے لڑکوں سے تمہاری بے تکلفی بالکل پسند نہیں۔ اب سمجھ میں آگئی بات۔" اس نے فضا میں تکتے تکتے اچانک ہی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"یہ کیسی بات کررہے ہیں آپ میں بھلا کب کسی لڑکے سے بے تکلف ہوئی؟" ناگواری کی ایک شدید لہر

اس نے اپنے رگ و پے میں اترتی محسوس کی۔

"سعد لڑکا نہیں ہے؟" وہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔

"سعد؟" میرب نے تعجب سے دہرایا' اس کا یہاں کیا ذکر؟" وہ بھی تمسخرانہ انداز میں بولی۔

"ذکر تو اس وقت اسی کا ہو رہا ہے۔" وہ زور دے کر بولا۔

"مگر کیوں؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔" شدید پریشانی کے زیر اثر وہ بولی۔

"بات اتنی پیچیدہ بھی نہیں کہ تم سمجھ ہی نہ سکو... اس کی تمہارے ساتھ بے تکلفی مجھے بالکل پسند نہیں' اب آگئی بات تمہاری عقل میں یا ابھی بھی کسی تشریح کی گنجائش ہے۔" وہ اسے دیکھتا ہوا طنز آمیز لہجے میں بولا۔

"مگ... مگر وہ تو میرے بھائیوں کی طرح ہے۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ فضول بات سن کر کس طرح کے رد عمل کا مظاہرہ کرے۔

"تمہارا ایک بھائی ہے' کیا وہ تمہارے لیے کافی نہیں؟" وہ کرختگی سے بولا۔

"لیکن ہمارے مابین تو بچپن سے بہت بے تکلفی اور دوستی ہے یہ اور بات کہ اس بے تکلفی نے کبھی حد سے تجاوز نہیں کیا۔ میں تو حیران ہو رہی ہوں کہ آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں۔" وہ شدید رنجیدگی سے بولی۔

"تم میری بیوی ہو کر میرے سامنے کسی غیر کو ڈیفینڈ کر رہی ہو..." وہ یخ بستہ لہجے میں مستفسرانہ نگاہوں سے اسے دیکھ کر کہنے لگا۔

"نہیں..." وہ بوکھلائی۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اچھا ٹھیک ہے اگر آپ کو اس بے تکلفی پر اعتراض ہے تو میں آئندہ خیال رکھوں گی۔" وہ اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے جلدی سے بولی۔ دینے کو اس کے پاس بہت سے دلائل تھے اور وہ دے بھی دیتی مگر اچانک ہی اس پر منکشف ہوا تھا کہ وہ جتنی وضاحت کرتی' وہ مزید خدشات میں گھرتا جاتا اور وہ اتنی ناسمجھ اور بے وقوف ہرگز نہیں تھی کہ اس "نان ایشو" پر اپنی شادی کے محض دو ہفتے بعد ہی جھگڑا کھڑا کر لیتی۔ نیا نیا تعلق تھا ایک دوسرے کو سمجھنے میں ایک دوسرے پر اعتماد کرنے میں وقت تو لگنا تھا اور پھر یہ بھی تھا کہ سائر نیا نیا شوہر بنا تھا' سو اس لحاظ سے بھی اس کے لیے خود غرض ہو رہا ہو گا۔ بس یہی سب سوچ کر اس نے اس بات پر مزید بحث مناسب نہیں سمجھی۔ چند ثانیے سائر اس کی جانب کھوجتی نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر یک دم بولا۔

"اٹس اوکے' جاؤ... چینج کر لو۔"

"اوکے۔" وہ مڑ کر اندر جانے لگی۔

سائر کی پرسوچ نگاہیں کالی سیاہ چادر پر چمکتے نگینوں پر تھیں اور اس کے ماتھے پر ابھری رگ اس کی سوچ کی گہرائی کی غمازی کر رہی تھی۔ رات بھیگ رہی تھی اور وہ جھلس رہا تھا ان دیکھی آگ میں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ناولٹ

نمرہ نے زیور کا ڈبا تیز آواز سے بند کیا وہ بھی جان بوجھ کر، اگرچہ صاحب کی توجہ حاصل کرنے کے اور بھی کئی طریقے تھے لیکن یہ خاص الخاص طریقہ ناراضی سے مشروط تھا، جب بہ امر مجبوری آپ زبان کا سہارا نہیں لے سکتے۔ نمرہ گزشتہ رات سے ثاقب سے ناراض تھی۔ کوشش تو اس کی یہی تھی کہ ثاقب کسی طرح اس کی طرف متوجہ ہو تاکہ بات کا آغاز ہو سکے اور وہ اپنا غصہ نکال پائے لیکن ہوا کیا؟ ثاقب نے بھنویں سکیڑ کر ایک غصیلی نگاہ اس پر ڈالی۔

"کیا مصیبت ہے یار! دھیان سے کام نہیں کر سکتیں... ساری توجہ ہٹا دی۔"

لگ رہی ہے، باقی کزنز، آنٹیاں وغیرہ کن خوش گپیوں میں مصروف ہیں، کھانے میں کیا کچھ ہے؟ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ فنکشن بخیر و خوبی تمام ہوا۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ ممانی نے سرخ سرخ آنکھوں کے ساتھ بیٹی کو رخصت کیا اور بجائے اس کے کہ دیر تک اسی شغل میں مصروف رہتیں، نمرہ کے کان میں آ گھسیں۔

"ثاقب نہیں آیا ناں...؟"

"ج... جی... ممانی! میں رابطہ کر رہی ہوں۔" وہ بری طرح گڑبڑا گئی۔

"اے ہٹو رہنے دو۔ اسے ہم اچھے بھی کہاں لگتے

فرح بخاری



اس نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں سخت خفگی سے نتھنے پھلائے تو نمرہ نے لب بھینچتے ہوئے بے ساختہ چھلک پڑنے والے آنسوؤں کو سختی سے روکا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

"یہ ہے میرا نصیب..." اس نے کچن میں آ کر بیلن پٹخا (اندر کی کڑواہٹ مسلسل اٹھا پٹخ پر آمادہ کر رہی تھی) تب ہی تو پہلے ڈبا پھر بیلن...

پچھلی رات نمرہ کی ماموں زاد بہن شمائلہ کی شادی تھی۔ وہ امی کے ساتھ میکے سے ماموں کے گھر گئی۔ ثاقب نے آٹھ بجے ڈائریکٹ شادی ہال پہنچنا تھا لیکن وہ نہیں آیا اور نمرہ کا تمام وقت گھڑی، موبائل فون اور گیٹ کی طرف دیکھنے میں صرف ہو گیا۔ دلہن کیسی

ہیں ورنہ سسرال کا معاملہ ہو تو کوئی ذمہ دار داماد ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ مہندی کی رسم میں بھی تمہیں گیٹ پہ چھوڑ کر مڑ گیا تھا ناں...؟"

"اف...!" نمرہ شرمندگی سے گڑ گئی۔ ممانی تو ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ ثاقب کی پچھلی رات والی لاپروائی کا انہیں پتا نہیں چلا ہو گا... لیکن توبہ! ان کی عقابی نظر... سب یونہی تو نہیں بد کتے ان سے۔

وہ شرمندہ شرمندہ سی گھر لوٹ آئی۔ امی، ابو نے ہی اسے گھر ڈراپ کیا۔ ثاقب آفس سے آ چکا تھا اور اکیلا نہیں، ساتھ دو عدد دوست بھی تھے۔ اسے غصہ پی کر الٹا چائے بھی بنانا پڑ گئی اور جب تک وہ کمرے میں

واپس آیا' نمرہ سوچ چکی تھی۔ سوچا صبح سویرے نمٹ لے گی۔ لیکن صبح اپنی دانست میں جو "تیر" اس نے ڈبا زور سے پٹخ کر مارا تو اس کا رزلٹ بھی کیا خاک نکلا تھا۔ الٹا ڈانٹ کھا کر کمرے سے نکلنا پڑا۔ اوپر سے تابع دار بیویوں کی طرح ناشتہ کروا کے شوہر کو آفس رخصت کیا۔

"تم بھی ناں نمی! جب ناراضی اتنی شدید تھی تو ناشتے پکانے کی کیا ضرورت تھی' ایک دن بھوکا آفس بھیجو پھر دیکھو' کیسے راستے پر آتا ہے۔" ثمو باجی نے الٹا اسی کے لتے لیے۔

"آپ بھیجتی ہوں گی عدیل بھائی کو بھوکا۔ ہمارے ہاں ایسا کوئی رواج نہیں۔" وہ طنزاً" مسکرائی۔

"اس کوتاہی کی ذمہ دار بھی تم جیسی عورتیں ہوتی ہیں۔ پہلے دن سے ہی شوہروں کو ایسے اونچے استھان پر بٹھا دیتی ہو کہ زندگی بھر کے لیے وہ وہاں سے اترنے کا نام ہی نہیں لیتے۔" ثمو مزید غصہ کھا گئیں۔

"آپ بھی ناں باجی!" وہ روہانسی ہو گئی۔ میں نے تو اس لیے فون کیا تھا کہ آپ سے پوچھوں' اب ممانی کی ناراضی کیسے دور کروں اور آپ ہیں کہ۔۔۔"

"ارے چھوڑو ممانی کو۔۔۔ نہ وہ پہلے کبھی خوش ہوئی ہیں اور نہ آگے کبھی ہوں گی۔ تمہارا جانا بھی بہت تھا' بس بھول بھال جائیں گی کچھ ہی روز میں' پھر تمہارا کون سا وہاں معمول کا آنا جانا ہے۔" ثمو نے پل میں اس کے سر سے بوجھ اتارا۔ "میں تو یہ سمجھا رہی ہوں کہ ثاقب کو زیادہ سر پہ مت چڑھایا کرو۔ بعد میں تمہیں ہی نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

"رہنے دیں باجی۔ مجھے تو لگتا ہے سارے شوہر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بیویوں کے معاملے میں لاپروا' ہٹ دھرم اور کنجوس۔"

"ہاں' یہ بھی ایک' بس تمہاری ہی ہمت ہے' جو جل کڑھ کر آخر میں خود کو تسلی دینے کے لیے ایسی باتیں سوچ لیتی ہو۔ ربیعہ کا شوہر ایسا ہے؟ ثنا کا شوہر اور وہ ناعمہ۔۔۔ کیسے پیچھے پیچھے بھاگتے ہیں بیویوں کے۔۔۔ نہ وہ لاپروا ہیں' نہ ہٹ دھرم اور نہ کنجوس۔"

"تو پھر کیا کروں؟" نمرہ نئے سرے سے مایوس اور دل گرفتہ نظر آنے لگی۔

"کچھ تو ہوشیار بنو نمرہ۔۔۔ تمہاری شادی کو اب چار سال ہو گئے ہیں۔ آس پاس نظر رکھا کرو' دوسری عورتوں سے کچھ سیکھو۔ شوہر جیسی عجیب و غریب مخلوق کو قابو کرنے کے لیے ساری حسیں بیدار رکھنی پڑتی ہیں۔ ہر دم چوکس رہنے والی عورت ہی کامیاب رہتی ہے۔ کسی بات کو اگنور مت کیا کرو۔" جتنا ہر معاملے میں درگزر سے کام لوگی اتنا شوہر تمہاری طرف سے لاپروا ہوتا جائے گا۔ جو عورتیں ہمہ وقت شوہر کو پریشان رکھتی ہیں' سمجھو وہی کامیاب ہیں کیونکہ ان کے شوہر ڈرتے ہیں ان سے۔"

ثمرہ باجی محبت سے چور لہجے میں اپنی زندگی کا نچوڑ بیان کرنے لگیں۔ نمرہ نے ان کے کارآمد نسخے گرہ سے باندھ کر اجازت لی۔ ثاقب سے شدید ناراضی کا دل ہی دل میں تہیہ کیا اور کاموں میں مصروف ہو گئی۔

یوں تو ثاقب سے اسے کوئی بہت بڑی شکایت نہ تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی تو چار سالہ ازدواجی زندگی کچھ زیادہ اونچ نیچ کا شکار نہیں تھی۔ اس کی اور ثاقب کی ارینج میرج ہوئی تھی۔ ثاقب کا رشتہ اس کی عاصمہ بھابھی کے توسط سے آیا تھا۔ وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھا۔ اس کی بڑی پوسٹ اور نام کی وجہ سے رشتہ جھٹ پٹ قبول کر لیا گیا۔ ثاقب فطرتاً" ذرا اکھڑ سا تھا۔ بہت کم گھلنے ملنے والا' کسی حد تک سرد مزاج۔۔۔

کم عمر نمرہ آغاز میں ہی دب سی گئی۔ لیے دیے رہنے والی ثاقب کی شخصیت سے وہ پہلے دن ہی ایسی مرعوب ہو گئی کہ چار سال گزرنے کے بعد بھی شوہر اس کے لیے ایک معمہ ہی رہا۔ دوسری شکایت اسے ثاقب کی لاپروائی اور کنجوسی سے تھی۔ اپنے ہر معاملے میں خصوصی اہتمام کرنے والے ثاقب کا' نمرہ کے معاملات سے اس قدر لاپرواہی برتنا ایک عجیب روش تھی۔ نمرہ کے تعلقات' اس کا کہیں آنا جانا' دوستیاں سب ثاقب کے چھوٹے موٹے کاموں کی نذر ہو جاتے اور ان سب سے سوا اس کی کنجوسی۔۔۔ یوں تو وہ ہر

معاملے میں ٹھیک ٹھاک پیسے خرچ کرنے والا بندہ تھا، نہ کبھی گھر میں کھانے پینے کی کمی آنے دی، نہ مہمان داری، نہ لین دین، بس ایک نمرہ کو چھوڑ کر... اسے یاد نہیں کبھی ثاقب اس کے لیے کوئی تحفہ لایا ہو یا آتے جاتے اسے خود سے نمرہ کے لیے کوئی چیز پسند آئی ہو یا کبھی کوئی موٹی رقم اس کے ہاتھ پہ رکھی ہو۔ نمرہ کو ہمیشہ ہی رو پیٹ کر رقم نکلوانی پڑتی۔

عاشر نیند سے جاگ گیا تھا۔ وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آئی اور اس کا فیڈر بنانے لگی۔ شام کو اس کا ارادہ تو یہی تھا کہ ثاقب کے آتے ہی پھٹ پڑے گی۔ لیکن وہ عین کھانے کے وقت پہنچا۔ اب وہ کھانے کی ٹیبل پر کیا بولتی اور جب برتن سمیٹ کر واپس پلٹی تو اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ثاقب شروع ہو گیا۔

"اگر تمہیں شادیوں وغیرہ سے فرصت مل گئی ہو تو کسی دن خاور صاحب کے ہاں چلیں؟ ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا انہیں عمرہ سے آئے، تمہاری ان کی بیگم سے علیک سلیک نہ ہوتی تو میں اکیلے ہی مبارک باد دے آتا لیکن وہ فیملی کے ساتھ عمرہ کرنے گئے تھے، اکیلا جاتا عجیب سا لگوں گا۔"

حد ہو گئی۔ نمرہ دل ہی دل میں سوچ کر باہر چلی گئی۔ کوئی جواب نہ پا کر پہلی مرتبہ ثاقب نے اس کی طویل خاموشی کا نوٹس لیا۔ تب ایک دم احساس ہوا کہ بیگم صاحبہ تو پچھلے چوبیں گھنٹوں سے چپ کے روزے پر ہیں۔ وہ عاشر کو گود میں لیے پیچھے آگیا۔

"کیا بات ہے... ناراض ہو؟" سوال خاصی حیرت لیے ہوئے تھا۔ نمرہ نے ایک خاموش نگاہ ڈال کر کام جاری رکھا۔

"ارے... کیا سچ مچ۔" وہ ایک بار پھر حیران ہو گیا "کس بات پر خفا ہو بھئی؟" لہجہ خاصی نرمی لیے ہوئے تھا۔ نمرہ کی ہمت بندھی۔

"رات شمائلہ کی رخصتی تھی اور آپ بھی انوائیٹڈ تھے۔ تین گھنٹے لگاتار میں نے گیٹ کی طرف دیکھ کر اپنی آنکھیں پھوڑی ہیں۔"

"او... او!" ثاقب نے کچھ یاد آنے پر سیٹی کے انداز میں لب سکیڑے۔

"سوری یار، تمہاری قسم، مجھے ابھی یاد آرہا ہے کہ وہاں تو مجھے بھی جانا تھا۔" وہ سخت شرمندگی سے سر کھجانے لگا۔

"ایکچوئلی تمہارے جاتے ہی فرحان اور ساجد کا فون آگیا۔ فرحان کا آج انٹرویو تھا۔ اسے ہر چیز (purchase) سے متعلق کچھ تفصیلی انفارمیشن چاہیے تھی اور ساجد کی آج بہت اہم پریزنٹیشن تھی۔ تم تو جانتی ہو دونوں ایسے کاموں کے لیے ہمیشہ میری طرف بھاگتے ہیں۔ انہوں نے مجھے ریسٹورنٹ بلایا لیکن میں نے بڑے مزے سے انہیں کہہ دیا کہ گھر پر بیگم اور بچے نہیں ہیں۔ بالکل فری ہوں، یہاں آجاؤ۔ واللہ ذہن میں یہی خیال تھا کہ تم معمول کے کسی فنکشن میں گئی ہو اور میں اب فارغ ہوں، بالکل ذہن سے نکل گیا کہ یہ تو فیملی فنکشن ہے اور میری شرکت بہت ضروری ہے۔"

وہ شرمندہ سا ہنس پڑا۔

"ہاں، ایک میری ہی باتیں ذہن سے نکل جاتی ہیں اور تو کچھ نہیں بھولتے۔" وہ بھڑک اٹھی۔ "لیکن آپ میرے بارے میں سوچتے ہی کہاں ہیں۔ آپ کے معمولات میں، میں شامل ہی نہیں ہوں۔"

"بھئی! سوچتا بندہ اس کے متعلق ہے جو دور ہو۔ اب تم سامنے ہو، پاس ہو، تمہیں کیسے سوچیں..." وہ ہلکے ہلکے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے لگا۔



"بہت مصروف رہنے لگی ہو... میں نہ آؤں تو تمہیں شاید ایک سال بھی میرا خیال نہ آئے۔" مہرین بہت محبت سے بغلگیر ہوئی تو نمرہ شرمندہ ہنسی ہنس دی۔

"بس یار... گھر کے کام دھندے ہی ختم نہیں ہوتے... آؤ۔"

وہ اسے لیے ڈرائنگ روم میں آئی۔ مہرین اس کی اسکول کی دوست تھی۔ برسوں کا ساتھ تھا۔ مہرین کی شادی، نمرہ کی شادی سے ایک سال پہلے ہوئی تھی۔

دونوں کا ایک دوسرے سے ملنا جلنا شادی کے بعد بھی قائم تھا البتہ مہرین نے سچ کہا تھا زیادہ تر وہی نمرہ سے ملنے اس کے گھر آجاتی' پھر وہ شادی کے بعد اسلام آباد بھی چلی گئی تھی۔ ملتان اس کا آنا مہینوں بعد ہوتا تو وہ نمرہ کے گھر آنے کا ٹائم بھی ضرور نکالتی تھی۔ نمرہ نے عاشر کے کھلونے وغیرہ نکال کر عاشر اور اریبہ کو سامنے قالین پر بٹھادیا۔ اریبہ' مہرین کی بیٹی تھی اور عاشر سے تھوڑی ہی بڑی تھی۔

"اور... ثاقب بھائی کیسے ہیں' سوری اس دن تم کچھ بتانے لگی تھیں لیکن مجھے میری ساس نے بلالیا تو فون بند کرکے جانا پڑا' تمہاری بات بھی پوری سن نہیں پائی۔"

"چھوڑو اب... یہاں تو روز نت نئے مسائل کا سامنا ہے۔" نمرہ پھیکا سا ہنس دی۔ مہرین نے بغور اس کا چہرہ پڑھا۔

"کل تمہاری شادی کی سالگرہ تھی ناں... کیسے منائی' کیا گفٹ ملا۔" مہرین نے اپنی دانست میں موضوع بدلا۔

"یہاں سالگرہ نہیں منائی جاتی' دل جلائے جاتے ہیں۔" نمرہ کا لہجہ پھر سے تلخ ہوگیا۔ "اور تحفہ... تم تو جانتی ہو' ثاقب تحفے وغیرہ دینے پر زیادہ یقین نہیں رکھتے۔ چھین جھپٹ کرکے' تین تحفے لیے ہیں ان چار برسوں میں... کل تو دیا ہی کچھ نہیں... صبح کہہ رہے تھے آج لاؤں گا اور وہ "آج" کبھی نہیں آئے گی۔"

"چلو کوئی بات نہیں... ان کا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔" مہرین نے اس کی دکھتی رگ پہ انجانے میں ہاتھ رکھ کر کافی افسوس محسوس کیا۔

"یہ تو ثاقب والی بات کی۔" نمرہ ہنس پڑی۔ "جانتی ہو' مجھے سب سے زیادہ اسی جملے سے چڑ ہے۔ جب بھی ان سے کچھ مانگو' آگے سے یہی فرماتے ہیں کہ سبھی کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ یعنی مجھے کپڑے چاہئیں تو میں گھر خود پہ لپیٹ لوں۔" وہ پوری ترنگ میں آگئی۔ مہرین بھی ہنسنے لگی۔

"اچھا ایک منٹ... میں ذرا چائے کی کیتلی رکھ دوں چولہے پر۔" وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ سامنے میز پر رکھا اس کا موبائل بجنے لگا۔ مہرین نے کچھ سوچ کر موبائل فون اٹھایا اور اسے دینے کچن میں آگئی۔

اسکرین پر نمرہ باجی کا نام لکھا آرہا تھا۔ مہرین موبائل اسے تھما کر واپس آگئی۔ نمرہ اب بہن سے باتیں کررہی تھی۔ اس کی اونچی آواز ڈرائنگ روم تک آرہی تھی۔

"بس باجی... آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مرد کی فطرت کبھی نہیں بدل سکتی۔ آج بھی وہی پہلے سال والی روش ہے ثاقب کی۔ تحفہ نہ دینے کی تو جیسے قسم ہی کھا رکھی ہے انہوں نے... بھلے میں جل کڑھ کر آدھی رہ جاؤں ان کی بلا سے۔"

"ہاں صحیح کہہ رہی ہیں۔" وہ دوسری طرف کی بات سن کر بولی۔

"کام کاج تو کرچکی ہوں۔ فی الحال بس مہرین کے ساتھ بیٹھی تھی۔"

"جی' جی وہ ابھی آئی ہے۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ میں پھر فارغ ہوکر خود ہی کال کرلوں گی۔" نمرہ نے اجازت لے کر فون بند کردیا۔

"ایک بات کہوں نمرہ! مائنڈ مت کرنا۔" چائے پینے کے دوران مہرین نے بولنے کے لیے تمہید باندھی۔

"ہاں' ہاں کہو۔" نمرہ حیران ہوکر اسے دیکھنے لگی۔

"ہم چھٹی جماعت سے دوست ہیں ناں...؟"

"ہاں!" نمرہ مسکرائی۔ "غالباً" گیارہ سال ہوگئے ہیں ہماری دوستی کو۔"

"ان گیارہ برسوں میں بہت سے موقعوں پر تم نے مجھے گائیڈ کیا ہے۔ اس طرح بہت سارے معاملات میں شاید میں نے تمہاری رہنمائی کی ہوگی۔ البتہ جب سے ملنا جلنا کم ہوا ہے تو ایک دوسرے کے معاملات سے آگاہی بھی کم کم ہوپاتی ہے۔ بہرحال دوستی کا رشتہ کم یا زیادہ ملنے سے مضبوط اور کمزور نہیں بنتا' وہ تو آج بھی اتنا ہی مضبوط ہے۔ کیا میں ہماری دوستی کے ناطے

تمہیں ایک مشورہ دوں ؟" مہرین نے کچھ زیادہ ہی طویل تمہید باندھی جس پر نمرہ کو مزید تعجب ہوا۔

"یار! تم میرے کان بھی کھینچ سکتی ہو مشورہ دینا تو بہت معمولی بات ہے۔ کھل کر کہو۔"

"مجھے لگتا ہے تمہیں اپنے پرسنل میٹرز ذرا سوچ سمجھ کر دوسروں سے شیئر کرنا چاہئیں" آئی مین اپنی اور ثاقب کی ہر چھوٹی بڑی بات اوروں سے بیان کرنے مت بیٹھ جایا کرو بلکہ میں ذرا زیادہ کھل کر سمجھاتی ہوں، خصوصاً" اپنے میکے والوں سے۔"

"ارے! نمرو حقیقتاً" حیران ہو گئی۔ "اب باجی اور امی سے بڑھ کر کون میرا ویل وشر ہو گا۔ ان سے تو سب کچھ کہہ لیتی ہوں۔"

"یہی تو۔" مہرین نے عجلت میں بات کاٹی "وہ تمہارے ویل وشر (خیر خواہ) ہیں' اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"دیکھو' تمہاری باجی اور امی تمہارے ساتھ تو نہیں رہتیں' تمہاری صبح سے شام تک کی روٹین انہیں تمہاری زبانی معلوم ہوتی ہے نا۔"

"ہاں' ظاہر ہے۔"

"تو اگر تم انہیں اوکے' کی رپورٹ دو تو انہیں کون بتائے گا کہ ثاقب کا رویہ تمہارے ساتھ ایسا ہے یا ویسا

ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ جب تم غصے سے بھری بیٹھی ہوتی ہو' تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے امی اور بہن سے ہر بات کہہ ڈالتی ہو۔ تمہارا غصہ تو کسی حد تک ٹھنڈا ہو جاتا ہے لیکن ان کے دلوں میں ثاقب کے لیے نفرت کے جذبات بڑھ جاتے ہیں اور ان کے یہی جذبات بعد میں کبھی ان کے برے رویے کی صورت میں ثاقب پر ظاہر ہو گئے تو تمہارے لیے ہی مسئلہ بنیں گے اور یقیناً" تم زیادہ تر باتیں ثاقب کی خامیوں سے متعلق ہی شیئر کرتی ہو گی۔ جب تم ثاقب کی کسی بات سے خوش ہوتی ہو گی تو مشکل ہے کہ امی یا باجی کو بتانے کی نوبت آتی ہو کیونکہ زیادہ تر تو ہم منفی باتیں ہی بوجھ کی طرح دوسروں پر ڈالتے ہیں۔ اور نتیجتاً" ہوتا کیا ہے۔ جانتی ہو؟" اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے سوالیہ نگاہ نمرہ پر ڈالی' جواباً" وہ چپ ہی رہی۔ مہرین نے ایک سرد آہ کھینچی۔

"ہم اپنے دل کی بھڑاس اپنوں کے سامنے نکال کر چند ہی گھنٹوں میں مزے سے شوہر کے ساتھ ہنس بول رہے ہوتے ہیں۔ آخر رشتہ جو ہے' ساتھ کھانا پینا' ہنسی مذاق سب کچھ روٹین کے مطابق جاری ہو جاتے ہیں لیکن جن سے ہم نے اپنی پریشانی شیئر کی ہوتی ہے' ان کے ذہنوں پر ایک عجیب تصویر نقش ہو جاتی ہے۔ یقین کرو' پچھلے چار سالوں میں میرے ذہن پر بھی ثاقب بھائی کی ایسی دہشت سی طاری ہو گئی ہے کہ ان کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی میرا دل ڈر جاتا ہے۔"

"او!" نمرہ خاصی شرمندگی سے مسکرائی' بات کافی دیر بعد اس کی سمجھ میں آئی تھی۔

"اور جہاں تک ماں باپ اور بھائی بہنوں کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ ہمارے لیے ان کی محبت فطری امر ہے۔ اب اگر ہر وقت ہم ان سے اپنے شوہر اور سسرال کی برائیاں کرتے رہیں تو انہیں لگے گا کہ کسی بہت غلط آدمی سے انہوں نے اپنی بیٹی کا رشتہ استوار کر دیا۔ دوسرے وہ صرف ایک پارٹی کی بات سنتے رہتے ہیں۔ ثاقب بھائی کا موقف جاننے کا انہیں کبھی موقع نہیں ملا اور نہ آگے اس کا امکان ہے۔"

"ثاقب نے ان سے کیا کہنا ہے۔ مسائل کا شکار تو ایک میری زندگی ہے۔" نمرہ نے خفگی سے منہ بنایا تو مہرین مسکرانے لگی۔

"یعنی ثاقب کو تم سے کوئی شکایت نہیں۔؟"

"آف کورس!" نمرہ نے کندھے اچکائے۔ "میں نے کب انہیں شکایت کا موقع دیا۔ زندگی تو میری خوار ہے۔" وہ فوراً" اس کی نفی کرنے لگی۔ مہرین نے ایک گہرا سانس لیا۔

"مائی ڈیئر نمرہ! جب دو انسان ایک رشتے میں زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے جاتے ہیں تو ایک دوسرے سے شکایت' اختلاف یا ٹکراؤ پیدا ہونا ایک نیچرل سی بات ہے۔ میاں اور بیوی شادی

سے پہلے دو الگ الگ ماحول کے پروردہ ہوتے ہیں۔ ان کی عادات، خصوصیات، رہن سہن کے طور اطوار ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی حوالے سے کوئی بھی اختلاف پیدا ہو سکتا ہے۔ تم اگر اپنا محاسبہ خود کرنے بیٹھو گی تو ضرور یہ بات سوچنے میں حق بجانب ہو سکتی ہو کہ ثاقب کو تم سے کوئی شکایت نہیں لیکن اگر ثاقب کی نظر سے تمہاری شخصیت کا جائزہ لیں تو ہو سکتا ہے تمہارے اندر بہت سی خامیاں ہوں۔ اب یہ تو دیکھنے کے نظریے پہ منحصر ہے۔ تم ثاقب بھائی کو اکھڑ، بدمزاج، لاپروا، کنجوس اور جانے کیا کیا سمجھتی ہو لیکن ثاقب بھائی کا ہرگز اپنے متعلق یہ خیال نہیں ہو گا۔ اپنی سخت مزاجی کو وہ لیے دیے اور ریزرو رہنے سے تعبیر کرتے ہوں گے اور کنجوسی کو کفایت شعاری سے... صرف وہی کیا، ہر کسی کے پاس اپنی خامیوں کے حوالے سے کوئی نہ کوئی معقول جواز ضرور ہوتا ہے... اس لیے اپنا محاسبہ اپنی نظر سے نہیں بلکہ اگلے کے نقطہ نظر سے کرنا چاہیے۔ میں تمہیں ایک مثال دیتی ہوں۔ جیسے میں جانتی ہوں کہ تم بہت مہمان نواز اور دوست دار ہو۔ اب بظاہر تو یہ ایک خوبی ہے لیکن اگر تمہارے گھر روز کے حساب سے مہمانوں کی آمد و رفت ہونے لگے اور تم لوگوں کا بجٹ ان خاطرداریوں کی نذر ہونے لگے تو کیا ثاقب بھائی اسے تمہاری خوبی گردانیں گے...؟ ہو سکتا ہے وہ اپنے خیر خواہوں میں ان الفاظ میں تمہارا ذکر کریں کہ میری بیوی کی شاہ خرچیوں نے میرا دیوالیہ نکال دیا ہے۔ یہ صرف ایک مثال ہے ایسے بے شمار عادات و خصائل ہوتے ہیں جنہیں دیکھنے کا نظریہ ہر ایک شخص کا الگ ہوتا ہے۔"

"یعنی تمہارے خیال میں میرا ثاقب کا گلہ کرنا غلط ہے۔" وہ قدرے دھیمے لہجے میں گویا ہوئی۔

"ہاں... لیکن صرف اس حد تک کہ ہر چھوٹی بڑی بات میکے والوں کو بتانے مت بیٹھ جایا کرو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تم ہی سراسر قصور وار ہو کیونکہ کچھ کمسوز واقعی عام ازدواجی معاملات سے ہٹ کر بھی ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آئے دن میاں بیوی میں طلاقیں کیوں ہوتیں... ہو بھی سکتا ہے کہ تمہارے گلے شکوے جائز ہوں۔ بعض شوہر واقعی بیویوں کے لیے بہت پریشانی اور اذیت کا باعث ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہت ساری بیویاں ایسی ہوتی ہیں جو شوہروں پر عذاب کی طرح مسلط ہوتی ہیں۔ کمی بیشی تو ہر جگہ ہوتی ہے۔ میں اپنی زندگی کا موازنہ تمہاری لائف سے نہیں کر سکتی کیونکہ احسن اور ثاقب ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ مجھے کچھ اور مسائل کا سامنا ہے، تمہیں کچھ اور... بس اپنے مسائل کو دیکھنے اور سمجھنے کا طریقہ تبدیل کرو۔ جانتی ہو میں اپنے مسائل کیسے حل کرتی ہوں؟"

"تمہیں بھی مسائل کا سامنا ہے؟" نمرہ نے آنکھیں پھیلائیں۔ "مجھے تو لگتا ہے احسن بھائی اور تمہاری لائف اتنی آئیڈیل ہے کہ کسی مسئلے وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" نمرہ نے بے ساختہ اتنی معصومیت سے کہا بے ساختہ مہرین نے قہقہہ لگایا۔

"تم بھی ناں... اسکول والا بچپنا ابھی بھی تمہارے اندر سے نہیں گیا" یار ہم بھی انسان ہیں۔ کوئی فرشتے یا جنّے تو نہیں کہ بنا کسی اونچ نیچ کے زندگی گزرتی چلی جائے۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ میں اپنے مسائل کو زیادہ ہائی لائٹ نہیں کرتی۔"

"اور تمہارے مسائل ہیں کیا؟"

"سب سے بنیادی مسئلہ تو یہ ہے کہ کچھ بھی ہو جائے گھر میں صرف احسن کی چلتی ہے۔ ان کا کہا حرف آخر ہوتا ہے۔ بہت سے معاملات میں، میں دل سے قطعاً" کنوینس نہیں ہوتی لیکن انہیں قائل کرنے کی کوشش بھی بے کار جاتی ہے۔ احسن وہی کرتے ہیں جو انہوں نے سوچ لیا ہے۔ اب یہ ایسی عادت ہے کہ گھر کے سب ہی معاملات اس عادت کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ بچوں کا معاملہ ہو، کہیں آنے جانا کا ہو، روپے پیسے، ملنے ملانے، کام کاروبار، شاپنگ، خرید و فروخت، لین دین غرض ہر چیز پر حاوی اور سوار ہو جاتی ہے ان کی یہ عادت۔"

"او!" نمرہ نے حیرت سے ہونٹ سکیڑے۔ "یہ تو واقعی بہت بڑا مسئلہ ہے۔"

"اب احسن نہ جھگڑا کرتے ہیں' نہ اونچا اونچا چلاتا' نہ بحث کرتا۔ بس آرام واطمینان سے فیصلہ سنا دیتا۔ اگر مجھ سے پوچھو تو مجھے رشک آتا ہے ان بیویوں اور شوہروں پر جو چیخ چلا کر ایک دوسرے کو ہر بات کہہ سن لیتے ہیں' کم از کم دل کی بھڑاس تو نکل جاتی ہے۔ مجھے تو اس خاموشی سے خوف آتا ہے' جو پانچ سالوں سے مجھ پر مسلط کر دی گئی ہے۔"

"تو تم اپنے پیرنٹس سے کچھ نہیں کہتیں؟" نمرہ ابھی بھی حیرت میں مبتلا تھی۔

"بالکل' میں نے کبھی' کچھ بھی اُن سے شیئر نہیں کیا۔ یہ اور بات کہ گزرے پانچ سالوں میں وہ یہ بات جان ضرور چکے ہیں کہ احسن کی کیا عادات ہیں۔ لیکن میں چونکہ اپنے منہ سے کبھی شکایت کے انداز میں کچھ نہیں کہتی تو وہ بھی یہ سوچ کر خاموش رہتے ہیں کہ جب مہرین کو احسن کی عادت سے کوئی پرابلم نہیں ہے تو وہ کیوں بیچ میں پڑیں۔ میرے خیال میں معاملات کو دیکھنے اور سمجھنے کا یہ انداز ہی ہوتا ہے جس کے بنانے اور بگاڑنے میں سارا ہاتھ ہمارا اپنا ہی ہوتا ہے۔ جس دن میں نے خود ان سے احسن کی شکایت کر دی تو بات جانے کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ اس لیے مجھے تو ہر بات دل میں رکھنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ ہاں لیکن تمہارے لیے یہ ذرا مشکل ہے۔" مہرین شرارت سے مسکرائی تو نمرہ بھی ہنس پڑی۔

"تمہاری عجلت پسندیوں سے میں واقف ہوں۔ لمحہ بھر بھی بات تمہارے پیٹ میں ٹکتی نہیں ہے لیکن بہرحال یہ تو انسان کی طبیعت پہ منحصر ہے۔ بعض لوگ اگر ہر بات دل میں رکھتے جائیں تو مسلسل جلنے کڑھنے اور پریشان رہنے سے بیمار بھی پڑ سکتے ہیں' بہتر ہوتا ہے کہ بندہ ایسی باتیں دوستوں سے شیئر کر کے ہلکا پھلکا ہو جائے۔ پھر ہمارے دوستوں کی ہماری نجی زندگی میں مداخلت بھی کم سے کم ہوتی ہے۔"

"ہوں!" نمرہ سنجیدگی سے سنتے سنتے کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ مہرین کی باتوں نے دل پہ گہرا اثر کیا تھا اور ایسا کہ کئی دن گزرنے پر بھی وہ معافی' درگزر' دل بڑا کرنے جیسے الفاظ کو ذہن نشین کرتی رہی۔ یہ الگ بات کہ کئی دن گزرنے پر بھی اس کے اور ثاقب کے بیچ کوئی قابلِ ذکر معاملہ زیرِ بحث نہیں آیا اور جس دن حالات روٹین کی سطح سے اوپر نیچے ہوئے تب تک نمرہ کے دماغ سے مہرین کے سنہری فرمودات نکل چکے تھے۔



ثاقب نے اپنے باس خاور صاحب کو مبارک باد کے لیے آنے کا دن اور وقت بتا دیا۔ نمرہ کو بھی ساتھ جانا تھا تب ہی جانے سے ایک دن پہلے نمرہ کی امی نے فون پر قرآن خوانی کی دعوت دی' جو اتفاق سے عین اسی وقت تھی' جب نمرہ نے ثاقب کے ساتھ خاور صاحب کے ہاں جانا تھا۔ امی کے دعوت نامے نے اسے اتنا پرجوش کیا کہ جھٹ اس نے ثاقب کو آفس کال ملائی کہ اگر باس کے ہاں جانے کا ٹائم تھوڑا ادھر ادھر ہو سکتا ہے تو وہ جلدی کچھ کرلے۔

ثاقب کو اس کی عجلت پر غصہ تو بہت آیا لیکن بنا کسی تبصرے کے فون رکھ دیا۔ خاور صاحب کے ہاں جانے کا ٹائم ادھر ادھر کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس کے باس تھے' تہذیب کا تقاضا یہی تھا کہ جو ٹائم ایک بار دے چکا تھا' ہر حال میں اب اسی پر ہی جایا جاتا۔ شام کو البتہ نمرہ کو خوب کھری کھری سننا پڑیں۔

"کتنا برا لگوں گا یہ کہتا کہ سوری سر! اب ہم ہفتے کی شام کو نہیں بلکہ اتوار کی شام آئیں گے۔ وہ کہیں گے تو کچھ نہیں' اب ظاہر ہے' گھر آنے والے مہمانوں کو کوئی کچھ کہتا بھی کہاں ہے لیکن میرا امپریشن تو خراب ہو جائے گا ناں....."

"لیکن امی کے ہاں قرآن خوانی کی تقریب بہت بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے۔ اگر سگی بیٹی ہی موجود نہ ہو تو سب کیا کہیں گے' آپ کے باس کے ہاں تو صرف ہم دو مہمان ہوں گے۔ جب چاہیں جا سکتے ہیں۔ ہماری

وجہ سے ان کا کوئی شیڈول وغیرہ تو متاثر نہیں ہو رہا۔"
وہ بولتی چلی گئی۔

"تم سے بحث بے کار ہے نمرہ!" ثاقب نے ٹائی بیڈ پر پھینکی "تمہاری موٹی عقل میں میرا اتنا سا جملہ نہیں سما رہا کہ بات ان پر امپریشن کی ہے۔ کیسا وعدہ خلاف اور ان مینرڈ لگوں گا اپنی ہی بات سے پھرتے ہوئے۔"

"تو میں امی کو کیا جواب دوں۔۔۔؟"

وہ نارمل سے قدرے اونچے لہجے میں بول رہی تھی۔ اپنے لب و لہجے پر کنٹرول پانا مشکل ہو رہا تھا۔ امی نے بتایا تھا کہ سب ہی کزنز، ممانیاں، خالائیں، پھپھو آنے والی ہیں۔ نمرہ کو سب سے زیادہ شمائلہ سے ملنے کا شوق ہو رہا تھا۔ اس کی شادی کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات ہوتی۔ نئی دلہن کے انداز اطوار، بات چیت، ہنسنا بولنا سبھی کچھ کتنا دل گدگدانے والا ہوتا ہے۔ نمرہ تو وہاں ایک طرح سے سب کی میزبانی کے فرائض انجام دیتی اور یہاں ثاقب صاحب بطور مہمان بھی لے جانے کو تیار نہیں تھے۔ رات کو بستر پر لیٹی تب بھی ذہن اسی اکھاڑ پچھاڑ میں لگا رہا۔

جانے دوسری بیویاں ایسے موقعوں پر کیسے اپنی بات منواتی ہیں۔ ایسا کیا کہتی ہیں کہ شوہر اپنے باس سے ٹکر لینے پر بھی تیار ہو جاتا ہے۔ ایسی حاوی، بات منوانے والی بیویاں تو شوہر کی مجبوریوں کو خاطر میں ہی نہیں

لاتیں۔۔۔ تف ہے تم پر نمرہ بتول۔ وہ اپنے آنسو پیتی، خود کو لعنت ملامت بھیجتی جیسے تیسے سو گئی۔

اگلے روز ثاقب کے آفس چلے جانے کے بعد امی کو فون کر کے اپنے نہ آنے کا بتایا جس پر انہوں نے خوب شور و غوغا کیا لیکن وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ جتنے بحث مباحثے کا اختیار و اظہار وہ ممکن سمجھتی تھی اتنا وہ پچھلی رات کر چکی تھی۔ اس سے زیادہ جھگڑے کے سائیڈ افیکٹس پھر جانے بات کو کہاں سے کہاں لے جاتے۔ امی نے اپنی طرف سے کئی نت نئے بہانے اور ثاقب کو قائل کرنے کے گر بتائے جن پر عمل کرنے کو اس کا دل شدت سے مچلا ضرور لیکن مصلحتیں آڑے آ گئیں۔ حتیٰ کہ دوپہر کو بپھری ہوئی ثمو باجی کی

دھواں دھار تقریر کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن وہ گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھی رہی۔

پانچ بجے ثاقب آیا تو وہ خود بھی تیار ہو چکی تھی اور عاشر کو بھی تیار کروا دیا تھا۔ ثاقب نے جلدی جلدی فریش ہو کر کپڑے تبدیل کیے اور بنا وقت ضائع کیے خاور صاحب کے ہاں جانے کے لیے نکل پڑے۔ نمرہ نے وہاں زبردستی اپنا موڈ، بات چیت کے لیے بنایا۔ زیادہ تر تو بیگم خاور کو ہی بولنے دیا کیونکہ وہ خود ذہنی طور پر امی کے ہاں پہنچی ہوئی تھی۔

خاور صاحب نے انہیں رات کے کھانے پر روکنے کی بہت کوشش کی لیکن ثاقب نے مروتاً بھی ہامی نہیں بھری۔ نمرہ کو اس کے مسلسل انکار کی وجہ تب تو سمجھ میں نہیں آئی لیکن جب ان کے ہاں سے ثاقب نے گاڑی سیدھے اس کی امی کے گھر کے سامنے روکی تو وہ خوشگوار حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"ہم قدرے لیٹ تو ہیں لیکن تقریب کا اہتمام شاید ڈنر تک ہے؟" ثاقب نے تائید طلب نظروں سے دیکھا تو نمرہ نے مسکراہٹ دبا کر جھٹ سر ہلایا۔

"پھر تو یقیناً" ہم وقت سے پہلے ہی پہنچے۔۔۔ اچھا اگر صرف لیڈیز انوائیٹڈ ہیں تو مجھے یہیں سے اجازت دو۔ جب لینے آؤں گا تو کچھ دیر بیٹھ بھی جاؤں گا۔"

"جی، جی!" نمرہ نے فوراً" ہامی بھری۔" صرف

عورتوں کا بلاوا تھا۔

"او کے، پھر جاؤ۔" اس نے آگے بڑھ کر عاشر کا گال چوما اور نمرہ اسے لیے باہر نکل آئی۔

اس کی اچانک آمد پر یہاں اس کا کافی پرجوش استقبال ہوا۔ قرآن خوانی کچھ دیر پہلے ہی ختم ہوئی تھی اور اس وقت سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ شمائلہ تو چند روز میں ہی ایک دم بدل گئی تھی۔ پتلا لمبا سا چہرہ کیسے ہفتہ دس دن میں بھرا بھرا سا لگنے لگا تھا۔ وہ کزنز کے ساتھ ہنسی مذاق میں شریک ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"بزی تو نہیں تھیں نمرہ۔۔۔؟" وہ اس وقت عاشر کو سلانے لگی تھی جب ربیعہ کا فون آ گیا۔

"نہیں، کام کاج سب کرلیے" بس اب عاشر کو سلا رہی تھی۔" اس نے گود میں لیٹے عاشر کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ربیعہ اس کی خالہ زاد تھی اور بہت اچھی دوست بھی، فارغ اوقات میں اکثر ہی اس کا فون آجاتا۔ پھر وہ دونوں ہوتیں اور دنیا جہان کی باتیں۔

"ثاقب بھائی آفس گئے ہوئے ہیں؟"

"ہاں اس وقت تو آفس ہی ہوتے ہیں۔"

"اکیلی ہو گھر پر۔۔؟" اس کا انداز کچھ محتاط سا تھا۔ نمرہ اس کے انداز پر پہلے چونکی پھر ہنس پڑی۔

"کیا ڈاکے کی نیت ہے۔۔۔ کیسے مشکوک سوال کر رہی ہو؟"

"ہاں۔۔۔ ربیعہ بھی ہنس پڑی۔" ڈاکا ہی سمجھ لو۔۔۔ دراصل" وہ قدرے رکی۔ "مجھے تم سے کچھ ضروری کام تھا اس لیے یہ سب پوچھنا پڑا۔"

"ہاں بھئی، بالکل اکیلی ہوں۔ خیریت تو ہے ناں؟"

"یار سمجھ میں نہیں آرہا کیسے کہوں۔" وہ پھر جھجھک کر رک گئی۔

"کہہ بھی چکو، کیا سسپنس پھیلا رہی ہو۔"

"وہ میری فرینڈ ہے ناں منزہ، جانتی ہو ناں تم۔"

"ہاں، ہاں وہ نوشابہ کی بہن جو ڈاکٹر بن رہی تھی۔"

"بالکل وہی۔۔۔ اس کی شادی ہے۔ اگلے ہفتے۔"

"اچھا زبردست۔۔۔ کیا وہ ڈاکٹر بن گئی اور شادی کہاں ہو رہی ہے۔"

"شادی بھی ڈاکٹر سے ہی ہو رہی ہے۔ ایک طرح سے لو میرج سمجھ لو۔ کافی خوش ہے۔" ربیعہ تفصیل بتانے لگی۔

"اچھا۔۔۔ تم کچھ بتا رہی تھیں۔ نمرہ کا دھیان اس کی رازداری والی بات کی طرف گیا۔

"ہاں ایکچوئلی، سہیل نہیں چاہتے کہ میں منزہ کی شادی میں جاؤں۔"

اس نے ایک طرح سے آغاز لیا، نمرہ حیرت سے سننے لگی۔ پہلا جملہ ہی خاصا عجیب تھا۔ ربیعہ اپنے شوہر کی کافی چہیتی تھی۔ سہیل کو سبھی ایک فرماں بردار، بیوی کا حکم ماننے والے شوہر کے طور پر جانتے تھے اور یہ سچ بھی تھا۔ ربیعہ نے ہمیشہ خوب فخر سے سہیل کی اطاعت گزاری کا ذکر کیا تھا۔ اور یہ وہی سہیل تھا جس کا رشتہ پہلے نمرہ کے لیے آیا تھا۔ نمرہ کے اس وقت ایک ساتھ کئی رشتے آئے ہوئے تھے اور میرٹ لسٹ پر سہیل کا نمبر تیسرا تھا۔ پھر اس کے لیے تو ثاقب کو پسند کرلیا گیا اور سہیل کی امی نے ربیعہ کا رشتہ مانگ لیا۔ خالہ نے تو جھٹ ہاں کرلی کیونکہ اب وہ ربیعہ کے رشتے کے لیے کچھ کچھ فکر مند رہنے لگی تھیں۔ ربیعہ کی کامیاب ازدواجی زندگی دیکھ کر کبھی کبھار نمرہ انجانے میں اپنا موازنہ اس سے کر بیٹھتی تھی۔ یہ خیال بھی ضرور آجاتا کہ اگر ثاقب کے بجائے سہیل کا رشتہ قبول کرلیا جاتا تو آج وہ ایک نوکر ٹائپ شوہر کی بیوی ہوتی۔ البتہ اس خیال کے پیچھے سہیل کے لیے کسی پسندیدگی کا ہرگز کوئی دخل نہیں تھا۔

"لیکن کیوں؟ سہیل بھائی کیوں نہیں چاہتے کہ تم منزہ کی شادی میں جاؤ۔"

"بس یار، بلاوجہ منزہ اور اس کی فیملی سے بیر کھاتے ہیں۔ اب ان سے کون بحث کرے۔" وہ کچھ طرح دے گئی۔

"ہوں۔" نمرہ نے سر ہلایا۔ "میری کیا مدد چاہیے؟"

"وہ ایکچوئلی۔۔۔ شادی پر تو میں اب نہیں جاؤں گی۔ منزہ سے ایڈوانس میں معذرت بھی کرچکی ہوں۔ وہ خفا تو بہت ہوئی لیکن میں نے کہہ دیا کہ سہیل کے کزن کی عین اسی دن شادی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے نمرہ کہ صرف شادی پر نہ آنے کے لیے معذرت کردینے سے بات نہیں بنتی، مجھے منزہ کو وش تو کرنا پڑے گا ناں..

اس نے مجھے میری شادی پر بہت قیمتی اور خوب صورت تحفہ دیا تھا۔ بھلے یہ اس کی محبت تھی لیکن مجھ پر تو احسان ہوا ناں۔۔۔ اب شادی میں شریک نہ ہوتا تو الگ بات ہے لیکن تحفہ بھی نہ دوں تو بتاؤ، کتنی بری لگوں گی۔"

"ہاں بات تو ٹھیک ہے۔" نمرہ محض اتنا ہی کہہ پائی

کیونکہ ربیعہ کی تمہید کا ابھی بھی کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔

"دراصل مجھے تم سے کچھ رقم ادھار چاہیے تھی۔" بالآخر سسپنس ٹوٹا۔ "میں نے منزہ کے لیے جو چیز پسند کی ہے اس کے لیے کم از کم مجھے بارہ 'پندرہ ہزار چاہئیں۔ کیا تم اتنی رقم مجھے دے سکو گی۔۔۔؟"

"اوہ!" نمرہ نے سر ہلایا "ہاں اتنی رقم تو میرے پاس ہے 'کب چاہیے؟"

"تم کہو تو میں آج دن میں ہی اپنی نند کے بیٹے کو تمہارے گھر بھیج دیتی ہوں۔ تم اسے دروازے پر ہی رقم دے دینا۔"

"نند کا بیٹا۔۔۔!" نمرہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ رقم تو وہ ثاقب کے ہاتھ بھی اسے بھجوا سکتی تھی لیکن ربیعہ نے خود ہی سختی سے ثاقب کو بتانے سے منع کر دیا تھا۔

"سنو تم علی کو نہیں بھیج سکتیں وہ تو اب کالج سے آنے والا ہو گا۔" نمرہ نے اجنبی لڑکے کے آنے سے بہتر سمجھا کہ ربیعہ کے بھائی کو بلوا لے۔ علی اس کا خالہ زاد تھا اور اکثر ہی گھر آتا تھا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں!" ربیعہ نے عجلت سے نفی کی۔ "علی سے کہوں گی تو وہ امی کو بتا دے گا' پھر وہ مجھ سے وجہ پوچھیں گی اور اگر انہیں پتا چلا کہ سہیل مجھ پر شک کرتے ہیں تو ان کی راتوں کی نیند ہی اڑ جائے گی۔"

ربیعہ روانی میں بول گئی۔

"شک۔۔۔ نمرہ ایک دم چونکی۔ کیسا شک ربیعہ سبا"

"دراصل میں۔۔۔" ربیعہ عجلت میں بتا تو بیٹھی لیکن اب سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"ہم دوست ہیں ربیعہ 'پلیز بتاؤ ناں۔۔۔ ایسی کیا بات ہے؟" نمرہ صرف نظر کرنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھی پھر رقم دے کر وہ اس کے ذاتی معاملے کا حصہ بننے والی تھی 'کل کو کوئی مسئلہ ہو جاتا تو وہ بلاوجہ پھنس سکتی تھی۔

"پلیز نمو! یہ بات کسی سے کہنا مت 'نہ ثاقب بھائی سے نہ خالہ اور ثمو باجی وغیرہ سے۔"

"وعدہ رہا' تمہاری بات صرف مجھ تک رہے گی لیکن دیکھو' بلا جھجک ہر بات بتانی ہو گی۔"

"سچ کہتی ہوں نمرو' بات کچھ بھی نہیں ہے لیکن سہیل کے رویے کی وجہ سے خود اپنی نظروں میں بھی چور بن گئی ہوں۔" ربیعہ کا لہجہ کچھ بھیگ سا گیا۔

"سہیل کو شک ہے کہ شادی سے پہلے شاید میرا منزہ کے بھائی کے ساتھ کچھ۔" وہ کہتے کہتے رک گئی جبکہ نمرہ بے یقینی کی کیفیت میں بیٹھی رہ گئی۔

"انہیں یہ شک کیوں ہوا' کیا ایسی کوئی بات واقعی تھی؟"

"قسم لے لو نمرہ' ایسی کوئی بات کبھی بھی نہیں تھی۔ تم تو خود بچپن سے مجھے جانتی ہو' کیا میں ایسی تھی اور مدثر کو تو میں بالکل بھائیوں کی طرح سمجھتی ہوں ہمیشہ سے بلکہ وہ بھی میرے بارے میں ایسے ہی جذبات رکھتا ہے۔"

"تو پھر ربیعہ۔۔۔ جب اس الزام میں کوئی سچائی ہی نہیں ہے تو سہیل بھائی کو ایسا شک کیوں ہوا؟"

"پتا نہیں کیوں۔۔۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ پچھلے دنوں سہیل کی اتفاقاً" مدثر سے بات ہوئی۔ وہ پاسپورٹ آفس میں کام کرتا ہے۔ سہیل وہاں کسی کام سے گئے تو مدثر نے انہیں پہچان لیا۔ بہت عزت سے پیش آیا چائے وغیرہ پلوائی۔ بس اس بے چارے کا قصور اتنا سا تھا کہ اس نے میرا نام لے کر کہا "آپ ربیعہ کے شوہر ہیں 'ایسے کیسے جانے دے سکتے ہیں چائے تو پینی پڑے گی وغیرہ۔"

"لیکن تمہارے نام کا حوالہ دینا کوئی ایسا بڑا جرم بھی نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ تم اس کی بہن کی دوست ہو تو تعارف کے لیے اسے اتنا تو بتانا ہی تھا۔" نمرہ ابھی بھی حیران تھی۔

"میں نے بھی سہیل سے یہی کہا کہ وہ تو آپ کو پہچان گیا تھا لیکن آپ اسے نہیں جانتے تھے تو ظاہر ہے اسے نام لینا پڑا۔"

"ایک بات پوچھوں نمرہ! پلیز مائنڈ مت کرنا۔" نمرہ نے جھجھک کر کہا۔

"ہاں‘ ہاں کہو۔"

"بات صرف اتنی ہی ہے ناں۔۔۔ آئی مین ‘تم مجھ سے اصل بات چھپا تو نہیں رہیں۔۔۔؟"

"مجھے انوشہ کی قسم نمرہ‘ واللہ جو کہا بات صرف اتنی ہی ہے۔"

"بس بس۔" نمرہ کا تو دل ہی دہل گیا۔ ربیعہ نے اپنی بیٹی کا نام لے دیا تھا۔ کسی شک کی گنجائش ہی کہاں تھی۔۔۔ لیکن۔" وہ کچھ سوچ کر چونکی۔

"تم نے فوراً" اتنی آسانی سے اپنی بچی کا نام لے لیا تو سہیل بھائی کو بھی یہی قسم کھا کر یقین دلا دو۔"

"کھا چکی ہوں۔" ربیعہ نے ٹھنڈے انداز میں بتایا تو نمرہ کی حیرت سے چیخ نکل گئی۔

"اس نے اتنی بڑی قسم کا بھی یقین نہیں کیا۔"

"بس نمرہ کیا بتاؤں‘ جسے شک کرنے کی عادت ہو وہ قسموں کا بھی یقین نہیں کرتے۔ سہیل کی عادت نے زندگی عذاب بنا رکھی ہے۔"

"تم نے پہلے کبھی ذکر نہیں کیا؟" نمرہ کو وہ ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ جن میں اس نے سہیل کی تعریفوں کے پل باندھے تھے۔

"کیا فائدہ بتانے کا۔۔۔ اس کی عادت تو نہیں بدل جائے گی ایک ایک کو بتانے سے۔" ربیعہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"ہوں۔" نمرہ نے آہستہ سے تائید کی۔

"اچھا‘ پھر کیا سوچا ہے میرے کام کا۔۔۔؟" ربیعہ نے یاد دلایا۔

"ٹھیک ہے‘ تم اپنی نند کے بیٹے کو بھیج دو۔ لیکن جلدی بھیجنا اور نام کیا ہے اس کا۔۔۔ سوری میں بھول گئی۔"

"سفیر نام ہے اور تقریباً" ایک بجے کے آس پاس آئے گا۔ بس وہ کالج سے آنے ہی والا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں عاشر کو سلا کر رقم نکال رکھتی ہوں۔" نمرہ نے فون بند کیا۔

پیسے نکالتے ہوئے دل میں سوچا کہ امی یا ثمرہ باجی سے ایک بار فون پر مشورہ کر لے لیکن ربیعہ کی باتوں کا کچھ اثر تھا کہ اس نے خود کو باز رکھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی سن کر کہ ربیعہ نے سہیل کی اتنی بڑی خامی کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا‘ حتیٰ کہ اپنی امی اور بہنوں سے بھی نہیں۔۔۔ نمرہ ایسی باتوں سے متاثر تو بہت ہوتی تھی لیکن اپنے ہلکے پیٹ کا کیا کرتی۔ چند ہی دنوں میں پھر بھول بھال کر لمبے لمبے حال احوال بانٹنا شروع کر دیتی۔ بہرحال اس وقت تو ربیعہ کی باتوں کا اثر غالب تھا اس لیے بنا کسی سے کچھ کہے سفیر کی آمد کا انتظار کرنے لگی اور وہ ایک بجے سے تھوڑا پہلے ہی آ گیا۔

"السلام علیکم نمرہ باجی!" نمرہ نے گیٹ کھولا تو اس نے مسکرا کر جھٹ سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام سفیر۔ آؤ" اس نے راستہ چھوڑا۔ "اندر آ جاؤ۔"

سولہ‘ سترہ سال کے اونچے لمبے‘ ہینڈسم سے سفیر سے وہ دو‘ تین مرتبہ ربیعہ کے گھر مل چکی تھی اس لیے مروت نبھائی۔

"شکریہ باجی۔ لیکن اس وقت ذرا جلدی میں ہوں۔" وہ پھر مسکرایا۔

"اچھا کوئی بات نہیں‘ یہ لو۔" نمرہ نے ہاتھ میں پکڑے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ "ربیعہ کو دے دینا اور ہاں‘ یہیں گن لو‘ احتیاط اچھی چیز ہے۔" نمرہ نے بھی مسکرا کر تنبیہہ کی اور وہ سر ہلا کر پلٹ گیا۔

ثاقب سے اس معاملے کا کوئی ذکر نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرتے ہوئے وہ گھر کے کام کاج میں مگن ہو گئی اور اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہی کہ ربیعہ نے ثاقب کو نہ بتانے کا وعدہ لیا تھا۔ عام حالات میں اگرچہ وہ ایسے وعدے آرام سے توڑ دیا کرتی تھی لیکن آج سوچ کچھ مختلف تھی۔ اپنے پاس کچھ رقم پس انداز کرنے کی عادت اسے شروع سے ہی تھی اور شادی کے آغاز کے دنوں میں ثاقب کو بھی پتا ہوتا تھا کہ نمرہ کے پاس گھر میں کتنے پیسے رکھے ہیں۔ ایسے میں نمرہ جب کسی ضرورت کے لیے ثاقب سے رقم مانگتی تو وہ پس انداز کی ہوئی رقم کا حوالہ دے کر صاف دامن بچا جاتا کیونکہ فطرتاً "تو کنجوس ہی تھا۔

آہستہ آہستہ نمرہ کو اس معاملے میں عقل آگئی اور اس نے بچائی گئی رقم کا کھول کھول کر تذکرہ کرنا چھوڑ دیا۔ اس طرح اسے شاپنگ وغیرہ کے لیے روپے نکلوانے میں سہولت ہوگئی۔ آج بھی ثاقب سے ذکر نہ کرنے کا پختہ ارادہ اس لیے کیا کہ ثاقب کو ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ اس کے پاس پچیس' تیس ہزار جمع ہو چکے ہیں۔

☆ ☆ ☆

"اور... کیسا رہا دن؟" ثاقب نے ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر نظر ڈالی۔

"ہاں جی... بالکل ٹھیک اور مصروف..." وہ مسکرا کر سامنے بیٹھ گئی۔

"کہیں جانا ہوا؟ امی کی طرف یا مارکیٹ؟" ثاقب نے پلیٹ اٹھائی۔

"نہیں... آج تو گھر پر ہی رہی۔"

"کوئی آیا گیا بھی نہیں...؟" وہ کھانا شروع کر چکا تھا ساتھ ساتھ سوالات بھی جاری تھے۔ نمرہ ہرگز نہیں چونکی کیونکہ یہ وہ سوال تھے جو ثاقب معمول کے مطابق روز ہی پوچھا کرتا تھا۔

"جی نہیں' آیا بھی کوئی نہیں۔"

"ہوں۔" وہ مزید سوالات کا ارادہ ترک کر کے کھانے میں مشغول ہو گیا اور وہ چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر عاشر کو کھلانے لگی۔

☆ ☆ ☆

"دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھا کرو نمرہ... یہ مانگنے والی عورتیں تو منہ اٹھا کر کمرے تک آجاتی ہیں۔" روبینہ باجی باہر سے بولتی ہوئی کمرے میں آئیں۔

"جی وہ زبیدہ ابھی کام ختم کر کے نکلی ہے۔ میں بس باہر ہی آنے والی تھی۔" اس نے گود میں سوئے عاشر کو بیڈ پہ لٹا کر کچھ دیر تھپکا۔

"چلو باہر چل کر بیٹھتے ہیں۔ یہاں عاشر ڈسٹرب ہو گا۔"

انہوں نے خود ہی باہر کی راہ لی تو نمرہ نے دل ہی دل میں شکر کیا۔ اگر وہ یہیں ڈیرہ جمالیتیں تو نمرہ مروت کے مارے کچھ بھی نہ کہہ پاتی۔ روبینہ اس کی بڑی نند تھی اور نندوں والی تمام روایتی خصوصیات سے لیس بھی۔ نمرہ ان کی اکثر تند و تیز باتوں کے جواب میں خاموش رہنے میں ہی عافیت جانتی کیونکہ ان کا تعلق بولنے والوں کی اس جماعت سے تھا جن سے جیتنا ناممکن ہوتا ہے۔ ان کا گھر پاس میں ہی تھا اس لیے اکثر کام کاج نمٹا کر آجایا کرتیں۔

"چائے بناؤں باجی!" باہر آکر بھی وہ مودب سی کھڑی رہی۔

"ارے نہیں... ناشتہ آج دیر سے کیا تھا۔ بیٹھو تم۔" خاصا حکمیہ انداز تھا۔ نمرہ فوراً بیٹھ گئی۔

"کل کون لڑکا تمہارے دروازے پر آیا تھا؟" پہلا سوال ہی غضب کا تھا۔

نمرہ کا دل ڈوب کر سیدھا پسلیوں سے جا ٹکرایا۔ "کک... کون لڑکا؟"

"ارے وہی' جسے تم نے ہزاروں روپے پکڑائے اور وہ گلی میں ہی گنتے گنتے چل پڑا... ایک اور دھماکہ...

نمرہ کی تو سٹی گم ہوگئی۔ اندھا سیدھا جواب ابھی منہ میں تھا کہ وہ دوبارہ بولنا شروع ہوگئیں۔

"صبح میں نے ثاقب سے پوچھا تو کہنے لگا۔ احمد علی صاحب کے گیٹ پر کوئی ہوگا۔ بتاؤ بھلا کوئی ایسے بھی کسی کی بات کو جھٹلاتا ہے۔ سوہ اپنے فر فر انداز میں بولے چلی گئیں اور نمرہ کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے۔ "ثاقب کو بھی پتا چل گیا؟"

"مجھے تو بھئی دانش نے بتایا۔ وہ گھر سے بائیک نکال رہا تھا جب تم لوگوں کے گیٹ پر اسے ایک لڑکا کھڑا دکھائی دیا۔ تب ہی اس نے دیکھا کہ کسی عورت نے ہاتھ بڑھا کر اسے روپے تھمائے اور وہ نوٹ گنتا دانش کے آگے سے گزر گیا۔ بتاؤ! اب شک کی کیا گنجائش اور یہ میرا بھائی ہے کہ اللہ توبہ... میرے میاں صاحب تو بہنوں کی طرف داری میں مجھے گھر سے

نکال دینے کو تیار ہو جاتے ہیں اور یہاں بڑی بہن کے کہے کی اتنی سی قدر ہے کہ کھڑے کھڑے کہہ دیا، نمرہ نے کہا ہے کل کوئی نہیں آیا تھا' حد ہو گئی....." روبی باجی اپنے مخصوص لٹھ مار انداز میں سیدھے سیدھے اسے لتاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں لیکن نمرہ کا سائیں سائیں کرتا دماغ ہرگز ان کی بے لگام گفتگو کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ روبی باجی نے ثاقب سے بھی بات کر لی تھی۔ جانے کیا کچھ سوچتے ہوئے آفس گئے ہوں گے۔ واپس آکر پتا نہیں کیسی تفتیش کریں۔ باجی کو تو انہوں نے ٹالنا ہی تھا کیونکہ گھر کی باتیں باہر شیئر کرنے سے اسے سخت چڑ تھی' بھلے وہ باہر والے سگے بھائی بہن ہی کیوں نہ ہوں۔ نہ تو ثاقب دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرتے تھے اور نہ اپنے معاملے میں دوسروں کی بے جا مداخلت پسند کرتے تھے' اس لیے روبی باجی کو فی الفور ٹال دینا نمرہ کی سمجھ میں آرہا تھا لیکن گھر واپس آکر بھی وہ بات کو اسی طرح آیا گیا کریں گے۔ یہ کہنا خاصا مشکل تھا۔

وہ باجی کے چلے جانے کے بعد اچانک ہی بری طرح تناؤ کا شکار ہو گئی۔ دماغ کچھ ایسے الجھ سا گیا کہ کوئی بھی کام وہ دن بھر میں ڈھنگ سے نہیں کرپائی۔ روزانہ وہ ثاقب کے آنے سے پہلے فریش ہو کر' صاف لباس تبدیل کر کے ہلکا پھلکا میک اپ بھی کرلیا کرتی تھی

لیکن اس روز ذہن ایسے دباؤ کا شکار ہوا کہ وہ ان ہی ملگجے سے کپڑوں میں بنا کنگھی کیے دروازے پر آگئی۔ عاشر دوڑ کر باپ کی ٹانگوں سے لپٹا تو اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا سامان نمرہ کی طرف بڑھا دیا اور عاشر کو اٹھالیا۔ وہ سامان کے شاپرز لیے خاصی غائب دماغی سے کچن میں آگئی۔

"میرے لیے کھانا فی الحال مت نکالنا۔" ثاقب نے باہر سے ہی اونچی آواز میں کہا۔ وہ بنا جواب دیے چیزیں جگہ پر رکھنے لگی۔

"اگر فارغ ہو تو ذرا یہاں آؤ..... کچھ بات کرنی ہے۔" ثاقب نے دوبارہ مخاطب کیا تو نمرہ کا دل یکبارگی بیٹھ سا گیا۔

"اسی سلسلے میں ہی بلا رہے ہوں گے بھلا اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ بڑی غلطی کی ثاقب کو نہ بتا کر۔ اب جھوٹ پہ جھوٹ بول کر معاملے کو مزید خراب نہیں کروں گی۔ ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سچ بتا دوں گی۔" وہ خود کو ذہنی طور پر تیار کرتی کچن سے روانہ ہوئی۔ اگرچہ بے وقت بولا گیا سچ بھی وقار کو شدید ٹھیس پہنچاتا ہے لیکن وہ خود کو شرمندہ ہونے کے لیے تیار کر چکی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ ثاقب کی نظروں میں ہمیشہ کے لیے بھروسے کے قابل نہ رہتی۔

"آر یو اوکے.....؟" ثاقب نے عاشر کو بیڈ پر بٹھاتے ہوئے ایک گہری نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ جانے کیسے انداز تھے ثاقب کے' کبھی وہ اس کے سخت لہجے سے ڈر جاتی تو کبھی ایسا مدھم پر سکون لہجہ ہولا دیتا۔ بس ایک رعب کا حصار تھا جس میں شادی کے اول دن سے مقید تھی۔ نہ کبھی ثاقب نے اس حصار کو توڑ کر نمرہ کو دوستانہ انداز میں اپنی قریب کیا اور نہ اسے کبھی ہمت ہوئی ایسا کرنے کی۔

"یہاں آؤ۔" وہ سینے پہ ہاتھ باندھے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ نمرہ نے گھبرا کر نظر اٹھائی۔ ثاقب نے آنکھوں کے اشارے سے دوبارہ بلایا۔ بڑا ہی دوٹوک انداز تھا۔ چہرے پہ گہری سنجیدگی الگ..... نمرہ اپنی لرزتی ٹانگوں پر قابو پاتی قریب آئی۔

"کوئی آیا تھا آج.....؟"

"جی آج....." وہ ذرا سا رکی۔ "آج تو بس روبی باجی ہی آئی تھیں۔"

"کچھ کہا انہوں نے۔" "کافی اپ سیٹ لگ رہی ہو!" وہ بغور اسی کو دیکھ رہا تھا۔ نمرہ تقریباً" رو دینے والی ہو گئی۔ اور اسی بھیگے لہجے میں آغاز لیا۔

"وہ ثاقب اصل میں۔" تھوک نگلتے ہوئے اس نے تمہید باندھنے کی کوشش کی۔

"پتا ہے مجھے۔" ثاقب نے اس کی بات کاٹی۔

"ضرور ان ہی کی باتوں کی وجہ سے پریشان ہو۔" ثاقب دو قدم چل کر اس کے نزدیک آیا "میں آج صبح آفس جانے کے لیے نکلا تو وہ اپنے دروازے پر کھڑی تھیں۔

مجھے دیکھا تو اندر بلا لیا، کہنے لگیں کل کوئی لڑکا تم لوگوں کے دروازے پر آکر نمرہ سے ہزاروں روپے لے گیا۔ مجھے بڑی ہنسی آئی میں انہیں باقاعدہ بازو سے پکڑ کر گیٹ تک لایا اور کہا کہ آپ کے گیٹ سے دیکھتے پر ہمارے اور احمد علی صاحب کے گیٹ کا فرق ٹھیک سے محسوس نہیں ہوتا دونوں کے سفید گیٹ تقریباً" ایک جیسے ہیں اور اتنے پاس پاس ہیں کہ دور سے دیکھنے پر ہر گز اندازہ نہیں ہوتا کس کے دروازے پر کیا ایکٹیویٹی چل رہی ہے اور ہمارے ہاں اگر پچھلے روز کوئی آیا ہوتا تو نمرہ ضرور مجھے بتاتی۔۔۔ یقیناً "تم سے بھی وہ یہی پوچھنے آئی ہوں گی۔۔۔ ہے ناں؟" ثاقب نے تائید چاہی تو نمرہ نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"تمہارا اپ سیٹ ہونا جائز ہے۔ انہیں اس طرح بنا تصدیق اتنی بڑی بات نہیں کرنی چاہیے تھی' اب ان کی نیچر تو تم جانتی ہو۔"

"لیکن ثاقب!" نمرہ نے بھیگے لہجے پر قابو پاتے ہوئے لب کھولنے کی کوشش کی تو ثاقب نے اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پہ رکھ کر روک دیا۔

"باجی کی طرف سے میں معذرت کرتا ہوں۔۔۔ تم پر کوئی انگلی اٹھائے تو میں اس کی انگلیاں توڑ دینے کی جرات بھی رکھتا ہوں لیکن روبینہ باجی میری بڑی بہن ہیں۔ ان سے بدتمیزی یا بحث مجھے زیب نہیں دیتی۔

پلیز تم اپنے آپ کو ہلکان مت کرو۔ تمہارے اور میرے درمیان انڈر اسٹینڈنگ کا جو لیول ہے وہ باجی کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ میں انہیں نہیں سمجھا سکتا کہ نمرہ پر میں جو اندھا اعتماد کرتا ہوں۔" وہ اس پر پوری بھی اتری ہے۔ وہ نہ مجھ سے کبھی کچھ چھپاتی ہے نہ جھوٹ بولتی ہے' میرے پیٹھ پیچھے میری بیوی کسی جوان لڑکے کے ہاتھ پر ہزاروں روپے رکھتی ہے۔ ایسی لغو اور بے ہودہ بات پر میں مر کر بھی یقین نہیں کر سکتا۔"

ایک میٹھی مسکراہٹ لبوں پر سجائے اس نے رسان سے کہا تو نمرہ آنکھیں پھاڑے ہونقوں کی طرح اسے دیکھے گئی۔ ثاقب کے موبائل فون پر کال آنے لگی تو وہ اٹینڈ کرتا باہر کی طرف بڑھ گیا اور نمرہ جو بڑی دیر سے آنسوؤں کا گولا روکے خود پر ضبط کیے کھڑی تھی' اٹیچڈ باتھ میں گھس گئی ندامت' شرمندگی' پچھتاوا' افسوس' جانے کیا کیا تھا آنسوؤں میں۔۔۔ بھلے اس کا جرم بہت معمولی تھا اگر سامنے آجاتا تو معافی' تلافی' در گزر سب ممکن تھے۔۔۔ دنوں اور ہفتوں میں جس کے معمولی تاریک سائے بھی چھٹ جاتے لیکن اسے تو رونا ثاقب کے بھروسے پر آرہا تھا۔

نمرہ کی ذات پر اس کا اعتماد جو آسمان کو چھوتا دکھائی دیا تھا اور وہ۔۔۔ کیسی کم ظرف تھی کہ چار سال اپنی ازدواجی زندگی کا موازنہ ربیعہ اور سہیل کی زندگی سے کرتی رہی۔ وہ سہیل جس نے ناحق ربیعہ کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ ایک سلجھی ہوئی شریف عورت کو خود اس کی اپنی نظر میں بے اعتبار بنا دیا تھا۔

اسے سوچ سوچ کر حیرت ہو رہی تھی کہ حساب کتاب کی لسٹ میں اعتبار' یقین اور بھروسے جیسے موضوعات اب سے پہلے کبھی ذہن میں کیوں نہ آئے تھے۔ کیا ایک عورت کی زندگی میں ہر چیز سے بڑھ کر یہ مان اہم نہیں کہ اس کا شوہر اس پر بھروسا کرتا ہے۔

☆ ☆ ☆

"بھئی' تمہیں تو توفیق نہیں ہوتی کہ دو گھڑی ماں سے مل آؤ۔ ثمرہ ایک ہفتے میں دو چکر لگا گئی۔۔۔ پر تمہارا جواب نہیں۔۔۔ سوچا آج خود ہی مل آؤں۔" امی لشتم پشتم تھیلے سنبھالتی دروازے سے ہی بولتی ہوئی اندر آئیں۔ نمرہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔

"بس امی' ایک دو روز میں آنے ہی والی تھی۔"

"اچھا چھوڑو وہ سب۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔ تمہارے لیے کچھ لائی ہوں۔" وہ پھیل کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے پر جوش انداز میں گویا ہوئیں۔

"تمہارے کنجوس شوہر کو تو خیال آئے گا نہیں کہ کتنی گرمی آگئی ہے سیزن کے نئے ڈریس ہی دلا دوں بیوی کو۔۔۔ لیکن "ایسوں" کا نہ دل چاہتا ہے کچھ لانے کو اور نہ بیوی نظر آتی ہے انہیں۔ لان کے ڈیزائنو

سوٹ لائی ہوں تمہارے لیے ذرا کپڑے کو ہاتھ تو لگاؤ۔ دیکھی ہے کہیں ایسی مکھن سی لان۔۔۔" انہوں نے باری باری دو سوٹ سامنے پھیلا کر ستائش کے انداز میں نمرہ کو دیکھا جس کا چہرہ ہر قسم کے جوش سے خالی تھا۔

"تمہیں کیا ہوا۔۔۔ خیر تو ہے؟" عطیہ بیگم کو پہلی مرتبہ تشویش سی لاحق ہوئی۔

"امی یہ ڈریسز آپ ثمو یا حِی کو دے دیں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔" "ارے کیا ہوا؟ وہ سب چھوڑ چھاڑ پریشانی سے اٹھیں۔ "ثاقب سے جھگڑا ہوا کیا' نہیں اس نے میکے والوں سے کچھ بھی لینے سے منع تو نہیں کر دیا؟" امی قدرے دور کی کوڑی لائیں۔ نمرہ چپ کی چپ کھڑی رہ گئی۔ یہ اپنی دی ہوئی جراتوں کا نتیجہ تھا کہ امی ثاقب کے خلاف بے محابا کچھ بھی بولے جا رہی تھیں۔ دل ہی دل میں اس نے خود کو کوسا۔ کتنی وفاشعار ہوتی ہیں وہ بیویاں جو شوہر کی تمام زیادتیاں' تمام سختیاں خود تک محدود رکھتی ہیں۔ ایسی بیویوں کے شوہر نہ صرف اپنی سسرال میں نہایت معتبر سمجھے جاتے ہیں بلکہ سسرال والے اپنے داماد کے آگے بچھ بچھ جاتے ہیں اور شاید ایسی قدر و منزلت پا کر آڑھے ٹیڑھے شوہر بھی دھیرے دھیرے بیویوں کے ساتھ اپنا رویہ ٹھیک کر لیا کرتے ہوں لیکن اس نے تو اپنی بے وقوفیوں کی بدولت ثاقب کو اپنے گھر والوں کی نظر میں خوب بے وقعت کر دیا تھا لیکن چونکہ ابھی بگڑا کچھ نہیں تھا تو اب یہ بھی اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ میکے والوں کی نگاہ میں ثاقب کے مقام و مرتبے کی تجدید اور تعین کرتی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے امی۔۔۔ ثاقب نے کچھ نہیں کہا۔"

"تو پھر۔ کیا سوٹ پسند نہیں آئے۔۔۔؟"

"نہیں امی۔۔۔ بس آپ تکلیف نہ کریں۔۔۔ مجھے ثاقب ہی سیزن کے کپڑے دلائیں گے۔"

"ہنہ کہاں سے دلائے گا۔" عطیہ بیگم کا لہجہ پھر سے تلخ ہوا۔ "تمہاری ضرورتیں اسے نظر کہاں آتی ہیں۔ ایسوں کو بس گھر کے کام کروانے کے وقت ہی بیویاں دکھائی دیتی ہیں۔ جہاں کچھ جیب ڈھیلی کرنا پڑ جائے تو ان جیسا تنگ دل کوئی نہیں ہوتا۔"

"شکر ہے وہ صرف روپے پیسے کے معاملے میں تنگ دل ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے شوہر کی محض اتنی سی خامی کچھ گھاٹے کا سودا تو نہیں ہے۔" وہ خلاؤں میں گھورتے ہوئے اپنے آپ مسکرائی تو عطیہ بیگم کو اس کی ذہنی حالت میں کسی خرابی کا شبہ ہوا۔

"ارے کیا بڑبڑا رہی ہو۔۔۔ شوہر کی کنجوسی کو اچھا کہے جا رہی ہو۔ دماغ تو نہیں گھوم گیا؟"

"نہیں امی۔۔۔" وہ بھیگے بھیگے لہجے میں پھر ہنسی۔ پلکوں سے ایک آدھ آنسو بھی ٹوٹ کر گرا جسے وہ ہتھیلی سے رگڑ کر ماں کے قریب آئی۔

"یہ جو دولت کی ریل پیل دکھا کر بیویوں کو ہواؤں میں اڑائے پھرتے ہیں ناں۔۔۔ اور جنہیں دیکھ کر ہم رشک سے صرف یہی سوچتے ہیں کہ ان جیسا خوش نصیب کوئی نہیں۔۔۔ ذرا ان بیویوں سے پوچھیں' روپے پیسے کی فراوانی دینے والے ان کے شوہروں کی سوچ کتنی تنگ' کتنی چھوٹی ہوتی ہے۔ کبھی ہم ایسوں کے اندر جھانک لیں تو ہماری چیخوں کا بھی دم گھٹ جائے۔" وہ گمبھیر سنجیدگی سے چور لہجے میں بولتی چلی گئی تو عطیہ بیگم خاموشی سے اسے سننے لگیں۔ کچھ ایسا ضرور تھا اس کے لہجے میں جس نے عطیہ بیگم کی بولتی زبان کو اچانک بریک لگا دی تھی۔ نمرہ نے آہستہ آہستہ اپنی اور ربیعہ کی تمام باتیں اور بعد میں پیش آنے والے حالات ان کے گوش گزار کیے۔ بھلے ربیعہ سے کیا عہد توڑنے کا جرم سرزد ہوا تھا' لیکن دل نے کہا شوہر کی برائیوں کو کھول کھول کر مسالا لگا کر میکے میں بتانے کی پاداش میں اب وہ ساری خوبیاں بھی کھل کر بیان کرنی چاہئیں جن پر پہلے اپنی نگاہ بھی نہیں پڑی تھی۔

"جوتوں' کپڑوں اور زیورات کے ڈھیر وہ خوشی کبھی نہیں دے سکتے امی! جو شوہر کی نظروں میں بھروسے اور اعتبار کی چمک دیکھ کر کل مجھے ہوئی۔ آپ نہیں

جانتیں کل میری اپنی نظروں میں میرا قد کتنا بلند ہوا اور وہ ثاقب نے کیا۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ثاقب میرے بارے میں اتنی اچھی رائے رکھتے ہیں۔

کیا تمہیں خوش نہیں ہونا چاہیے امی؟" نمرہ کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔ رندھے گلے سے اس نے ماں سے سوال کیا تو انہوں نے نمرہ کا گال تھپتھپا کر بھرپور تائید میں سرہلایا۔

"غلط فہمی ایک ایسا لفظ ہے جس کا مفہوم' معنی اور وضاحت کسی سے پوچھے جائیں تو ایک منفی مطلب کی صورت میں سامنے آئیں گے شاید لغت بھی اس کا کوئی مثبت معنی نہ دے سکے لیکن ایک غلط فہمی نے میری زندگی جنت بنا رکھی ہے اور آج تک مجھے اس کا احساس بھی نہیں تھا۔ یہ وہ غلط فہمی ہے جو ثاقب کو میرے متعلق ہے۔ وہ سمجھتے ہیں میں ان سے کبھی کچھ نہیں چھپاتی' ہمیشہ سچ بولتی ہوں۔ ان کے بھروسے کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتی۔ جانے کب سے یہ رائے ان کے دل میں جگہ پا چکی ہے اور اس قدر پختہ ہے کہ انہیں میری کسی وضاحت کی بھی ضرورت نہیں ہے اور ایک غلط فہمی وہ ہے امی' جو سہیل کو ربیعہ کے متعلق پیدا ہو گئی ہے۔ جس نے بلاوجہ ربیعہ کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ آج سے پہلے کبھی دھیان میں نہیں آیا کہ مرد کی شک کرنے کی عادت عورت کی زندگی کو کتنا کھوکھلا بنا سکتی ہے اور اعتبار کتنا مضبوط۔"

نمرہ نے ایک جذب سے ماں کا ہاتھ پکڑا تو عطیہ بیگم نے مسکرا کر اس کی حمایت کی۔

کوئی ماں بھلا کیونکر چاہے گی کہ اس کی بیٹی اور داماد میں فاصلوں کی دیوار اونچی سے اونچی ہوتی جائے البتہ بیٹی کی محبت میں وہ بھی یہ بات بھول بیٹھی تھیں کہ ان کی ہر معاملے میں بے جا مداخلت میاں بیوی کے رشتے میں کڑواہٹ گھولنے کا باعث بن سکتی ہے۔ وہ نمرہ کے حق میں دعا کرتی گھر کو روانہ ہوئیں۔

مہرین نے ایک بار کہا تھا "جوں جوں شادی شدہ زندگی کا سفر طویل ہوتا جاتا ہے' ہم میاں بیوی کھول کھول کر ایک دوسرے کی خامیاں گنواتے' وقت گزارنے لگتے ہیں حتیٰ کہ ایک دن اپنے ہی ہاتھوں اپنے مضبوط قلعے جیسے گھر کو زمین بوس کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔ شادی کے ہنی مون پیریڈ میں ایک دوسرے کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملانے والوں کو چند سال گزرنے کے بعد لفظ "تعریف" سے جھجک محسوس ہونے لگتی ہے۔ اگر میاں ہر صبح ناشتے کی میز پر بیوی کی ایک جملے میں تعریف کرتے ہوئے آفس جائے اور بیوی شام کو تھکے ہارے شوہر کی واپسی پر گھر میں اس کے ہونے کی اہمیت اور قدر و قیمت پر چند لائنیں بول دے تو یقیناً" دور جاتے رشتوں کو پل میں پاس لایا جا سکتا ہے۔" دوست کی باتیں یاد کر کے وہ اپنے آپ میں مسکرائی اچانک خود کو بھی بدلی بدلی سی محسوس ہوئی۔ شکوے شکایتوں کے ڈھیر اٹھاتے اس کا وجود بھی تھکنے لگا تھا۔ پل بھر میں اس نے ثاقب کی چھوٹی موٹی خامیوں کی گٹھڑی اپنے سر سے اتار پھینکی جسے چار برسوں سے "پہاڑ" سمجھ کر خود ہی اس کے نیچے دبتی جا رہی تھی۔ زندگی تو بہت خوب صورت بہت حسین ہے۔ ابھی جینے کے لیے اس میں اتنا فیول موجود ہے کہ گاڑی کو بجائے کھینچنے کے سہولت سے چلایا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے اور ثاقب کے انڈر اسٹینڈنگ لیول کو مزید ہائی کرنے کا پختہ عزم کیا اور مسکراتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آبیٹھی۔

ان خوشی سے مسکراتے لبوں کو لپ اسٹک کی ضرورت تو ہرگز نہیں تھی لیکن عورت تیار اپنے لیے کہاں ہوتی ہے۔ اسے تو مرد کی آنکھوں میں اپنائیت اور توجہ کے چند جگنو تلاش کرنے کی چاہ ہوتی ہے اور اب وہ ہر جگنو اپنی مٹھی میں بھر لینا چاہتی تھی' صرف سنگھار کر کے نہیں بلکہ اپنی ذاتی کوششوں کے بل پر بھی۔۔۔!

عفت سحر طاہر

بن مانگی دعا

وہ کئی دنوں سے تاک میں تھی۔ اس کا موبائل واحد امید تھا جو اس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ معیز کو مدد کے لیے پکار سکتی اور جب سلطانہ نے معیز کا نمبر مراد صدیقی کو دینے کے لیے موبائل نکالا تو واش روم سے واپس آتی ایبہا نے کن انکھیوں سے اسے موبائل واپس دروازے سے لٹکتے تھیلے میں گھسیڑتے دیکھ لیا اور آج جب اسے موقع مل ہی گیا کہ وہ جلدی سے معیز کا نمبر ملا کر اسے مدد کے لیے پکار لیتی تو حلق میں آنسوؤں کا پھندا لگ گیا۔

جانے کہاں سے آ کے سلطانہ نے چیل کی طرح جھپٹا مار کے اس سے موبایل چھین لیا' بلکہ اس کے ساتھ ہی ایبہا کی بھی شامت آ گئی۔ منہ سے گندی مغلظات بکتے ہوئے اس نے ایبہا کو مردانہ وار مارنا شروع کیا تھا اور وہ ٹھٹھرتے حواس لیے بے بسی سے پٹتی اپنا بچاؤ کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔

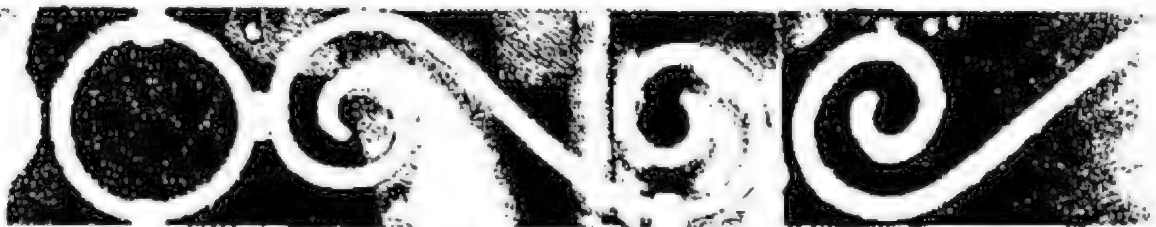


وہ ادھر اُدھر دیکھتا' بہت محتاط انداز میں فون بوتھ کی طرف بڑھا تو دل دھک دھک کر رہا تھا۔ جیب سے معیز کے موبائل نمبر والی پرچی نکال کر اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ نمبر ملانا شروع کیا اور اسے حیرت نہیں ہوئی' جب اگلی ہی بیل پہ کال اٹینڈ کر لی گئی۔

"ہیلو۔" مراد صدیقی کھنکھارا۔

تیئسویں قسط





"کون۔۔۔معیز احمد۔۔۔؟"

"جی۔۔۔ آپ کون بول رہے ہیں؟" وہ الجھن آمیز لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"تعارف کو چھوڑو اور میرے سوال کا جواب دو۔۔۔ اپنی بیوی کے بدلے میں تم کتنی رقم دے سکتے ہو؟" ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ دبے ہوئے مگر تختی سے پُر لہجے میں بولا تو معیز کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

"ایبھا۔۔۔ تمہارے پاس ہے؟" وہ بے یقینی سے پوچھنے لگا۔ پھر تیز لہجے میں بولا۔

"کون ہو تم۔۔۔ کیوں مان لوں میں کہ ایبھا تمہارے پاس ہے؟"

"ماننا تو تمہیں پڑے گا منے۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ زیادہ ٹائم نہیں دوں گا میں۔۔۔ اتنے غریب تو نہیں ہو کہ تمہیں رقم کا "بندوبست" کرنے کی ضرورت پڑے۔" وہ غرایا تھا۔

"دیکھو۔۔۔ تم جو کوئی بھی ہو۔۔۔ پہلے ایبھا سے میری بات کرواؤ۔ بس ایک بار مجھے اس کی آواز سنوا دو۔" معیز نے چلا کر کہا۔ اسے خوف لاحق ہوا کہیں وہ کال کاٹ نہ دے۔

"وہ بھی کروا دوں گا مگر تم کل شام تک پچاس لاکھ میری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچاؤ گے۔"

مراد صدیقی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگی شکار کی تڑپ "زندگی" سے اس کی محبت کا پتا دے رہی تھی۔

"او کے۔۔۔ ڈن۔۔۔ لیکن اُسے ایک خراش بھی نہیں آنی چاہیے۔ میں تمہیں جہاں کہو گے وہاں رقم پہنچا دوں گا۔" معیز نے تیزی سے کہا۔

"اور پولیس کو اس معاملے میں ملوث کرنے کا مطلب تو تم اچھی طرح سمجھتے ہو گے؟" اس کے لہجے میں مخفی دھمکی کو معیز نے اچھی طرح سمجھا تھا۔

"تم بے فکر رہو۔۔۔ لیکن تم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔" معیز کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے اغوا کار اپنا غصہ ایبھا پر نکالتے۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ تم بے فکر رہو۔"

"کس جگہ رقم پہنچانی ہے؟" معیز نے پوچھا۔ ایبھا کے ملنے کی امید بندھی تو وہ ایک لمحے کو بھی نہیں سوچنا چاہتا تھا کہ رقم دینی چاہیے یا نہیں۔

"وہ میں تمہیں کل بتاؤں گا۔"

"مگر اس سے پہلے تم ایک بار ایبھا سے میری بات کرواؤ گے۔" معیز نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں۔۔۔ مگر پچاس لاکھ سے ایک پائی بھی کم نہ ہو اور پولیس کو بھنک بھی پڑی تو۔۔۔ ساری عمر بیوی کی شکل کو ترسو گے۔"

وہ سفاکی سے بولا اور اگلی بات سنے بغیر ریسیور کریڈل پر ڈال کر تیزی سے فون بوتھ سے نکلا اور ادھر اُدھر دیکھتا جلدی سے گلی میں گھس گیا۔



"بڑی بے غیرت ہے۔ ذرا ترس نہیں آتا تجھے اپنے باپ پر۔۔۔ اس کی غریبی پر۔۔۔" اسے مارتے مارتے تھک کر سلطانہ چیخی تھی۔

وہ لمبے سانس لیتی بے دم سی پڑی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ معیز کی پکار ابھی اس کی سماعت میں تازہ تھی۔ تو کیا وہ پیاری آواز اب وہ کبھی سن نہ پائے گی۔

"نہ تیری ماں نے اسے سکھ دیا اور نہ ہی تو دے گی۔ ٹیکسی چلا کے گزارہ کر رہا ہے بے چارہ۔" ان دونوں کی بے چارگی کی کوئی حد نہ تھی۔
"اب فاقوں پہ آئے گا تو تجھے ہی بیچے گا نا۔"
سلطانہ نے سارا الزام اس کے سر تھوپا۔ تب ایبہا نے نفرت سے اس بدرنگی عورت کو دیکھا اور زہر خند لہجے میں بولی۔
"تو تجھے کیوں نہیں بیچتا۔" اسے جواب میں گالیوں اور مار کی امید تھی، مگر سلطانہ نے دفعتاً" اونچا سا قہقہہ لگایا۔ پھر محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔
"یہاں چمڑی کا دام چلتا ہے، سمجھی..." ایبہا کو بے اختیار حنا یاد آئی تو اس نے جھرجھری سی لی۔
"چپ چاپ اس گھر میں پڑی رہ۔ ورنہ میں اپنی کرنی پہ آئی تو مراد صدیقی بھی تجھے نہیں بچا پائے گا۔ ایسی جگہ سے تیرے دام کھرے کروں گی۔"
سلطانہ نے اسے دھمکایا تو لب و لہجے میں کچھ کر گزرنے کی سنگینی تھی۔
"شکر کر تیرے گھر والے سے ہی تیرا سودا کر رہا ہے وہ..."
واقعی... اس پر سجدہ شکر واجب تھا۔ ورنہ وہ اسے ادھر ادھر کر دیتے تو وہ کیا کر لیتی۔
مراد صدیقی گھر لوٹا تو اس کی چال ڈھال میں سرمستی سی تھی، مگر نیل پڑے چہرے کے ساتھ گم صم بیٹھی ساکت و جامد ایبہا کو دیکھ کر اس کی ساری مستی ہرن ہو گئی۔
لمحہ بھر ششدر رہنے کے بعد وہ دانت پیستا باورچی خانے کی طرف بڑھا جہاں سلطانہ کے گنگناتے ہوئے برتن دھونے کی آواز آ رہی تھی۔
"الو کی پٹھی... بدذات، کمینی عورت... تجھے منع کیا تھا میں نے... (تھپڑ) ہاتھ نہ لگا یو اب کے اسے۔ پھر مارا تو نے اسے۔" (تھپڑ...)
ایبہا بے تاثر سی ان کا جھگڑا سنتی رہی۔
دو تھپڑ کھانے کے بعد سلطانہ نے دبنے کے بجائے جواباً" مردانہ وار مغلظات بکنی شروع کیں تو ایبہا نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔

مراد نے اسے اسٹیل کا گلاس کھینچ مارا۔ سلطانہ اب اونچی آواز میں روتے ہوئے بول بھی رہی تھی۔
"تیری ہی راہ میں روڑے اٹکا رہی تھی۔ اپنے خصم کو فون ملا رہی تھی تیری ہوتی سوتی... وہ پولیس لے کے آتا تو پتا چلتا تجھے... سلطانہ کا دم ہے جو آزاد پھر رہا ہے تو..."
مراد دھیما پڑ گیا۔
"دیکھ سلطانہ... میری بیٹی ہے اس لیے تھوڑی طرف داری کرتا ہوں۔ یہ تو بلینک چیک ہے۔ اپنی مرضی کی رقم بھر کے کیش کرواتا ہے میں نے۔ اس کی دیکھ بھال تو کرنی ہی پڑے گی نا۔" وہ سلطانہ کو پچکار رہا تھا۔
ایبہا کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔
اب تو اس نے سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ یہ شخص اس کا باپ ہے کہ شاید اس طرح تکلیف کا کم احساس ہو، مگر دل دکھے تو تکلیف بہت ہوا کرتی ہے۔ چاہے ذہن کتنی ہی تاویلیں دے لے۔

☆ ☆ ☆

"میرے خیال میں ہمیں پولیس کی مدد لے لینی چاہیے معیز!" عون نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔
"بالکل نہیں۔ ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں یہ لوگ۔ فوراً ہی کڈنیپرز کو اطلاع مل جائے گی۔ وہ لوگ ایبہا کو نقصان پہنچائیں گے۔" معیز نے فی الفور یہ تجویز رد کر دی۔
"ہاں بالکل۔ پولیس کو بیچ میں ڈالنے سے معاملہ بگڑ جائے گا۔" ثانیہ نے بھی اس کی تائید کی تھی۔
"ہم ایف آئی آر کٹوا چکے ہیں۔ پولیس تو آل ریڈی اس معاملے میں ملوث ہے۔ اصولاً تو پولیس کو انفارم کرنا ہی چاہیے۔" ابراز نے بھائی کو دیکھا۔ وہ بہت پریشان دکھائی دیتا تھا۔ نفی میں سر ہلا کر بولا۔
"میں ایبہا کے لیے ایک فیصد بھی نقصان کا رسک نہیں لے سکتا۔ ذرا سی بھی گڑبڑ ہوئی تو وہ لوگ کوئی انتہائی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ انہوں نے سختی سے منع کیا ہے۔"
"اور ہو سکتا ہے، وہ ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔" ثانیہ نے کہا۔
"نظر ہی تو رکھے ہوئے تھے اور نہ جانے کب سے۔" معیز کی آنکھوں میں خفیف سی سرخی اتر آئی۔
"جب ہی تو۔ وہ آدھی رات کو باہر نکلی اور ان لوگوں کو موقع مل گیا۔"
"رقم کا انتظام ہو گیا ہے نا؟" عون نے پوچھا۔
"رقم کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے صرف یہ ٹینشن ہے کہ وہ لوگ ایبہا کو خیریت سے لوٹا دیں۔" وہ مضطربانہ انداز میں بولا۔
"یا اللہ۔" سفینہ بیگم کے تو کلیجے پہ ہاتھ پڑا۔ وہ تیزی سے چلتی ان کی طرف آئیں اور تند لہجے میں بولیں۔
"حق حلال کی کمائی میں سے پچاس روپے بھی کوئی دھوکے سے وصولے تو دکھ ہوتا ہے اور تمہیں پچاس لاکھ معمولی دکھائی دے رہے ہیں۔" ابراز کو ثانیہ اور عون کے سامنے ماں کے رویے پر شرمندگی محسوس ہوئی۔
"ایک زندگی کا سوال ہے ماما! ان کی جگہ میں ہوتا تب اس سے دگنی رقم بھی ہوتی دیتے۔"
ابراز نے نرمی سے ماں کو "سمجھانا" چاہا۔ مگر سوئے کو تو کوئی جگائے۔ اب جو جاگ رہا ہو اسے کون جگائے؟
"خدا نہ کرے۔" وہ تیزی سے بولیں۔ گھور کے ابراز کو دیکھا۔
"اس کا اکاؤنٹ بھرا ہوا ہے تمہارے باپ نے۔ وہیں سے پیسہ چکا کے جان کیوں نہیں بچا لیتی اپنی اور پھر معیز بیٹا۔" وہ لب و لہجہ بدل کے نرمی سے معیز سے مخاطب ہوئیں۔
"کیا گارنٹی ہے کہ وہ پچاس لاکھ لینے کے بعد اسے زندہ واپس کریں گے؟"

"ماما پلیز۔" مارے دکھ کے معیز کی آواز حلق میں پھنسی۔
"آنٹی! آپ تو ماں ہیں۔ دعا کریں گی تو اللہ ضرور سنے گا۔"
ثانیہ کو سفینہ کی ایک ہی "جھلک" سے اندازہ ہو گیا کہ ایبہا کے شب و روز کس جہنم میں گزرتے رہے ہوں گے۔

"ہوں۔" انہوں نے ثانیہ کی بات پہ کوئی حوصلہ افزا جملہ کہنے کے بجائے مبہم سے انداز میں ہنکارا بھرا، پھر معیز کو مشورہ دینے لگیں۔
"تم سیدھے پولیس کو انفارم کرو۔ آگے پولیس جانے اور اغوا کار جانیں۔ تم اس معاملے میں مت پڑو۔ مجھے تمہاری جان عزیز ہے میرے بچے۔" ان کے لب و لہجے سے اپنی اولاد کے لیے پیار ٹپکتا تھا۔
"اور مجھے ایبہا۔" معیز جیسے خود پر سے ضبط کھونے والا تھا۔ جتانے والے انداز میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔
سفینہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ پھر پینترا بدلتے ہوئے بولیں۔

"اتنے دنوں گھر سے باہر رہنے والی لڑکیوں کو یہ معاشرہ قبول نہیں کرتا معیز احمد۔۔۔"
"میں کرلوں گا ماما۔۔۔ میں کروں گا۔" وہ بے اختیار ہی خود پر سے قابو کھو کر اونچی آواز میں بولا۔ عون اور ثانیہ سفینہ بیگم کی شقی القلبی دیکھ کر ششدر رہ گئے۔
"ماما پلیز۔۔۔ انف (بہت ہوگیا۔)" ایزاز اٹھ کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے لب و لہجے اور آنکھوں سے ناراضی جھلکتی تھی۔
سفینہ بیگم غصے سے بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے گئیں۔
"مجھے کیا ہے۔۔۔ پچاس لاکھ باپ نے اس کے اکاؤنٹ میں بھر دیا' پچاس تم لوگ لگادو۔ چاہے یہ بھی اسی کے اکاؤنٹ میں چلا جائے۔" وہ صاف لفظوں میں ایہا کے اغوا کو "ڈرامہ" کہہ گئی تھیں۔
ثانیہ نے گہری سانس بھری۔ بعض لوگ زندگی میں "آؤٹ آف کورس" سوالوں کی طرح آتے ہیں۔ آپ نے زندگی میں جتنا بھی تجربہ حاصل کیا ہو' وہ سارا ان کے سامنے فیل ہو جاتا ہے۔ ساری کی ساری تیاری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔
"کل شام کو رقم پہنچانی ہے۔ جگہ وہ کل بتائے گا۔ بس تم لوگ دعا کرو کہ وہ لوگ۔۔۔"
معیز بہت دیر کے بعد بولا تو شدت جذبات سے اس کی آواز گلے میں اٹک گئی۔
مگر وہ تینوں جانتے تھے کہ کیا دعا کرنی ہے۔



سلطانہ "پچاس لاکھ" پہ بہت خوش نہیں تھی۔
"اتنی بڑی آسامی ہے تیرا جمائی' پچاس لاکھ کیا مانگنے بیٹھا تھا اس سے۔۔۔"
وہ پچاس لاکھ پہ پہلے خوش ہوئی تھی' مگر جب سنا کہ **معیز فورا"** مان گیا تو اس کی خوشی کو پچھتاوا بننے میں دیر نہیں لگی۔
مراد نے اسے گھورا۔ پیار سے گالی دی۔
"اری۔۔۔ کبھی لاکھ بھی اکٹھا دیکھا ہے تو نے۔ ایسے منہ بنا رہی ہے جیسے پچاس لاکھ تو تیرا باپ واسکٹ میں ڈال کے پھرا کرتا تھا۔"
"دو کمینے۔۔۔ یہ سوچ کہ جو ایک ہی ملے میں پچاس لاکھ دینے پہ راضی ہوگیا ہے' کیا وہ ایک کروڑ نہ دیتا؟" سلطانہ کی آنکھیں چمکیں۔
"بس بس۔۔۔" مراد نے ہاتھ اٹھایا۔
"ناشکری مت بن۔۔۔ میرا تو دل اچھل اچھل کے حلق میں آ رہا تھا۔ پیسے والا بندہ ہے۔ عزت سے بات کر رہا ہے تو میں بھی حد میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ ابھی وہ پولیس سے ریڈ ڈلوانی شروع کردے تو تھانے میں ہم دونوں کو الٹا لٹکا کے چھترول ہو ہماری۔"
سلطانہ نے منہ بنایا۔
"تو رہیو سدا ڈرپوک۔۔۔ ایک ہی بار لمبا ہاتھ مارتا تو ہم دونوں کہیں باہر ملک نکل لیتے۔"
"اری بدبخت۔۔۔ تھوڑا مانگا تب ہی خوشی سے دے رہا ہے۔ اس کی پہنچ سے باہر مانگتا تو مجبورا" وہ پولیس کو انوالو کرتا۔ سمجھتی نہیں ہے۔ کم عقل عورت۔" وہ زچ آگیا تھا۔

"اور فکر نہ کر۔ پچاس لاکھ میں ہم دونوں تین چار ہنی مون منا سکتے ہیں۔ دبئی اور ملائیشیا کا چکر تو لگوا ہی دوں گا اپنی رانی کو میں۔"

مراد نے شوخی سے کہا تو سلطانہ کے ہونٹوں کی لالی بھی ذو معنی انداز میں پھیلنے لگی۔

ساتھ والے کمرے میں بان کی چارپائی پہ نیم بے ہوش پڑا وجود بے بسی اور بے کسی کی مثال تھا۔



معیز نے کھانا بھی برائے نام ہی کھایا۔ ایراز کے کہنے پر زارا نے سفینہ بیگم کو ایہا کے متعلق کوئی بھی الٹی سیدھی بات بالخصوص معیز کے سامنے کرنے سے منع کر دیا تھا۔

وہ محض سفینہ بیگم کا دل رکھنے کو ساتھ بیٹھ گیا تھا' ورنہ اتنے دنوں سے تو گویا وہ بس جینے کے لیے ہی کھا رہا تھا۔

اسے کرسی گھسیٹ کر اٹھنے کو پر تولتا دیکھ کر سفینہ بیگم نے سرسری انداز میں بات شروع کی۔

"سفیر آگیا ہے پاکستان۔۔۔ اب ہمیں شادی کی تاریخ دے دینی چاہیے' تمہارا کیا خیال ہے معیز۔۔۔؟"

زارا کا جی چاہا پلیٹ اٹھا کے اپنے سر پہ مار لے۔ بے اختیار معیز کا چہرہ دیکھا۔ جہاں پہلے حیرت اور پھر اذیت پھیل گئی تھی۔

"جیسا آپ مناسب سمجھیں ماما۔" وہ خود کو سنبھال کر بے تاثر لہجے میں بولا۔

"تو۔۔۔ ویسے ساری دنیا کی فکریں سر پہ لیے پھرتے ہو اور تمہاری بہن کے لیے "مناسب" میں سوچوں۔" انہوں نے تیکھے انداز میں کہا۔

"تھوڑے دن انتظار کر لیں ماما! ابھی ویسے ہی ایک ایشو چل رہا ہے۔ اسے سولو (حل) ہو جانے دیں پہلے۔" ایراز نے تنبیہی نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"دوجہنم میں جائے وہ ایشو۔ میری بیٹی کی پوری زندگی کا معاملہ ہے۔"

وہ بگڑ کر بولیں۔ معیز کے چہرے پر تکلیف کے آثار پیدا ہوئے' مگر وہ بنا کچھ بولے وہاں سے چلا گیا تھا۔

"وہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے ماما۔" زارا زچ آگئی۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"ماں باپ نالائق نکلیں تو اولادیں یوں ہی رلتی ہیں۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ ان کا اپنا ہی فلسفہ تھا۔

"بہرحال۔۔۔ میں اگلے ماہ کی کوئی تاریخ دے دوں گی مسز احسن کو۔ وہ تو شکر ہے تم نے سفیر سے بات کلیئر کر لی' ورنہ رباب تو خوب ہی طوفان مچاتی۔" انہوں نے زارا کو دیکھا۔

"ماما پلیز۔" وہ رونے والی ہو گئی۔

"میری وجہ سے بھائی کی زندگی پرابلم میں آئی ہے۔ جب تک ایہا مل نہیں جاتی میری شادی کا سوچیے بھی مت۔ میں بھائی سے نظر نہیں ملا پاؤں گی۔"

"شٹ اپ زارا! تم لوگوں نے تو زندگی کو مذاق اور بچوں کا کھیل بنا لیا ہے۔ اس گھر میں وہی ہو گا جو میں چاہوں گی۔ خبردار جو کسی نے مجھے فضول مشورے دینے کی کوشش کی ہو تو۔۔۔" وہ بھڑک اٹھی تھیں۔

"اپنے لفظوں پہ غور کریں ماما! اور پھر اپنے عمل پر۔۔۔ کیا آپ بھی کسی کی زندگی کو مذاق اور کھیل نہیں سمجھ رہیں؟" ایراز نے تلخی سے کہا تھا۔

"میں نے اسے آدھی رات کو بھاگنے کو نہیں کہا تھا۔" وہ بگڑ کر بولیں۔

"تم میں نے تو کہا تھا۔۔۔ وہ بھی آپ کی خاطر۔" زارا رونے لگی۔ انہیں مزید غصہ آیا۔

"ایک سے ایک ڈرامہ بھرا پڑا ہے میرے گھر میں۔ بھائی اس بھگوڑی کی طرف دار اور بہن اس سے بڑھ

کے۔" ان کے لفظی جناؤ پر تملا کر چمچہ پلیٹ میں پٹخ کر ایراز اٹھ کے ہی چلا گیا۔
"جاؤ جاؤ.... مگر ہوگا وہی جو میں نے طے کر لیا ہے۔"
وہ پیچھے سے اونچی آواز میں بولیں۔ تو زارا کا جی چاہا میز پہ ماتھا ٹکا کے رونا شروع کر دے۔ بڑبڑاتے ہوئے وہ اپنی پلیٹ میں سالن نکالنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

ہجر کی رات کاٹنے والے
کیا کرے گا اگر صبح نہ ہوئی؟

کوئی مجسم تڑپ اور بے قراری کو دیکھنا چاہتا تو اس رات معیز احمد کو دیکھتا اور ان دونوں کیفیات کو پالیتا۔ فجر کی نماز کے بعد اس کا سجدہ طویل اور دعا میں جذب تھا۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی....
وہ موبائل کو فل چارج کیے اپنے پاس رکھے ہوئے تھا۔ کبھی بھی اغوا کار اس کی ابیہا سے بات کروا سکتے تھے۔ رقم وہ پہلے ہی نکلوا چکا تھا۔ اب تو بات اغوا کاروں کی پیشہ وارانہ ایمان داری پر ٹھہری تھی کہ وہ کیا کرتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

"ماں باپ ہمیشہ اولاد کے لیے قربانیاں دیتے اور ان کی زندگی بناتے چلے آئے ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر اولاد کے نصیب میں یہ اعزاز آجائے۔ اب اگر تیری وجہ سے میری زندگی میں تھوڑی بہت خوش حالی آرہی ہے تو روڑے مت اٹکانا۔"
مراد صدیقی بڑی نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ بھاری پپوٹے اٹھا کر بمشکل ابیہا نے اسے دیکھا اس کے لفظوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔
"دو منٹ بات کراؤں گا تیرے گھر والے سے تیری۔ بس اسے اپنی خیریت کی تسلی دے دینا اور یہ بھی کہہ دینا کہ شرافت سے روپیہ میرے حوالے کردے۔ اور خبردار۔ اگر پولیس کو بھنک بھی پڑنے دی ہو تو۔"
ابیہا نے بے یقینی سے مراد صدیقی کو دیکھا۔
"اسے یہ مت بتانا کہ تو کس کے پاس ہے۔ بس اپنی خیریت کا یقین دلا دینا اور کہنا کہ رقم لے کر اکیلے آئے۔ ورنہ ساری عمر تجھے ڈھونڈتا ہی رہے گا۔"
اس نے دھمکایا۔ خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے ابیہا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
مراد نے سلطانہ کو اشارہ کیا تو وہ موبائل نکال کے لے آئی۔ اسے آن کر کے مراد کے حوالے کیا۔ اس نے معیز کا نمبر ملا کر موبائل ابیہا کی طرف بڑھایا۔ تو اس نے کپکپاتا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ مراد صدیقی اتنی مہربانی پر اتر آیا تھا کہ خود سے اس کی معیز سے بات کروا رہا تھا۔
"دھیان سے۔ ایک بھی لفظ کم یا زیادہ کیا تو پہلی گولی تیرے شوہر کو ماروں گا۔" موبائل کا اسپیکر آن کرتے ہوئے۔ مراد نے دھیمے سفاک لہجے میں کہا تو وہ پوری جان سے تھرا گئی۔

☼ ☼ ☼

ابیہا کے نمبر سے کال تھی۔ معیز نے جھپٹ کر موبائل اٹھایا اور فوراً" کال اٹینڈ کی۔
ایراز اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا۔

"ہیلو۔ ایمہا۔؟" معیز نے آس و نراس میں گھرتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔
"جی معیز۔ ایمہا بول رہی ہوں۔" دوسری طرف سے اس کا کپکپاتا ہوا بہت محتاط سا جواب آیا۔ تو معیز کو لگا اس کے وجود میں ٹھنڈک کی ایک لہر سی دوڑ گئی ہو۔
"کیسی ہو تم ایمہا۔ کہاں ہو۔ کون لوگ ہیں یہ۔؟" وہ ہلکا سا کھنکھاری۔
"میں بالکل ٹھیک ہوں معیز۔ یہ لوگ۔ جو ڈیمانڈ کر رہے ہیں اگر آپ وہ پوری کر سکتے ہیں تو ہی کیجئے گا۔"
وہ بولتے بولتے ایک دم کراہی۔ یوں جیسے اسے کسی نے ہاتھ مارا ہو۔ گونجتی آواز نے فوراً" معیز کو الرٹ کر دیا۔ یقیناً" ان لوگوں نے اسپیکر آن کر رکھا تھا۔
"اوکے۔ اٹس اوکے۔ میں نے رقم کا بندوبست کر لیا ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔
"تم صرف مجھے وقت اور جگہ بتا دو۔"
مراد نے ایمہا سے موبائل لے کر اسے وقت اور جگہ بتائی۔

☆ ☆ ☆

عون جلدی اٹھا۔ آج وہ ریسٹورنٹ کے بجائے سیدھا معیز کی طرف جانے والا تھا۔
"معیز بھائی کی امی تو اللہ کی پناہ۔ کس قدر پتھر دل ہیں۔" ثانیہ نے جھرجھری سی لی۔ اس نے سفینہ کے متعلق سن تو رکھا تھا مگر بالمشافہ پہلی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو ان کی شقی القلبی جھنجھوڑ کے رکھ گئی۔
عون گہری سانس بھر کے شرٹ پہننے لگا۔
"ویسے عون۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب آئی اور اس کا ہاتھ ہٹا کر اس کی شرٹ کے بٹن خود بند کرتے ہوئے تاسف سے بولی۔
"ہم جب اعوذ باللہ پڑھتے ہیں تو اس کا مطلب ہے "میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان مردود کے شر سے۔" یعنی ہر بری شے سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ مانگی جاتی ہے تو ایسے لوگ کس کٹیگری میں آئیں گے جن سے بچنے کے لیے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔؟"
"بس خدا معاف ہی کرے۔ اللہ سے دعا مانگتے رہنا چاہیے۔ دل کی نرمی کی۔"
وہ مسکرایا۔ پھر بغور اسے دیکھتے ہوئے شرارت سے بولا۔
"ویسے شادی کے بعد تم کافی حسین ہو گئی ہو۔" ثانیہ نے آخری بٹن بند کر کے مسکراتے ہوئے اس کے شانوں پہ دونوں ہاتھ رکھے۔
"یعنی یہ کریڈٹ بھی تمہیں ہی گیا۔"
عون نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر چھیڑتے ہوئے بولا۔
"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ "مجھ سے" شادی کرنے کے بعد تم حسین ہو گئی ہو۔"
"مگر میں تمہارے "دل" کی خوب سمجھتی ہوں۔" ثانیہ نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا تو عون نے دونوں ہاتھ اس کی کمر پر جما دیے۔ ذرا سا جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"اچھا۔ تو اب کیا چل رہا ہے میرے دل میں۔ ذرا بتاؤ تو مس قیافہ شناس۔"
ثانیہ نے لمحہ بھر اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر فوراً" ہی اس کے ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے شرارت آمیز سنجیدگی سے بولی۔ "اونہوں۔ عون عباس۔ بری بات ہے۔"
"ارے۔ سنو۔ ادھر تو آؤ۔" وہ اس کی طرف لپکا۔

"خبردار۔ سیدھے جائیں معیز بھائی انتظار کر رہے ہوں گے۔" وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے مسکرائی تھی۔ عون دل مسوس کر رہ گیا۔ موبائل اٹھایا اور گہری سانس بھرتے ہوئے معیز کو کال کرنے لگا۔



"تم لوگ سمجھ نہیں رہے۔ میں زیرو پرسنٹ بھی رسک نہیں لینا چاہتا۔ اس نے مجھے اکیلے آنے کو کہا ہے تو میں اکیلے ہی جاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا۔" وہ لوگ ایبہا کو نقصان پہنچائیں۔"
عون اور ایراز کو معیز نے صاف لفظوں میں انکار کردیا تھا۔
"اٹس اوکے۔ میں سمجھتا ہوں۔ مگر ہم لوگ آس پاس رہ کے آپ پہ نظر تو رکھ سکتے ہیں۔ ان لوگوں پہ اندھا اعتبار بھی تو نہیں کیا جاسکتا نا۔" ایراز جذباتی ہو کر بولا۔
"میں کہتی ہوں۔ ضرورت ہی کیا ہے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کی معیز۔"
سفینہ بیگم زارا کے ہمراہ آئی تھیں۔ زارا نے بے اختیار ان کا بازو تھاما۔
یہ اشارہ تھا۔ اب بس۔ چپ۔ مگر سفینہ بیگم نے اس کے ہاتھ کے تنبیہی دباؤ کو نظر انداز کرتے ہوئے معیز کو تیز نظروں سے دیکھا۔
"اللہ بہتر کرے گا آنٹی۔ آپ بس دعا کریں۔ ان لوگوں کو صرف روپے سے غرض ہے۔" عون نے نپے تلے انداز میں بات کی۔
"وہی تو۔ انہیں کسی کی جان کی کیا پرواہ یہ کیوں اس بے کار سی لڑکی کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔ وہ لوگ اسے نقصان پہنچادیں تو؟"
ان کی آواز بھیگنے لگی۔ یہ ایک ماں کی محبت تھی۔ مگر صرف اپنے بچوں کے لیے تھی' اس لیے قطعی متاثر کن نہیں تھی۔
ماں تو ہر بچے کے لیے "ماں" بن جاتی ہے۔
معیز لب بھینچے خاموش بیٹھا تھا۔ جامد اور سرد۔
"کچھ نہیں ہوگا ماما۔ آپ فکر نہ کریں۔"
ایراز کو افسوس تھا۔ اس معاملے کی تو بھنک بھی سفینہ بیگم کو نہیں پڑنا چاہیے تھی۔ خوامخواہ ہی وہ ذہن پہ سوار کرلیتیں تو ذہنی دباؤ کا شکار ہو سکتی تھیں۔
"کیسے فکر نہ کروں۔ میری تو ساری عمر کی کمائی ہی تم تینوں ہو۔" وہ تیز لہجے میں بولیں۔
"رقم کا کیا ہے آنٹی۔ وہ تو میں بھی انہیں پہنچا سکتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔"
عون نے معیز کو خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے بات گھمائی تو انہوں نے ناقدانہ نظروں سے عون کو دیکھا۔
"ہوں۔ یہ بہتر ہے۔ تمہارے ساتھ تو ان لوگوں کی کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تمہیں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچائیں گے وہ۔" وہ اپنے آپ سے آگے کسی اور کے متعلق سوچنے کی عادی نہیں تھیں۔
"آپ کی میڈیسن کا ٹائم ہو رہا ہے ماما۔" زارا انہیں بہانے سے اٹھا کے لے گئی تھی۔
"میری نافرمانی مت کرنا معیز۔ پچاس لاکھ تمہارا صدقہ سمجھ کے دے رہی ہوں۔ حالانکہ میں جانتی ہوں یہ بھی اس لڑکی کی کوئی چال ہی ہوگی۔" وہ جاتے جاتے بھی باز نہیں آئی تھیں۔
"بڑھاپے میں والدین ایسی ایسی باتیں کر جاتے ہیں کہ انہیں ان کا "بچگانہ پن" سمجھ کر نظر انداز کرنے میں ہی بھلائی ہوتی ہے۔ میرے ابا بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ جنہیں ماننا ممکن ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔"

عون نے ماحول کی خاموشی کو شگفتگی سے توڑا تھا۔ پھر وہ تینوں رقم پہنچانے اور ایبہا کی واپسی کے سارے عوامل کو ڈسکس کرنے لگے۔



ایبہا کو جگانے کی کوشش میں ناکام ہو کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے مراد کے ہاتھ جو چیز لگی اس نے مراد کا دل عجیب سے وہم کا شکار کر دیا۔ وہ بہ عجلت باہر نکلا۔

"سلطانہ۔ سلطانہ۔"

اونچی آواز میں پکارا تو دیوار کے ساتھ لٹکے آئینے میں جھانک کر کس کے چٹیا کرتی سلطانہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا۔ نکل آئی سوا کروڑ کی لاٹری۔؟"

"لاٹری کی بچی۔" وہ دانت پیستا اس کی پشت پہ آکھڑا ہوا۔ "ایبہا اٹھ کیوں نہیں رہی۔ مدہوش ہو کے سو رہی ہے۔ ابھی لے جانا تھا اسے ساتھ۔" کڑے لہجے میں استفسار کیا تو وہ گڑبڑائی۔

"مجھے کیا پتا۔"

"پر مجھے پتا ہے۔ کمینی۔ حرام کی۔"

اس نے دانت کچکچاتے ہوئے سلطانہ کی چٹیا پکڑی۔ جواباً اس نے اسے ایسا رولا ڈالا کہ الامان الحفیظ۔

مراد نے اس کے سامنے مٹھی کھولی۔ جس میں ایک انجیکشن کی خالی شیشی اور سرنج موجود تھی۔

"الو کی پٹھی۔ انجکشن دیتی رہی ہے اسے۔" اس کا دماغ گھوما ہوا تھا۔

سلطانہ نے بمشکل اس کی گرفت سے اپنے بال چھڑائے۔ پھر بھی وہ دو چار بھاری ہاتھ اسے مار ہی چکا تھا۔

"تو اور کیا کرتی۔ تمہاری بے غیرت اولاد ساری رات بین کر کے میرے سر میں درد کر دیتی تھی۔ خود ڈیوٹی دیتے تو پتا چلتا۔"

وہ اچھل کر اس کی پہنچ سے دور ہوتے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تو اسے نشے کے ٹیکے لگانے شروع کر دیتی۔"

وہ اتنی زور سے چیخا کہ گلے میں خراش پڑ گئی۔ وہ کھانسنے لگا۔

"نیند کے انجیکشن لگاتی رہی ہوں ہیروئن کے تو نہیں تھے۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

"آج اسے اس کے شوہر کے حوالے کرنا تھا۔ اور وہ۔"

"تو اچھا ہے نا۔ ٹیکسی میں ڈال کے لے جا۔ شور بھی نہیں کرے گی۔ اور نہ ہی کوئی مسئلہ کھڑا ہو گا۔"

سلطانہ نے زور سے کہا۔ تو بات مراد کے دل کو لگی۔ اس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کے سلطانہ کو طرارہ آیا۔ اس نے جھک کر ٹب میں پڑا مگا اٹھایا اور مراد کو دے مارا۔

"ادھر آ میری شہزادی۔ ایسے ہی۔ تجھے تو پتا ہے یوں ہی غصہ آجاتا ہے مجھے۔ ورنہ تو تو جان ہے میری۔" مراد کا غصہ لمحوں میں بھاگا تھا۔

سلطانہ غصے سے سر جھٹک کر آئینے کی طرف مڑ گئی۔

"مر گئی تیری شہزادی۔ جب دل چاہا ہاتھ پکڑ لیا اور جب جی چاہا ہاتھ منہ پہ دے مارا۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"چل چھوڑ۔ دعا نہیں کرے گی۔ تیرے لیے کمائی کرنے جا رہا ہوں۔"

مراد نے پیچھے سے اسے بانہوں کے گھیرے میں لیا۔ مگر وہ مصنوعی غصے سے منہ بنا کر اسے جھٹکتی رہی اور مراد

چاپلوسانہ سرگوشیوں میں اسے مناتا رہا۔



وہ دیے ہوئے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ اپنی گاڑی سائیڈ پہ کھڑی کر کے وہ فون کرنے والے کے بتائے گئے طریقے کے مطابق فٹ پاتھ پہ پان کی دکان کی داہنی سائیڈ پر جا کھڑا ہوا۔

مراد صدیقی اپنا حلیہ بدلے وہاں سے کافی دور ٹیکسی روک کر لاک کرنے کے بعد معیز کو دور سے چیک کر رہا تھا۔ کہ کہیں وہ پولیس کو تو ساتھ نہیں لایا ہوا۔ پھر قدرے سائیڈ پہ ہو کر مراد نے معیز کو کال ملائی۔

"اپنی گاڑی کا لاک کھول دو۔ میرا آدمی آکے رقم لے جائے گا۔" وہ رعب دار انداز میں بولا۔

"ایبہا کہاں ہے؟ اس سے بات کراؤ میری۔"

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ دیر کرو گے تو نقصان کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔" مراد نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سختی سے کہا۔

"او کے۔" معیز بے بس ہونے لگا۔ اس نے جیب سے ریموٹ نکال کر دور ہی سے گاڑی ان لاک کر دی تھی۔

ذرا فاصلے پر ایراز اور عون بھی یوں ہی راہ گیروں کے سے انداز میں موجود تھے اور معیز کی گاڑی پہ نظر رکھے ہوئے تھے۔

"اب تم پان والی دکان پہ جاؤ۔ اور اس سے دو میٹھے پان بنواؤ۔ اور خبردار جو پلٹ کے دیکھا ہو تو۔"

اسے پچکار کے کہتے ہوئے مراد نے لائن کاٹ دی تھی۔ معیز بے بس سا پان والی دکان کی طرف مڑ گیا۔ ایراز اور عون نے ایک ادھیڑ عمر شخص کو تیزی سے معیز کی کار کی طرف بڑھتے دیکھا۔

"میرے خیال میں یہ اغوا کاروں میں سے کوئی ہے۔" عون نے تیزی سے کہا۔ ان دونوں کی نظریں مراد صدیقی پر جمی ہوئی تھیں۔

"اکیلا لگ رہا ہے بظاہر۔" وہ معیز کی گاڑی میں سے بریف کیس نکال کر اندر ہی کھول کر چیک کرنے کے بعد اب تیزی سے پلٹ گیا تھا۔ معیز جب تک پان بنوا کر پلٹا تب تک گاڑی کے اردگرد کسی ذی نفس کا نشان تک نہ تھا۔

وہ بھاگتے ہوئے اپنی گاڑی تک آیا۔ شاید وہ ایبہا کو چھوڑ گیا ہو۔ مگر گاڑی میں کوئی نہیں تھا۔ بریف کیس بھی نہیں۔

وہ پاؤں باہر زمین پہ ٹکائے اپنی سیٹ پر ڈھے سا گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں تیزی سے ایک طرف بڑھتے مراد صدیقی کے پیچھے تھے کافی پیچھے۔ مگر مستقل۔

"اس نے ایبہا کو نہیں چھوڑا ہے۔" عون نے کہا۔

"ابھی پتا چل جائے گا۔ یہ آدمی کہیں جا کے تو رکے گا۔" ایراز نے اشارہ کیا۔

مراد صدیقی ایک سنسان سڑک پہ نکل آیا اور اب وہ بنا ادھر ادھر دیکھے اپنی ٹیکسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا ناچنے گانے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس بے وقوف معیز احمد نے اتنی آسانی سے پچاس لاکھ حوالے کر دیے تھے۔

(اگر تم روپے لے کر ایبہا کو واپس نہ کرو تو ہماری اگلی قسط بھی نکل سکتی ہے اس کے شوہر کی جیب سے) اسے سلطانہ کی بات یاد تھی۔ جسے اب تک تو مراد نے رد کر دیا تھا مگر اب جبکہ بھاری رقم ہاتھ لگی تو اسے سلطانہ کی کمینگی

میں دم نظر آنے لگا۔

وہ چابی لگا کر دروازہ کھول کر ٹیکسی میں بیٹھا اور بریف کیس کھول کے دیکھنے لگا۔

عون اور ایراز تیزی سے وہاں پہنچے۔ پچھلی سیٹ پہ ساکت آنکھیں موندے ڈھلکی گردن کے ساتھ بیٹھی ابیہا پہلی نظر میں ہی انہیں دکھائی دے گئی تھی۔

عون نے لمحوں میں فیصلہ کیا۔ اگلے ہی پل اس نے دروازہ کھول کر گریبان سے پکڑ کر مراد صدیقی کو باہر گھسیٹ لیا تھا۔

"گگ۔ گولی ماردوں گا۔ چھوڑ دو مجھے۔"

وہ بوکھلا گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا' ایراز اور عون تمام تر غصہ اس پر نکالنے کے لیے اس پر پل پڑے۔ اور مراد صدیقی کوئی پیشہ ور اغوا کار تو تھا نہیں۔ لمحوں میں گھٹنوں کے بل ڈھے گیا تو ایراز نے اسے قابو کرلیا۔ عون تیزی سے معیز کو کال ملانے لگا۔



"آپ کی پیشنٹ اب ٹھیک ہیں۔ ہوش میں ہیں۔" نرس نے آکر مژدہ ہی تو سنایا تھا۔ معیز کی رگ سے پے میں بڑے طویل عرصے کے بعد سکون کی لہریں دوڑنے لگیں۔

عون اور ایراز نے بھی سکھ کی سانس لی تھی۔ عون کے اشارے پر وہ کمرے کی طرف بڑھا۔

ابیہا کی بے سدھ سی کیفیت دیکھ کر وہ اسے سیدھا اسپتال لے آیا جبکہ ایراز اور عون نے مراد صدیقی کو سیدھا تھانے پہنچایا تھا۔

معیز تو ٹیکسی میں اغوا کار کے روپ میں مراد صدیقی کو دیکھ کر ششدر ہی رہ گیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مراد صدیقی دوبارہ ایسی گراوٹ دکھا سکتا ہے۔ مگر بہر حال اس کی پہلی ترجیح ابیہا کو اسپتال پہنچانا تھا۔

"انہیں نیند کے انجکشنز دیے جاتے رہے ہیں اور چوٹوں کے نشان بھی ہیں چہرے اور بازی پر۔"

لیڈی ڈاکٹر نے پہلے تفصیلی چیک اپ کے بعد معیز کو بتایا تو وہ دکھ کے حصار میں گھرنے لگا۔

معیز دروازہ کھول کے کمرے میں داخل ہوا۔ تو وہ آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی تھی۔ دوسرے بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ کھٹکے کی آواز پر ابیہا نے بے اختیار بازو ہٹا کر آنے والے کو دیکھا۔ ہلکی بڑھی ہوئی شیو اور رف سے حلیے میں وہ معیز احمد ہی تھا۔ ابیہا کا دل پوری قوت سے سکڑ کر پھیلا۔ اک محشر تھا جو رگ جان میں برپا ہو گیا تھا۔

کھونے کے بعد پالینا کیسا ہوتا ہے۔ وہ دونوں ہی اس کیفیت کے زیر اثر تھے۔ معیز نے آگے بڑھ کے اس کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اس لمس میں اپنائیت اور ہمدردی سمیت محبت کے سارے رنگ تھے۔ اور ابیہا کی تو گویا روح تک اس مسیحائی کی تاثیر اتری۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں موندیں تو آنکھوں کے کونوں سے آنسو بہنے لگے۔

شرمندگی' ندامت' پچھتاوے اور دکھ کا گہرا احساس۔ ایک تکلیف کی گہری کاٹ تھی جو وہ اپنے دل کے اندر تک محسوس کر رہا تھا۔

کیا کیا حالات نہیں سہے تھے [illegible] اس لڑکی نے۔

اس سب نے اگر اسے [illegible] کرنے [illegible] تو معیز نے [illegible] سے سکھ کے ہنڈولوں میں جھلایا تھا۔

"میں جانتا ہوں ایبہا! اگر میں کھلے دل اور ذہن سے کام لیتا تو میرے نکاح میں آنے کے بعد تمہاری تمام مشکلات ختم ہو جاتیں۔ ایم سوری تمہاری ہر تکلیف کی وجہ میں بنا۔" وہ بوجھل لہجے میں بولا مگر ایبہا کے پاس آنسوؤں کے علاوہ اور کوئی جواب نہ تھا۔

معیز نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے اس کی بند آنکھوں کے کونوں سے بہتے آنسوؤں کو پونچھا اس کا چہرہ معیز کے ہاتھوں کی گرفت میں تھا۔

"لیکن یقین کرو ایبہا! اب تمہاری ہر آزمائش ختم ہو گئی ہے۔" وہ بے حد نرمی سے بولا تو ایبہا نے بھیگتی پلکیں وا کیں۔ معیز نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر دکھ سے بولا۔

"بہت بڑی غلطی کی تم نے ایبہا۔ کوئی ایسے بھی گھر سے نکلتا ہے۔ زارا نے بے وقوفی میں ایک بات کر دی تو تم نے بے وقوفی کی انتہا ہی کر دی۔ ایک لمحے کو بھی میرے متعلق نہیں سوچا۔" وہ تاسف سے بولتے بولتے رکا۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جذب سے بولا۔

"میں جو ہار مان گیا تھا تمہارے آگے۔"

"میں آپ کا گھر توڑنا نہیں چاہتی تھی۔" وہ پھر سے رو دی

"میرا گھر تم سے ہے بے وقوف لڑکی! میں تو دیر سے یہ بات سمجھا مگر تم تو پہلے سے ہی جانتی تھیں۔" وہ اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔ پھر قدرے توقف کے بعد تاسف سے کہنے لگا۔

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہارے اغوا میں تمہارے فادر کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایراز اور عون نے ہمت کر لی ورنہ میں تو تمہارے معاملے میں ایک فیصد بھی رسک لینے کو تیار نہ تھا۔"

ایبہا کے آنسو ٹھہر گئے۔ شرمندگی کی تند و تیز لہر اسے سرتاپا بھگو گئی۔

وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ مراد صدیقی نے فون پر ہی معیز سے سارا معاملہ طے کیا ہے اور سامنے آئے بغیر ہی رقم وصول کر کے اسے معیز کے حوالے کر دیا ہے۔ مگر یہاں تو اور ہی کہانی نکلی تھی۔

معیز نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگ سے اس کی سوچ کو فی الفور پڑھ لیا۔

"وہ اب پولیس کسٹڈی میں ہے اس کی نشان دہی پر اس کی ساتھی عورت بھی گرفتار ہو گئی ہے۔" معیز اس کے چہرے پہ چھائے تکلیف دہ تاثرات دیکھ رہا تھا۔

"اگر تم کہو گی تو انہیں معاف کر دیا جائے گا۔ لیکن اگر مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گا کہ ان دونوں کو ان کے کیے کی ہر ممکن سزا ملنی چاہیے' تاکہ آئندہ وہ کبھی ایسے جرم کا سوچ بھی نہ سکیں۔"

معیز نے نرمی سے اپنی شہادت کی انگلی سے اس کی پیشانی کے مندمل ہوتے زخم کو چھوا۔ اور پھر بے ساختہ جھک کر اس کی پیشانی پہ لب رکھ دیے۔

ایبہا کی سانس تو کیا دھڑکن بھی تھم سی گئی۔

"میں جب جب تمہارے زخموں کو دیکھتا ہوں تب تب خود کو ملامت کرتا ہوں کہ تمہاری ان سب تکلیفوں کی وجہ میں خود ہوں۔"

وہ دکھ سے کہہ رہا تھا۔ ایبہا نے بدقت تمام ہلکا سا نفی میں سر ہلایا۔ معیز کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"مگر اب بس۔ میں اپنی تمام تر ناانصافیوں کا مداوا بڑے انصاف سے کرنے کی کوشش کروں گا۔ بس تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔" ایبہا کی ہر پریشانی' ہر دکھ جیسے اڑن چھو ہونے لگا۔

"تمہیں بھوک لگی ہو گی۔ میں ڈاکٹر سے پوچھتا ہوں تمہارے کھانے کے متعلق۔ ثانیہ بھی بس پہنچتی ہی

ہوگی۔"
وہ نرمی سے اس کا رخسار سہلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایمہا کے ہونٹوں پر پہلی بار بے ساختہ مسکراہٹ آئی تھی۔



"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا معیز! میں زارا کی رخصتی کی تاریخ دینے لگی ہوں کل اور تم اس گندگی کو پھر سے اٹھا کے اس گھر میں لا رہے ہو۔" سفینہ نے تلملا کر غصے سے کہا تو معیز کو بھی غصہ آگیا۔
"ماما پلیز۔ میری بیوی ہے وہ۔ اس کے لیے ایسے الفاظ استعمال مت کریں۔"
"آہاہ۔ تو اب وہ تمہاری بیوی ہوگئی ہے۔" اس کے تیز لہجے نے سفینہ کو بھی تلخ بنا دیا۔ "کل تک تو تم اسے طلاق دے کر اس کے لیے بر ڈھونڈنے کی مہم پر نکلنے والے تھے۔"
"وہ گزرا کل ہے ماما اور اس پر مجھے شرمندگی بھی ہے۔ لیکن میرے لیے حال زیادہ اہم ہے ماما! جس میں ہم جی رہے ہیں۔ اور مجھے کیسی زندگی جینا ہے یہ فیصلہ میں کر چکا ہوں۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔
"بکواس مت کرو معیز۔ زارا کا گھر برباد کرو گے کیا؟ رباب کو کیا کیا خواب نہیں دکھائے تم نے۔" انہوں نے اب اسے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کے لیے زارا کا حوالہ دیا۔ مگر وہ مطمئن تھا۔
"اس کی آپ فکر مت کریں۔ رباب کو ساری حقیقت بتا دی ہے میں نے۔ اب وہ اپنی زندگی کے لیے بہتر فیصلہ کرے گی۔ اسے ایک شادی شدہ آدمی سے کوئی دلچسپی نہیں۔" وہ اندر ہی اندر تلملائیں۔
"میں اس لڑکی کو قبول نہیں کروں گی معیز۔"
"میں تو کر چکا ماما۔ اور میری خوشی کے لیے آپ کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔ ورنہ مجھے بہت افسوس ہوگا۔" معیز نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا تو سفینہ اسے دیکھتے ہوئے اس کا لہجہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ بہت اٹل اور قطعی انداز تھا اس کا۔
"اب آپ رد کریں گی تو ہم دونوں کو ماما۔ اس گھر سے نکالیں گی تو اس اکیلی کو نہیں۔"
"معیز۔!" وہ سناٹے میں رہ گئیں۔ بدقت تمام دکھ سے بولیں۔ "اب تم اس دو کوڑی کی لڑکی کی خاطر گھر چھوڑو گے؟"
"یہ آپ پہ ڈپینڈ کرتا ہے ماما! آپ نکالیں گی تو ہم چلے جائیں گے۔ کھلے دل سے ویلکم کریں گی تو تاعمر آپ کی خدمت کریں گے۔" اس نے پھیکے انداز میں مسکراتے ہوئے ساری بات ان ہی پر چھوڑ دی تھی۔
"جاؤ بیٹا! ٹھیک ہے جو مرضی میں آئے کرتے پھرو۔ باپ رہا نہیں سر پہ۔ ماں کی خاک سنو گے تم اب۔" وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔ کلیجہ تو جل کے خاک ہوگیا تھا۔
اس روڑی کے پتھر سے اتنی محبت۔ ہمیشہ ماں کی محبت کے ہاتھوں بلیک میل ہو جانے والا معیز احمد اتنا بے مروت کیسے ہوگیا ایمہا مراد بلکہ نامراد کے لیے۔ ان کی سمجھ سے بالاتر تھی یہ بات۔
معیز نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے۔ اور انہیں یقین دلاتے ہوئے بولا۔
"آپ کی مرضی ہی تو چاہ رہا ہوں۔ کیا کمی ہے ایمہا میں ماما۔ پڑھی لکھی ہے ہماری اپنی فیملی میں سے ہے۔ اور پھر میرے نکاح میں ہے۔ کسی لو میرج تو نہیں کرنے جا رہا ہوں۔"
سفینہ لڑکھڑا کر صوفے پر ڈھیر ہوگئیں اور سر ہاتھوں میں تھام لیا۔
وہ بڑے اطمینان کے ساتھ ان کی اجازت کے بغیر ایمہا کو پھر سے انیکسی میں لے آیا تھا۔ اور اب یقیناً "وہ بہت جلد معیز کے کمرے میں بھی آ جانے والی تھی۔ مجھے اس سے پہلے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ ان کا دماغ تیزی سے چلنے

لگا۔

"اس سلسلے میں رباب سے مدد لی جاسکتی ہے۔ آخر کو اسی نے اس گھر کی بہو بننا ہے۔" دل ہی دل میں طے کرتے ہوئے انہیں قدرے اطمینان ہوا۔ ابھی کچھ پتے ان کے ہاتھ میں تھے۔

اور شاید۔ ان ہی میں ترپ کا پتا بھی شامل ہوتا" کون جانے۔



رباب کو پتا چلا کہ گھر والے زارا اور سفیر کی شادی کی تاریخ لینے جارہے ہیں تو وہ تلملا اٹھی۔

"بھائی! آپ کو عجیب نہیں لگا۔ آپ کے سسرالیوں نے تو جھوٹ کے انبار لگادیے شادی سے پہلے ہی۔" سب کے بیچ رباب نے تلخی سے کہا تو سفیر نے تحیر سے رباب کو دیکھا۔

امی کو غصہ آیا۔ "یہ کون سا طریقہ ہے بھائی سے بات کرنے کا رباب۔ تمیز نہیں ہے تمہیں۔"

"تو کیا غلط کہہ رہی ہوں میں۔ ان کے تو سالے کا کریکٹر ہی مشکوک ہے۔ پہلے تو کچھ بتایا نہیں۔ اب ایک لڑکی ایک دم سے اس کی منکوحہ نکل آئی۔" وہ ڈھٹائی سے تمسخر بھرے انداز میں بولی۔

"وہ اس کا ذاتی معاملہ ہے رباب۔" سفیر نے نرمی سے رباب کو ٹوکا۔ وہ امی اور ابو کو مختصراً" معیز اور ایبہا کے نکاح کا قصہ بتا چکا تھا۔

"اور پھر بیاہ کے زارا نے گھر میں آنا ہے اس کی فیملی نے نہیں۔ زارا بہت اچھی اور سمجھ دار لڑکی ہے۔" امی نے تنبیہی نظروں سے رباب کو دیکھتے ہوئے کھلے دل سے زارا کی سچی تعریف کی تھی۔

"ہاں بھئی۔ ان کی مجبوری تو وہ ہی جانتے ہیں۔ ہمیں اتنی گہرائی میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو صرف اپنی بہورانی سے غرض ہے۔"

ابو نے مسکراتے ہوئے کہا تو سفیر ہلکا پھلکا ہوگیا۔ جبکہ رباب اپنی جگہ تلملا کر رہ گئی۔

اس کے دماغ نے شیطانی منصوبہ بنانے کی ٹھان لی تھی۔



عون گیٹ سے اندر آتے ہی معیز سے الجھ پڑا۔

"کیا یار۔ اتنی مشکل سے میری بیوی ہاتھ لگی تھی۔ اس پر بھی تم لوگوں نے قبضہ جمالیا ہے۔"

ثانیہ تین دن سے ایبہا کے ساتھ انیکسی میں رہ رہی تھی۔ معیز ہنسنے لگا۔

"یہی تو امتحان ہے دوستی کا۔ فرسٹ آنا چاہیے تجھے اس میں۔" اسے چھیڑا۔

"شٹ اپ یار۔ زندگی بے رنگ کردی ہے میری تم میاں بیوی نے۔ رات کو نیند نہیں آتی، صبح کو آنکھ نہیں کھلتی۔ ابا تو عاق کرنے پہ تلے ہوئے ہیں مجھے۔" اس نے جی بھر کے مسکینی طاری کی تھی خود پر۔ معیز ہنستے ہوئے اسے لان میں لے آیا۔

"دے دیں گے تمہاری بیوی واپس۔ اتنے تھڑدلے مت بنو۔"

"جناب کو ابھی بیوی ملی نہیں ہے نا۔ اس لیے پتا نہیں ہے کہ بیوی کے مل کے چھن جانے کا دکھ کیسا ہوتا ہے۔" عون نے آہ بھری۔ "خبیث۔" معیز کو ہنسی آگئی۔

"پھر بھی یار۔" وہ رازدارانہ انداز میں آگے کو جھکا تو معیز بھی بے ساختہ آگے ہوا۔ "کب تک تم دونوں کے بیچ۔ "ہم اس پار تم اس پار" والی سچویشن رہے گی۔؟"

معیز ٹھنڈی آہ بھر کے سیدھا ہوا۔

"کچھ ابھی باقی ہے میرے یار۔ ماما نہیں مان رہیں۔"
"اوہو۔ نکاح ہو چکا ہے اب تو قاضی والا بیان بھی نہیں رہا اُٹھا کے لے آ یار۔"
"کس کو۔ قاضی کو؟" معیز نے تحیر سے پوچھا۔
"گدھے۔ میری بھابھی کو۔" عون نے دانت پیسے۔ معیز اور حیران۔
"تمہاری بھابھی کو کیوں۔؟" جواباً" عون کا مکا اس کا کندھا سینک گیا۔
"تیری بیوی کی بات کر رہا ہوں۔" معیز نے رکا ہوا قہقہہ فضا کے حوالے کیا۔ عون کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"اچھے لگ رہے ہو۔ مطمئن۔ اور پُرسکون۔ بہت لمبے عرصے کے بعد پہلے والے معیز احمد کی طرح۔" وہ مسکراتا رہا۔
"میری مانو تو اب رخصتی کروالو۔ اگر آنٹی کا مسئلہ ہے تو خود رخصت ہو کے انیکسی میں آجاؤ۔"
عون اسے اوٹ پٹانگ مشورے دیتا رہا اور وہ ہنستا رہا۔ مگر دل کو یہ باتیں اچھی لگ رہی تھیں اور ایک الگ ہی لے میں دھڑکا رہی تھیں۔ اس کے دل و جان سے قریب تر ایک رشتہ موجود تھا۔ جو اس کی دسترس سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بس ایک جھجک مانع تھی دونوں کے مابین۔
وہ جب سے واپس آئی' ثانیہ اس کے ساتھ تھی۔ تو معیز پلٹ کر انیکسی میں نہیں گیا تھا۔
"میں تو آج اپنی بیوی کو ہر حال میں لے کے جاؤں گا۔ میرا' میرے کمرے کا اور میرے گھر کا حال خراب ہو رہا ہے۔" عون نے اسے دھمکایا۔
پھر کچھ سوچ کر شرارت سے بولا۔
"موقع اچھا ہے معیز! بھابھی بے چاری اکیلی ہو جائیں گی خاصی۔"
"تو فکر نہ کر۔ اسے اکیلے رہنے کا خاصا تجربہ ہے۔" معیز نے اسے چڑایا تو وہ گہری سانس بھر کے رہ گیا۔



سفینہ بیگم کے غم و غصے کو زارا نے قدرے ٹھنڈا کر دیا تھا۔
"ماما پلیز۔ میری شادی میں تو اس مسئلے کو مت اٹھائیں۔ میں اس گھر سے مطمئن ہو کر جانا چاہتی ہوں۔ پریشان دل کے ساتھ نہیں۔"
وہ رونے لگی تو انہوں نے بے بسی سے کہا۔
"تو کیا کروں۔ اس خبیث لڑکی کو اپنی بہو تسلیم کر لوں؟"
"خدا کے لیے ماما۔" زارا نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"ہم بھائی کی خوشی میں خوش ہیں۔ آپ بھی راضی ہو جائیں۔" تو وقتی طور پر سفینہ بیگم کو خاموش ہونا پڑا۔ مگر رباب کے فون نے ان کی نفرت انگیز سوچوں کو اور مہمیز کیا۔
"دیکھا آنٹی! آپ نے۔ کیسے کھیلا ہے معیز نے میری زندگی اور میرے جذبات کے ساتھ۔"
وہ بوکھلا گئیں۔ کل وہ لوگ تاریخ لینے آرہے تھے اور آج رباب کا فون۔
"میری چندا۔! وہ مجبور ہو گیا ہے۔ زبردستی کا بندھن منڈھ دیا تھا تمہارے انکل نے اس کے سر۔ تمہاری شکل میں اسے اپنا آئیڈیل مل گیا تھا۔ مگر کیا کرے۔ بے چاری یتیم لڑکی ہے۔ اس لیے ہی چھوڑ بھی نہیں پا رہا اسے۔"
انہوں نے نمناک لہجے میں ادھر ادھر کی ساری ہی لگا دیں۔ رباب نے دانت پیسے۔

"مگر میں اپنی انسلٹ بھی نہیں بھولوں گی آنٹی! معیز نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا اور اگر کسی کی بیٹیوں کے ساتھ برا کیا جائے تو اپنی بیٹیوں کے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ یہ بات یاد رکھیے گا۔"

سفینہ بیگم دھک سے رہ گئیں۔ رباب کی دھمکی کا ماخذ وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔ اس کا اشارہ صاف طور پر زارا کی طرف تھا۔ جو اپنی نئی زندگی گزارنے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

"تم فکر مت کرو رباب! میں نے تو ہمیشہ معیز کے لیے دلہن کے روپ میں تم ہی کو سوچا تھا اور ان شاء اللہ تم ہی اس گھر میں آؤ گی بہو بن کر۔"

وہ ایک مصمم عہد کے ساتھ جوشیلے انداز میں بولیں تو ان کے کمرے کے دروازے تک آیا ایراز ٹھنک گیا۔ اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں پھیل گئیں۔



بے حد خوش گوار ماحول میں چائے پی گئی اور ریفرشمنٹ سے خوب انصاف کیا گیا تھا۔

سفینہ بیگم کی دلائی گئی امید (اور شاید اپنے کسی منصوبے) کے تحت رباب بہت اچھے موڈ میں تھی۔ معیز سے بھی یوں ملی جیسے بہت اچھی دوستی ہو۔ مگر معیز کا انداز بہت محتاط سا تھا۔ سفینہ بیگم نے بڑے اچھے ماحول اور موڈ میں زارا کی شادی کی اس مہینے کے آخر کی تاریخ دی تو ایک دوسرے کا منہ میٹھا کرایا گیا۔

"اور اس موقع پر میں آپ لوگوں کی اجازت سے اپنے دل کی ایک اور خواہش بھی پوری کرنا چاہتی ہوں۔" سفینہ بیگم نے اچانک کہا۔ تو فطری طور پر سب ہی ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔

رباب کا ہاتھ تھام کر انہوں نے اپنے بالکل ساتھ لگا کر اسے بٹھایا تو معیز کا رنگ اڑ گیا۔

"جی۔ ضرور۔ آج تو دن ہی خوشی کا ہے۔" سفیر کی امی نے خوش دلی سے سمدھن کا حوصلہ بڑھایا۔

معیز کا دل گھبرانے لگا۔ وہ ایک ٹک ماں کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یہ چہرہ اس کا سینکڑوں نہیں ہزاروں بار کا پڑھا ہوا تھا۔ اسے اچھی طرح سمجھ میں آگیا تھا کہ سفینہ اسے کہاں مات دینے کی کوشش کررہی ہیں۔ وہ یقیناً "رباب اور معیز کے رشتے کی بات کرنے لگی تھیں

اور ماں کے رشتہ مانگ لینے کے بعد بیٹا اٹھ کے انکار کرتا تو بہن کی ہونے والی سسرال میں کیا طوفان نہ اٹھتا۔ وہ ساکت سا بیٹھا تھا۔

سب کی نظریں سفینہ بیگم کے کھلتے ہوئے چہرے پر تھیں۔ جنہوں نے بڑی لگاوٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے تفاخر سے مسکراتی رباب کو ساتھ لگا رکھا تھا۔ تب انہوں نے اچٹتی مگر بے حد جتاتی ہوئی نگاہ معیز پر ڈالی تو ان کی نگاہوں میں کھلا چیلنج اور اپنی مرضی چلانے کا عزم دیکھ کر معیز کا دل بیٹھنے لگا۔

اسی وقت ایراز پیچھے سے جھکا اور ماں کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے شوخی سے سب کو مخاطب کیا۔

"ماما! یہ خوشی کی خبر اور آپ کی خواہش میں شیئر کروں گا۔" سفینہ اس افتاد پہ گڑبڑا سی گئیں۔ بھلا اس بے وقوف کو کیا پتا۔ وہ کھنکھارا۔

"دراصل آنٹی! ماما کی دلی خواہش ہے کہ زارا کی شادی کے ساتھ معیز بھائی کی شادی بھی نمٹادی جائے اور اس گھر میں بہو آجائے۔ اس لیے یہ چاہتی ہیں کہ ایبہا بھابھی بھی رخصت ہو کر اس گھر میں آجائیں اگر آپ کو دونوں فنکشنز کے اکٹھا ہونے پر اعتراض نہ ہو تو۔"

ایراز کی بات سن کر سفینہ بے ہوش ہونے کو ہو گئیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا
آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
بلبل گلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

اللہ بچائے مرضِ عشق سے دل کو
سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا

تشبیہ ترے چہرے کو کیا دوں گلِ تر سے
ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا

میں نزع میں ہوں، آئیں تو احسان ہے ان کا
لیکن یہ سمجھ لیں کہ تماشا نہیں ہوتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اکبر الٰہ آبادی

درد میں لذت بہت اشکوں میں رعنائی بہت
اے غمِ ہستی، ہمیں دنیا پسند آئی بہت

ہو نہ ہو، دشت و چمن میں اک تعلق ہے ضرور
یادِ صحرائی بھی خوشبو میں اٹھا لائی بہت

مصلحت کا جبر ایسا تھا کہ چپ رہنا پڑا
ورنہ اسلوبِ زمانہ پر ہنسی آئی بہت

بے سہاروں کی محبت، بے نواؤں کا خلوص
آہ یہ دولت کہ انسانوں نے ٹھکرائی بہت

بے خیالی میں بھی کتنے فاصلے طے ہو گئے
بے ارادہ بھی یہ دنیا دور لے آئی بہت

اپنی فطرت میں بھی روشن ہوں گے لیکن اے ضمیر
میری راتوں سے بھی تاروں نے چمک پائی بہت

سید ضمیر جعفری



روک لوں یا نہیں سوچتا رہ گیا
اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا

حاصلِ گفتگو کیا ٹھہرتا بھلا
ایک وہ لفظ جو اَن کہا رہ گیا

ڈھل گئی دھیان سے کوئی صورت مگر
نام اک لوحِ دل پر لکھا رہ گیا

کل اچانک کھلا وہ مرے دل میں ہے
میں جسے عمر بھر ڈھونڈتا رہ گیا

شکر ہے بزمِ ہستی میں تابش کمال
فیصلہ جو ہوا، حوصلہ رہ گیا

تابش کمال

پچھتاوا

آج تمہارا وہ چہرہ دیکھا
جو اس سے پہلے دیکھ نہیں پائی تھی
لیکن اب سب بے سود ہے، لاحاصل ہے
اب تو پیچھے جلنے بجھنے والی
کشتیوں کی راکھ کے سوا کچھ بھی نہیں
کچھ بھی تو نہیں

فاخرہ بتول



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوخزامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا۔

"ہم دواؤں کے ذریعے سے علاج کرتے ہیں اور دعاؤں کے ساتھ دم کرتے ہیں اور دفاعی اشیاء کے ذریعے سے اپنا بچاؤ کرتے ہیں۔ کیا یہ چیزیں اللہ کی تقدیر میں سے کسی چیز کو روک سکتی ہیں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ بھی اللہ کی تقدیر میں شامل ہیں!"

مٹی پہ سونے والا شہنشاہ،

قیصر روم نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے اپنا ایک آدمی مدینہ بھیجا۔ وہاں پہنچ کر وہ لوگوں سے پوچھنے لگا۔

"آپ کے شہنشاہ معظم کا محل کہاں ہے؟"

مدینہ کے لوگ ان شہنشاہ معظم جیسے الفاظ سے ناواقف تھے۔ انہوں نے کہا۔

"آپ بتائیں آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

آدمی نے جواب دیا۔

مسلمانوں کے بادشاہ سے' مدینہ والوں نے اسے بتایا کہ ہمارے ہاں کوئی بادشاہ نہیں صرف ایک خادم ہوتا ہے جو ہمارے تمام معاملات سنبھالتا ہے۔ اُس کا نام عمرؓ ہے اور وہ گارے سے بنے ایک جھونپڑے میں رہتا ہے!!

رومی بہت حیران ہوا اور آپؓ کی تلاش میں چل پڑا۔ جا کر دیکھا کہ عمرؓ سر کے نیچے زرہ رکھ کر مٹی پہ سوئے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ کہنے لگا۔

"کیا یہ ہے وہ عمرؓ جس کی ہیبت سے دنیا کے فرمانرواؤں کی نیند اڑ چکی ہے۔ اے عمرؓ! تم انصاف کرتے ہو تبھی تمہیں گرم ریتلی مٹی پر بھی نیند آ گئی جبکہ ہمارے بادشاہ ظالم و بددیانت ہیں اس لیے انہیں نرم و گداز بستروں اور سنگین حصاروں میں بھی نیند نہیں آتی؟"

آسیہ فرید۔ ملتان

مایوسی،

ابلیس کے لفظی معنی ہیں "انتہائی مایوس"۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس، جنت میں داخلے سے مایوس، انسان کے مقام و مرتبہ یا اس سے بھی بڑھ کر کوئی مقام حاصل کر لینے سے مایوس۔

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

واصف علی واصف کی نظر میں،

- روح کی گہرائی سے نکلی ہوئی بات روح کی گہرائی تک ضرور جائے گی۔
- ملنے کے بعد تحقیق گمراہ کر دیتی ہے۔
- "توبہ" جب منظور ہو جاتی ہے تو یادِ گناہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔
- ہم لوگ فرعون کی زندگی چاہتے ہیں اور موسیٰؑ کی عاقبت۔
- لطیف روحیں مجلس میں لطافت پیدا کرتی ہیں اور کثیف روحیں کثافت۔
- اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں دی ہیں، ان کا یہی شکر ہے کہ تکلیف برداشت کرو۔
- جب انسان کے دل میں روشنی نہ ہو، وہ چراغوں کے میلے میں کیا حاصل کرے گا۔
- سب سے بڑی خواہش ہر انسان کو خوش کرنے اور اسے متاثر کرنے کی خواہش ہے اور اس کی سزا

یہ ہے کہ انسان نہ متاثر ہوں گے اور نہ خوش۔
سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

عام سی لڑکی

میرے چہرے پر جلتی بجھتی لو دیکھ کر حیران مت ہو پگلی۔ ہجر تو تلنے کو بھی چمکا کے سونا بنا دیتا ہے، میں تو پھر عام سی لڑکی ہوں۔
گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

لفظوں کی گہرائیاں

- دل کی طرح سخت اور اس کی طرح نرم و ملائم دنیا میں کوئی چیز نہیں۔
(زاہدی)
- دل سمندر کی طرح ہے۔ بظاہر خاموش مگر گہرائیوں میں طوفان موجزن ہیں۔ (ارسطو)
- ایسا دماغ جس کی پرواز پرندے کی پرواز سے زائد نہ ہو، میں اسے چھوٹا اور حقیر دماغ کہوں گا۔
(شیکسپیئر)
- اس خوشی سے دور رہو جو کل غم کا نشانہ بن کر دکھ دے۔ (خلیل جبران)
- انسان کے لیے بہترین مطالعہ انسانوں کے دلوں کا مطالعہ ہے۔ (بالسورتھ)
- تجربہ مفت ملنے والی چیز نہیں ہے۔ اس کے لیے وقت اور عمر گنوانی پڑتی ہے۔
(ٹیگور)
- انکساری کا راستہ لے کر چلو، ورنہ ٹھوکر کھاؤ گے۔
(مودی)
- میرے خیال میں موت تکلیف دہ ہے لیکن اتنی نہیں جتنی زندگی۔ (ایجیل فنڈ)
- جب لوگ تمہاری برائی کریں تو تم اس طرح زندگی بسر کرو کہ کوئی بھی شخص ان برائی کرنے والوں کی باتوں پر یقین نہ کر پائے۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

سکونِ قلب

سکونِ قلب کسی اور چیز کا نام نہیں، بلکہ اللہ کے فضل کا نام ہے۔ اور اللہ کا فضل جب نازل ہوتا ہے تو آپ کو سکونِ قلب محسوس ہوتا ہے۔
(واصف علی واصف)
نوال افضل گھمن۔ لاہور

تعاون

بھارت سے شائع ہونے والا "پنجابی سماچار" اخبار دنیا کے کئی ملکوں میں جاتا ہے۔ جس میں افریقہ بھی شامل ہے۔ ایک مرتبہ اس اخبار کے مالک اور ایڈیٹر شری گل اخبار کی سرکولیشن میں اضافے کے لیے دورہ کرتے ہوئے افریقہ بھی گئے اور اپنے ایک عزیز کی معرفت سالانہ خریدار بناتے رہے۔ ایک روز ایک ہندوستانی سکھ بیوپاری سے سالانہ ڈھائی سو روپے چندہ وصول کر کے اسے سالانہ خریدار بنایا اور ساتھ ہی یہ گزارش کی کہ اپنے کسی اور واقف کار، عزیز دوست، رشتہ دار کو بھی سالانہ خریدار بننے پر آمادہ کر کے اسے خریدار بنوا دیں۔ چنانچہ وہ اسے ساتھ لے کر ایک اور سکھ دوست کے گھر چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی اور ساتھ ہی زور سے آواز دے کر کہا۔
"اوئے بیل سنگھا! اوئے بیل سنگھا!"
گھنٹی اور پکار کی آواز سن کر بیل سنگھ فوراً اوپر کی کھڑکی میں آ کھڑا ہوا اور پوچھا۔
"خیریت تو ہے۔ بہت جلدی میں لگتے ہو۔"
شری گل کے ساتھی سردار نے گل صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"دیکھو گل جی آئے ہیں۔ "پنجابی سماچار" اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ فوراً ڈھائی سو روپے لے کر نیچے آؤ اور اخبار کے سالانہ خریدار بن جاؤ۔"
بیل سنگھ نے وہیں کھڑے کھڑے اوپر سے ہی جواب دیا۔ "مگر مجھے تو پنجابی پڑھنی نہیں آتی۔ پنجابی اخبار کا سالانہ خریدار بن کر کیا کروں گا۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو میرے یار! جہاں سے میں اپنا اخبار پڑھواتا ہوں، وہاں سے تمہارا اخبار بھی پڑھوا دیا کروں گا۔ بس تم جلدی سے ڈھائی سو روپے لے کر نیچے آجاؤ۔ باقی فکر میری ہے، تمہاری نہیں!" گل جی کے سفارشی نے کھناک سے جواب دیا۔

ثمرہ اقراء۔ کراچی

رحمتیں!

کسی نے ایک بزرگ سے معلوم کیا کہ مخلص کون ہے۔ انہوں نے فرمایا۔

"مخلص وہ ہے جو اپنی نیکیوں کو اس طرح چھپائے جیسے برائیوں کو چھپاتا ہے۔"

پھر پوچھا "اخلاص کی غایت کیا ہے؟"

بزرگ بولے۔ "لوگوں کی جانب سے کی جانے والی تعریف کو پسند نہ کرو۔"

عذرا ناصر۔ کراچی

جواب!

کرائے دار نے مالک مکان سے کہا۔

"خدا کے لیے اس سال تو کھڑکیوں میں پٹ لگوا دیجیے، میں کمرے میں بیٹھا ہوں تو تیز ہوا سے بال بکھر جاتے ہیں۔"

مالک مکان نے کرائے دار کے دیے ہوئے کرائے میں سے پچاس روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میرا اتنا خرچا کرنے سے بہتر نہیں کہ آپ فٹ پاتھ پر بیٹھے کسی نائی سے بال کٹوا لیں۔"

عابدہ نثار۔ حیدرآباد

پریشانی!

انسان پریشان اس وقت ہوتا ہے جب اس کے دل میں کسی بڑے مقصد کے حصول کی خواہش ہو لیکن اس کے مطابق صلاحیت نہ ہو۔ پرسکون رہنے کے لیے ضروری ہے کہ یا تو خواہش کم کی جائے یا صلاحیت بڑھا دی جائے۔

(واصف علی واصف)

ثمینہ کوثر عطاری۔ گجرات

وجہ!

فرزانہ بیگم نے نئے خانساماں رحیم بخش سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم ایک اچھے کک ہو لیکن مجھے تمہاری ایک بات بالکل پسند نہیں ہے۔ تمہارے دوست بہت ہیں جو آئے دن تم سے ملنے یہاں آتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو بہت بدتمیز ہیں، کل ہی تمہارا دوست جو تم سے ملنے آیا تھا وہ تمہارے ساتھ کچن میں اتنے زور زور سے ہنس رہا تھا کہ میرے کمرے تک آواز آرہی تھی۔"

"معافی چاہتا ہوں بیگم صاحبہ! آئندہ احتیاط کروں گا۔" رحیم بخش خانساماں نے عاجزی سے کہا پھر سادگی سے وضاحت کی۔

"دراصل میں اسے اس دن کا قصہ سنا رہا تھا جب آپ نے اوون میں کیک بنانے کی کوشش کی تھی۔"

صائمہ جبیں۔ کراچی

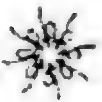
موتی مالا!

☆ جب کسی کو کسی سے رشتہ ختم کرنا ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے زبان کی مٹھاس ختم کرتا ہے۔

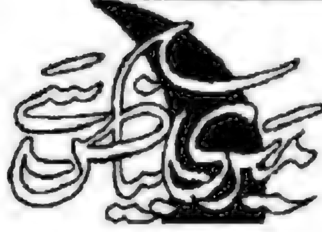
☆ زندگی کا مشکل ترین مرحلہ وہ ہوتا ہے جب آپ خود کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

☆ سب سے مشکل کام اپنا احتساب کرنا ہے۔ دوسروں کو سب ہی برا بھلا کہتے ہیں۔

فریحہ شبیر۔ شاہ نکڈر



خالدہ جیلانی



آمنہ اُجالا ______ ڈہرکی

دلوں میں فرق آجائے تو اتنا یاد رکھنا تم
دلیلیں، منتیں اور فلسفے بے کار جاتے ہیں

آسیہ فرید ______ ملتان

مخلص ہوں میں دشمن پہ بھی کرتا ہوں بھروسا
تا عمر مجھے جینے کے آداب نہ آئے

مدیحہ نورین مہک ______ برنالی

یوں غلط نہیں ہوتے چہروں کے تاثر لیکن
لوگ ویسے ہوتے بھی نہیں جیسے نظر آتے ہیں

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ______ کراچی

منظر بدل گئے پس منظر بدل گئے
حالات اپنے شہر کے یکسر بدل گئے
سورج کے ڈوبنے پہ نہ حیران ہوئے کبھی
اب سوچتے ہیں کتنے کیلنڈر بدل گئے

نمرہ، اقرا ______ کراچی

بہتے پانی پہ چل رہا ہوں میں
ساتھ لے کر رواں دواں منظر
رنگ کیا کیا زمیں بدلتی ہے
جب بدلتا ہے آسماں منظر

فریحہ شبیر ______ شاہ نکدر

وہ کیسے لوگ تھے یارب جنہوں نے پا لیا تجھ کو
ہمیں تو ہو گیا دشوار اک انسان کا ملنا

حرا قریشی ______ ملتان

اک عجب شور سا بپا ہے کہیں
کوئی خاموش ہو گیا ہے کہیں
تو مجھے ڈھونڈ میں تجھے ڈھونڈوں
کوئی ہم میں سے رہ گیا ہے کہیں

بشریٰ خالد ______ لاہور

لفظوں سے اُن کو پیار ہے مفہوم سے مجھے
وہ گل کہیں جسے میں ترا نقشِ پا کہوں
اب جستجو ہے تیری جفا کے جواز کی
جی چاہتا ہے تجھ کو وفا آشنا کہوں

فہمیدہ گل ______ لاڑکانہ

مجھ کو میرے ہم سفر ایسا سفر درپیش ہے
راستہ کٹ بھی گیا تو فاصلہ رہ جائے گا

شبنم شمشاد ______ بزمان

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم
کہ تو نہیں تھا تیرے ساتھ ایک دنیا تھی

مہوش جواد ______ چوک اعظم

دل سے مجبور ہو کر اس امید پہ سو جاتا ہوں محسن
جو حقیقت میں نہیں ملتے، شاید خواب میں ہی آجائیں

فوزیہ ثمر بٹ ______ گجرات

خدا کی اتنی بڑی کائنات میں، میں نے
بس اک شخص کو مانگا مجھے وہی نہ ملا

زوباریہ خالد ______ لاہور

اے مصور تجھے استاد مانوں گا
درد بھی کھینچ میری تصویر کے ساتھ

سیدہ لوبا سجاد ______ کہروڑ پکا

صاف کہہ دو اگر گلہ ہے کوئی
فیصلہ، فاصلے سے بہتر ہے

کوثر خالد ______ جڑانوالہ

میں نے محسوس کیا تم سے دو باتیں کر کے
تم زمانے میں زمانے سے جدا لگتی ہو

فرحت اشرف گھمن ―――― سیروالا

کبھی شعر و نغمہ بن کے کبھی آنسوؤں میں ڈھل کے
وہ مجھے ملے تو لیکن ملے صورتیں بدل کے

عالیہ نور ―――― منڈوالہ یار

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

صائمہ جبیں ―――― کراچی

وہ راہ بدلنے میں ہواؤں کی طرح تھا
جو شخص کڑی دھوپ میں چھاؤں کی طرح تھا
اس شخص کی منزل تھی قاف سے آگے
میں راہ میں پڑتے کسی گاؤں کی طرح تھا

نسبت منیعہ ―――― کہروڑ پکا

آنکھوں کی ہے بس ایک ہی تمنا
دیکھا کریں روز خواب اس کے
اپنے لیے مانگ لوں خدا سے
حصے میں ہیں جو عذاب اس کے

بلینا سحر ―――― نامعلوم شہر

گم صم رہنا، کھوئے کھوئے رہنا
یاد دور ہنے اس کی کر دیا ہمیں گمشدہ

بشریٰ خالد ―――― لاہور

کتنے برسوں کا سفر خاک ہوا محسن
اس نے جب پوچھا کیسے آنا ہوا

سدرہ بتول ―――― ملتان

اتنے نخرے نہیں دیکھے جاتے
بھاڑ میں جائے محبت تیری

نویلہ وڑائچ ―――― ممٹی شریف

خوشیوں کی شام اور یادوں کا یہ سماں
اپنی پلکوں پہ ہرگز ستارے نہ لائیں گے
رکھنا سنبھال کر چند خوشیاں میرے لیے
میں لوٹ آؤں گا تو عیدیں منائیں گے

نیلم مقبول ―――― اسلام گڑھ

یقین اس کو نہیں آتا وضاحت میں نہیں کرتا
گزر جائے گی ساری عمر شاید امتحانوں میں

نوال افضل گھمن ―――― لاہور

ہمارا نام تیری گفتگو میں جب آئے
کسی کو کیا کوئی حرف زیر لب آئے
میں دکھ میں تھا تو اکیلا تھا پوری بستی میں
میں سکھ میں ہوں تو میرے آس پاس سب آئے

زوباریہ خالد ―――― لاہور

اداس زندگی، اداس وقت، اداس موسم!!
کتنی چیزوں پہ الزام لگ جاتے ہیں اک تمہارے بعد

دعائے سحر: انا ―――― گجرات

ساقی شراب لا کہ، طبیعت اداس ہے
مطرب رباب اٹھا کہ طبیعت اداس ہے
توبہ تو کر چکا ہوں مگر پھر بھی اے عدم
تھوڑا سا زہر لا کہ، طبیعت اداس ہے

شائستہ اکبر ―――― گڈ کالونی

بس اتنا ہوش ہے مجھ کو کہ اجنبی ہیں سب
رکا ہوا ہوں سفر میں، کسی دیار میں ہوں

سیدہ نسبت زہرا ―――― کہروڑ پکا

تیرہ شبوں کو پھر سے جگمگائے ہلال عید
سندیسۂ بہار بن کے آئے ہلال عید
تمنا ہے کہ دیکھیں نئی سحر کی رنگینی
اے کاش! نوید صبح لے کر آئے ہلال عید

گڑیا شاہ ―――― کہروڑ پکا

دیکھا ہے اجڑتے ہوئے کتنے ہی گھروں کو
ہے کون جو اس عشق میں برباد نہیں ہے
آتا ہے خیالوں میں میرے ایک ہی چہرہ
بس اس کے سوا مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے

زارا حیات ―――― پشاور

خفا جو ہم ہو گئے تو کون منائے گا تمہیں
آؤ ملو عید کہ عید مبارک تم سے کہیں





امت الصبوح

خواتین کی ڈائری

مہوشش جواد کی ڈائری سے

خواب زندگی میں رنگ بھرتے ہیں، یہ نہ ہوں تو زندگی کتنی بے رنگ ہوتی ہے۔ احمد فراز کی یہ غزل مجھے صرف ایک شعر کی وجہ سے پسند ہے۔

آوارگی میں ہم نے اُس کو بھی مُنر جانا
اقرار وفا کرنا پھر اس سے مکر جانا

جب خواب نہیں کوئی کیا زندگی کا کرنا
ہر صبح کو جی اُٹھنا ہر رات کو مر جانا

شب بھر کے ٹھکانے کو اک چھت کے سوا کیا ہے
کیا وقت پہ گھر جانا کیا دیر سے گھر جانا

ایسا نہ ہو دریا میں تم بارِ گراں ٹھہرو
جب لوگ زیادہ ہوں کشتی سے اُتر جانا

سقراط کے پینے سے کیا مجھ پہ عیاں ہوتا
خود زہر پیا میں نے تب اس کا اثر جانا

جب بھی نظر آؤ گے ہم تم کو پکاریں گے
چاہو تو ٹھہر جانا چاہو تو گزر جانا

شبنم شمشاد کی ڈائری سے

منیر نیازی نے جو بھی لکھا، بہت خوب لکھا۔ انہی کا ایک شاہکار آپ بھی پڑھیں۔

خوبصورت زندگی کو ہم نے کیسے گزارا

آج کا دن کیسے گزرے گا کل گزرے گی کیسے
کل جو پریشانی میں بیتا وہ بھولے گا کیسے

کتنے دن ہم اور جئیں گے کام ہیں کتنے باقی
کتنے دُکھ ہم کاٹ چکے ہیں اور ہیں کتنے باقی

خاص طرح کی سوچ تھی جس میں سیدھی بات گنوا دی
چھوٹے چھوٹے وہموں ہی میں ساری عمر بتا دی

فریحہ تبسیر کی ڈائری سے

کم عمری میں چھوٹی چھوٹی خواہشیں اور ان کی تکمیل کتنی خوشی دیتی ہے۔ اس کا شاید کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اسی موضوع پہ یہ خوبصورت غزل۔

دہکتے دن میں عجب لطف اُٹھایا کرتا تھا
میں اپنے ہاتھ کا تتلی پہ سایہ کرتا تھا

ہمارے گھر کے قریب ایک جھیل ہوتی تھی
اور اُس میں شام کو مہتاب آیا کرتا تھا

یہ زندگی مجھے تیرے پاس لے آئی
ورنہ یہ راستہ تو کہیں اور جایا کرتا تھا

تلاشِ رزق میں نکلے ہوئے پرندوں کو
میں جیب خرچ سے دانا کھلایا کرتا تھا

عجب خواہش پرواز مجھ میں ہوتی تھی
میں کاپیوں میں پرندے اڑایا کرتا تھا

دعا عالم بسنجاری کی ڈائری سے

کسی نامعلوم شاعر کی یہ غزل ایک دوست نے بھجوائی جو مجھے بے حد پسند آئی۔ آپ بھی پڑھیے۔

دستکوں پر بھی جو نہ کھلتا تھا، وہ در کیسا تھا
نام لکھا تھا جس پر میرا، وہ گھر کیسا تھا

سنگ پھینکا نہ کسی نے اسے مڑ کر دیکھا
جو ہری شاخ پہ ٹھہرا تھا، ثمر کیسا تھا

مطمئن پختہ مکانوں سے تو سب ہی تھے لیکن
شہر میں موسم برسات کا ڈر کیسا تھا

جس کے سائے میں نہ ملتا تھا مسافر کو سکون
وہ گھنا پیڑ سر راہگزر کیسا تھا

سیدہ نسبت زہرا کی ڈائری سے

یہ محبت بھی کیا عجب شے ہے۔ ملے نہ ملے، حاصل ہو نہ ہو، انسان بے بس ہوتا ہے اور انسان کیے جانے پر مجبور بلکہ محبت کا اصل اپنا آپ منوا کر ہی رہتا ہے۔ محبت ایک آفاقی جذبہ ہے۔ محبت تو ازل سے ابد تک رہے گی۔ اس کی کسک، زخم، جدائی بھی ساتھ ساتھ۔ محسن نقوی کی یہ غزل محبت بھرے دلوں کی داستان لگتی ہے۔ پڑھیے اور ہمارے ذوق کی داد دیجیے۔

وفائیں اب یہ ہنر بھی اختیار کرتا ہے
وہ سچ کہے نہ کہے اعتبار کرتا ہے

یہ تجھ کو جاگتے رہنے کا شوق کب سے ہوا
مجھے تو خیر ترا انتظار کرتا ہے

ہوا کی زد میں جلائے ہیں آنسوؤں کے چراغ
کبھی یہ جشن سر رہگزار کرتا ہے

وہ مسکرا کے نئے وسوسوں میں ڈال گیا
خیال تھا اسے شرمسار کرتا ہے

ترے فراق میں دن کس طرح کٹیں اپنے
کہ شغل شب تو ستارے شمار کرتا ہے

چلو یہ اشک ہی موتی سمجھ کے بیچ آئیں
کسی طرح تو ہمیں روزگار کرتا ہے

انجل کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ نظم جس میں وہ اہل چمن سے گلہ کرتے نظر آرہے ہیں۔ آپ بھی پڑھیے اور سطر سطر اسے اپنے دل میں اترتا محسوس کیجیے۔

گلہ ہوا سے نہیں ہے، ہوا تو اندھی تھی
مگر وہ برگ کہ ٹوٹے تو پھر ہرے نہ ہوئے
مگر وہ سر کہ جھکے اور پھر کھڑے نہ ہوئے
مگر وہ خواب کہ بکھرے تو بے نشاں ٹھہرے
مگر وہ ہاتھ کہ بچھڑے تو استخواں ٹھہرے
گلہ ہوا سے نہیں، تندیٔ ہوا سے نہیں
ہنسی کے تیر چلاتی فضا سے نہیں
عدو کے سنگ سے، اغیار کی جفا سے نہیں
گلہ تو گرتے مکانوں کے بام و در سے ہے
گلہ تو اپنے بکھرتے ہوئے سفر سے ہے
ہوا کا کام تو چلنا ہے، اس کو چلنا تھا
کوئی درخت رہے یا گرے اسے کیا ہے
گلہ تو اہل چمن کے دل و نظر سے ہے
خزاں کی دھول میں لپٹے ہوئے شجر سے ہے
گلہ سحر سے نہیں، رونق سحر سے ہے

خامشی کو بیاں ملے

امت الصبور

حرا قریشی.... ملتان

1 :۔ لیجئے جو عرصے سے جامد چپ کی مہر لبوں پر لگی تھی' وہ خامشی کو بیان دینے کے لیے توڑ دی ہم نے۔ گرد' گرما' گورستان اور اولیا کے قدیم شہر ملتان سے میرا تعلق ہے۔ بہترین مشاغل "پڑھنا لکھنا" ہیں۔ بی ایس سی' بی ایڈ اور ایم ایڈ اسپیشل کرچکی ہوں۔ مزید اور شدید خواہش کے باوجود وقت اور حالات کے پیش نظر وقفہ بدرجہ اتم موجود ہے ورنہ ایم فل کے مدارج بھی طے کر ہی لیتے.... مطالعہ دل پسند تفریح کے طور پر کرتے ہیں' خواہ وہ کتاب علمی ہو' دینی ہو' ڈائجسٹ ہو' سائنسی ہو یا شاعری ہو۔ کچھ لوگ خبطی سمجھتے ہیں پر کیا کریں کہ ہم تو ہیں ہی ایسے۔

2 :۔ خوبیاں اور خامیاں؟ اگر میں ان پر کوئی کتاب مرتب کردوں تو ذخیرۂ الفاظ میں کمی محسوس ہونے لگے گی۔ عزیز احباب کے کمنٹس قلمبند کرتے ہیں۔ "یو آر یونیک امنگ اور گرلز" (مائی اسپیذ بریکر) آپ مجھے ساری کی ساری پسند ہیں۔ (رخسانہ فاطمہ) "مرا دل چاہتا ہے میں تمہارے جیسی بن جاؤں۔" (ثانی ذیر) یو آر انٹیلکچوئل' انٹیلی جنٹ اینڈ ہارڈ ورکنگ (ثمائلہ یاسمین) "یار تمہاری انگلش بہت اچھی ہے۔" (قرۃ العین) یو آر رئیلی نائس گرل ہیونگ اسٹرونگ کریکٹر (گل جبیں) "آپ بہت جینئس ہیں۔" عمارہ یو لو زلیس برلینٹ مائنڈ (سمیرا واحد) کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ سحر سیما۔

اتنی اچھی ہوں نہیں' کچھ زیادہ ہوگیا۔ اب محترم اساتذہ کی طرف آتے ہیں۔ کام کرنے کی لگن' جذبہ بہت ہے' محنتی بھی ہو۔ (سر امین) "سارے ٹیچر اگر ثمیم کی طرح پڑھائیں تو اسکول کا معیار مزید بلند ہو جائے گا۔" (سر خلیل احمد) بہت لونگ اور سنسیئر ہو' تمہارا رابطے میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ (میم صائمہ نوشین) مخلص' حساس اور ذہین (میم انیقہ) نہ چیٹنگ کرتی ہے' نہ کرنے دیتی ہے۔ (سر نسیم) ریگولر اور پنکچوئل (میم فاطمہ علی) سب سے

اچھی اسٹوڈنٹ (میم شازیہ)

سب "تقریباً" کہتے ہیں کہ ذہین ہوں میں' مگر ریگ جاں کہتی ہے ذہین نہیں محنتی ہو۔

فیملی ممبرز بھی چند اسی طرح کی خوبیاں ذہن میں رکھتے ہیں۔ اب ذرا خامیوں پر غور فرمائیں۔

"فارغ ہے' عقل سے" (عظیم بھائی) صبر اور برداشت کی کمی (ریگ جاں) سڑیل' خود غرض (چھوٹی آپی) کتابی کیڑا (چھوٹے بھائی)

مزید پھر بھی.... اپنی ذات کے حوالے سے جو ہر بشر خود جانتا ہے' وہ کوئی نہیں جان سکتا اور پرفیکٹ تو کوئی بھی نہیں ہوتا' ہر فرد خوبیوں اور خامیوں کا مرقع ہوتا ہے۔ (گریباں میں جھانکتے رہنا چاہیے)

اگر میں خود سے اپنی بات کروں تو یہ ہی کہوں گی کہ ہر کام کو بہترین اور یونیک طریقے سے کرنے کی سعی کرتی ہوں' ہیلپ کو آپریٹو اور اچھی گائیڈ رہوں۔

بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ کرجاتی ہوں۔ حساس بہت ہوں ذرا سا کچھ کہہ دیا کسی نے' جھٹ سے آنکھیں نم' اعتماد کی صلاحیت میں مکمل پرفیکشن نہیں آئی ابھی تک' نماز کے وقت کوئی کام کہہ دے تو مزاج لاشعوری طور پر بگڑ جاتا ہے اور کیا کہوں' بہت گندی بچی ہوں؟

بابا کہتے ہیں.... حرا بیٹا بریانی اور دال بھرے پراٹھے بہت اچھے بناتی ہے۔

اور ہمارے اسکول کی میم عظمیٰ کہتی تھیں کہ "شمیم کو بیسٹ ٹیچر کا ایوارڈ ملنا چاہیے۔" (دادوں اس کی کہ ہم نے پڑھایا کیسا؟) جن افراد کو ہضم نہ ہو رہا ہو وہ برائے مہربانی ہاجمولا پاس رکھ لیں کہ حاسد اور عدو بہت زیادہ ہیں اپنے۔

3 :۔ مشاغل میں مطالعہ' مطالعہ' اور مطالعہ سرفہرست ہے۔

4 :۔ بی ایڈ کے بعد ان ڈائجسٹ کی طرف آئے۔ تین' چار سال ہو ہی گئے ہوں گے۔ سو اب خواتین' شعاع' کرن ڈائجسٹ وقت نکال کر پڑھ ہی لیتے ہیں اور باقاعدگی سے سلسلوں میں حاضری دینے کی بھی سعی کرتے ہیں۔ اعلا معیار کا لکھنا ان معیاری ڈائجسٹ کی مصنفین کا خاصہ ہے۔ اپنے ــــــ قیمتی قلم سے عمیرہ احمد' فرحت اشتیاق' راحت جبیں' فاخرہ جبیں' نمرہ احمد' نگہت سیما' عنیزہ سید' نگہت عبداللہ' آمنہ رزاق' عفت سحر پاشا' ماہا ملک' سائرہ رضا' سمیرا حمید' وغیرہ بہت ہی مایہ ناز تحریروں کا خزانہ ہم تک پہنچاتے ہیں۔ (وقت کم ہے ورنہ تحریروں پر بھی ایک لمبا تبصرہ ہو جاتا)۔ دلی خواہش ہے کہ ان ناموں کے درمیان اپنا بھی نام آئے۔

5 :۔ سالگرہ خصوصی طور پر نہیں مناتے لیکن تمام دوست احباب اور فیملی ممبرز سے نیک تمنائیں حق سمجھ کر وصول کرتے ہیں۔ ریگ جاں' سحر سیما' فری۔ 15 اکتوبر کا خاص دن کبھی نہیں بھولتے۔ سب سے پیارا تحفہ بزرگوں کی دعائیں ہیں جو بن مانگے ملتی رہتی ہیں۔ ریگ مری چوائس کا خصوصی خیال رکھتی ہیں اور تحفہ بھی پھر ویسا ہی قابل دید ہوتا ہے اور لیلتہ القدر کی میٹھی میٹھی یاریاں۔ (مزیدار) خاص خوشگوار ایام کی طرح اس دن کے لمحے گزارتے ہیں۔

6 :۔ کتابوں سے والہانہ محبت ہے۔ ممتاز مفتی کی "تلاش" "بات سے بات" واصف علی واصف کی' عمیرہ احمد' نمرہ احمد' فرحت اشتیاق' ماہا ملک' راحت جبیں' رفعت سراج کی ڈھیر ساری تحریریں پڑھی ہوئی ہیں جو کامیاب زیست کے لیے مشعل راہ کا بہترین ہی نہ ثابت ہو سکتی ہیں' اور ایک ایسی درس گاہ جہاں سے چھٹی کرنے کو بھی دل نہ مانے' صراط مستقیم کی طرف لے جانے والی نایاب سڑک کی طرف اشارہ کرتی تحریریں کہ جس میں کٹھنائیاں ہیں تو ان سے بچ نکلنے کا راستہ بھی موجود ہے۔ یہ سلسلہ صد اشاد و آباد رہے! آمین

7 :۔ پسندیدہ فقرہ "جب دل ایڑیاں رگڑ رگڑ کر رو رہا ہو تو مسکراہٹ بھی آہ و فغاں کا ذائقہ دیتی ہے۔"
(رشک حبیبہ کی تحریر خمیازہ سے لیا گیا)

"اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزیں اپنی مرضی سے ردوبدل نہیں کرتے' اللہ تعالیٰ کو یہ اچھا نہیں لگے گا۔" (جنت کے پتے' نمرہ احمد)

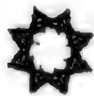
شاعری سے بے حد رغبت ہے۔ بہت سے شعراء کو پڑھا ہوا ہے' جن میں ابن انشاء' محسن نقوی' فاخرہ بتول' پروین شاکر' نوشی گیلانی' امجد اسلام امجد' وصی شاہ' مدثر فاضل مجیب' میر تقی میر' میر انیس' غالب' فیض' جون ایلیا' باقی احمد پوری' فرحت عباس شاہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس لیے شاعری کی بہت سی کتابیں پڑھی ہوئی ہیں۔ پسندیدہ شعر بہت سے ہیں۔ جن میں چند لکھ رہی ہوں۔

اس کا انداز سخن سب سے جدا تھا شاید
بات لگتی ہوئی لہجہ وہ مکرنے والا

کرن پھول کی پتیوں میں دبی
ہنسی اس کے ہونٹوں پہ آئی ہوئی!

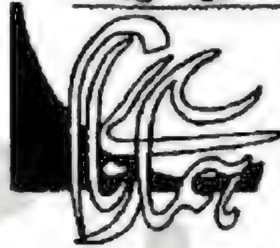
بہترین شعر تو آخر میں یاد آیا ہے

ایسا کوئی محبوب نہ دیکھا نہ کہیں ہے
بیٹھا ہے چٹائی پہ اور عرش نشیں ہے!





نامۂ خواتین



خط بھجوانے کے لیے پتا

خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com

khawateendigest@hotmail.com

ثمینہ کوثر عطاری..... ڈوگہ گجرات

"کہنی ختنی" ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا۔ "آب حیات" بہت الجھتا جا رہا ہے' پلیز سالار اور امامہ کو جدائی کے عذاب میں مبتلا نہ کیا جائے "بن مانگی دعا" نہایت خوب صورت ناول ہے معیز کو ابیہا کی طرف ہی لوٹنا ہے' سو سوچا سمجھا اینڈ ہے "عہد الست" کی اگر بات کروں تو تنزیلہ کا یہ پہلا ناول ہے جو میں نے پڑھا اور سچ تنزیلہ! آپ نے اپنے چاہنے والوں میں ثمینہ کا اضافہ کر لیا ہے اب میں بات کروں گی اپنے اور اپنی سسٹرز کے موسٹ فیورٹ ناول "نمل" کا تو نمرہ احمد آپ یقین جانیں۔ ایک ایک لفظ میں جادو ہے جیو اور ایسے خوب صورت ناول لکھتی جاؤ شکریہ! سائرہ! آپ جس بھی ٹاپک پہ لکھتی ہیں کمال لکھتی ہیں میں جب بھی آپ کا کوئی ناول پڑھتی ہوں تو میں کئی دن اس کے حصار میں رہتی ہوں' ہر ناول پہ میں یہ کہتی ہوں اس بہتر نہیں لکھا جا سکتا پر آپ کا اگلا ناول اس سے بھی زیادہ شان دار ہوتا ہے افسانے سارے کے سارے بہترین تھے۔ "خاتون کی ڈائری سے" میں ہر دفعہ قارئین کے ذوق پہ حیران رہ جاتی ہوں ماشاء اللہ بہت خوب صورت بہت یونیک چوائس ہے خواتین کے قارئین کی۔ اب اگر بات کریں پکوان کی تو یقین مانیں میں بہت نمبر ون ہوں اپنی فیملی سے جس کو جو بھی بنانا ہے وہ مجھ سے پوچھنے ضرور آتی ہے۔ پلیز پاستا بنانے کی ترکیب بتادیں۔

ثمینہ کوثر! اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔ آپ جیسے قارئین ہمارے لیے آکسیجن کا درجہ رکھتے ہیں جو ہر کہانی' ہر سلسلہ پوری توجہ سے پڑھتے ہیں اور اپنی رائے ہم تک پہنچاتے ہیں۔ ہمیں اندازہ ہے پرچا پڑھ کر خط لکھنا اور پوسٹ کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا پاستا بنانے کی ترکیب آئندہ ماہ شامل ہوگی۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

اے کیو ملک..... چکوال

رفاقت کی طویل داستان ہے۔ بہت پرانا ساتھ ہے۔ خواتین اور شعاع کے ساتھ وابستگی تب سے ہے جب لفظوں سے ہمارا تعارف تو تھا مگر مفہوم سے ناآشنائی۔ بس دن میں لیے ازل سے شوق مطالعہ کی تسکین کے لیے خواتین اور شعاع کو بچپن سے ہی سفر حیات میں ساتھ لے لیا۔ اس پرچے نے ہمیں لازوال کہانیاں' بے مثال سبق دیے۔

ج اے کیو ملک! آپ نے اپنا نام کیوں نہیں لکھا۔ اپنی شناخت تو ہونی چاہیے۔ نام پہلی شناخت ہوتا ہے۔

ہم سفر کا اثر سفر پر ضرور ہوتا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ سفر حیات میں آپ نے ہمارے پرچوں کو عزت بخشی۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

آپ نے نومبر 2015ء کا خواتین منگوایا ہے۔ نومبر 2015ء تو ابھی آیا ہی نہیں۔ پرچا کیسے آئے گا۔ شاید آپ نے مہینے کا نام غلط لکھ دیا ہے۔ آپ ہمیں دوبارہ لکھیں کس مہینے کا پرچا منگوانا چاہتی ہیں۔ اپنا مکمل پتا بھی لکھیں پرچا وی پی کیا جائے تو سو روپے ڈاکیے کو ادا کرنا ہوتے ہیں۔

نخبہ اکرم' سعدیہ اکرم...... گاؤں گولیکی ضلع گجرات

سائرہ رضا کے ناول کی میں جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ سائرہ جی ہر دفعہ کی طرح آپ کا یہ ناول بھی بہت پسند آیا۔ بہت زیادہ ہنسایا دادی نے باہ باہ باہ اور نازیہ جہانگیر کا افسانہ بھی بہت بہت اچھا ہے۔ اب بھی غائب نہ ہونا نادیہ !

قرۃ العین رائے کا رقص بہاراں بھی بہت اچھی اسٹوری تھی۔ "عہد الست" کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ تنزیلہ ریاض نے بہت ہی شان دار ناول لکھا۔ یہ ناول مدتوں یاد رہے گا۔ میری طرف سے تنزیلہ ریاض کو بہت زیادہ مبارک باد۔ نمرہ احمد کے کیا کہنے' ہر قسط پہلے سے بڑھ کر ثابت ہوتی ہے۔

آب حیات پڑھ کر اس بار دل بہت اداس ہو گیا۔ اللہ جی سالار کے ساتھ کچھ برا نہ ہو۔ سونیا حسین سے ملاقات اچھی لگی۔ فرحت اشتیاق سے ایک ناول اب لکھوا لیں۔ بہت انتظار کر لیا۔

ج پیاری نخبہ! آپ بچوں کو گھر میں قرآن پاک پڑھاتی ہیں۔ بہت اچھا کام کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب کرے۔ آپ کو پرچہ پسند آیا۔ بس سمجھیے ہماری محنت وصول ہو گئی' ہماری مصنفات ان ہی کرداروں کو زیر تحریر لاتی ہیں جو ہمارے ارد گرد بستے ہیں تب ہی آپ کو ان میں اپنا عکس نظر آیا۔ ہم اپنی قارئین کی محبتوں کے دل سے قدر دان ہیں۔ آئندہ بھی آپ کے تبصرے کے منتظر رہیں گے۔

ا ب ج...... ٹیلہ ضلع سرگودھا

خواتین ہم تینوں بہنوں کا پسندیدہ رسالہ ہے۔ عمیرہ احمد جی ہماری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ کہانی میں انوکھا رنگ ڈالتی ہیں۔ نمرہ احمد جی آپ کے تو کیا کہنے "عہد الست" "بن مانگی دعا" سب ہی پسندیدہ ہیں۔

ج۔ ا ب ج! معذرت خواہ ہیں آپ کا پچھلا خط شامل نہ ہو سکا اس دفعہ خط شامل ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے آپ تینوں بہنوں کا شکریہ۔

نثار رحمن...... گوجرانوالہ

میں اپنی بیماری کے باعث 7 ماہ کے شمارے پڑھ نہ سکی۔ اب اکٹھے پڑھے۔ "آب حیات" کی اس دفعہ کی قسط اچھی لگی۔ سائرہ رضا کی ہمیشہ کی طرح بلند' اعلیٰ' ارفع تحریر' لوئر مڈل کلاس کے ہر گھرانے میں ایسی آپا موجود ہے۔ سائرہ جو بھی کردار لے کے آتی ہیں۔ ایسا سادہ ہوتا ہے کہ ساتھ گھل مل جاتا ہے اور ایسا خاص بن جاتا ہے کہ ویسا بننے کی چاہ رہتی ہے۔ "عہد الست" جیسے جیسے پڑھا ویسے ویسے آنسو رواں...... رواں اور بس رواں" تمل میں ہاشم کردار کا کردار مجھ سمیت میرے تمام رابطوں کو بہت پسند ہے۔ یہ نمرہ کی خوبی ہے کہ منفی کردار کے ساتھ ہماری وابستگی ہوئی۔ "بن مانگی دعا" بس جلد ختم ہو جائے۔ اس دفعہ سمیرا عثمان کا ناولٹ عجیب تھا۔ کہانی میں بہت جھول تھا۔ بچکانہ انداز لگا۔ میٹرک کا اسٹوڈنٹ رزلٹ بھی نہیں آیا اور سی وی؟ نوکری؟ محبت؟ سگریٹ؟ کہانی کی بنت کمزور تھی۔ آخر فیصل کے کردار کا پہلو کیا تھا' افسانے بھی اچھے تھے۔ خطوط کا سلسلہ سب سے زیادہ پسند ہے۔ حرا قریشی کی نظم پسند آئی۔ اگر ثمینہ عظمت علی اس اگست کے شمارے میں وطن پرستی کا کوئی افسانہ لے آتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔

ج پیاری نثار رحمن! خواتین ڈائجسٹ سے چاہ کے الزام کو تو آپ اکرام ہی سمجھیں۔ سمیرا کا ناولٹ آپ کو عجیب لگا حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی مہربانیوں کی بدولت اسٹوڈنٹ میٹرک سے پہلے ہی اس کارزار میں قدم رکھ دیتے ہیں۔ کہانیاں زندگی سے ہی لی جاتی ہیں تو یہ بھی زندگی کا ایک رنگ تھا اور اگر آپ دیکھیں گی تو اس کے کردار بھی آپ کم ہی سہی' نظر ضرور آجائیں گے۔

اخت حماد شفقت...... سنجرپور

ٹائٹل پر ماڈلز کی تصاویر نہ دیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہا خاص طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہا (کیونکہ حضرت علی کے فرامین زیادہ ہوتے ہیں) کے فرامین کے حوالہ جات ضرور دیں کہ کس کتاب سے لیے گئے ہیں تاکہ ہم پورے یقین کے ساتھ ان پر عمل کر سکیں۔ اگر حوالہ جات نہ ہوں تو فرامین کے حوالہ جات ضرور دیں۔

میں نے "آب حیات" کو پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اب جب نویں قسط میں کانگو سے متعلقہ معلومات نے میری توجہ لی تو

پھر دوبارہ ”آبِ حیات“ شروع کر لیا۔

بن مانگی دعا اچھی ہے مگر مجھے بے مقصد لگتی ہے۔ کچھ اچھوتا نہیں.... جب کہ ابیہا کا ماہانہ خرچ بندھا ہے تو اسے کیا پڑی سفینہ بیگم جیسی پھترل عورت کی چاکری کرنے کی۔ میں یہاں اپنی ایک سوچ عیاں کر دوں.... جس کی بنا پر مجھے اکثر ناولوں اور افسانوں پر اعتراض ہوا.... جب اسلام نے صرف شوہر کی خدمت اور بچوں کی پرورش و تعلیم و تربیت عورت کے ذمے کی ہے تو عورت کیوں اپنے آپ کو ساس نندوں اور دیوروں کی نظر میں اچھا ثابت کرنے کے لیے اپنے آپ کو ہلکان کرتی ہے اور اپنے بچوں کی تربیت سے بے پرواہ اور حد درجہ بے پرواہ ہو جاتی ہے....

جتنا میں جان پائی ہوں مائیں خود بھی اپنے بچوں کی تعلیم میں انٹرسٹڈ نہیں۔ انہیں سسرال میں مزے مزے کے کھانے پکانے اور جسمانی مشقت برداشت کرنا آسان لگتا ہے۔

جب انسان دین اسلام کے فطری طریقوں سے دور ہٹے گا تو پھر وہ مشکلات میں ضرور مبتلا ہو گا۔ سسرال کی خدمت بہو پر فرض نہیں.... ماں باپ کی خدمت ان کے بیٹے کی ذمہ داری و فرض ہے نہ کہ بہو کی.... دوسرے نامحرم کی نسبت دیور سے پردے کی تلقین زیادہ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ساس کی خدمت بہو نہیں کرے گی تو پھر اور کون کرے گا۔ ساس بے چاری کہاں جائے۔ بات یہ ہے ہمارے ہاں خواتین نے اپنے آپ کو بہت نازک مزاج بنا لیا ہے اور بہو کے آتے ہی دنیا سے ایسے دست بردار ہوتی ہیں کہ.... ”بس جی اب ہم تھک گئے۔ اب اگلی نسل کی باری ہے۔“

میرا ذاتی خیال ہے کہ ہمیں آخری لمحۂ زندگی تک سرگرم رہنا چاہیے....

تیرے ہی جیسا ہوں مصنفہ سائرہ رضا کے ناول میں مختلف آوازوں سے متعلق ان کے انداز بیان نے مزہ دیا۔

”ازین ماما کے خود غرضانہ.... بلکہ سفاکانہ خیالات سے واقف تو تھا۔“ اس میں مجھے ماما کے لیے خود غرضانہ اور سفاکانہ کے الفاظ پسند نہیں آئے۔ ماما نے الگ گھر مانگا تھا۔ جس کا حق اس کے دین نے اسے دیا ہے۔

اور اسلام نے یہ بات ناپسند کی ہے کہ کوئی بندہ کہے کہ مجھے شادی نہیں ملی.... ازین کی آپا کو شادی کر لینی چاہیے تھی خواہ ان کی عمر پچاس سال ہوتی۔

”عہد الست“ میں بہت سی باتیں پسند آئیں۔ جنہیں میں ڈسکس کرنا چاہتی ہوں مگر خط کی طوالت مانع ہے۔ کچھ پوائنٹ مندرجہ ذیل ہیں۔

صفحہ نمبر 257 سے 258 تک جس میں بل گرانٹ (نور محمد) کی پی ایچ ڈی تقریر ہے ”آج کی ماں اپنے بچے کو سکھاتی ہے کہ تم سب سے بہترین ہو۔ تمہارے مقابلے کا دنیا میں دوسرا کوئی نہیں۔ جاؤ اور جا کر سب کو پیچھے چھوڑ دو وہ یہ کیوں نہیں سکھاتی کہ سب کو ساتھ لے کر چلو.... اسی میں بھلائی ہے.... خیر ہے....(صفحہ 258)

اور یہ بات تو بہت ہی خاص ہے.... سبق آموز اور قابلِ عمل.... قابلِ نظیر ”کسی نے خوب کہا ہے نا کہ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ نیک بنے تو آپ کو اپنے ہمسائے کے بچے کو بھی نیک بنانا پڑے گا کیونکہ آپ کے بچے کو گھر سے نکل کر ہمسائے کے بچے کے ساتھ ہی کھیلنا ہے۔“ یاد رکھیں چالیس گھر تک مسلمان کے ہمسائے ختم نہیں ہوتے۔“(صفحہ 258)

اپنی ریاست کی ماں کو ان کاموں میں خوار نہ کریں جس کے متعلق اللہ نے اس سے سوال نہیں کرنا۔ (صفحہ 258)

اب ”نمل“ کی باری۔ سلسلہ وار ناولوں میں سب سے زیادہ انتظار مجھے ”نمل“ کا ہی ہوتا ہے۔ ”نمل“ میں ایک بات ہے کہ باقی ناولوں‘ ڈراموں یا فلموں میں جس کردار کو برا دکھایا جاتا ہے وہ سرتاپا برا ہی ہوتا ہے کسی کی نیکی کو نیکی نہیں سمجھتا اور برے سے برا کام کر کے بھی پچھتاتا نہیں۔ مگر نمل میں ہاشم نے وارث کو قتل کر دیا مگر وہ افسردہ تھا۔

سعدی کا کردار اچھا ہے۔ ہر کسی کے لیے مخلص.... سعدی کا کثرت سے قرآن پڑھنا اور اس کی قرآن سے محبت اور قرآن کو اتنی اہمیت دینا۔

ج: پیاری بہن! شریعت کے لحاظ سے عورت پر سسرال والوں کی خدمت فرض نہیں لیکن مرد پر ماں باپ کی خدمت فرض ہے۔ اب شوہر روزی کمانے کے چکر میں صبح اٹھ کر گھر سے چلا جاتا ہے اور رات کو گھر آتا ہے۔ آپ ایک ڈرائیور کو ہی لے لیں‘ پرائیویٹ جاب میں ایک

ڈرائیور کی ڈیوٹی بارہ سے چودہ گھنٹے ہوتی ہے اور تنخواہ کا بھی آپ اندازہ کر سکتی ہیں۔ وہ ماں کی خدمت کے لیے نوکر نہیں رکھ سکتا تو کیا والدین کو جو ضعیف ہو چکے ہیں بیمار ہیں' اولڈ ہوم میں بھجوا دے؟

عورت اگر والدین کو خوش نہ رکھے تو وہ ناراض ہو کر بیٹے سے کہہ سکتے ہیں کہ اسے چھوڑ دو۔ شریعت کے تحت اولاد پر والدین کے حکم کی تعمیل فرض ہے تو ایسی صورت میں سسرال والوں کو خوش رکھ کر عورت کو اپنا گھر نہیں بچانا چاہیے؟

زندگی میں افراط و تفریط سے کام نہیں چلتا۔ سوچ سمجھ کر سمجھوتا کر کے ہی زندگی گزرتی ہے۔ سائرہ رضا کے ناول میں آپ کو اعتراض ہے کہ آپا نے 50 سال کی عمر میں شادی سے کیوں انکار کیا؟ اگر وہ انکار نہ کرتیں تو اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ انہیں 50 سال کی عمر میں کوئی رشتہ مل جاتا۔ اس عمر میں کسی لڑکی کو رشتہ اول تو ملتا نہیں اور اگر مل بھی جائے تو دس مسائل ہوتے ہیں۔ بہن بھائیوں کی پرورش میں جان کھپا کر ایک تھکی ہوئی عورت ان کا مقابلہ کیسے کرتی؟ پھر سائرہ نے کہیں بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ ان کے لیے کوئی رشتہ موجود تھا۔

آپا نے ازین کی پرورش ماں بن کر کی تھی۔ اب مایا کہہ رہی تھی کہ اپنی ماں کو گھر سے نکال دو' میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی تو یہ سوچ سفاک اور خود غرضانہ ہی تھی..... ازین نے صحیح فیصلہ کیا۔ آپا اس عمر میں کہاں جاتیں؟

تسنیم فاطمہ..... ڈیرہ غازی خان

جس ناولٹ نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ ہے سحر ساجد کا "وہ پاگل سی" اف..... کیا لکھ دیا ہے آپ نے..... سحر ساجد

یعنی بس کیا بتاؤں۔ اب ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ مئی 2015ء میں چھپنے والی کہانی پہ تبصرہ اگست میں کیوں؛ ہمارے گھر میں خیر سے ماہانہ 12 سے 15 رسالے آتے ہیں کہ اباجی کو پڑھنے کا شوق نہیں نشہ ہے مگر افسوس! خواتین "اور" شعاع "کا نام اس فہرست میں شامل نہیں وجہ؟ ارے وجہ وہی "مردوں کی حاکمیت" اور ہم تو کیا ہی نہیں کہ گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے ابھی تک بچہ ہی سمجھا جاتا ہے (یاد رہے' مابدولت کیمسٹری میں ایم فل کر رہی ہیں) سحر ساجد کا ناولٹ پڑھتے ہوئے یقین جانیے اگر میرے جناتی قسم کے قہقہے سن کر ابھی تک کوئی خیریت دریافت کرنے نہیں آیا تو اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ میں ہاسٹل ہوں اور آدھا ہاسٹل سو رہا ہے۔ باقی آدھا ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔

"جو چلے تو جاں سے گزر گئے" تب پڑھا جب میں 8th میں تھی اور عالم شاہ کی موت نے مجھے بھی ہفتوں گم صم رکھا۔

امربیل' میرا موسٹ فیورٹ..... جس کی علیزہ کے روپ میں' مدتوں خود کو دیکھا۔ اور پھر سالار سکندر..... کتنے ہی دن نماز کے بعد دعائیں مانگی گئیں "یا اللہ! مجھے امامہ ہاشم بنا دے" (یعنی اللہ کے لیے بھی خالص اور بونس میں سالار سکندر بھی' ڈبل مزہ)

کیا کچھ یاد دلا دیا آپ نے سحر ساجد! (اس کے لیے بہت شکریہ)

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے اباجی "شدید قسم کے ادبی" ہونے کے باوجود "جاوید صاحب" جیسے نہیں ہیں..... اگر "جاوید صاحب" کے بجائے پروفیسر قاسم حسین رضوی ہوتے نا تو "صبح جاوید" صاحبہ اپنی پہلی ہی اوور ایکٹنگ یہ "عشق کی راہ" میں شہید ہو چکی ہوتیں (ہمیں تو رونا بھی چھپ چھپ کر پڑتا ہے اپنے ہیروز کے مرنے پر)

دوسرا غم..... نعمان عابد کو بھی ہر "ہیرو" کی طرح محبت ہی ہوئی نا..... (تب ہی اتنے پاپڑ بھی بیل لیے) اب ہم یہ محبت نامی بلا کہاں سے لائیں کہ نہ ہمیں کسی سے ہوتی ہے (کہ خدا ہی سے اس کا ساتھ مانگیں "ہیروئنز" کی طرح) نہ ہمارے ابا کے ڈر سے (یہ خالصتاً "ہمارا ذاتی خیال ہے) کوئی ہم سے کرنے کی جرأت کرتا ہے۔

بہرحال ایک یاد رہ جانے والی کہانی بہت شکریہ سحر ساجد! خوش رہیں اور یونہی خوشیاں بانٹتی رہیں' جانتی ہوں خط طویل ہے پر کیا کریں۔ جون میں تھا سو تھا۔

ج۔ پیاری تسنیم! ہمیشہ خوش رہیں۔ آپ کے والد صاحب ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ بارہ چودہ پرچے پڑھتے ہیں اگر آپ کوشش کرتیں اور خواتین اور شعاع سے متعارف کرا دیتیں تو وہ ہر ماہ آپ کو خود پرچے لا کر دیتے ہیں خیر ابھی بھی دیر نہیں ہوئی۔ اس ماہ نمیرا احمید کی کہانی "جوگ اس" شامل ہے اپنے والد کو پڑھائیں۔ وہ جان جائیں گے کہ سارے ڈائجسٹ بے ادب نہیں ہوتے۔

اور جب آپ کی تمام حرکتیں صبح جاوید جیسی ہیں تو بس

نعمان عابد کی ہی کمی رہتی ہے۔ ان شاء اللہ اس کی انٹری بھی ضرور ہوگی۔ دیر آید ٗ درست آید اور ابھی ایسی دیر بھی تو نہیں ہوئی۔

عائشہ خان.....

کل شام ایک دوست کا ٹیکسٹ ملا۔

"ڈیئر! افسانہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی.... مگر یار خیریت کا ایک ٹیکسٹ افسانے سے مشکل تو نہیں.... مگر شاید ہم اس قابل ہی نہیں....!"

کیسا افسانہ.... کون سا افسانہ یہ تو سمجھ میں نہیں آیا۔ شکوہ ضرور سمجھ میں آگیا۔ صورت احوال کچھ یوں ہے کہ تقریباً" چار سال قبل اپنے کچھ پرابلمز کی وجہ سے میرا قلم سے اور دوست احباب سے رابطہ منقطع ہوگیا۔

شروع میں انہوں نے کال اور میسجز کیے مگر کوئی جواب نہیں دے سکی۔ میں جانتی ہوں کہ یہ انتہائی غیر اخلاقی حرکت ہے مگر.... کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

آپی جان! بطور قاری تو میرا "خواتین" کے ساتھ پہلی محبت والا تعلق ہے اور.... ایک ننھا سا تعلق بطور رائٹر بھی ہے کہ میرے دو افسانے خواتین اور شعاع کے دلکش صفحات پر جگہ پانے کا شرف حاصل کرچکے ہیں۔

تو دیرینہ قاری اور رائٹر کے ان حوالوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی فیور کی جسارت تو کر ہی سکتی ہوں کہ اگر آپ میری ان ہم نام بہن عائشہ خان سے کہیں کہ وہ اپنے سر نیم کے ساتھ کچھ ایڈ کرلیں تو میں آپ کی ممنون ہوں گی اس طرح ہم دونوں کی الگ الگ پہچان بھی برقرار رہے گی اور غلط فہمی کی بنا پر میرے احباب کی شکایت کا امکان بھی نہیں رہے گا۔

ج عائشہ! آپ کی ہم نام عائشہ خان ہمیں ٹنڈو محمد خان سے خط لکھتی ہیں۔ ہم آپ کی درخواست ان تک پہنچا رہے ہیں لیکن آپ بھی تو اپنے نام میں تبدیلی کرسکتی ہیں۔

عائشہ! آپ نے صحیح لکھا ٗ دوست احباب تو دور کی بات زندگی کبھی کبھی اتنی الجھ جاتی ہے کہ خود اپنے آپ سے رابطہ کرنے کی مہلت نہیں ملتی۔ اچھی بات یہ ہے کہ گلے شکوے نہ کیے جائیں اور نہ ہی دوستوں کے لیے دل میں بدگمانی لائی جائے۔

صائمہ بشیر..... گجرات

اس مرتبہ تحریم شاہد بخاری نے جب نمل کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ میرے سعدی کے ساتھ کیا کیا تو غصہ آیا کہ بھئی سعدی تو میرا ہے۔ آپ کہاں سے بیچ میں آگئیں۔ خیر یہ تو مذاق تھا۔ قارئین سعدی اور زمر کی ذہانت سے ایسے متاثر ہیں کہ بیان کرنا مشکل ہے۔

"عہد الست" نے ہر مرتبہ میرے رونگٹے کھڑے کیے۔ ہر بار یہ خیال آتا کہ اللہ تعالیٰ سے مقابلہ کرنے والے کیا اتنے مضبوط ہیں کہ وہ سوچوں پر بھی قابض ہیں۔ مگر آخری قسط میں مسلمان ایک ہجوم سے ایک قوم ہوئے تو دشمن کی پسپائی کتنی آسان ثابت ہوئی۔ بس ہمیں بھی ہجوم سے ایک قوم بننا ہے۔ ان شاء اللہ اور جو بچوں نے ڈرامہ پیش کیا میں بھی وہ اپنے اسکول میں کرواؤں گی۔ "آب حیات" میں سالار نے اپنے معاملات بندوں کے ہاتھوں میں دینے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں دیے تو اس سے کافی ایمان تازہ ہوا۔ صد شکر کوئی موسیٰ بھی ہے۔ سائرہ رضا کی تحریر بھی زبردست تھی۔ خاص طور پر دادی کے اسٹور والے سین میں تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئے۔

سر شہروز کی باتیں تو ان کی شخصیت کے برعکس نکلیں۔ لگتے تو بہت سادہ مزاج کے ہیں۔ مگر باتیں تو بڑی تیکھی کرتے ہیں۔

ج صائمہ! یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ہماری ساری قارئین سعدی کے لیے بہنوں والے جذبات کیوں رکھتی ہیں۔ جبکہ فارس کے لیے ان کے جذبات بالکل مختلف ہیں۔ اس میں شک نہیں سعدی کا کردار بہت پیارا ہے ٗ ہمیں بھی اپنا اپنا سا لگتا ہے۔

عہد الست بلاشبہ تنزیلہ کی شاہکار کہانی تھی۔ شروع سے لے کر آخر تک تنزیلہ نے کئی سوال اٹھائے اور ان سوالوں کے جامع اور مدلل جواب بھی دیے۔

اور سالار کے بارے میں کیا کہیں۔ سالار تو آپ سب کا مشترکہ ہیرو ہے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عائشہ خان..... ٹنڈو محمد خان

کہانیوں میں سب سے پہلے "نمل" پڑھی اور پڑھ کر اب تک اداس ہوں۔ میں ہاشم کو مجرم اور قاتل تو سمجھتی

تھی۔ مگر وہ اس حد تک گر جائے گا۔ یہ اندازہ نہیں تھا۔
باقی خواتین ہمیشہ کی طرح بہتر سے بہترین تھا۔
اور ہاں ہماری فیورٹ مصنفین سے کہیں کہ جلدی جلدی کہانی بھیجا کریں صدف آصف 'حیا بخاری' سویرا فلک 'قرۃ العین خرم' عزہ خالد اور نیو رائٹر میں ندا حسنین اچھی جا رہی ہیں۔ ندا کا عابدوالا افسانہ بہت پیارا لگا۔
باقی پرانی مصنفین میں سے ایک کھوئی ہوئی بہن "میمونہ خورشید" وہ مجھے بہت یاد آتی ہیں۔ خصوصاً" ان کا عید اسپیشل ناول جس میں سامعہ نامی ہیروئین اور اجمال نامی ہیرو تھا۔ بہت یاد آتا ہے۔
اور ہاں باورچی خانے میں مسز حمیرا ثقلین کی لیموں والی ٹپ پسند آئی۔
انٹرویو میں سونیا کی باتیں اچھی لگیں... کیونکہ سونیا کا اس سے پہلے میں نے کوئی انٹرویو نہیں پڑھا تھا۔
شاہین آپی سے ایک ریکوئسٹ ہے۔ حیدر آباد کے صحافی فوٹو گرافر ندیم خاور کا انٹرویو کریں۔
ج۔ عائشہ! تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔ "میمونہ خورشید" کہاں ہو بھئی... عائشہ کے ساتھ ساتھ ہم بھی تمہیں یاد کرتے ہیں۔ شاہین رشید تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے۔

اقراء اشتیاق..... طور جہلم

"عہد الست" سے اچھا ناول میں نے آج تک نہ تو پڑھا ہے اور شاید کبھی نہ پڑھ سکوں۔ شروع سے آخر تک تمام کرداروں کو اچھے طریقے سے نبھایا گیا ہے۔ تنزیلہ ریاض کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس ناول کی بہت سی اہم باتوں کو میں نے اپنے پاس لکھ کر محفوظ کر لیا ہے۔ ناول کے ختم ہونے کا غم تو ہے لیکن اتنا اچھا ناول پڑھنے کی خوشی بھی بیان سے باہر ہے۔ باقی سلسلے وار ناولوں میں "بن مانگی دعا" میری مما کا فیورٹ اور مجھے پہلے اچھا لگتا تھا لیکن اب انتہائی برا لگتا ہے۔ وہی گھریلو باتیں اور لڑائیاں "آب حیات" اچھا ہے "نمل" کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے وہ ایک اچھا ناول ہی نہیں ہے بلکہ بہت سی اسلامی باتیں بھی سکھاتا ہے۔ رسالے کے مستقل سلسلے تو اچھے ہیں۔ ناولٹ "محبت کا رنگ" جیسے ناولٹ پڑھنے کے بعد لڑکیوں نے خراب نہیں ہونا تو اور کیا ہونا ہے۔ پلیز یہ میکے سسرال اور مظلوم بہوؤں اور گھٹیا رومانوی کہانیاں مت شائع کیا کریں۔ جو عورتیں سسرال میں خدمت کی وجہ سے اپنا مقام بنانا چاہتی ہیں اور اس سلسلے میں ظلم برداشت کرتی ہیں وہ غلط کرتی ہیں کیونکہ ظلم برداشت کرنا بذات خود ایک ظلم ہے۔ کچھ کہانیاں پڑھ کر لگتا ہے کہ وہ اس رسالے کے معیار کی نہیں ہیں۔ شاید میری تنقید آپ کو اور دوسرے لوگوں کو بری لگے لیکن یہ میرا نظریہ ہے۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ عورتوں کو مضبوط ہونا چاہیے۔ پلیز عشق و محبت اور گھریلو لڑائی جھگڑے چھوڑ کر رائٹرز "عہد الست" اور "نمل" جیسے مضبوط موضوعات پر لکھا کریں۔
ج۔ پیاری اقراء اشتیاق! آپ نے بہت اچھا خط لکھا ہے آپ کی تنقید سر آنکھوں پر۔ مگر پیاری اقرا! آپ کا کیا خیال ہے۔ جو عورت گھر میں رہتی ہے۔ دن بھر خانگی ذمہ داریاں ادا کرتی ہے۔ ایک نسل کو پروان چڑھاتی ہے اس کی تربیت کرتی ہے کیا وہ کمزور ہے؟ ظلم کسی بھی صورت میں ہو اس کی برداشت کے تو ہم بھی قائل نہیں مگر ایک عورت مختلف رشتوں میں بندھی ہوتی ہے اور اس کا خمیر ہی محبت سے گندھا ہے۔ تو کیا محبت 'ایثار' قربانی' ہمدردی اور برداشت کا دوسرا نام نہیں اور محبت کا مان رکھنا ہی اس کے حوصلے کی گواہی ہے۔
پھر ہمارے قارئین میں ہر مزاج کے لوگ شامل ہیں۔ بہت سے لوگ وہ پڑھنا چاہتے ہیں جو آپ کو پسند نہیں۔ اب ہم تو کسی کا بھی دل نہیں توڑ سکتے آخر ہمیں بھی تو اپنی محبت کا مان رکھنا ہے۔ امید ہے آئندہ بھی مع تبصرہ شامل رہیں گی۔
اور ایک بات ہمارے پرچے میں جو رومانوی کہانیاں شائع ہوتی ہیں بہ نظر غائر دیکھیں تو ان میں بھی سبق پنہاں ہوتا ہے۔

ام محمد..... اسلام آباد

بعض اوقات افسانوں / ناولوں میں کوئی بات خلاف حقیقت ہوتی ہے تاہم موقع نہیں ملتا کہ خط لکھ کر اس کی طرف توجہ دلائی جائے۔ یہ چند نکات ہیں۔ امید ہے کہ توجہ دی جائے گی۔
اکثر کہانیوں میں اولاد باپ سے مطالبہ کرتی ہے کہ کاروبار یا جائیداد میں سے ان کا حصہ انہیں دے کر الگ کر دیا جائے۔ حالانکہ صاحب جائیداد (چاہے وہ ماں ہو یا باپ)

کی زندگی میں اولاد کا اس پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ وہ وارث ضرور ہیں مگر مرنے کے بعد۔ ترکہ ہمیشہ مورث کی موت کے بعد تقسیم ہوتا ہے۔ اسی لیے جو اولاد صاحب جائیداد (ماں یا باپ) کی زندگی میں فوت ہو جائے' وہ ورثاء کی فہرست سے نکل جاتی ہے۔ بیٹے کے مرنے کی صورت میں اس کے بیوی بچوں اور بیٹی کے مرنے کی صورت میں اس کے شوہر اور بچوں کا جائیداد میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ صاحب جائیداد چاہے تو انہیں کچھ ہبہ کر دے یا پھر شریعت نے اسے ایک تہائی تک وصیت کرنے کی جو اجازت دی ہے' اس کی وصیت کر سکتا ہے جو اس کے مرنے کے بعد انہیں ملے گی۔

(یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ماں باپ بھی اولاد کی جائیداد میں وارث ہوتے ہیں۔ یعنی اگر صاحب جائیداد بیٹا یا بیٹی فوت ہو جائے تو ماں باپ کا ترکہ میں حصہ ہوتا ہے۔ لیکن بے چارے ماں باپ کبھی اولاد سے نہیں کہتے کہ اپنی زندگی میں اپنی جائیداد سے ہمیں ہمارا حصہ دو...)

کبھی کبھار کہانیوں میں بات کورٹ میرج تک پہنچ جاتی ہے۔ اسلام میں کنواری لڑکی کا نکاح بغیر ولی کی رضامندی کے جائز نہیں۔ اسی لیے اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ کر شادی کرنے کے لیے انگریزی قانون کے تحت کورٹ میرج کی سہولت دی گئی ہے۔ تاہم لڑکے کو نکاح کے لیے ولی کی ضرورت نہیں۔ اگر دلہن کا ولی راضی ہو تو لڑکا اپنے گھر والوں کی رضامندی کے بغیر بھی گواہوں کی موجودگی میں نکاح کر سکتا ہے جو شرعاً" درست ہو گا۔ نبیلہ عزیز کو مبارک ہو کہ تیمور حیدر اور مادرا کو کورٹ میرج کی ضرورت نہیں۔ ہاں البتہ بے عزت کو کورٹ سے رجوع کرنا پڑے گا۔ تاہم علماء کی نظر میں یہ نکاح قابل اعتبار نہیں۔

جون کے شمارے میں آپ نے معذرت کی ہے کہ "غافر" نام کی کوئی سورۃ قرآن میں نہیں 'سہوا" لکھا گیا ہے۔

اصل میں سورۃ فاطر ہے۔

غرض یہ ہے کہ قرآن میں ایک سورۃ کے کئی نام ہیں۔ حدیث شریف میں سورۃ الفاتحہ کے کئی ناموں کا ذکر ہے۔ مثلاً "سبع المثانی' رقیہ وغیرہ۔ اسی طرح بنی اسرائیل اور الاسراء ایک ہی سورۃ کے نام ہیں۔ التوبہ کا دوسرا نام براءۃ ہے۔

اسی طرح چوبیسویں پارے میں سورۃ الزمر کے بعد جو سورۃ ہے اس کا نام سورۃ المومن بھی ہے اور غافر بھی۔ سورۃ کی تیسری آیت ہے غافر الذنب و قابل التوب شدید العقاب...

ناول "نمل" میں زمر کے نکاح کے وقت کمرے میں صرف دو مرد تھے۔ لڑکی سے جب رضامندی حاصل کی جاتی ہے تو ایک وکیل اور دو گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے یعنی کہ تین افراد۔ یہ دونوں اگر گواہ تھے تو وکیل کون تھا؟ اگر ایک وکیل تھا تو دوسرا گواہ کون تھا؟

حالانکہ وکیل اس لیے ہوتا ہے کہ نکاح کے لیے ایک ہی مجلس میں ایجاب و قبول ہونا ضروری ہے۔ اور کیونکہ ہماری معاشرتی اقدار کے باوصف دلہن اس مجلس میں موجود نہیں ہوتی' اس لیے اس کی طرف سے وکیل رضامندی کا اظہار کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علماء کرام ٹیلیفون پر نکاح کو درست نہیں سمجھتے کیونکہ دونوں فریق (دلہا اور دلہن) ایک مجلس میں موجود نہیں ہوتے۔ چاہیے یہ کہ جو فریق مجلس میں موجود نہ ہو' وہ اپنا وکیل مقرر کرے جو اس کی طرف سے ایجاب و قبول کرے۔

"خالی آسمان" اور "تعویذ حب" دونوں مکمل ناول کے عنوان کے تحت تھے جبکہ ایک کا اختتام ہو گیا دوسرا جاری ہے۔ آخر یہ مکمل ناول کی اصطلاح کا کیا مطلب ہے؟

ج۔ ام محمد! آپ نے ہمیں معلومات فراہم کیں' بہت شکریہ اب آپ کے سلسلہ وار جواب

(1) آپ کا اعتراض بالکل درست ہے یہ خلاف شریعت ہے۔ کہ والدین سے زندگی میں وراثت کا حصہ مانگا جائے۔ لیکن بہت سی ناخلف اولادیں والدین سے مطالبہ کرتی نظر آتی ہیں بلکہ جائیداد کی خاطر والدین کی جان تک لے لیتی ہیں۔ اخبارات میں اس قسم کے قصے آپ نے ضرور پڑھے ہوں گے۔ ہماری مصنفین نے جب بھی اولاد کی طرف سے یہ مطالبہ دکھایا ہے۔ اس اولاد کو برا اور غلط دکھایا ہے۔

(2) کورٹ میرج انگریزی قانون ہے' شرعی نہیں۔ شرعی لحاظ سے آپ نے بالکل درست رہنمائی کی ہے لیکن ولی کی رضامندی کے بارے میں مختلف علما کرام کی مختلف آراء ہیں۔

(3) اس بات کی تصحیح ہم بھی کر چکے ہیں۔ یہ غلطی سے شائع ہو گیا تھا۔ آپ نے صحیح لکھا سورۃ مومن کا نام سورہ غافر بھی ہے۔

(4) اتنی باریکیوں کا خیال 'وکیل گواہ.... ہمارے خیال میں کہانی میں اس سب کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی زمر کے والد نے فارس سے اپنی بیٹی کا نکاح برضا و رغبت کر دیا۔ کہانی کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

(5) پیاری بہن! سلسلہ وار ناول تین سے چار سال تک چلتے ہیں اس میں کہانی کئی ٹریک پر چلتی ہے جبکہ مکمل ناول کے 40 سے 50 صفحات دیے جاتے ہیں اور یہ چند اقساط میں مکمل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کو ہم مکمل ناول لکھتے ہیں۔

نور العین 'الزاہرہ.... عبدالحکیم سے

سب سے پہلے "عہد الست" واہ! لاجواب کہانی ہمارے لیے اس بار 14 اگست کا بہترین تحفہ۔ تنزیلہ ریاض صاحبہ کو اتنے اچھے تحفے اور اتنی اچھی کہانی ہمیں پیش کرنے کا بہت شکریہ اور ان کو ایسی لاجواب کہانی لکھنے پر مبارک باد۔ دوسرا نمرہ احمد کا مکمل 'بیسٹ ناول' نمرہ جی پلیز اب اس کہانی کی تمام چیونٹیوں کو ایک جگہ پر اکٹھا کر دو اور وہ ایک خاندان کی طرح کام کریں۔ باقی کہانیوں پر رائے محفوظ ہے ٹائٹل گرل بہت خوب صورت اور پیاری تھی۔ کیا میں آپ کو اپنی کہانیاں بھیج سکتی ہوں (اجازت درکار) ہے۔

ج نور العین! اپنی کہانیاں ضرور بھجوائیں۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا پہلا خط ہمیں ملا نہیں ورنہ ضرور شامل کرتے۔

افشاں یاسر گوندل.... اٹاوہ

سب سے پہلے نمل۔ بھئی سعدی فیورٹ ہیرو بن گیا ہے گھر بھر کا۔ بہرحال بہت اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہا ہے ناول پھر آئے جی عہد الست کی طرف تنزیلہ ریاض جی! کمال ہی کمال ساری تحریر میں تھا مگر اینڈ تو باکمال ہی تھا۔ ہر جملہ دل میں اترنے کی تاثیر رکھتا ہے۔ اتنے سارے اسباق ایک ساتھ دیے آپ نے اور ہر ایک دوسرے بڑھ کر بچوں

کا میلوں کو نگاہ کرے۔ میں بھی اسکول میں ایسا ہی پروگرام کرانے کا ارادہ کر چکی ہوں بچوں سے۔ افسانے بھی سب اچھے ہیں۔

دیاروں کے ولی اور فارہ کا انٹرویو دیں۔ میری کہانی کا کیا بنا! پسند نہیں آئی کیا۔

ج افشاں! آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں۔ انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔



قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ

37-اردو بازار کراچی

خبریں گپ شپ خبریں

وصفہ سہیل

ڈرامے میں اور پھروہی اب نئی۔۔۔ آنے والی۔۔۔ فلموں میں۔۔۔ واہ کیا تبدیلی ہے بھئی!) ٹیلنٹ کو آگے لانا ہوگا' (لا تو رہے ہیں اپنے اپنے۔۔۔ بھئی پسندیدہ ٹیلنٹ کو۔۔۔!) سب میڈیم یعنی تھیٹر' فلم اور ٹی وی کے لوگوں کو آنا چاہیے اگر یہ سب آئیں گے تو انڈسٹری آگے جاسکتی ہے (کس کے۔۔۔؟) فلم کی ریکوائرمنٹ کچھ اور ہوتی ہے۔ وہی کام نہیں ہو سکتا جو ہم ٹی وی اور تھیٹر پر کرتے ہیں فلم کا میڈیم الگ ہے (اب کہاں رہ گیا بھئی۔۔۔ الگ۔۔۔)



جھونکا

اداکارہ حمیمہ ملک ممتاز ٹی وی سے سفر کرکے اب فلم میں چلی گئی ہیں۔ اپنی تازہ ترین ریلیز ہوئی فلم "مور" (مور بلوچی میں ماں کو کہتے ہیں۔) کے بارے میں کہتی ہیں کہ فلم "مور" پاکستان کی ترقی کرتی ہوئی فلمی صنعت کے لیے ایک تازہ جھونکا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ میرا ٹی وی انڈسٹری سے فلم انڈسٹری میں آنا' میرا سوچ سمجھ کر کیا گیا فیصلہ ہے۔ ہماری فلم انڈسٹری میں جس طرح سے ہیروئن کام کرتی رہی ہیں (ہائیں! ہماری ہیروئنیں "کام" بھی کرتی رہی ہیں؟) خاص کر پنجابی فلموں میں ایک ہی چہرے بار بار (نام لینے کی ضرورت نہیں۔ آپ جانتے ہیں) اس کو بدلنا پڑے گا (بھئی بدل تو لیا' ٹی وی پر آگیا وہ چہرہ؟) لوگ ان چہروں سے اکتا گئے' (تو۔۔۔ پروا کس کو ہے یہاں۔۔۔) اب فلم انڈسٹری کے ٹیسٹ کو بدلنا ہوگا (جی۔۔۔ وہی چہرے ہر دوسرے

بیان

عمران عباس جو فلم جانثار میں شہزادے کا کردار ادا کررہے ہیں' کہتے ہیں کہ ڈائریکٹر مظفر علی نے میرے بارے میں کہا کہ "عمران عباس سے بہتر شہزادے کا کردار کوئی نہیں کرسکتا تھا (کیوں باقی کیا بادشاہ کا کردار ہی کرسکتے ہیں؟) میرے پاس چوائس ہی نہیں تھی'



(مطلب۔۔۔؟ کوئی آپ کے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔۔۔؟) مجھے ضرورت ہی نہیں پڑی اور مجھے بنا بنایا شہزادہ مل گیا۔ انڈیا اور پاکستان میں اتنا پیارا اور خوش شکل لڑکا کوئی نہیں ہے۔ (عمران! چُوری کھاؤ گے۔۔۔؟) عمران عباس نے مزید بتایا کہ دلیپ کمار صاحب نے کہا کہ عمران اگر ہماری فلم انڈسٹری میں نہیں آیا تو ہماری فلم انڈسٹری کا نقصان ہوگا۔ اتنا خوب صورت چہرہ ہے۔ (واقعی بھئی دلیپ کمار صاحب کی عمر بہت ہی۔۔۔ زیادہ ہوگئی ہے ورنہ۔۔۔؟) عمران کا کہنا ہے کہ دلیپ کمار صاحب نے میری امی کو فون کرکے کہا کہ آپ کا بیٹا بہت خوب صورت ہے (دیکھا۔۔۔ میں نے کہا تھا نا کہ دلیپ صاحب۔۔۔ کی عمر۔۔۔؟) ان کا میرے بارے میں اس طرح کا کھلی منشر ہونا میرے لیے باعث فخر اور کسی اعزاز سے کم نہیں ہے (اور باعث غور و فکر۔۔۔ بھی تو ہے نا۔۔۔)

انکار

خوب صورت اداکارا ماہرہ خان اب تک بولی ووڈ کے کسی بھی سپر اسٹار کے ساتھ کام کرنے والی پہلی پاکستانی فنکارہ ہیں۔ جو شاہ رخ خان کے ساتھ فلم "رئیس" میں کام کررہی ہیں۔ اس فلم میں بھارتی اداکار نوازالدین بھی ہیں' ہماری اطلاع کے مطابق ماہرہ خان سے نوازالدین کے ساتھ کچھ بولڈ سین فلمانے کا مطالبہ کیا گیا' تاہم ماہرہ خان نے کسی قسم کے بولڈ مناظر عکس بند کرانے سے انکار کردیا ہے۔ (وینا ملک' میرا اور سارا لورین سن لیں!) اب دیکھنا یہ ہے کہ ماہرہ خان کو اس انکار کی وجہ سے فلم سے باہر کردیا جاتا ہے یا پھر برداشت کرلیا جاتا ہے' لیکن ماہرہ اپنی بات پر ڈٹی ہوئی ہیں۔

اپنا گھر

عدنان سمیع خان عرصہ دراز سے بھارت میں مقیم ہیں اور کمارہے ہیں (گا جو رہے ہیں تو۔۔۔) انہوں نے بہت بار یہ درخواست دی کہ انہیں بھارتی شہریت دے دی جائے۔ تاہم ہر بار کسی نہ کسی وجہ سے ان کی یہ درخواست مسترد کردی جاتی تھی۔ اب انہوں نے مئی میں بھارت میں یہ درخواست جمع کرائی کہ انہیں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر بھارت سے ڈی پورٹ نہ کیا جائے۔

بھارتی وزارت داخلہ نے ان کی یہ درخواست منظور کرتے ہوئے انہیں غیر معینہ مدت تک کے لیے بھارت میں قیام کی اجازت دے دی ہے۔ عدنان سمیع اس پر بہت خوش ہیں اور کہتے ہیں کہ پاکستان میں لوگ اس فیصلے سے خوش نہیں ہیں' لیکن وہ بہت خوش ہیں کیوں کہ انہیں "گھر" مل گیا ہے۔ (بھارتی آقاؤں کو خوش کرنے والے بے ضمیر لوگ۔۔۔) یعنی عدنان سمیع نے بھارت کو اپنا گھر تسلیم کرلیا۔ (اس سے بہتر تھا کہ عبدالستار ایدھی صاحب کے "اپنا گھر" آجاتے۔) عدنان سمیع نے بھارت سے درخواست کی ہے کہ دنیا بھر میں لوگ انہیں بھارتی فنکار سمجھتے ہیں اور ان کا دل بھی بھارت کے لیے ہی دھڑکتا ہے۔ (کاش۔۔۔) اس لیے وہ بھارتی شہریت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ (زیبا بختیار کتنی سمجھ دار تھیں۔ آج سمجھ میں آیا ہے۔)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ کراچی میں قتل عام عالمی اداروں کی سرپرستی میں ہو تا رہا ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ وہ عالمی خبر رساں ادارے جو پاتال کی خبریں بھی نکال لاتے ہیں۔ ان میں سے کسی نے آج تک پاکستان کے سب سے بڑے شہر میں قتل و غارت گری کے ذمہ داروں کے بارے میں کوئی رپورٹ تیار نہیں کی۔

(یحییٰ بن زکریا صدیقی' فرائی ڈے اسپیشل)

☆ وہ مشرف۔ جس کا ذکر بھارتی صوبے مدھیہ پردیش کی نصابی کتاب میں "چھ بڑے آدمی" کے باب میں شامل ہے۔ مشرف کے تو بھارت پر اتنے احسان ہیں کہ چھ بڑے آدمیوں میں ان کا نام شامل ہونا پورا انصاف نہیں۔

(عبداللہ طارق سہیل۔ وغیرہ وغیرہ)

آپ کا باورچی خانہ

صائمہ مشتاق.... سرگودھا

سوال - کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں۔ پسند ناپسند' غذائیت یا گھر والوں کی صحت؟

(1) کھانا پکاتے وقت میں ان تمام چیزوں کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ غذائیت گھر والوں کی صحت' پسند ناپسند' ویسے تو میں ابھی پڑھ رہی ہوں لیکن بہن' بھائی سب کزنز فرمائش کر کے کھانا بنواتے ہیں اس لیے پڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کا بھی خیال رکھتی ہوں کیوں کہ سب بہن بھائیوں اور کزنز سے بڑی جو ہوئی۔

سوال - کھانے کا وقت ہے' گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کر سکیں اور تواضع کر سکیں؟

(2) گھر میں بہت کم مہمان اچانک آتے ہیں زیادہ تر مہمان اطلاع دے کر آتے ہیں' بہر حال جلد تیار ہونے والی ڈش لکھ رہی ہوں۔

سنگاپوری چاول

اجزاء :

چاول	ایک گلاس (ابال لیں)
اسپگھٹی	آدھا پیکٹ (ابال لیں)
ہری پیاز	ایک پاؤ (باریک کٹی ہوئی)
نمک	حسب ذائقہ
سویا سوس	دو کھانے کے چمچ
ہری مرچ باریک کٹی ہوئی	4 عدد
اجینو موتو	ایک کھانے کا چمچ

ترکیب :

ایک پتیلی میں تیل گرم کر کے ہری پیاز فرائی کر لیں۔ تمام اشیاء اس میں ڈال کر اس کے بعد چاول اور اسپگھٹی بھی اس میں ڈال دیں' بیس منٹ دم پر رہنے دیں' لذیذ سنگاپوری چاول تیار ہیں' ٹماٹو کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

نوٹ : پیاز فرائی کرنے کے بعد اپنے ذائقے کے مطابق اس میں چکن یا فش بون لیس پیس اور سبزیاں بھی ڈالی جا سکتی ہیں۔

سوال - کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے' آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

(3) واقعی کچن عورت کا آئینہ دار ہوتا ہے' مجھے تو ویسے بھی صاف ستھرا رہنا پسند ہے اور گھر کو بھی صاف ستھرا ہی رکھتی ہوں۔ کچن کو ہر روز صاف کرتی ہوں۔ میری' کزن اقراء اور بہن افراء سے ہمیشہ اس بات پر ہی لڑائی ہوتی ہے کہ وہ جہاں سے چیز اٹھاتی ہیں' واپس نہیں رکھتیں۔ میں رات کو کچن صاف کرتی ہوں اور برتن دھو کر رکھ دیتی ہوں۔ امی صبح کا ناشتہ بناتی ہیں تو ہر چیز اپنی جگہ پر ملتی ہے۔ وقت کی بہت پابند ہوں۔

سوال - صبح کا ناشتہ ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ ایسی خصوصی ڈش کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں؟

(4) تمام دن کے کھانے میں صبح کے ناشتے کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے گھر میں عام سا ناشتہ ہوتا ہے ہم گھی میں تلے پراٹھے اور ساتھ میں چائے پیتے ہیں لیکن سب گھر والے گوبھی بھرے پراٹھے شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کی ترکیب بہت آسان ہے۔

گوبھی بھرے پراٹھے

اجزاء :

بند گوبھی	آدھا کلو

پیاز	ایک عدد
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
ہری مرچیں	چار عدد
ہرا دھنیا	ایک گڈی
سرخ مرچ	حسب ضرورت
انار دانہ (پسا ہوا)	دو کھانے کے چمچ
نمک	حسب ذائقہ
سفید زیرہ	کھانے کا ایک چمچہ
گھی یا تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

بند گوبھی کو باریک کاٹ لیں اور اس میں باریک کٹی ہوئی ۔ پسی ہوئی ادرک' ہری مرچ' نمک' کٹا ہوا ہرا دھنیا' سرخ مرچ' سفید زیرہ' ثابت دھنیا شامل کرکے اچھی طرح مکس کرلیں۔ آٹا گوندھ کر پیڑے بنالیں اور ایک روٹی بیل کر گوبھی کا آمیزہ حسب خواہش پھیلا لیں۔ پھر دوسری روٹی بیل کر اس پر رکھ کر کنارے دبا کر بیل لیں اب توے پر گھی میں تل لیں گوبھی کا چٹ پٹا پراٹھا تیار ہے۔

سوال ۔ آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھاتی ہیں؟

(5) ہمارے گھر میں ہوٹل میں کھانا نہیں کھاتے اور نہ ہی ہم کو باہر جانے کی اجازت ہے' اس لیے جو جی چاہے گھر میں ہی بنالیتے ہیں۔

سوال ۔ کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مد نظر رکھتی ہیں؟

(6) ہاں کھانا بناتے وقت موسم کو مد نظر ضرور رکھتی ہوں سردیوں میں' خاص کر برسات کے موسم میں میرا تو دل چاہتا ہے کہ ایک عدد رسالہ ہو اور ساتھ پکوڑے اور گرمیوں میں ٹھنڈے مشروبات بنائے جاتے ہیں۔

(7) اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

کھانا بنانے میں محنت کی قائل ہوں' جتنا آپ دل سے کھانا تیار کریں گی اتنا ہی اچھا بنے گا۔

سوال کچن کی کوئی ٹپ جو دینا چاہیں؟

(8) ویسے تو میرے پاس کئی کچن ٹپس ہیں لیکن ایک لکھ رہی ہوں ایک تو یہی ہے کہ جب آپ کھانا بنا رہے ہوں تو آیت الکرسی پڑھتی رہا کریں اس طرح چیز بھی اچھی بنتی ہے۔

پسی ہوئی سرخ مرچیں اگر کچھ عرصہ استعمال کے بغیر پڑی رہیں تو پھیکی ہو جاتی ہے ان کی رنگت برقرار رکھنے کے لیے جار یا بوتل میں مرچیں ڈالنے سے پہلے اس کی اندرونی سطح کو مونگ پھلی کے تیل سے ہلکا سا چکنا کریں مرچیں ڈالیں تو یہ خراب نہیں ہوں گی۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

ہنٹر بیف

ضروری اشیاء :

گائے کا گوشت	1کلو
قلمی شورہ	1/2کھانے کا چمچہ
لیموں کا رس	1/4کپ
کچری	1چائے کا چمچ
گرم مسالا پاؤڈر	1چائے کا چمچہ
سرخ مرچ (کٹی ہوئی)	1 1/2کا چمچہ
اجوائن	1/2چائے کا چمچہ
زیرہ	1چائے کا چمچ
کباب چینی	1/4چائے کا چمچہ
جائفل' جاوتری (پسی ہوئی)	1/4چائے کا چمچہ
تیل یا گھی	حسب ضرورت

ترکیب :

گوشت کو قلمی شورہ لگا کر کم از کم تین گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ اس میں سے پانی نکلے گا' وہ سب پھینک دیں بلکہ مزید دبا دبا کر اچھی طرح پانی نکال دیں۔ اس میں لیموں کا رس' کچری' گرم مسالا' اجوائن' جاوتری' سرخ مرچ' زیرہ' کباب چینی' جائفل لگا دیں ان مسالوں کو لگا کر تقریباً" چھ گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر اتنا پانی ڈالیں کہ گوشت گل جائے۔ ہلکی آنچ پر پکانے کے لیے رکھ دیں۔ گوشت گل جانے کے بعد تھوڑا سا تیل گرم کریں اور گوشت کو ایک یا دو منٹ کے لیے فرائی کریں اور ٹماٹو کیچپ کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

مسالے دار بیف بریانی

ضروری اشیاء :

گوشت	1کلو
چاول (دھو کر بھگو دیں)	750گرام
آلو (چھیل کر کاٹ لیں)	1/2کلو
دہی	1 1/2کپ
پیاز (سلائس کاٹ لیں)	3عدد
ادرک لہسن پیسٹ	1کھانے کا چمچہ
ٹماٹر (کاٹ لیں)	1/2کلو
سرخ مرچ پاؤڈر	2کھانے کے چمچے
ہلدی پاؤڈر	1/2چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	1کھانے کا چمچہ
بڑی الائچی	4عدد
چھوٹی الائچی	5-6عدد
جائفل پاؤڈر	1/4چائے کا چمچہ
جاوتری پاؤڈر	1/4چائے کا چمچہ
آلو بخارے	8-10عدد
سفید زیرہ	1چائے کا چمچ
لونگ	6-7عدد
ثابت سیاہ مرچ	8-10عدد
زردے کا رنگ	1/4چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

دیگچی میں تیل گرم کر کے پیاز گولڈن فرائی کریں۔ اس میں گوشت شامل کر کے اتنا فرائی کریں کہ گوشت کا پانی خشک ہو جائے۔ اس کے بعد اس میں دہی' ادرک' لہسن پیسٹ' ٹماٹر' سرخ مرچ پاؤڈر' ہلدی پاؤڈر' دھنیا پاؤڈر' بڑی الائچی' چھوٹی الائچی' جائفل پاؤڈر' جاوتری پاؤڈر' لونگیں' آلو بخارے' سیاہ مرچ' سفید زیرہ اور نمک ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔

گوشت گلانے کے لیے پانی ڈال دیں۔ جب گوشت آدھا گل جائے تو اس میں آلو شامل کردیں۔ گوشت اور آلو گل جائیں تو تھوڑا اور بھون کر اتار لیں۔ ایک بڑی دیگچی میں پانی گرم کرکے اس میں چاول اور 2 کھانے کے چمچے نمک ڈال کر 1 کنی رکھ کر ابال لیں اور چھلنی میں ڈال کر چھان لیں۔ ایک بڑی دیگچی میں تیار شدہ سالن کی آدھی مقدار ڈال کر اس کے اوپر آدھے چاولوں کی تہہ لگادیں اور تھوڑا سا زردے کا رنگ ڈال دیں دوبارہ یہی ترتیب دہرائیں۔ چاول پہلے تیز آنچ پر پکائیں اس کے بعد ہلکی آنچ پر 15-12 منٹ دم پر رکھ دیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر رائتے کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

کلیجی

اجزاء :

کلیجی	آدھا کلو
پیاز	دو عدد (باریک کاٹ لیں)
ٹماٹر	تین عدد (باریک کاٹ لیں)
ہری مرچیں	پانچ سے چھ عدد (باریک کاٹ لیں)
لہسن، ادرک (پسا ہوا)	دو کھانے کے چمچے
لال کٹی مرچ	1 چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
گرم مسالا (پسا ہوا)	آدھا چائے کا چمچہ
سرکہ	ایک چمچہ
قصوری میتھی	ایک چمچہ

ترکیب :

کلیجی کو پسا لہسن ڈال کر اچھی طرح ابال لیں تاکہ اس کی ہیک نکل جائے۔ کڑاہی میں تیل گرم کرکے پیاز کو گلابی کرلیں پھر اس میں باریک کٹے ہوئے ٹماٹر، پسا ہوا لہسن ادرک، ہری مرچیں، کٹی مرچ، ہلدی، نمک، گرم مسالا، سرکہ ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ پھر اس میں ابلی ہوئی کلیجی ڈال دیں اور اچھی طرح بھون لیں۔ جب کلیجی گل جائے تو اس میں اوپر سے قصوری میتھی چھڑک کر ڈھک دیں۔ پھر سرونگ ڈش میں نکال کر اوپر سے ادرک، پودینہ، اور لیموں چھڑک کر گرم گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔

کریمی ٹرائفل

ضروری اشیاء :

سادہ کیک	1/2 پونڈ
بنانا جیلی کرسٹلز	1 پیکٹ
پائن ایپل جیلی کرسٹلز	1 پیکٹ
اسٹرابیری جیلی کرسٹلز	1 پیکٹ
دودھ	1/2 لیٹر
کیلے	3-2 عدد
انناس	4 سلائس
ونیلا کسٹرڈ پاوڈر	3 کھانے کے چمچے
چینی	2 کھانے کے چمچے
پنیر	سجاوٹ کے لیے
کھوپرا	2 کھانے کے چمچے (بھنا ہوا)

ترکیب :

2 کھانے کے چمچے دودھ الگ کرکے اس میں کسٹرڈ پاوڈر گھول لیں۔ بقیہ دودھ کو ابال کر اس میں چینی ڈال کر پکائیں۔

کسٹرڈ پاوڈر ڈال کر ہلکا گاڑھا ہونے تک پکائیں اس کے بعد چولہے سے اتار کر اس میں کیلے کاٹ کر ڈال دیں اور کمرے کے درجہ حرارت پر ٹھنڈا ہونے دیں۔ تینوں قسم کی جیلیز کو علیحدہ علیحدہ آدھے کپ پانی میں ابال کر جمائیں۔

ایک بڑی ڈش میں پہلے کیک کی تہہ لگا کر اوپر سے پائن ایپل جیلی کی تہہ لگائیں اب تھوڑے کسٹرڈ میں کھانے کا رنگ ڈال کر اس کی تہہ لگائیں اوپر اسٹرابیری جیلی کی تہہ لگا کر تھوڑے کسٹرڈ میں گلابی رنگ ڈالیں۔

اسے جما کر سیٹ کرلیں اس کی تہہ لگائیں آخر میں کسٹرڈ کے اوپر جیلی اور انناس کے قتلے سجا کر ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

نفسیاتی و ازدواجی الجھنیں

امِ ثمر

س : شادی کو تقریباً" تین سال ہو گئے ہیں اور پچھلے دس ماہ سے میکے میں ہوں۔ میں یہ بات سمجھتی ہوں کہ کوئی بھی انسان پرفیکٹ نہیں ہوتا مگر کچھ خامیاں ایسی ہوتی ہیں جن سے کوئی عورت نباہ نہیں کر سکتی جن میں شکی مرد سرفہرست ہے۔ میری عمر 22 سال اور میاں کی 29 سال ہے۔ دو بچے ہیں۔

میاں شکی مزاج ہیں اور شاید کسی قسم کا احساس کمتری بھی ہے۔ جس کو وہ احساس برتری (شعوری طور پر) سے ڈھانپنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہر وقت میری ٹوہ میں لگے رہتے تھے کہ میری کوئی خامی یا قابل گرفت چیز ان کی نظر میں آجائے۔ مجھ سے چھپ کر میری چیزیں چیک کرتے رہتے تھے۔ میکے آتی تو ساتھ آتے' یہاں بھی پرانی چیزیں چیک کرتے رہتے۔ ہر وقت بلاوجہ تفتیش جاری رکھتے تھے۔ جیسے کچھ اگلوانا ہو۔

شادی سے پہلے میں کافی خوش مزاج اور ہنس مکھ تھی۔ مطالعے کا بھی بے حد شوق تھا۔ شادی کے بعد میاں نے ہر چیز پر پابندی لگادی۔ شروع شروع میں سہیلیوں کا فون آجاتا تو اسپیکر آن کروا کر ساری بات سنتے تھے۔ گھر والوں سے بھی کبھی میں نے اکیلے بات نہ کی بلکہ سارا وقت سر پر کھڑے رہتے تھے۔ وہاں جتنا بھی عرصہ گزارا عجیب حالت میں گزارا۔ دماغ تو جیسے بند ہی ہو گیا تھا۔ کسی سے شیئر بھی نہ کر سکتی تھی۔ اور وہ جو بھی بات سوچ لیتے ہیں بس اسی پہ ڈٹے رہتے ہیں چاہے جتنا بھی سر کھپاؤ! بہت عجیب رویہ اپنا لیتے ہیں اور زبان بھی عجیب و غریب استعمال کرتے ہیں۔

اب جبکہ میرے اور میرے گھر والوں کے دل میں ان کے لیے ذرا بھی عزت نہیں بچی اور نہ ہی ان کے دل میں شروع سے میرے یا میرے گھر والوں کے لیے کوئی اچھے جذبات تھے تو کیا اس صورت حال میں مجھے واپس جانا چاہیے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر میں واپس چلی بھی جاؤں تو میں اس شخص سے کس طرح کا رویہ اپناؤں۔ میں بچوں کی وجہ سے مجبور ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ وہ باپ کے سائے کے بغیر زندگی گزاریں۔ لیکن جب بھی میں واپس جانے کا سوچتی ہوں تو دل جیسے کسی کھائی میں گرنے لگتا ہے۔

ایک اور مسئلہ بھی ہے کہ اگر میں واپس جاؤں تو میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے بھی اپنے باپ کی طرح بن جائیں۔ وہ اپنے آپ کو بہت عظیم سمجھتے ہیں' ماں' بہنوں کی بھی عزت نہیں کرتے اور اپنے آپ کو رول ماڈل سمجھتے ہیں' جو کسی قسم کی غلطی تو کر ہی نہیں سکتا۔

ج : شکی مزاج شوہر کے ساتھ گزارا کرنا بہت مشکل ہے۔ اور اس صورت میں جبکہ وہ اپنی ماں' بہنوں کی بھی عزت نہیں کرتے تو بیوی کا درجہ ان کی نظر میں کیا ہو گا؟

سچ تو یہ ہے کہ آپ کے شوہر مریض ہیں' انہیں شک کا مرض لاحق ہے سوال یہ ہے ایسی صورت میں کیا آپ کو ان کے پاس واپس جانا چاہیے؟

مسئلہ یہ ہے کہ آپ دو بچوں کی ماں ہیں۔ اگر آپ واپس نہیں جاتیں تو اکیلے بچوں کی پرورش کیسے کریں گی؟ کوئی جاب وغیرہ بھی نہیں کرتیں۔ پھر آگے کی زندگی کا مسئلہ ہے' ابھی آپ بہت کم عمر ہیں اگر دوسری شادی کرتی ہیں تو آپ کو تو شوہر مل سکتا ہے' بچوں کو باپ نہیں۔ اس شخص کے پاس بچوں کو چھوڑنا بھی مشکل ہے۔ جس کا ذہن ایسا ہو' وہ بچوں کو کیسے سنبھالے گا اور کیا تربیت کرے گا۔

آپ اسے ایک موقع اور دیں اور اس کے ساتھ جانے کے لیے کچھ شرائط رکھیں۔ اس سے کہیں کہ اسے اپنے اندر تبدیلی لانا ہو گی۔ اور وہ کسی سائیکاٹرسٹ سے باقاعدہ علاج کرائے تب آپ اس کے ساتھ جائیں گی۔

دوسرا سوال بہت اہم ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کس طرح کا رویہ رکھا جائے؟

اس طرح کے لوگوں کے ساتھ صرف ایک ہی رویہ رکھا جا سکتا ہے کہ صبر و تحمل سے کام لیا جائے۔ (جانتا ہوں یہ بہت مشکل ہے) اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے۔ ممکن ہے وقت کے ساتھ کوئی تبدیلی آجائے۔

ب۔ج، کراچی

اچھی بہن! آپ کا خط پڑھا۔ آپ کی رائٹنگ، تحریر کی روانی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ذہین ہیں۔ خط میں کہیں کہیں باتیں دہرائی گئی ہیں اور کہیں آپ اپنی ہی بات کی نفی کرتی نظر آتی ہیں لیکن اس کے باوجود آپ نہ صرف نارمل ذہن کی مالک ہیں...... بلکہ بہت اچھے ذہن کی مالک ہیں۔